دانشِ سُہیل

مرتب

ڈاکٹر شبابُ الدین

ناشر
ضیاءُ الدین خاں میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ
بڈھریا، اعظم گڑھ

علامہ اقبال سہیل کی شعری کائنات، نظم، غزل، نعت، منقبت، مثنوی، قصیدہ، قطعہ اور رباعی پر مشتمل ہے۔ کلیاتِ سہیل میں ایک حصہ "نوائے شیراز" بھی شامل ہے جس میں اُن کی فارسی شاعری کے جلوۂ صد رنگ نمایاں ہیں۔ کلیاتِ سہیل کا مطالعہ موصوف کے افکار و نظریات کی گراں قدر ترجمانی کرتا ہے۔ وہ ایک منفرد فکر و فن کے شاعر کی حیثیت سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اُن کا شعری اور ادبی اُفق ہشت پہل ہے۔ حالانکہ وہ کسی تحریک کا نتیجہ نہیں ہیں، وہ کسی بندھے ٹکے نظریات سے وابستہ نہیں بلکہ خود ایک عہد آفریں شاعر کے طور پر مطلع شعر و ادب پر نمودار ہوتے ہیں۔ جس میں عرب کا تجمل، عجم کی رعنائی اور سرزمین ہند کی برنائی کا حسین امتزاج ہے۔ وہ فطری شاعر تھے، اُن کے استاد علامہ شبلی نعمانی نے سہیل کی بدیہہ گوئی کی تعریف کی ہے۔ جب باکمال اُستاد شاگرد کے کلام پر مہر تصدیق و توصیف ثبت کردے تو پھر کسی کی سند کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

— پروفیسر سید فضل امام رضوی

DANISH-E- SUHAIL

نام کتاب	:	دانش سہیل
مرتب	:	ڈاکٹر شباب الدین
صفحات	:	۵۵۲
طبع اول	:	مئی ۲۰۱۸ء
ناشر	:	ضیاءالدین خاں میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ بڈھریا، اعظم گڑھ
مطبع	:	الھدی پبلیکشنز نئی دہلی
قیمت	:	Rs. 500/-
کمپوزنگ	:	صلاح الدین نثار معروفی 9889036799

تقسیم کار

(۱) دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

(۳) ضیاءالدین خاں میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، بڈھریا، اعظم گڑھ

(۴) مکتبہ نعیمیہ صدر بازار، مئوناتھ بھنجن (یوپی)

مندرجات

☆☆☆

—☆—

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا
ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

کئے ہیں چاکِ دل سے بوئے گل نے بال و پر پیدا
ہوس ہے زندگانی کی تو ذوقِ مرگ کر پیدا

جوانو! یہ صدائیں آ رہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا

اقبال سہیل

نگاہِ اولیں

علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کے شاگرد رشید، ڈاکٹر ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی کے ہم درس و ہم جماعت علامہ اقبال احمد خاں سہیل اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بڑہریا میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ مدرسۃ الاصلاح کے بانی مولانا محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب سے درسی کتابیں پڑھیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہیؒ سے بھی کسب فیض کیا۔ دینی تعلیم کے حصول کا سلسلہ ۱۹۰۹ء تک جاری رہا، انگریزی تعلیم انھوں نے بنارس کے ایک انگریزی اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم اے او کالج، علی گڑھ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) تشریف لے گئے اور وہاں کے ممتاز اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ آخر عمر تک اسی پیشہ وکالت سے وابستہ رہے۔ شبلی کالج اور مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کی انتظامیہ کمیٹی کے معزز رکن رہے، ان اداروں سے وابستگی اور غیر معمولی تعلق کی اصل وجہ ان اداروں کی تعمیر و تاسیس میں ان کے اساتذہ مولانا شبلی اور مولانا فراہی کا کردار تھا۔

مولانا شبلی سے شاگردی کے متعلق افتخار اعظمی نے لکھا ہے کہ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے شبلی سے عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ دیوان حماسہ، شرح مسلم، بحر العلوم اور عقد الفرید وغیرہ زیر درس تھیں۔ درس سے خارج اوقات میں بھی وہ علامہ شبلی کی خدمت میں حاضر رہتے۔ استاد کی نکتہ بار گفتگو سنتے اور اس طرح ذوق علم و ادب کو جلا دیتے۔ ادبیات فارسی اور نقد سخن کا تذکرہ اکثر ہوتا، بزم شبلی میں جو تذکرے شاعری کے متعلق ہوتے انھیں نہایت غور سے سنتے اور حافظہ میں محفوظ رکھتے۔ ان کے شاعرانہ اور ادبی ذوق کو جو بلند پروازی حاصل ہوئی یقیناً شبلی کی صحبتوں کا ہی اثر تھا۔ اس کا اعتراف

خود اقبال سہیل مرحوم نے بھی کیا ہے۔ شبلی کو اپنی فارسی شاعری پر بہت ناز تھا، اپنی شاعری کو وہ حافظ اور سعدی کے ہم پلہ سمجھتے تھے۔ ان کی فارسی شاعری کے سامنے کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا تھا لیکن اقبال سہیل وہ شاعر ہیں جن کے کلام کے متعلق خود شبلی نے کہا "تیری شاعری پر مجھ کو خود اپنے کلام کا دھوکہ ہو رہا تھا۔"

قیام علی گڑھ کے دوران اُن کو اس زمانہ کے جن ممتاز علماء اور دانشوروں سے ملنے اور جن سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا، ان میں مولانا الطاف حسین حالی، مولوی وحید الدین خاں سلیم اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ الطاف حسین حالی کے متعلق ان کے عقیدت مندانہ اعتراف کا حال سنئے۔ فرماتے ہیں:

> "مجھے فخر ہے کہ مولانا حالی کی زبان سے اپنی ناچیز شاعری پر چند کلمات تحسین سننے کا شرف حاصل ہوا، اور مولانا نے اپنے خاص شفقت آمیز اور سراپا خلوص لہجے میں چند دعائیں بھی میرے لئے مرحمت فرمائیں۔"

اقبال سہیل کے علمی کمالات اور ادبی مقام و مرتبہ کا اعتراف کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اپنے عہد کے عالی مرتبہ عالم اور بے مثال محقق مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ علامہ حمید الدین فراہیؒ کے باقاعدہ شاگرد ہیں۔ احادیث اور قرآن کے بارے میں وہ علامہ فراہیؒ سے جو نکات سنتے اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتے۔ قرآن پر اقبال سہیل کی نظر کسی بلند نظر مفسر سے کم نہ تھی۔ انھیں حدیثیں کثرت سے یاد تھیں۔ مولانا فراہیؒ ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت آخذہ کے قائل تھے۔ مولانا شبلی نے بھی ان کی لیاقت کا اعتراف کیا ہے اور ان کی بدیہہ گوئی کی تعریف کی ہے۔ ان کی شاعری کے شبلی اس قدر قائل و معترف تھے کہ کسی سے اصلاح نہ لینے کی ہدایت کی تھی۔ سہیل کی زبانی سنئے:

> "اصلاح کلام کی استدعا کی .... تو یہ ہدایت ہوئی کہ کسی کو اپنا کلام اصلاح کی غرض سے نہ دکھاؤں، اور اپنے نتائج فکر کی معاندانہ تنقید کرتا رہوں۔ اس مشق و ممارست سے چند ہی دنوں میں بازوئے فکر توانا ہو جائیں گے اور جو تبدیل و تغیر اپنے کلام میں خود کیا جائے گا وہ استاد کی اصلاح سے بسا اوقات بہتر اور ترقی

استعداد میں بہر حال زیادہ معاون ہوگا۔ مولانا جیسے امام فن کی زبان سے چند کلمات تحسین کا نکلنا تھا کہ دفعۃً میں اعظم گڑھ کے پورے علمی وادبی حلقہ کا مرکز توجہ بن گیا اور بڑے بڑے نامور شعرا اپنے سابق اساتذہ کو چھوڑ کر مجھ سے مشورہ واصلاح لینے لگے۔''

اقبال سہیل کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح واقف ہیں کہ ان کو قومی وملی سیاست سے بے پناہ دلچسپی اور برطانوی اقتدار سے شدید نفرت تھی۔ انھوں نے مولانا حسرت موہانی کے اخبار 'اردوئے معلی' کے پاشا نمبر میں ایک مضمون مصر میں برطانیہ کی عیارانہ سیاست کے بارے میں تحریر کیا تھا۔ اس وقت اقبال سہیل علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے۔ اخبار میں نام نہیں تھا، ایڈیٹر مولانا حسرت موہانی نے بھی ان کا نام ظاہر نہیں کیا اور خود اس مضمون کی اشاعت کے جرم میں جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سہیل کو جذبہ آزادی اپنے خاندان اور استاد علامہ شبلی نعمانی سے ملا تھا۔ ملک کی آزادی میں ان کی نظموں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اس وقت کے عظیم مجاہدین آزادی مولانا محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی وغیرہ کی ملک وقوم کے تئیں قربانیوں اور سرگرمیوں کا مشاہدہ بچشم خود کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاسی بصیرت میں ان شخصیتوں کی چھاپ محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا اور اعظم گڑھ سے ایم ایل اے بھی منتخب ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ ان کی منظوم تقریریں اسمبلی ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ ان کی سماجی وسیاسی شخصیت کا ایک پُرکشش اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ فرقہ واریت کے تنگ دائرے میں محدود نہیں ہوئے اور ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دی۔ انگریزوں کی عیاری اور مکاری کی وجہ سے انھیں وہ آدم کی نہیں ابلیس کی نسل سے سمجھتے تھے۔ وہ ان چند لوگوں میں تھے جو دوسروں کی خیر خواہی میں اپنی ساری زندگی تج دیتے ہیں اور ان کے دل دوسروں ہی کے واسطے دھڑکتے ہیں۔

انھوں نے چند مقالات شبلی کی جامعیت، داستان تاریخ اردو اور مشرقی یوپی کے کچھ اہلِ قلم علامہ شبلی کے مکاتیب، حقیقت ربو، چند مقدمات نشاط روح (اصغر گونڈوی) جلوۂ صد رنگ (حبیب احمد صدیقی) خرمن عشق (شفیق جونپوری) گنجینۂ تحقیق (بیخود موہانی) حدیث حسن (فطرت واسطی) نغمۂ دل (دل شاہجہاں پوری) اور چند خطبات خطبہ صدارت مشاعرہ آئینہ ادب کانپور، خطبۂ صدارت

مشاعرہ، مدح صحابہ، لکھنؤ تحریر کیے۔ اس کے علاوہ ''سیرت شبلی'' کے نام سے الاصلاح سرائمیر میں ۵ اقسطیں تحریر کی ہیں جو حیات شبلی کا اہم ماخذ ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ان کے بیانات کو خاص اہمیت دی ہے اور حسب موقع ان کے اشعار بھی شامل کیے ہیں۔

مختصر یہ کہ علم وادب اور ہندوستان کی تحریک آزادی اور آزادی کے بعد نئے ہندوستان کی تاریخ مرتب کرتے وقت اگر اقبال سہیل سے صرف نظر کیا جائے گا تو یہ انصاف کے خلاف ہوگا۔ ان کے متعدد مجموعہ کلام مثلاً تابش سہیل، ارمغان حرم، مرتبہ افتخار احمد اعظمی، کلیات اقبال سہیل۔ مرتبہ ڈاکٹر عارف رفیع طبع ہو کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے شبلی صدی کے موقع پر ''سیرت شبلی'' بھی منظر عام پر آگئی ہے۔ جس کو بہت پسند کیا جارہا ہے۔ اقبال سہیل صاحب جیسی دل آویز شخصیت اعظم گڑھ کے کلاہ افتخار میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نئی نسل کو ان سے متعارف کرانا اور عہد حاضر میں ان کے فکر وفن کی معنویت متعین کرنا وقت کی اہم ضرورت تھی جس کے پیش نظر شبلی کالج اور ضیاء الدین خاں میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ بڈھریا کے اشتراک سے ''علامہ اقبال سہیل کی علمی وادبی جہات'' کے موضوع پر ۱۹، ۲۰ رفروری ۲۰۱۷ء کو دو روزہ قومی سمینار منعقد کیا گیا۔ اس سمینار میں ملک کے مشہور ومعروف علما، ادباء اور دانشوروں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ان کے علاوہ علامہ اقبال سہیل کے خانوادہ کے اہم افراد ڈاکٹر احمد صفی صاحب، ڈاکٹر عارف رفیع صاحب (نواسے) جناب نیر اقبال صاحب، فواد اعظمی (پوتے) اور محترمہ رفیعہ صمد صاحبہ (نواسی) کی شرکت اور خصوصی دلچسپی نے سمینار کی رونق میں اضافہ کیا، اقبال سہیل کی بیٹی محترمہ مسلمہ خانم ان تاریخوں میں ملک سے باہر تھیں لیکن انھوں نے ایک تحریر لکھ کر بھیج دی جو سمینار میں پیش کی گئی اور زیر نظر مجموعہ میں شامل بھی کر لی گئی ہے۔ ان کی نواسی محترمہ رفیعہ صمد نے بھی اپنے نانا کی یاد میں ایک تحریر پیش کی جس کو سن کر حاضرین نمناک ہو گئے۔ شکریے کے ساتھ یہ تحریر بھی کتاب میں شامل کر لی گئی ہے۔ اس مجموعہ مقالات کا سب سے اہم اور دلچسپ مقالہ خود علامہ اقبال سہیل کے تراوش قلم کا نتیجہ ہے جو انھوں نے اسعد عباسی معظم آبادی کے مجموعہ کلام ''شمیم عشرت'' کے لیے ''تنقید'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا، قارئین کی ضیافت طبع کی خاطر کتاب کے شروع میں بہ طور تبرک شامل ہے، یہ قیمتی ہدیہ استاد محترم پروفیسر اصغر عباس صاحب سابق صدر شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے خصوصی التفات سے حاصل ہوا، اس

عنایت پر ہم اپنے استاد محترم کے بے حد شکر گزار ہیں۔

انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر ہم اس موقع پر اپنے ان خصوصی معاونین ڈاکٹر احمد صفی انصاری، ڈاکٹر عارف رفیع، ڈاکٹر عبدالحنان، کالج کے پرنسپل ڈاکٹر غیاث اسد خاں اور اراکین دارالمصنفین کا تذکرہ نہ کریں، وصی الرحمٰن جنھوں نے سمینار کے انعقاد میں ابتدا سے اختتام تک ہماری دست گیری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور سمینار کو کامیابیوں سے ہم کنار کیا۔

زیر نظر مجموعہ "دانش سہیل" کی ترتیب و اشاعت میں مجھے برادر محترم ڈاکٹر محی الدین آزاد، ڈاکٹر علاء الدین خاں اور عزیز شاگرد ابو رافع کا تعاون قدم قدم پر حاصل رہا ہے۔ ہم دل کی گہرائیوں سے ان کے شکر گزار ہیں۔ توقع ہے کہ ہماری یہ کاوش و کوشش اقبال سہیل کی علمی و ادبی جہات کے تعین میں معاون و مددگار ہوگی اور علمی و ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

ڈاکٹر شباب الدین
صدر شعبۂ اردو
شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ

مکتوب

مکرمی ڈاکٹر شباب الدین صاحب سلام مسنون

میں نے جب یہ سنا کہ آپ علامہ اقبال سہیل پر سمینار کر رہے ہیں تو بڑی خوشی ہوئی، میں بچپن میں ان کے گھر اعظم گڑھ گیا تھا اور ان کا کلام ان کی زبان سے سنا تھا۔ یہ سب باتیں اب خواب وخیال ہیں۔

علامہ ابوالفضل احسان اللہ عباسی جو چریا کوٹ کے تھے، بعد میں نظام پور گورکھپور میں انھوں نے مکان بنا لیا تھا، ان کے بیٹے اسداللہ عباسی شاعر تھے، ان کا مجموعہ کلام شمیم عشرت کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، سہیل صاحب نے اس پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس کی زیراکس کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ جب سمینار کے مضامین شائع کریں تو تبرک کے طور پر اس مضمون کو بھی شامل کر لیجیے۔ سمینار کی کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ

خیر اندیش

اصغر عباس

اقبال سہیل کی ایک نادر تحریر

علامہ آزاد بلگرامی قدس اللہ سرہٗ نے ہندوستان کے اس خطہ کو جو آج صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کا مشرقی حصہ ہے اور جو ان کے زمانہ میں سرکار جونپور شالی تھا، شیراز ہند کا لقب دیا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علمی حیثیت سے یہ خطہ نہ صرف عہد ماضی میں بلکہ آج بھی دوسرے حصص ملک سے ممتاز ہے اور جہاں تک علوم اسلامیہ یا مسلم ارباب فضل وکمال کا تعلق ہے خصوصیت کے ساتھ یہ خطہ شاہان مشرقی کے دور حکومت سے لے کر آج تک ممتاز چلا آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدرت کے فیوض دوسرے حصص ملک میں بھی رشحہ باری کرتے رہے ہیں اور سیاسی مرکزیت کی بنا پر دہلی اور لکھنؤ میں بھی اکثر ارباب کمال کا اجتماع رہا اور خود شہر دہلی نے بڑے بڑے اساطین فن پیدا کیے، اسی طرح مضافات اودھ میں بلگرام اور صوبہ بہار کے بعض حصے علمی حیثیت سے جواہر خیز کہے جاسکتے ہیں، لیکن یہ خصوصیت اسی نواح کو حاصل ہے کہ سیاسی مرکزیت یعنی سلطنت شرقی کے زوال کو صدیاں گذر گئیں، اقتدار اودھ کے دور نامسعود میں ہر طرح کی ابتلا مصائب اور مظالم کا شکار ہونا پڑا اور موجودہ حکومت کی سیاسی تفرقہ پردازی نے سرکار جونپور کو اعظم گڑھ، جون پور، فیض آباد، غازی پور اور بلیا کے مختلف حصوں میں بکھیر دیا، پھر بھی اس مردم خیز خطہ کی جواہر خیزی کو لیل ونہار کے یہ انقلابات مٹا نہ سکے۔ اگر عہد سلف میں اس خطہ نے تفسیر بحر موج، شرح بخاری، شمس بازغہ، مناظرہ رشیدیہ وغیرہ کے مصنفین پیدا کئے تھے تو عصر حاضر میں بھی ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان فاروقی مرحوم جیسی جامع حیثیات اور یگانہ روزگار شخصیت کے پیدا کرنے کا فخر اسی خطہ کو حاصل ہے، اگر علوم قدیمہ کا مجدد اور بزم کہن کا آخری صدر نشیں علامہ شبلی جیسا مفکر اعظم اور مجموعہ کمالات اسی خطہ سے اٹھا تو تہذیب جدید کا گراں مایہ فرزند اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کا دوسرا ہندوستانی چیف جسٹس بھی علامہ مرحوم ہی کا چراغ خاندان ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ

اس خاک سے اٹھنے والے علم اور کمال کے میدان میں جہاں بھی گئے اور اپنے فطری رجحان کے مطابق جس شعبہ کی طرف توجہ کی اقران وامائل میں سربلند رہے۔

چنانچہ شرفائے اعظم گڑھ کی وہ جماعت جو دوسرے مقامات پر جاکر آباد ہوگئی اس کو ہمیشہ مقامی باشندوں پر یک گونہ تفوق حاصل رہا۔ دور کیوں جایئے، اسی کمشنری کا صدر مقام گورکھپور ہمارے دعوئ کی بین دلیل ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جن اشخاص کی بدولت گورکھپور کی قسمت چمک اٹھی مثلاً شاہ صاحبان سبز پوش کا خاندان، خان بہادر مولانا حاجی نثار اللہ صاحب ایم، ایل، سی، مولانا سبحان اللہ صاحب رئیس اعظم، آنر ایبل مسٹر محمد اسماعیل صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد وغیرہ سب کے سب بلا استثناء اصلاً اعظم گڈھی ہیں۔ اعظم گڑھ کے انھیں مہاجرین میں سے ہمارے محترم بزرگ اور اردو کے مایہ ناز مصنف علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی چریاکوٹی مرحوم بھی تھے۔ چریاکوٹ ضلع اعظم گڑھ کے مشرقی حصہ میں ایک چھوٹا سا قریہ ہے مگر سچ پوچھئے تو سرکار جون پور شالی سے اس کو وہی نسبت حاصل ہے جو دماغ کو جسم انسانی کے دوسرے اعضاء سے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر سرکار جون پور کو علم و دانش کا ایک نظر فریب چمنستان قرار دیا جائے تو اس کا سب سے نزہت آفریں اور سرمایۂ ناز چمن یہی خطہ قرار پائے گا۔ ہندوستان کا کونسا گوشہ ہے جو فضل و کمال کے اس سرچشمہ سے سیراب نہیں ہوا۔ حضرت مولانا احمد علی، حضرت مولانا عباس، فخر الادباء والمہندسین حضرت مولانا عنایت رسول اور استاذ المتاخرین حضرت مولانا فاروق مرحوم جیسے ائمہ فن جس خاک سے اٹھے ہوں اس کا مجد وشرف کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ سرسید مرحوم کی خطبات احمدیہ زیادہ تر حضرت مولانا عنایت رسول کی علمی تحقیق سے مستعار ہے اور اس طرح پرنئی روشنی کا چراغ بھی اسی شبستان علمی کی بدولت روشن ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید مرحوم کو ارباب چریاکوٹ کے ساتھ ہمیشہ مخصوص قلبی تعلق رہا اور مدرسۃ العلوم کے آغاز میں جن طلباء کو اولیت کا شرف حاصل ہے ان میں سے ایک علامہ محمد احسان اللہ عباسی چریاکوٹی مرحوم بھی تھے۔ انھیں علامۂ مرحوم کے نامور فرزند ہمارے دوست قاضی محمد اسد اللہ عباسی ہیں جن کا دیوان اس وقت زیر نظر ہے۔

قاضی صاحب موصوف نے اپنی طالب العلمی کا کچھ زمانہ اعظم گڑھ میں گذارا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علامہ شبلی کے آستانہ فیض کی خاک بوسی نے مجھے علوم جدیدہ سے بے نیاز کر رکھا تھا اور انگریزی کا حرف شناس تک نہ تھا، مگر چریاکوٹ کی نسبت دلی کشش کی محرک ہوئی اور قاضی صاحب سے

نہ صرف رسمی تعارف بلکہ قلبی ارتباط پیدا ہو گیا۔ ابھی اس کو چند ہی مہینے گذرے تھے کہ قاضی صاحب نے اعظم گڑھ کو خیر باد کہی اور میں بھی شہر اعظم گڑھ چھوڑ کر کچھ دنوں اپنے گاؤں پر رہا اور پھر بنارس، الہ آباد اور علی گڑھ کی خاک چھانتا پھرا اور بالآخر اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی۔

اتفاق سے ایک مقدمہ کی پیروی میں گورکھپور جانا ہوا تو بیسیوں برس کے بعد قاضی صاحب کی زیارت نصیب ہوئی اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ قاضی صاحب نے اپنے لئے نیا میدان عمل انتخاب کیا ہے اور علمی شغل جو ابًا عن جدٍ وراثت میں ملا تھا ایک مدت سے ترک کر دیا ہے اور اب ایک نہایت کامیاب تاجر ہیں۔ بچپن میں بھی ان کا رجحان طبیعت حصول علم کی طرف زیادہ نہ تھا اور میرا تو یہی اندازہ تھا کہ غالباً ہمارے یہ دوست بزرگ زادہ نادان ہو کر رہ جائیں گے اور اسلاف کا اندوختہ اسی بیدردی کے ساتھ نذر تعیش کریں گے جو ہمارے شریف زادوں کا مخصوص طرۂ امتیاز ہے مگر تجارت میں ان کی غیر معمولی اور خلاف توقع کامیابی دیکھ کر مجھ کو واقعۃً دلی مسرت ہوئی اور ماننا پڑا کہ اس مردم خیز خطے کے نونہال اپنی فطری استعداد کی بدولت ہر میدان عمل میں علم امتیاز بلند کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

قاضی صاحب کے ایک مخلص دوست کی حیثیت سے ان کی یہ دنیاوی کامیابی ہی میرے لئے کیا کم مسرت انگیز تھی مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ طالب العلمی کا فیشن ایبل نوجوان اور شباب کا ایک ہوشیار تاجر بڑھاپے کا شاعر بھی ہے اور گاہے ماہے شعر وسخن کا بھی شغل رکھتا ہے۔

میں نے قاضی صاحب کو بچپن میں بھی دیکھا تھا اور جانتا تھا کہ شعر موزوں کرنا تو کجا موزوں اشعار کو بھی پڑھ کر ناموزوں کر دیا کرتے تھے، مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ شاعری یا موزونی طبع ایک فطری ودیعت اور ایک وہبی ملکہ ہے سعی و اکتساب سے یہ چیز حاصل نہیں کی جا سکتی مگر یہ کیا معلوم تھا کہ خاک چریا کوٹ کی کرامت ایک قدیم کلیہ کو باطل کر دے گی اور کم سے کم ایک استثناء کرنا پڑے گا۔

اولاً تو گورکھپور کی ملاقات بھی محض سرسری تھی، ثانیاً قاضی صاحب کے ذوق علمی سے میری بدگمانی کافی قدیم اور راسخ تھی، اس لئے سچ تو یہ ہے کہ گورکھپور کے زمانہ قیام میں مجھے ان کے شاعر ہونے کا یقین نہیں ہوا اور میں یہی سمجھتا رہا کہ جس طرح قاضی اینڈ کو کی شاندار دوکان میں دساور سے

خریدے ہوئے مال سجائے ہوئے ہیں اسی طرح یہ شاعری بھی مقامی سوداگروں سے خریدی گئی ہے، لیکن میرے ایک قابل اعتماد اور عزیز دوست دانش چریاکوٹی (محمد مزمل اللہ عباسی) نے مجھے یقین دلایا اور اب دیوان کے مطالعہ کے بعد وہ ایمان بالغیب حق الیقین بلکہ درجۂ شہود تک پہنچ گیا ہے کہ قاضی صاحب کی شاعری حقیقتاً انھیں کی طبع زاد اور نتیجۂ فکر ہے اور کوئی خارجی عنصر اس میں شامل نہیں ہے۔

قاضی صاحب نے اپنے دیوان کی اشاعت سے نیپولین کا یہ مقولہ ثابت کردیا ہے کہ لغت سے لفظ محال کو خارج کردینا چاہئے اور سعی وعمل سے ہر محال کو ممکن بنایا جاسکتا ہے، اگر فطری صلاحیت نہ ہونے کے باوجود ایک صاحب دیوان شاعر بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانی کوشش بڑی سے بڑی مشکل پر غالب نہ آسکے۔

میری تو رائے یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر سے یہ دیوان نوجوانوں کے لئے ایک درس عمل ہے اور کسی مزید تبصرہ یا مقدمہ کا محتاج نہیں اور اگر اشعار سے حظ حاصل کرنا نفسیات شاعر کے مطالعہ پر بھی سمجھا جائے تو خود فاضل مصنف کا مقدمہ جس کو انھوں نے غایت خاکساری سے "یاد ایام" کا عنوان دے رکھا ہے کافی سبق آموز ہے۔

مجھ کو تو صرف ایک فقرہ کی صداقت نے بہت متاثر کیا، قاضی صاحب فرماتے ہیں اور بجا فرماتے ہیں کہ "ان کی شاعری بیدمؔ، ریاضؔ اور غالبؔ کی شاعری سے متاثر اور انھیں حضرات کے تتبع کا نمونہ ہے۔" بادی النظر میں یہ تین نمونے دال روٹی، پوسٹ کارڈ کی طرح باہم غیر مربوط انمل اور بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں لیکن دیوان کے مطالعہ کے بعد جو گوناں گوں تنوع آپ کو اس میں نظر آئے گا وہ مصنف کی صداقت کے اعتراف پر مجبور کردے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے قدم قدم پر بیدمؔ شاہ صاحب کی بزم سماع اور رنگ ریاضؔ کی عریانی جذبات کو غالبؔ کی حکیمانہ شاعری کے ساتھ سمونے کی کوشش کی ہے اور کم سے کم دو اول الذکر نمونوں کی تقلید میں بسا اوقات خاص کامیابی حاصل کی ہے۔

آپ اسے میری بدقسمتی سمجھیں یا خوش قسمتی لیکن حق یہ ہے کہ قوالی ہو یا عریاں نگاری جس کو شاعروں کی اصطلاح میں معاملہ بندی کہتے ہیں مجھ کو دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اس لئے اس دیوان پر کسی بسیط تبصرہ کی صلاحیت اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ اس کے لئے مجھ سے زیادہ اہل نظر کی ضرورت ہے اور وکالت کے مشغلہ نے فرصت کے اوقات سے محروم کر رکھا ہے، اگر بکوشش کچھ لکھا بھی

چاہوں تو وقت نہیں ہے۔ لہٰذا ان چند سطروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

اسی سلسلہ میں یہ گذارش کر دینا ہے کہ ہمارے دوست قاضی صاحب نے اپنے اس نادر مجموعہ کلام کی طباعت میں غیر معمولی بخل سے کام لیا ہے، یہ دل آویز نغمے تو اس کے مستحق تھے اور قاضی صاحب کو خدا نے استطاعت بھی دے رکھی تھی کہ عمدہ کاغذ پر اور کسی صاحب فن کاتب سے لکھوا کر اہتمام کے ساتھ شائع کئے جاتے مگر افسوس ہے کہ کاغذ اور شان خط کی خرابی تو الگ رہی کتابت کی غلطیاں اس قدر ہیں کہ اگر ایک ناواقف شخص کی نظر سے یہ دیوان گذرا تو بہت ممکن ہے کہ کاتب صاحب کی غلطیوں کو خود مصنف کی طرف منسوب کر دے۔

خطبہ صدارت

ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں☆

علامہ اقبال احمد خان ''سہیل'' (۱۸۸۴ء-۱۹۵۵ء) اگرچہ بطور شاعر زیادہ معروف ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک جامع کمالات شخصیت تھے، سہیلؔ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے وہ اسلامی اسکالر، وکیل، سیاستداں، مجاہد آزادی، خطیب اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ اگرچہ انھوں نے صرف ایک کتاب یعنی ''حقیقت ربا'' کے علاوہ کوئی تصنیف باقاعدہ شائع نہیں کی لیکن ان کی کلیات مختلف عناوین سے شائع ہوتی رہی ہے جسے دوسرے لوگوں نے مرتب کیا۔

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ محمد حسن کالج جونپور کے ایک خصوصی شمارے کی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے بعد علامہ اقبال ''سہیل'' کے نواسے عارف رفیع نے مزید اضافوں کے ساتھ ''کلیات سہیل'' کو کئی بار شائع کیا۔ افتخار اعظمی نے ''ارمغان حرم'' اور ''تابش سہیل'' نامی کتابوں میں سہیل کے کلام اور ان کے احوال زندگی کو بڑی حد تک جمع کر دیا ہے۔ ان پر متعدد تصانیف لکھی گئی ہیں اور پی ایچ ڈی کے مقالات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ علامہ اقبال سہیل کی معرکۃ الآراء کتاب ''حقیقت ربا'' کو میں نے ایڈٹ کر کے تقریباً ۲۰ سال قبل نہ صرف اردو میں دوبارہ چھاپا بلکہ اس کا ترجمہ کر کے عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی شائع کیا۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ علامہ اقبال سہیل نہ صرف ایک جید عالم تھے بلکہ مسائل پر ڈگر سے ہٹ کر بھی سوچنے اور لکھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتے تھے۔ مذکورہ کتاب لکھنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمان جدید معاشیات اور بینکوں کے سسٹم سے کٹنے کی وجہ سے اقتصادی طور پر مسلسل ابتری اور تنزلی کا شکار ہو رہے تھے۔ اقبال سہیل نے بہت باریک بینی سے ''ربا'' کا تجزیہ کیا اور حالات پر تطبیق کرتے ہوئے بتایا کہ بینکوں سے ملنے والا موجودہ منافع وہ ''ربا'' نہیں ہے جسے اسلام نے منع کیا ہے۔

☆ ایڈیٹر ملی گزٹ، دہلی۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں اس کتاب کے چھپنے پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا جس کی وجہ سے اس کی کاپیاں تلف کردی گئیں اور اس پر جو گفتگو ہونی چاہئے تھی وہ نہ ہوسکی۔ افسوس ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کے تقریباً ۸۰ سال بعد بھی یہ مسئلہ مسلم قوم کے لئے وبالِ جان بنا ہوا ہے اور وہ معاشی طور پر مسلسل تنزلی کا شکار ہو رہی ہے۔ اس کتاب کی جدید اشاعت پر تقریباً ۲۰ سال گذر چکے ہیں لیکن دوسرے نقطۂ نظر کے حامل افراد اس کا جواب نہیں دے سکے ہیں۔ یہاں میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے آپسی معاملات اور سماجی لین دین میں ربا قطعاً حرام ہے۔ علامہ اقبال سہیل نے جس ربا کو جائز قرار دیا ہے وہ دارالحرب کے اندر تجارتی معاملات پر ہے۔

اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ اقبال سہیل شبلی کالج کو چلانے والی تنظیم اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی اور دارالمصنفین کی انتظامیہ کمیٹیوں کے عرصۂ دراز تک ممبر بھی رہے۔ وہ کانگریس پارٹی کی طرف سے ۱۹۳۷ء میں یوپی لجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور انتظامات میں مسلم لیگ کے سید علی ظہیر کو ہرایا۔ علامہ اقبال ''سہیل'' انگریزی سامراج اور تقسیم ہند کے سخت مخالف تھے۔

اقبال سہیل کی ابتدائی دینی تعلیم اپنے زمانے کے جید عالم مولانا محمد شفیع کے ہاتھوں ہوئی جو مدرسۃ الاصلاح کے بانی تھے۔ بعد میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کے سامنے بھی زانوے تلمذتہ کیا۔ ۱۹۱۴ء میں بنارس کے کوینز کالج سے بی اے کرنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اس وقت کا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) سے ۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء کے دوران ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ ان کے اس زمانے کے ساتھی تھے۔ مؤخر الذکر نے اپنی کتاب ''آشفتہ بیانی میری'' میں مولانا اقبال سہیل کی ذہانت اور خطابت کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے اور اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اقرار کیا ہے کہ اس زمانے کی ان کی بہت سی تقریریں علامہ اقبال سہیل نے لکھی تھیں۔

میں ان تمام لوگوں کو مبارک باد دیتا ہوں جنھوں نے علامہ اقبال سہیل کو یاد رکھا اور آج یہاں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کر کے ان کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ ایسی عظیم شخصیتوں کے کام کو یاد کرنے سے نئی نسل کو بڑا حوصلہ ملتا ہے کہ جب بہت محدود وسائل کا استعمال کرتے ہوئے ہمارے بزرگ اتنے بڑے بڑے کارنامے کر سکتے تھے تو آج ہم بھی اپنے اور اپنے آزاد ملک کے بے شمار وسائل کو استعمال کرتے ہوئے اپنی قوم، ملک اور دنیا کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

خطبۂ استقبالیہ

محترم جناب صدر، معزز مندوبین وسامعین!

آج کی یہ صبح کس قدر دلنواز ومسرت آگیں ہے کہ تعلیم وتعلم، علم وفن اور شعروادب کے اس گلشن ''شبلی کالج'' میں ہم کو آپ کے استقبال وخیر مقدم کی توفیق وسعادت نصیب ہورہی ہے۔

حضرات گرامی قدر! آج علم وفضل کے جس مرکز میں آپ تشریف فرما اور اپنی آنکھوں کو اس کی تجلیات سے پرنور اور مشام جاں کو اس کے درودیوار اور اس کی کیاریوں میں لگے پھولوں سے معطر وعطربیز کررہے ہیں اس کی بنیاد اپنے وقت کے عظیم وجلیل عالم اور مشہور عالم دانشور وفاضل علامہ شبلی نعمانی نے رکھی تھی اور جس کے دست کرشمہ ساز نے کتنے ذروں کو آفتاب اور جس کی نگہِ التفات نے نہ جانے کتنے موتیوں کو گوہر نایاب بنادیا اور یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جس شخصیت کے فکری، علمی اور ادبی اکتسابات کے جائزہ وتجزیہ کے مقصد سے اس کے بعد محفل مذاکرہ آراستہ وپیراستہ کی جانے والی ہے، وہ دراصل اسی ذات والا صفات کے حسن تربیت کا نہایت خوبصورت اور حسین ترین مظہر یعنی اس کو بھی اس کی شاگردی کا فخر اور اس کالج کے معزز رکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

حضرات! علامہ شبلی کے نام وکام اور جلال وجمال سے ایک پورا جہان تابناک ودرخشاں ہے اور ان کے فیوض وبرکات سے مستفید وفیض یاب ہونے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور شاگرد بھی فضل وکمال اور علم ودانش کا وہ نیر تاباں ہے جس سے اردو وفارسی کی فضائے شاعری منور تھی اور جس کو بجا طور پر ''چشم وچراغ دودمان شاعری، ناز غالب اور فخر شبلی'' کے القاب سے نوازا گیا۔

علامہ شبلی نے ۲۰رجون ۱۸۸۳ء میں جب کالج کی بنیاد رکھی تو ابھی اقبال سہیل پیدا بھی نہیں

ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش ۷ار جنوری ۱۸۸۶ء کو ہوئی۔ ایک سال کے ہوئے تو کالج مڈل اور ۹ سال کے ہوئے تو ۱۸۹۵ء میں یہ ہائی اسکول ہو گیا۔ گویا کالج اور اقبال احمد خاں سہیل ڈھائی برس کے فرق کے ساتھ ہم عمر ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کا بچپن اور عہد شباب دیکھا۔ سرد وگرم حالات اور زمانہ کی ستم آرائیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کالج نے جب اپنی عمر کی ۳۱ بہاریں دیکھ لیں تو ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو اس کو وجود بخشنے والا اپنے مالک حقیقی سے جاملا اور کالج یتیم ہو گیا۔ یتیمی کا یہ داغ کالج کے ساتھ ساتھ اقبال سہیل کو بھی اس لحاظ سے سہنا پڑا کہ ان کو بھی شبلی کی روحانی اولاد ہونے کا مرتبہ حاصل تھا۔ اقبال نے شبلی کے انتقال پر فارسی میں ایک طویل مرثیہ لکھا جس میں استاد گرامی کے کارہائے نمایاں کا احاطہ کیا ہے، اس کے ایک شعر میں کالج کے وجود کا سبب شبلی کے عزم وہمت کو قرار دیا ہے۔

ع: آں نیشنل کہ ہمت تو دادہ اش وجود

اس سمع خراشی کا مقصد علامہ شبلی، شبلی کالج (جہاں یہ سیمینار منعقد کیا جارہا ہے) سے اقبال سہیل کے ربط وتعلق کو دکھانا تھا تاکہ آپ کے دل ودماغ میں اس سیمینار کی اہمیت ومعنویت واضح ہو جائے۔

حضرات سامعین! شبلی، شبلی کالج اور اقبال احمد خاں سہیل تینوں اہل علم وادب بالخصوص ہم اہالیان اعظم گڑھ کے لئے سرمایہ ناز وافتخار ہیں۔ تینوں کی علمی، تعلیمی، دینی، عصری اور ادبی خدمات کی شہرت چاردانگ عالم میں ہے۔ دین ومذہب کی سربلندی، قوم وملت اور ملک ووطن کی نیک نامی، تعلیم وتعلم اور تحقیق وتنقید کے میدان میں اعلیٰ پایہ کی خدمات کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو اعظم گڑھ کے پس منظر میں ان تینوں کا نام آہی جاتا ہے۔

اقبال سہیل اعظم گڑھ کی ادبی اور سیاسی تاریخ کا ناقابل فراموش نام ہے۔ وہ نہایت ذہین وفطین، عبقری بلکہ نابغۂ روزگار شخص تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی چاروں زبانوں پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی۔ تصنیف وتالیف اور تقریر وخطابت میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ حافظہ غضب کا پایا تھا اور بقول شاہ معین الدین احمد ندوی:

> ”قوت حافظہ نے ان کے دماغ کو مختلف النوع معلومات کا خزانہ اور گزشتہ واقعات کی تاریخ بنادیا تھا۔“

ان کے ذوق و مذاق کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کا مذاق بڑا متنوع اور ہمہ گیر تھا۔ ہر موضوع اور ہر فن سے ان کو یکساں دلچسپی تھی۔ مشکل سے دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نکل سکتا ہے جس میں ان کو کچھ نہ کچھ دخل نہ رہا ہو۔ بلند سے بلند مسائل سے لے کر ادنیٰ اور پست سے پست باتوں تک سے ان کو یکساں دلچسپی تھی..... نہایت خوش بیان مقرر تھے، ان کی تقریر بڑی خطیبانہ، پُرمغز اور مدلل ہوتی تھی، بڑے بڑے مسائل پر برجستہ بولتے تھے۔ انشاء پرداز بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ جیسی تحریر وہ قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے ویسی بڑے بڑے کہنہ مشق صاحب قلم غور و فکر کے بعد بھی مشکل سے لکھ سکتے ہیں۔''

اقبال سہیل کے ایک ہم عصر مرزا احسان احمد بیگ لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ مرحوم نے کوئی مستقل علمی تصنیف نہیں کی لیکن وہ تمام قابلیتیں جو ایک کامل الفن مصنف کے لئے ضروری ہیں، ان میں موجود تھیں۔''

محترم حاضرین کرام! ان کی ادیبانہ شخصیت کا سب سے نمایاں اور پرکشش وصف شاعری ہے جس سے بہت حد تک اہل علم واقف ہیں اور جس پر کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، نعت، قطعہ، رباعی، مخمس اور مسدس وغیرہ شاید ہی کوئی صنف سخن ایسی ہو جس میں اقبال سہیل نے اپنی غیر معمولی دسترس کا ثبوت بہم نہ پہنچایا ہو۔ بقول مرزا احسان احمد بیگ:

''جب اور جو کچھ لکھنا چاہتے تھے ان کے قلم کی روانی اور برجستگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، غیر معمولی قوت نظم کے علاوہ عربی اور فارسی تعلیم کی بدولت ان کے دماغ میں ہر قسم کے فصیح و بلیغ الفاظ اور لطیف و نازک ترکیبوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ اس لئے شاعری کے کسی میدان میں ان کے طائر خیال کو عجز و درماندگی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے شاعرانہ کمالات کا اصلی تماشا گاہ کچھ قصیدہ ہی کا میدان تھا جہاں کسی اور کو ان کے سامنے حریف مقابل بن کر کھڑے ہونے کی مشکل ہی سے جرأت ہو سکتی تھی۔''

شاعری کی مشہور صنف نعت کو لے لیجئے۔ یہ صنف ایسی ہے کہ جس میں شعرا بالعموم افراط

وتفریط کے شکار ہو جاتے ہیں مگر اقبال سہیل نے ''نعت کی بزم تجلّی میں افراط وتفریط سے محفوظ رہ کر جس احتیاط اور جذبۂ احترام کے ساتھ اپنے اخلاص وعقیدت کی نذر پیش کی ہے اس کی مثال سے اردو شاعری اب تک خالی ہے۔'' یہاں ان کی مشہور نعت کے چند اشعار سنائے بغیر گزر جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

محمدؐ وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی | محمدؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی
وہ فاتح، جس کا پرچم اطلس زنگاریٔ گردوں | وہ امی جس کے آگے عقل کل طفل دبستانی
وہ رابط، عقل ومذہب کو کیا شیر وشکر جس نے | وہ فارق زہد سے جس نے مٹایا داغ رہبانی
وہ عادل جس کی میزان عدالت میں برابر ہے | غبار مسکنت ہو یا وقار تاجِ سلطانی
وہ جامع جس نے یکجا کر دیئے بکھرے ہوئے دانے | مٹا دی آ کے جس نے باہمی تفریق انسانی

غزل تمام شعرا کی محبوب صنف ہے اور شاید ہی کوئی شاعر ہو جس کا دفتر شاعری اس صنف سے خالی ہو، لیکن یہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال سہیل کو غزل گوئی سے بہت کم دلچسپی تھی اور وہ غزل کو ایک معمولی صنف خیال کرتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے کافی غزلیں کہی ہیں اور فنی لحاظ سے بھی وہ بلند مقام پر ہیں۔ قوت تخئیل کی وسعت سے مجبور ہو کر ان کے دماغ میں جب خیالات کا طوفان اٹھتا تھا تو ان کا طائر فکر قصائد کے وسیع میدان کے ساتھ ساتھ تنگنائے غزل کی سیر کرتا ہوا عشق ومحبت کے نوع بہ نوع پھولوں کو بھی چن کر لذت شناسوں کے خوانِ فکر وذہن پر پیش کر دیتا تھا۔ غزلوں کے چند اشعار آپ کی نذر کرتا ہوں:

دل میں رہے تو سامنے آیا کرے کوئی
خود اپنے گھر میں کس لئے پردہ کرے کوئی

رہتی ہے ان کو نت نئے بسمل کی جستجو
یہ شوق ہے کہ سامنے تڑپا کرے کوئی

انجامِ وفا بھی دیکھ لیا، اب کس لئے سر خم ہوتا ہے
نازک ہے مزاجِ حسن بہت سجدے سے بھی برہم ہوتا ہے

جب کی نہ دوائے دردِ دروں، پھر چارہ گرو کہتے ہو یہ کیوں

ہر درد کا درماں ہوتا ہے، ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے

افتخار احمد اعظمی نے لکھا ہے کہ ’’حب وطن، ولولۂ حریت، جوش و ہمت اور انگریز دشمنی میں سہیل کا مزاج حسرت موہانی سے بالکل قریب تھا۔ انگریزوں سے نفرت تو انھوں نے اپنے آباء و اجداد سے ورثہ میں پائی تھی۔ انگریز دشمنی اور آزادی کی حمایت ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان کے پرداد اضیاء الدین خاں کے دونوں بھائی پیر علی خاں اور منور علی خاں انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شامل ہوئے۔ ان کا خاندان نشاطِ آزادی سے اس درجہ سرشار تھا کہ جب مشہور باغی کنور سنگھ نے پناہ مانگی تو سہیل کے خاندان نے اسے عرصہ تک مہمان رکھا۔‘‘ اس کے علاوہ خود ذاتی طور پر انھوں نے مولانا شبلی اور مولانا فراہی جیسے آزادی کے متوالوں کی صحبت اور حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر جیسے عظیم مجاہد آزادی کی معیت اٹھائی تھی، ان حضرات کی حاشیہ نشینی بساط کی سعادت کے سبب ان کے جذبۂ حریت اور احساس آزادی کو مزید جلا ملی اور اس وقت کے مشہور و معروف سیاسی رہنماؤں بالخصوص وفد خلافت کے حامیوں اور تحریک ترک موالات کے علم برداروں سے ان کو انس ہو گیا اور افتخار احمد اعظمی کے بقول ’’نہرو خاندان سے تو انھیں بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ گاندھی جی سے انھیں لگاؤ بعد میں پیدا ہوا۔ مولانا محمد علی مرحوم کو وہ جنگ آزادی کا سب سے بڑا ہیرو تسلیم کرتے تھے۔‘‘

ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بنیادی طور پر اقبال سہیل غلامی کو سب سے بڑی لعنت اور آزادی کو سب سے بڑی نعمت تصور کرتے تھے۔ انگریزوں کی غلامی نے ہندوستانیوں کو ذہنی و فکری اور تعلیمی و تہذیبی لحاظ سے کس قدر پست کر دیا تھا، اقبال سہیل نے اس کا مشاہدہ بچشم خود کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کے سیاسی قائدین اور لیلائے آزادی کے عاشقوں پر انگریزوں کے ظلم و ستم کے حقائق بھی ان کے سامنے کے مناظر تھے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے گرد و پیش رونما ہونے والے قومی و سیاسی حالات سے بے خبر نہ تھے۔ گرچہ وہ ان حالات میں کوئی قائدانہ رول ادا نہ کر سکتے تھے، لیکن بقول مرزا احسان احمد ’’ان کا دل ان تمام جذبات کا آتش کدہ تھا، جس کی شرر فشانیاں ان کی تمام قومی و ملی اور سیاسی نظموں میں نظر آتی ہیں۔‘‘

وہ غلام ہندوستان میں پیدا ہوئے مگر ہندوستان ان کی نگاہوں کے سامنے آزاد ہوا۔ اس

پورے ہنگامہ خیز اور صبر آزما سیاسی حالات سے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہوتے رہے۔ عملی سیاست میں بھی انھوں نے حصہ لیا۔ اعظم گڑھ سے وہ ایم ایل اے منتخب ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ کسانوں کے مسائل پر اسمبلی میں منظوم تقریر کی، جو وہاں کے ریکارڈ میں باقاعدہ درج ہے۔ چنانچہ جب ملک کو غلامی کی لعنت سے مکمل نجات مل گئی تو انھوں نے متعدد نظمیں کہیں اور اپنے جذبات کا بڑے پُر جوش انداز میں اظہار کیا۔ ایک طویل نظم کے چند اشعار جس میں انھوں نے طلوع آزادی، رخصت غلامی، اس کے لئے اپنی جانیں قربان کر دینے والوں سے عقیدت، خفتگان راہ عدم کو اس فتح عظیم کی بشارت کا ذکر کیا ہے اور آخر میں ارباب وطن کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ اب تم پر بڑی ذمہ داری آگئی ہے۔ بڑا کٹھن وقت ہے۔ بڑی ہوشیاری کے ساتھ وطن کی آبرو بچانا اور اس کو سنوارنا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

گلزار وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج — سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت وچمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفل دہن آج — ہے ہر گل خنداں کی زباں پر یہ سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندانِ محن آج

رخصت ہے شب تار غلامی کا اندھیرا — وہ سامنے ہے صبح سعادت کا سویرا
بھارت سے بدیسی کا اکھڑنے لگا ڈیرا — لہرائے نہ کیوں عظمت قومی کا پھریرا
آزاد ہوا قیدِ غلامی سے وطن آج

اے بادِ صبا! خواب سے ٹیپو کو جگادے — مرحوم ظفر شاہ کے شانوں کو ہلادے
پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکادے — پھر دونوں کو یہ مژدۂ جاں بخش سنادے
آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

ارباب وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل — ہاں جشن منالو کہ ہے موقع اسی قابل
ہو جانا نہیں جوشِ طرب میں کہیں غافل — تخریب تو آسان تھی تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یہاں ایک — اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود و زیاں ایک — ہم سب کا خدا ایک ہے ہم سب کا نشاں ایک

پھر دل میں ہو کیوں خار عداوت کی چبھن آج

جو دین بھی ہو، دیتا ہے محبت ہی کا پیغام | وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہب اسلام
گل شیر وشکر ہوں یوں ہی گل ہند کی اقوام | مذہب کو خدا کے لئے مت کیجئے بدنام

سنگم پہ ہیں جس طرح ملی گنگ وجمن آج

ایک خیر خواہ وطن کی یہ نیک خواہش آزادی کے ۶۸ ویں سورج طلوع ہونے کے بعد افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تشنۂ تکمیل ہے اور آج بھی صدیوں کا بھرا ہوا جوش انتقام ملک کی ترقی و امن کی راہ میں حائل ہے۔ معلوم نہیں تنگ نظری، فرقہ پرستی، عدم رواداری، باہمی بیزاری اور نفرت کی سیاہ رات آسمانِ وطن پر کب تک چھائی رہے گی اور خلوص ومحبت، اتفاق واتحاد، یکجہتی ورواداری کی صبح کب نمودار ہوگی۔

سہیل کے شاعرانہ کمالات کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نثر نگاری کا بھی مختصر اذکر کر دیا جائے۔

محترم حضرات! اقبال سہیل میں کامل الفن مصنف، بڑے نثر نگار، مقتدر نقاد اور صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز بننے کے تمام گر موجود تھے لیکن طبیعت کے لاابالی پن اور سیاست ووکالت کے پیشہ سے وابستگی نے ان کو اس جانب توجہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بس دو چار ادبی وسوانحی مقالات شبلی کی جامعیت، داستان تاریخ اردو اور مشرقی یوپی کے کچھ اہل قلم، علامہ شبلی کے مکاتیب، سیرت شبلی، ایک رسالہ ''حقیقت ربو'' (اس میں جواز سود کے دلائل فراہم کئے گئے ہیں) بعض مشہور اہل علم کی تصنیفات ودواوین، نشاط روح (اصغر گونڈوی) جلوۂ صد رنگ (حبیب احمد صدیقی) خرمن عشق (شفیق جونپوری) گنجینۂ تحقیق (بیخود موہانی)، حدیث عشق (فطرت واسطی)، نغمۂ دل (دل شاہجہاں پوری) وغیرہ پر مقدمے، کانپور اور لکھنؤ میں منعقد ہونے والے مدح صحابہ پر مشاعروں میں خطبات صدارت وغیرہ ان کی کل نثری کائنات ہیں اور بقول شاہ معین الدین ندوی ''مگر یہ چند مضامین ان کی انشاء پردازی اور ادبی نکتہ سنجی کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں۔'' مولانا سعید احمد اکبرآبادی ان کی اچھی نثر کے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ جو مضامین ان کے قلم سے نکلے ہیں، ان کو مرتب کرکے شائع کر دیا جائے۔ امروز کراچی کے ایڈیٹر نے ان کی وفات پر جو مضمون لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:

''سہیل ادب کے صحیح نباض تھے۔ اردو ہو یا فارسی، دونوں ہی زبانوں پر حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ الفاظ تو ان کے اشاروں کے پابند تھے۔ وہ اردو، عربی اور فارسی ادب پر غائر نظر رکھتے تھے...... سہیل صاحب ایک طرز خاص کے مالک تھے اور وسعت معلومات کے بغیر اس طرز کو اپنانا ہر ایک کا کام نہیں۔''

یہاں بطور مثال ان کی نثر پر مشتمل چند سطریں پیش ہیں، جن سے سہیل صاحب کی ادیبانہ طرز نگارش کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ نشاط روح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''فنونِ لطیفہ کی تقسیم چہارگانہ میں شاعری مسلمہ طور پر سب سے بلند تر ہے۔ اس کی وجہ محض اس قدر ہے کہ شاعری بقیہ اصناف کی جامع محاسن ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے قلم رو میں حقائق و معارف، اسرار و حکم کی غیر فانی دنیا بھی شامل ہے، جہاں مصوری و موسیقی کو کوئی دسترس نہیں۔ مصور کا قلم صرف ان ہی کیفیات نفسی کی تصویر کھینچ سکتا ہے جن کا اظہار عوارض جسمانی سے ممکن ہے، لیکن شاعر کی نگاہ نفس انسانی کی ان گہرائیوں تک پہنچتی ہے جہاں کیف و کم کی گنجائش نہیں۔''

اردو کے بعض نقاد شبلی کو محض ایک بلند پایہ مورخ سمجھتے ہیں اور دوسرے علوم میں ان کی دسترس کے قائل نہیں۔ اقبال سہیل نے ان کے اس خیال کی تردید بلند پایہ اسلوب اور پُر زور انداز میں کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''بعض کوتاہ نظر کہتے ہیں کہ مولانا مرحوم ایک بلند پایہ مورخ تھے، دوسرے علوم میں ان کو درجۂ کمال حاصل نہ تھا۔ ان محروم العقل اور صبی الفہم حضرات نے یا تو مولانا کی تصانیف پڑھی ہی نہیں یا پڑھی ہیں تو سمجھی نہیں۔ مولانا کی تاریخی تصنیفات محض مغازی اور فتوحات کی داستانیں نہیں بلکہ اسلام کے تمام علمی، ادبی، سیاسی اور معاشرتی کارناموں کے دلآویز مرقع ہیں۔ جس بحث پر مولانا کے قلم سے ایک جملہ نکلا ہے وہ ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ اور اس بحث پر آخری قول فیصل ہے۔''

مشاعرہ مدحِ صحابہ منعقدہ لکھنؤ کے خطبۂ صدارت کی یہ سطریں انشاء پردازانہ خصوصیات کی حامل اور اقبال سہیل کے طرز نگارش کی شاہکار کی حیثیت سے آپ کے سامنے پیش کرنے کی ہمت

کررہاہوں:

''مشاعرہ مدح صحابہ کا حقیقی صدر تو وہ لم یزل اور لایزال نوید بخت ہے کہ جس کے ایک نغمۂ کُہن نے کونین کی چمن آرائی کی اور جس نے منقبت صدیقی میں ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْهُمَا فِی الْغَارِ کی زمزمہ پیرائی فرمائی۔''

آگے لکھتے ہیں:

''خدائے حی وقیوم کے بعد اس بزم نور کا مسند آرا چمنستان کائنات کا وہ گل سرسبد ہے فَدَیْتُہٗ اَبِیْ وَاُمِّیْ جس کا ارشاد ہے اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ اور جس کے واجب الاطاعت فرمان کی تعمیل میں حضرت حسان بن ثابتؓ نے صدیق اکبرؓ کا قصیدۂ منقبت نذر بارگاہ رسالت کیا۔''

مذکورہ بالا اقتباسات سے آپ کے گوش سماعت نے یقیناً اسلوب نگارش سہیل کا لطف اٹھایا ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کے قلم کی روانی، سحر طرازی بیان وگوہر افشانی زبان اور حیرت انگیز قوت تحریر کا اندازہ بھی ہوا ہوگا۔

حضرات گرامی قدر! سہیل صاحب کے یہ علمی کمالات وادبی اکتسابات جس طرح ہر صاحب دیدواہل نظر کے لئے باعث کشش اور ان کی ساحرانہ شخصیت کی جانب اس کے دامن دل کو کھینچتے ہیں۔ بحیثیت انسان اقبال سہیل صاحب کے اخلاق واوصاف حمیدہ کی تجلیات بھی کچھ کم نہ تھیں۔ بقول مرزا احسان احمد:

''حلقۂ زہاد میں جہاں صرف ظاہری رسوم وآداب کا اتباع معیار تقدس سمجھا جاتا ہے، ممکن ہے کہ وہ باریابی کے شرف سے محروم رہے ہوں لیکن ان کے دل کی دنیا کچھ ایسی اخلاقی خوبیوں سے منور تھی جو موجودہ دورِ نفس پرستی میں رفتہ رفتہ ناپید ہورہی ہیں۔ باوجود صاحب کمال ہونے کے مزاج میں حد درجہ انکسار، سادگی اور مروت تھی لیکن خودداری اور عزت نفس کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پاتا تھا۔ خود غرض نہ تھے۔ وہ دوسروں کی کسی ممکن امداد سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے، ذاتی نفع ونقصان کا بہت کم خیال کرتے تھے۔ طبیعت منافقانہ تصنع وتکلف سے قطعاً

ناآشنا تھی۔ دنیاوی دولت اور جاہ واقتدار کی طمع سے کوسوں دور تھے۔ موجودہ طرز تمدن کی ظاہری زینت وآرائش سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلامی سادگی کی مجسم تصویر تھے۔ وضع قطع، رفتار وگفتار، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے وغیرہ کسی ادا میں رعونت یا مصنوعی شان وشوکت کا شائبہ تک نہ تھا۔''

یہ تھے اقبال سہیل، جن کی ظاہری وباطنی شخصیت کا تقریباً تمام پہلو اپنے اندر عجیب وغریب جاذبیت رکھتا ہے۔ ان کے سوانح اور علمی وادبی اکتسابات پر اس سے قبل متعدد کتابیں اقبال سہیل حیات اور شاعری: ڈاکٹر منور انجم، اقبال سہیل کا فن: پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، افکار سہیل: مرتبہ شوکت سلطان وعلی حماد عباسی، محمد حسن کالج میگزین سہیل نمبر، معارف، برہان، امروز کراچی، مضامین رشید اور مقالات احسان وغیرہ میں ان پر گراں قدر مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے متعدد مجموعہ ہائے کلام تابش سہیل، ارمغان حرم مرتبہ افتخار احمد اعظمی اور کلیات اقبال سہیل: مرتبہ ڈاکٹر عارف رفیع وغیرہ، چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ الاصلاح سرائے میر میں شائع شدہ سیرت شبلی کی نامکمل ۱۵ ارقسطیں بھی مرتب ہوکر شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ابھی حال ہی میں اقبال سہیل کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ مصنفہ صدف پرویز منظر عام پر آچکی ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اہل علم وارباب تنقید کی جس توجہ والتفات کے مستحق اقبال سہیل تھے، ابھی بھی وہ اس سے محروم ہیں۔

اعظم گڑھ بالخصوص شبلی کالج سے اقبال سہیل کا جو تعلق ہے اس کے پس منظر میں کالج کے شعبۂ اردو نے ضیاء الدین خان میموریل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ بڈھریا کے اشتراک سے ''علامہ اقبال سہیل کی علمی وادبی جہات'' کے موضوع پر دوروزہ قومی سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سیمینار کا سب سے اہم اور خاص مقصد اپنے اس عدیم النظیر ادیب وشاعر کو خراج عقیدت پیش کرنا اور نسل نو کو اس کی دلآویز شخصیت سے متعارف کرانا ہے، جس کے ادبی وشاعرانہ کمالات کی معنویت آج بھی باقی ہے اور آئندہ بھی اس کے جائزہ وتجزیہ کی ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی۔

مہمانانِ گرامی: ہمارا دل بے حد خوشی اور بے پناہ مسرت سے لبریز ہے کہ آپ نے ہماری دعوت کو شرف قبول بخشا اور آپ ہی کے التفات خاص کے سبب اقبال سہیل کی علمی وادبی جہات کے تجزیہ وتعین کے مقصد سے یہ خوبصورت محفلِ مذاکرہ آراستہ کرنے کا ہم کو موقع ہاتھ آیا۔ ہمیں امید ہے

کہ آپ نے اپنے مقالات میں اقبال سہیل کے فنی وفکری کمالات اوران کی شاعرانہ وادیبانہ نکتہ سنجیوں کی مرقع آرائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ہوگا۔ہم آپ جیسے عظیم محققین وادباء سے بجاطور پر یہ بھی توقع کریں گے کہ آپ نے اقبال سہیل کے تنقیدی نظریات، اسلوب نگارش اور انداز خطابت کے امتیازات پر جم کر روشنی ڈالی ہوگی۔ہم کو یہ بھی گمان غالب ہے کہ علمی وتحقیقی فرائض کی انجام دہی میں آپ نے پوری دیانت داری وایمان داری کا ثبوت بہم پہنچایا ہوگا۔

حضرات مندوبین! شبلی کالج کی مجلس انتظامیہ، اساتذہ وطلبہ، ضیاء الدین خاں میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ بڈھریا اوراہل اعظم گڑھ کی طرف سے ہم آپ جیسی مایہ ناز ہستیوں کا دل کی گہرائیوں کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس دوروزہ سیمینار کے ظاہری وباطنی فیوض وبرکات سے مستفید اور نتائج کے لحاظ سے مفید بنائے۔آمین۔ شکریہ

ڈاکٹر شباب الدین
صدر شعبۂ اردو
شبلی نیشنل پی۔جی کالج، اعظم گڑھ

میرے ابا

مسلمہ خانم☆

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

میرے والد یعنی میرے ابا کی غیر معمولی علمی، ادبی اور ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں تھوڑا بہت صفحہ قرطاس پر آچکا ہے، لیکن کسی کے اخلاق و عادات کا صحیح تجزیہ کرنا ہو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ اپنے ملازموں، گھر والوں اور کمزوروں کے ساتھ اس کا اخلاق کیسا ہے۔ میرے آٹھ بہن بھائیوں میں سے اس وقت کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ صرف میں ہی تنہا بقید حیات ہوں، لیکن ذہن کے بعض گوشے میں ماضی کے کچھ نقوش اب بھی ثبت ہیں جن کے بارے میں آپ لوگوں کو بتانا چاہوں گی، بچپن سے ہم لوگوں کو یہ تاکید تھی کہ ملازموں کے ناموں کے ساتھ ان کی عمر کے لحاظ سے دادا، چچا یا بھائی ضرور لگایا جائے۔

ان کے ملازم خاص چچا رحمان مرحوم کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں تھی، لیکن کچہری کی واپسی کے بعد جیسے ہی گھر میں داخل ہوتے شیروانی کے جیب میں ہاتھ ڈالتے اور پیسے نکال کر انھیں دیدیتے، نہ تو دینے والا یہ دیکھتا کہ کتنا دیا اور نہ ہی لینے والے کو اس وقت یہ معلوم ہوتا کہ کیا ملا۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ چچا رحمان مرحوم کے لمبے چوڑے خاندان کے لئے اتنی کافی رقم ہوتی جس میں وہ نہایت فارغ البالی سے گذر بسر کر رہے تھے۔ ابا ہمیشہ کھدر کی قمیص پہنتے، لیکن رحمٰن چچا اس سج دھج سے رہتے کہ انھیں کوئی ملازم نہیں سمجھ سکتا تھا، وہ ابا کے صرف نجی کاموں کے لئے مامور تھے۔

☆ گلزار کالونی نزد ٹائمس آف انڈیا پریس، نیو بری روڈ لکھنؤ۔

ابا کا رویہ اپنے بچوں کے ساتھ عموماً لوگوں سے بالکل مختلف تھا، ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی کے قائل نہیں تھے، ہم لوگوں کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ اور دوستانہ برتاؤ رکھتے، یہاں تک کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم لوگ کیرم یا کوئی اور کھیل کھیل رہے ہوتے تو اس میں بھی شامل ہوجاتے یا کم از کم قریب بیٹھ جاتے اور کمزور فریق کی مدد کرنے کی کوشش کرتے، ان کا خیال تھا کہ بچوں کے ساتھ زیادہ سختی اور تاکید بچوں سے دوری کا سبب بن جاتی ہے، اپنے بچوں کی دلچسپیوں کا بھی غیر معمولی خیال رکھتے، گرمیوں کی تعطیل میں جب سب بہنیں اور ان کے بچے ماموں اور خالہ زاد بھائی اور بہنیں وغیرہ اور یمین الاسلام میرے چھوٹے بھائی کے کچھ دوست وغیرہ اکٹھا ہوتے تو ان کی تفریح کا اسقدر خیال رکھتے کہ لڑکوں کے لئے ندی میں نہانے امرود اور آم کے باغوں میں تفریح کے بہت سے سامان ہونے کے باوجود بچوں کی تفریح کے لئے ایک گھوڑی بھی رکھی تھی، ایک سائیس بھی تھا، کبھی کبھی جس پر یہ لوگ پھریہا اسٹیشن سے گھر آنے کے لئے استعمال کرتے۔ لڑکیوں کی تفریح صرف بیت بازیوں اور چھوٹے موٹے مشاعروں تک محدود تھی جس کا ایک مختصر نمونہ کلیات سہیل میں بھی موجود ہے، ان مشاعروں کے لئے چند منٹوں میں کچھ اشعار لکھ دیتے، اسی طرح بیت بازیوں میں بھی کچھ نہ کچھ مدد ضرور کرتے، ان کی تفریحات میں شرکت کے علاوہ ہم لوگوں کی پڑھائی میں بھی ہر طرح کی مدد کے لئے تیار رہتے، لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کے قائل نہیں تھے، اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود میرے دبیر کامل کے امتحان کے لئے پورا فارسی کا کورس انھوں نے مجھے خود پڑھایا اور امتحان دلوانے مجھ کو لے کر خود لکھنؤ گئے۔ اگر کسی کو پرانے شاعر پر تنقید لکھنی ہے اس کی درخواست پر چند منٹوں میں ایسی بہترین لکھوا دیتے کہ حیرت ہوتی، اگر کسی کو اسکول کے جلسے میں یا کسی استاد کی رخصتی کے موقع پر نظم سنانی ہوتی تو وہ بھی فوراً تیار کر دیتے۔ آفتاب احمد جو ہمارے ماموں زاد بھائی تھے، انھیں امتحان کے لئے اگر کچھ سویرے اٹھنا ہوتا تو آواز دینے کے بجائے ان کے بستر پر جا کر ان کے پیر دبانے لگتے تاکہ وہ جلدی اٹھ جائیں، رشتوں کے بھائی بہنوں کے ساتھ ان کے تعلقات ایسے تھے جو سگے بھائی بہنوں میں بھی عموماً نہیں ہوتے، دور کے رشتوں کا بھی اس قدر لحاظ تھا کہ کوئی رشتہ دار خواہ عمر میں کتنا ہی چھوٹا ہو اس کو اسی رشتے کے مطابق پکارنا ہوتا، ہمیشہ ہی خاندانی تعلقات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہتے، قریبی رشتہ داروں کے علاوہ کئی دور کے رشتہ داروں کے بچوں نے ہمارے گھر پر رہ کر تعلیم حاصل کی۔

جب ہم لوگوں کی جائداد کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے لیے منشی صاحب مقرر ہوئے، اکثر رشتے داروں نے ان سے تاکید کی کہ زمین کے معمولی حصوں کو ابا کے حصے میں ڈالیں، چوں کہ وہ زیادہ کے مالک ہیں اس سے انھیں کچھ زیادہ نقصان نہ ہوگا۔ اس بات کو سن کر بھی ابا کو کچھ غم نہیں ہوا، ان کی فطرت سلیم کو مال و دولت عزوجاہ نام ونمود وغیرہ سے ہمیشہ بے نیاز رہی، اعظم گڑھ کے بڑے ساہوکاروں نے اپنے مقدمات جیتنے کے عوض میں بے حد بڑی بڑی زمین پیش کیں لیکن انھیں کبھی قبول نہیں کیا، کیوں کہ ان کی یہی دعا تھی:

میں تجھ سے کیا کہوں اے فیضِ فطرت مجھ کو کیا دینا
دلِ بے مدعا دینا لب بے التجا دینا

انھیں علی گڑھ کے زمانے سے ہی الیکشن میں دل چسپی تھی جو دوران وکالت میں بھی قائم رہی، ویسے ان کی سیاسی بصیرت پر آج بھی میری عقل حیران ہے، اس زمانے میں مسلم لیگ کا دور دورہ تھا اور مسلمانوں کی ۹۰ فیصد آبادی تعمیر پاکستان کو بہت بڑی کامیابی تصور کر رہی تھی، ابا کی دور بین نظروں نے اس کے انجام کو آئینہ کی طرح دیکھ لیا تھا اور اس کی تقسیم پر ان کا دل ہمیشہ روتا رہا، کیوں کہ وہ ہمیشہ ایک ملی جلی تہذیب میں وطن کی بھلائی سمجھتے تھے۔

مل جل کے برنگ شیر و شکر، دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر، تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے
اسی سنگم کے دو دھارے ہیں ہندو بھی مسلماں بھی
گلے مل مل کے روئے بھی، ہوئے دست و گریباں بھی
کیوں بزم طرب کے صدر نشیں، پائیں کے بھی اب ہم اہل نہیں
کل وادی غم میں ہم دونوں، تھے شانہ بشانہ کیا کہیے
یا لالۂ و گل اس باغ کے سب، کرتے تھے ہمارا پاس ادب
یا کھنچتے ہیں ہم سے خار بھی اب ، نیرنگ زمانہ کیا کہیے

مختصر یہ ہے کہ ابا نے اپنی زندگی کی تصویر ان دونوں اشعار میں بیان کر دی ہے:

نکہت گل کی ملی ہے مجھے تقدیر سہیل میرے طالع کی سعادت ہے پریشاں ہونا

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال   راحت اغیار کو دی آپ پریشاں ہوکر

ابا کو اپنے گاؤں سے بے انتہا لگاؤ اور محبت تھی ہم لوگ اعظم گڑھ سے بڈھیریا منتقل ہوئے اور ابا ہر شام کو کچہری سے سیدھے بڈھیریا آجاتے اور اپنی زندگی کے آخری ایام وہیں گزارنا پسند کرتے تھے۔

اگر انسانی روحوں کو اللہ تعالیٰ اپنی پرانی قیام گاہوں کی جھلک دکھاتا تو انھیں اپنے گھر کو ایک خوبصورت اسکول کی شکل میں دیکھ کر اس اسکول کی بنیاد رکھنے والے کی خلوص نیت اور اس کی ترقی کے لئے شب و روز بے دریغ اور بے لوث کوششوں میں ہمہ تن اپنے نواسے ڈاکٹر احمد صفی کی کارکردگیوں پر کس قدر نازاں اور کس درجہ خوشی محسوس کرتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اس انجمن کو سدا سرسبز و شاداب رکھے، اور صفی میاں کو صحت و عافیت سے نوازے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ ابا کو اپنی خاص رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

☆☆☆

نانا ابا

رفیعہ صمد☆

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ابوذحابی کے دوران قیام مجھے علم ہوا کہ علامہ اقبال سہیل کی علمی وادبی جہات پر ایک دوروزہ سیمینار منعقد ہورہا ہے تو میری شدید خواہش ہوئی کہ میں اس میں شرکت کروں میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتی ہوں کہ اقبال سہیل جیسے عظیم دانشور اور ماہر علم وفن کی نواسی ہوں اور فخر بھی محسوس کرتی ہوں کہ زندگی کے بہت سارے ماہ وسال ان کے سایہ عاطفت میں گذارنے کی سعادت مجھے حاصل رہی، میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے، اس عظمت رفتہ اور عہد گذشتہ کے نقوش آج بھی ذہن کے گوشہ میں جاگزیں ہیں جنھیں میں صفحہ قرطاس پر لانے کی ناکام کوشش کررہی ہوں۔

میرے نانا علامہ اقبال سہیل ایک اعلیٰ نسب، روشن خیال اور خوش حال گھرانے کے چشم وچراغ تھے چوں کہ والد والدہ بھی تعلیم یافتہ اور فارسی داں تھے، اس لئے علمی وادبی ماحول نے ان کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی، بچپن میں والدہ ماجدہ نے انھیں گلستاں بوستاں پڑھائی تھی، یہی وجہ تھی کہ کم عمری ہی میں فارسی اور عربی اشعار برجستہ کہنے پر قادر تھے، میرے بھائی عارف رفیع کا بہت اصرار تھا کہ میں ان کی نجی زندگی کے بارے میں جو بھی جانتی ہوں ایک مضمون لکھوں۔ میں اپنے کو اس لائق تو نہیں سمجھتی لیکن اپنی اہلیت کے مطابق ان کی جو باتیں مجھے یاد ہیں وہ آپ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کررہی ہوں۔

درمیانہ قد اکہرا بدن، باوقار اور بارعب چہرہ، بہت بڑی بڑی روشن اور ذہین آنکھیں اور کشادہ پیشانی، یہ تھا ان کا ظاہری سراپا۔ وہ نہایت ذہین ہی نہیں بلکہ ایک عبقری تھے، ان کی عالمانہ اور فنکارانہ

☆ ڈھال گرٹولہ، نزد اٹالہ مسجد، جونپور

صلاحیتوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان کی ذکاوت وذہانت کی پرزور توصیف وتائید کی گئی ہے، اس لئے اس سلسلہ میں نہ میں اس کی ضرورت سمجھتی ہوں نہ اس کی اہل ہوں۔ بہر حال وہ ایک نہایت خلیق، وضعدار اور مخیر انسان تھے، رقیق القلبی اور رحم دلی ان کی فطرت ثانیہ تھی، کسی کو ذرا سی تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی سے ناراض ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، لیکن بدکلامی اور بدزبانی سے وہ سخت نفرت کرتے تھے۔ انسانوں کے علاوہ جانوروں اور پرندوں کے لئے بھی دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اگر گھر کا کوئی فرد خواہ بچہ ہی کیوں نہ ہو، اگر کسی پرندے یا جانور کو ستاتا تو اسے سخت تنبیہ کرتے تھے۔ گھر میں متعدد ملازمین مختلف کاموں کے لئے مامور تھے، ان کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مخلصانہ اور نرم تھا، گھر کے ہر فرد کو یہ ہدایت تھی کہ ان کی عمر کے لحاظ سے انکا احترام کیا جائے اور انھیں بھائی، آپا، ماموں، خالہ، چچا، چچی کہہ کر مخاطب کیا جائے۔ رشتوں کا احترام ہر فرد کے لئے لازم تھا، خواہ وہ گھر کے فرد ہوں یا ملازم۔ ان کے ملازم خاص (عبدالرحمٰن) جنھیں ہم سب احتراماً ماموں کہہ کر پکارتے تھے، ان کے جو بھی کام کرنے والے تھے ان پر ان کا خاص کرم تھا، ان کے پورے خاندان کی کفالت نانا ابا ہی کرتے تھے۔ کبھی انھیں پیسوں کی ضرورت ہوتی کہتے میری شیروانی میں سے نکال لو۔ یہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

نانا ابا کی دریا دلی یہیں تک محدود نہیں تھی بلکہ بہت سے ایسے بچے جن کے لئے شہر میں تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا ان کو اپنے گھر میں رکھا اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائی جو آج بیرون واندرون ملک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ آفتاب احمد جوان کے سالے کے بیٹے تھے اور بہت کم سنی میں یتیم ہو گئے تھے، ان کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھا اور انھوں نے بھی ہمیشہ اسی گھر کو اپنا گھر سمجھا۔ نانا ابا کے حقیقی بھائی بہن نہیں تھے لیکن اپنے سے وابستہ تمام عزیزوں کو اپنا حقیقی بھائی بہن یا چچا چچی سمجھتے تھے، یہاں تک کہ سب کا کھانا ایک ساتھ پکتا تھا، یہ باتیں ان کی فیاضی اور دریا دلی کی روشن دلیل تھیں، گھر ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ انھوں نے خلوص ومحبت کے جس پودے کی آبیاری کی تھی وہ آج ایک تناور درخت بن چکا ہے، اخلاق ومحبت کی روایت آج بھی اسی طرح قائم ہے خاندان پہلے بھی وسیع تھا، اب اور بھی وسیع ہو گیا ہے، آج بھی سب لوگ ایک دوسرے سے اسی گرم جوشی اور خلوص سے ملتے ہیں، خواہ وہ قریبی ہوں یا دور کے۔ ماشاء اللہ خاندان کے سبھی افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، اندرون ملک اور ممالک غیر میں اونچے عہدوں پر فائز ہیں لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اتنے وسیع خاندان میں کوئی شاعر یا

مصنف نہیں ہو سکا اور نہ اعلیٰ مرتبہ حاصل کر سکا۔ میری خالہ مسلمہ خانم اقبال جو عربی، فارسی اور انگلش داں ہیں ماشاء اللہ وہ کالجز میں پرنسپل کے فرائض انجام دے چکی ہیں، اس وقت ان کی عمر ۹۴ سال ہے اور بہت کمزور ہیں، اس ناچیز نے بھی ان کے سایہ شفقت میں چند سال گزارے ہیں اور ان کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔

جب میں چھوٹی تھی تو اپنے نانا نانی کے ساتھ بڈھیریا میں رہتی تھی، نانا ابا روزانہ اعظم گڑھ سے بڈھیریا آتے تھے، گھر کے افراد اور بچوں کے لئے ہر طرح کے سامان لے کر آتے تھے، بچے شام میں ان کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے، چونکہ انھیں بچوں سے بہت انس تھا، اس لئے گاؤں ہی میں انھوں نے تمام جدید کھیلوں مثلاً کرکٹ، ہاکی، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس اور کیرم کے تمام سامان فراہم کئے تھے، ہم بچوں کو پڑھانے کے لئے ایک ٹیچر مستقل رہتے تھے جو بچوں کو تمام مضامین پڑھاتے تھے، اس کے علاوہ زندگی کے ہر شعبہ سے انھیں دلچسپی تھی خواہ وہ زراعت ہو، گھریلو معاملات، گاؤں میں آموں اور دوسرے پھلوں کے باغ لگواتے تھے جن میں دنیا کے مشہور نامور آموں کے بیشمار درخت لگے تھے جو آج بھی وہاں موجود ہیں۔ جب آموں کے پکنے کا وقت آتا تو سارے عزیزوں کو مدعو کرتے تھے، پورا گھر بھر جاتا تھا، سارے لوگ نانا ابا کی دریادلی سے محظوظ ہوتے اور ان کی ضیافت کا لطف اٹھاتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک سال انھوں نے باہر سے گیہوں کے اعلیٰ قسم کے بیج بونے کے لئے منگائے تھے۔ اس سال فصل بہت شاندار ہوئی۔ نانا ابا گھر میں کچھ دانے لے کر آئے اور دکھا کر کہا دیکھو کتنے خوبصورت دانے ہیں، اس بار فصل بہت اچھی ہے، وہ بہت خوش تھے، لیکن دو تین روز کے بعد کسی حاسد نے پورے کھلیان میں آگ لگادی نتیجتاً ساری فصل گیہوں، ارہر، مٹر، چنے اور سرسوں جل کر خاک ہوگئی، نانا ابا سے کبھی کسی سے دشمنی نہیں تھی لیکن شاید کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی کی شہرت، عزت اور عظمت برداشت نہیں کر پاتے۔ بہرحال اس حادثہ نے سبھی کو اداس اور غمزدہ کر دیا لیکن ان کے چہرہ پر ذرہ برابر شکن نہیں تھی، بس اتنا کہا کس بات کا غم ہے جس نے دیا تھا وہی آئندہ بھی دے گا۔ یہ باتیں ان کے صبر و توکل کی واضح مثال ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی چیزوں کی قدر کرنا ان کی فطرت تھی، اگر زمین پہ گرا ہوا غلہ کا کوئی دانہ نظر آجاتا اسے فوراً اٹھا لیتے تھے اور کسی کو دے کر کہتے

اسے رکھ دو کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کہیں پڑا ہوا دیکھتے اگر اس پر کچھ لکھا ہوتا تو ضرور پڑھتے تھے خواہ الف ب ہی کیوں نہ لکھا ہوتا۔

حصول تعلیم کے لئے میرے والد عبدالقوی انصاری ہم لوگوں کو جب اعظم گڑھ لائے تو مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، کیوں کہ ہم لوگ ساتھ رہتے تھے، سن شعور کو پہنچنے کے بعد مجھے کتابوں کے مطالعہ کا کچھ شوق پیدا ہو گیا خصوصاً شاعری سے بہت لگاؤ پیدا ہو گیا، نانا ابا اور علامہ اقبال کے کلام سے بہت دلچسپی تھی، خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس زمانہ میں ہم عصر شعرا جگر مراد آبادی، روش صدیقی، اصغر گونڈوی وغیرہ کے علاوہ بڑے بڑے علمائے کرام مثلاً سید سلیمان ندوی اور دوسرے مشاہیر بھی غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے، علمی و ادبی محفلیں جمتی تھیں، بڑا خوش آئند پر کیف دور تھا۔ اکثر نانا ابا اپنے مضامین مجھ سے لکھواتے تھے، وہ اپنی مسہری پر لیٹ کر بولتے اور میں لکھتی رہتی، ان کے کچھ مسودے میرے پاس محفوظ تھے لیکن جب میرے چچازاد بھائی (افتخار اعظمی) نانا ابا کے کلام کو مرتب کر رہے تھے وہ مسودے اور چند خطوط جو میرے نانا مجھے وقتاً فوقتاً لکھتے تھے مجھ سے مانگ کر لے گئے، اب مجھے علم نہیں وہ کیا ہوئے، اُن قیمتی تحریروں اور مسودوں سے مجھے انتہائی لگاؤ تھا، افسوس کہ وہ سب ضائع ہو گئیں، جب محمد حسن مسلم کالج سے 'سہیل نمبر' نکلا اس کی ایک کاپی پر نانا نے خود اپنی خوبصورت تحریر میں ایک دعائیہ مضمون اپنی نیک خواہشات کے ساتھ لکھ کر دیا تھا جو مجھے عزیز تھا وہ مجھے پیار سے پھول یا منی کہہ کر بلاتے تھے، ان کی شفقت اور پیار آج بھی یاد کر کے نمدیدہ ہو جاتی ہوں۔ انھوں نے اپنی زندگی دوسروں کی بہبودی اور خیر خواہی کے لئے وقف کر دی تھی، جو کچھ کمایا خرچ کر دیا، کبھی ایک پیسہ بینک یا کہیں اور جمع نہیں کیا خود سادگی پسند تھے، کھدر کی قمیص اور شیروانی پہنتے تھے لیکن دوسروں کے لئے ان کا دل بہت کشادہ تھا، لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک لاابالی انسان تھے، لیکن میں اس سے متفق نہیں ہوں وہ اپنی ذات سے لاپرواہ ضرور تھے لیکن یہ لاابالی پن نہیں بلکہ ان کی بے نیازانہ فطرت تھی جو دوسروں کی خوشنودی کا خواہاں ہو، اس کے لئے اپنی ذات کی نفی ایک لازمی امر ہے، ان کا اپنا ہی شعر ان کی فطرت کا ترجمان ہے۔

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال
راحت اغیار کو دی آپ پریشاں ہو کر

☆☆☆

اقبال سہیل اور آتش کدۂ شوقِ خلیل

پروفیسر عبدالحق ☆

پہلے پیدا تو کر آتش کدۂ شوقِ خلیل
آج بھی سہل ہے شعلوں کا گلستاں ہونا

اس شعری نقش کی نسبت بڑا ہی ہے، جو معمار جہاں ہیں، جہان فرسودہ ہو یا عالم نو کی تاریخ، سنگِ خارہ کو موم کے گداز میں تبدیل کرنے کا عمل، کار خلیلاں سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ عزم و ایثار کا یہ نسخۂ شفا ظلم کے آتشکدہ اور صلیب دار سے حاصل کیا گیا ہے۔ ان ابدی حقیقتوں سے گزر کر رہ روان شوق نے فردائے قیامت تک کے لئے ہماری رہ بری کی ہے۔ یہی حقیقت ابدی ہے۔ استعارہ نہیں۔ استعارہ حقیقت کا بدل نہیں ہو سکتا۔ عکس اور پرتو بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ حقیقت بہر حال حقیقت ہے۔ اسے استعارہ کہنے والے گمراہ اور فسادِ قلب و نظر میں روپوش ہیں۔ اقبال نے مقام شبیری کو بھی حقیقت ابدی ہی قرار دیا ہے۔ یہی جہاں بانی اور نگہبانی کا سرِ نہاں ہے، جسے اقبال سہیل نے اشاراتی اسلوب میں کائنات کا تکوینی نظام تسلیم کیا ہے۔ یہ اشارہ صرف تاریخ و تلمیح نہیں ہے بلکہ تشکیل کائنات کا آئین مسلم ہے۔ ملتوں کے عظمت و عروج میں اسے بارہا آزمایا گیا ہے۔

اقبال سہیل اپنے دور انحطاط کے پروردہ تھے اور پشیمان بھی تھے۔ غلامی کی سراسیمگی سوہانِ روح بن کر ستاتی رہی۔ وہ بے خبر اور بے حس بھی نہ تھے کہ تقدیر الٰہی پر تکیہ کر کے خانقاہ میں پناہ نشینی کے بہانے فرار ہو جاتے۔ یا تخلیق شعر کے نوحہ و ماتم میں پناہ لیتے اور اسی کو طرۂ امتیاز سمجھتے۔ وہ صلیب و شہادت کو حیات جاوید کہہ کر قبول کرتے رہے اور تسلیم جان پر گامزن رہے۔ مختلف واقعات سے متاثر

☆ سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

بنایا۔ اقبال سہیل نے ان سے قدرے جداگانہ راہ اختیار کی۔ یہ ان کی مجبوری بھی تھی، دانش گاہِ علی گڑھ سے فارغ دانشوروں کو اکثر آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ہندی مسلمانوں کا مقدر بھی ہے، وکالت ایک معزز اور باوقار پیشہ تصور کیا جاتا تھا، مگر آزادی کے بعد اقدار میں تیزی سے انحطاط کا آغاز ہوا۔ زمیندار گھرانوں کے نوجوانوں کے روبرو نفسیاتی کشاکشوں کا ہجوم تھا۔ زمینداری کے خاتمہ کی حکمت عملی کا نفاذ ہوا۔ بے دست و پائی دستک دینے لگی۔ ناامیدی نے سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیا۔ صوبۂ متحدہ کے خوش حال مسلم گھرانوں پر تقسیم ملک کے بعد یہ دوسری قیامت تھی۔ اقبال سہیل بھی ہدف کی زد میں تھے۔ مگر ان کے پاس قلب کی استقامت کا سہارا تھا جو عزم جواں کی طرف گامزن رہا۔ اقبال سہیل پر رشید صاحب کی تحریریں اتحاد ثلاثہ کے فکری رویوں کی جاوداں یادگار ہیں اور اقبال اول و ثانی کے درمیان رشید صاحب مرغ قبلہ نما کی بانگِ اذاں ہیں۔

اس گفتگو کے سیاق میں مولانا سہیل کی نظموں کے عنوانات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ان کے پیش نگاہ چند موضوعات کی معنویت ان کے دور کی فکری و سیاسی تصورات کے تابع ہے۔ یہ مضامین نو نہ ہی مگر اپنے عصر کے ترجمان ضرور ہیں۔ ان سے اقبال سہیل کی شناخت کا ایک نقش ابھرتا ہے۔ اس سے ان کا انفرادی اسلوب قائم ہوتا ہے۔ موضوعات ملاحظہ ہوں۔

خطاب، فتح سمرنا، جنون آرزو، زمیندار اور کسان، نغمۂ بے تاب، فلسفۂ شہادت مسلم، پیام حق، بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے۔ موضوعات پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس دور کے طرز فکر و عمل کے مظہر ہیں۔ جو دلوں کی آواز اور ذہنوں کے نہاں خانوں کی سرگوشیاں ہیں۔ اقبال سہیل نے بلا تامل اور برملا انھیں منظوم کر کے اپنے بے پایاں احساس کی ترجمانی کی ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد و احساس سے بے تعلق نہ تھے۔ بلکہ تن من پیکر درد نظر آتے ہیں۔ سیاسی سطح پر رونما ہونے والے واقعات سے اکثر ان کے جذبات برانگیختہ ہوتے اور شعری تخلیق کا سرچشمہ پھوٹ پڑتا۔ لگتا ہے کہ وہ فی البدیہہ شاعری کے خوگر تھے۔ فنی حسن آفرینی کے لئے نظر ثانی کے لئے شاید وقت نکالنا مشکل تھا، روٹی روزی کی ذمہ داریاں دامن گیر تھیں۔ وکالت کے پیشے کی وجہ سے فرصت مفقود تھی۔ مقدمات کے فائلوں کی ورق گردانی اور عدالتوں کے قانونی موشگافیوں میں وقت گزرتا رہا۔ پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ ان ناخوشگوار حالات کے باوجود وہ فکر شعر کی طرف متوجہ ہوتے۔

یہ حقیقت ہے کہ قدرت نے انھیں تخلیقی قوت بڑی فیاضی سے بخشی تھی۔ جس کا استعمال بھرپور جامعیت اور حکمت کے ساتھ نہ ہو سکا۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان ایک سیاسی و علمی بحث شروع ہوئی جس نے طول پکڑا، علامہ اقبال کو مولانا کے بیان سے سخت تکلیف ہوئی، محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کا غیر معمولی رد عمل ان کے لئے نا قابل برداشت تھا، مولانا کا حلقہ اثر اقبال کے خلاف میدان کارزار میں مصلح ہوکر اترا۔ اقبال سہیل کے دل پر بھی گراں گزرا۔ اقبال سہیل کو مولانا مدنی سے غلو کی حد تک عقیدت تھی۔ نظم کا آخری شعر ارادت بے جا کا مظہر ہے:

بگیر راہ حسین احمد ار خدا خواہی　　　　که وارث است نبی را و ہم ز آل نبیؐ است

پاس احترام کے لئے انھوں نے نظم منظوم کی اور مولانا کے طرف داروں کی صف میں شامل ہوئے۔ بہر حال ان کی حمایت یا عدم حمایت کا سوال زیر بحث نہیں بلکہ اقبال سہیل کی عصری حیثیت اور واقعات کے تاثرات کا ذکر مقصود ہے۔ واقعات سے متاثر ہونا ہر ذی شعور کی فطرت ہوتی ہے، ہاں بے حس کی سنگ دلی میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ہماری بدنصیبی تھی کہ علامہ اقبال کو روٹی کے لئے عدالتوں کی خاک چھاننی پڑی۔ اگر اس کا انتظام ہوتا اور اقبال کو روزی کمانے کی مکروہات سے فرصت و فراغت میسر آتی تو ان کا فکر و فلسفہ اور شعر و فن مکمل طور پر مربوط صورت میں ہمارے سامنے آتا، مگر کیا کیجئے فکر روزی کا ساتھ تو عدم سے ہے۔ گہر کی آبرو کا انحصار آب و دانے پر ہے۔ علامہ کی طرح اقبال سہیل بھی مقدمے سے معاش حاصل کرتے رہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ طلاطم ہائے دریا سے گوہر کی سیرابی ہوتی ہے۔

ناچیز کا خیال ہے کہ اگر آسودگی ملی ہوتی تو شاید اقبال سہیل کے فکر و فن کو بے پایاں قوت ملتی۔ ضلعی عدالتوں میں مقامی معاملات کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہ مقامیت فکر و شعور کی بلند پروازی میں حائل ہوتی ہے۔ اقبال سہیل بھی لاشعوری طور پر حد بندیوں کے آسیب میں گھرے رہے۔ سیاسی و مذہبی اشخاص اور وطن و ملک کے مسائل سے نبرد آزمائی میں آفاقی پہنائیاں گم ہو جاتی ہیں۔ علامہ اقبال نے محسوس کیا اور بہت جلد اس تنگ دامانی سے ترک تعلق کر کے بین آفاقیت میں جا بسے، خار وطن کو گل و ریحان سے بہتر سمجھنے والے بڑے قومی شاعر و فن کار نہ بن سکے۔ خواہ چکبست ہوں یا سرور جہاں آبادی، جوئے کم

آب ہوجاتی ہے، وہ بحرِ بے کراں کا خواب نہیں دیکھ پاتی۔ مولانا سہیل کے ساتھ بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ براق ذہن کے مالک تھے۔ مشرقی علوم کے ساتھ زبان وادب پر بھرپور دسترس تھی، ان کی فارسی شاعری دلیل ہے، جو بھی ہو۔ ان کی شاعری کا اصل موضوع فکر فروزی اور جوش انگیزی ہے، اصنافِ شعر میں جابجا اس عزم وجلال کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔

چٹانیں چور ہوجائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا — جوانوں یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
دیارِ حسن میں ہوجائے شورِ الحذر پیدا — دلِ آتش نوا تجھ کو قسم ہے داغِ ہجراں کی

ان کا احتجاجی لہجہ انقلاب میں تبدیل ہوجاتا ہے، اگرچہ انھیں برملا اور برہنہ اظہار میں تامل محسوس ہوتا ہے، اشارہ وکنایہ کا سہارا لے کر دل کے مطلب کو استعاروں میں چھپالیتے ہیں۔ لیکن لفظوں کے پردوں کو چاک کر کے سینۂ سہیل میں پوشیدہ آتش سوزاں کی خلش کا ادراک قاری کے لئے مشکل نہیں۔

اس کی مجھے پروا نہیں اے گردشِ ایام — ہمت کے لئے ننگ ہے اندیشۂ انجام

سود وزیاں سے برتر زندگی ہی قابلِ قبول ہے، سپرِ روجاں کا نام ہی زندگی ہے۔ یہ جزا اور سزا کی تمناؤں سے بے نیاز ہے۔ پیکرِ خاکی میں شورشِ جاں کو پیدا کرنے کی ضرورت پر اقبال سہیل نے اشارے کئے ہیں:

بنا تمام جل گئی حریمِ اقتدار کی

اس کے علاوہ اور بھی کئی عنوانات ہیں جو سہیل اقبال کے پسندیدہ اسلوب میں ڈھل گئے ہیں، جنھیں ذیلی اور اضافی موضوعات میں شامل کیا جاسکتا ہے، علامہ اقبال کے فکر وشعر کا پرتو بیسویں صدی کے ہر ذی شعور قلم کار پر نظر آتا ہے۔ اقبال سہیل کی لفظیات اور اسالیب میں بھی وہ موثرات محسوس کئے جاسکتے ہیں، سرعنوان شعر کے آتش کدہ شوقِ خلیل میں نہاں جذبہ جہاد کی بھرپور تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ علامہ اقبال کے اس شعر کی بازخوانی کی جائے۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

☆☆☆

علامہ اقبال سہیلؔ کی شعری کائنات

پروفیسر سید فضل امام☆

مشرقی اتر پردیش کے پانچ اضلاع میں جون پور، اعظم گڑھ، بنارس، غازی پور اور گورکھپور پر سحاب علم وفضل وکمال ٹوٹ ٹوٹ کر اور جھوم جھوم کر کے برسا ہے۔ یہاں کے دیہی علاقوں میں بھی علم وادب کی شمعیں ہر دور زمان میں فروزاں رہی ہیں۔ ان دیہاتوں میں ایسے بھی مقتدر شعراء وکوی (कवि) رہے ہیں جو دستخط تک سے عاری تھے لیکن اصناف شعر کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بہرہ ور تھے، مجھے اپنے بچپنے میں اچھی طرح یاد ہے کہ اعظم گڑھ کے موضع دریا پور کے ایک ریاست حسین خاں تھے جو مصور تخلص کرتے تھے، قطعی حرف ناشناس تھے، لیکن بڑے معرکے کے قصائد اور نعت پاک طرحی محافل میں پیش کرتے تھے۔ بھوج پوری میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُن کا ایک مختصر مجموعہ ''جذبات مصور'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو اب ناپید ہے۔

دراصل یہ تاریخ ادب اُردو کی کوتاہ نظری یا نارسائی ہے کہ اُس نے اس علاقے پر توجہ نہیں فرمائی اور مشرقی اتر پردیش کے سخنوروں کو نظر انداز کیا۔ دبستانوں کی تقسیم اور ان کی عصبیت نے مزید ضرب کاری لگائی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ والوں نے تو خود ایک دوسرے پر فوقیت اور سبقت لے جانے کی مہم چلا رکھی تھی اور وہ ایسے میں کسی دوسری جانب کیوں کر متوجہ ہوتے اور گردانتے؟ حالانکہ اگر تہذیبی، تاریخی، ثقافتی اور جغرافیائی طور پر دیکھا جائے تو جسے دبستانِ لکھنؤ یا دبستان دہلی کہتے ہیں وہاں کی تہذیبی اور ادبی میراث میں مختلف مقامات سے آکر آباد ہونے والوں کی کاوشیں اور رنگ آمیزیاں شامل ہیں۔

☆ سابق صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف الہ آباد

جب ہم اودھ کی تہذیب اور ادبی میراث کا نام لیتے ہیں تو اس سے صرف اور صرف لکھنؤ عبارت نہیں ہے بلکہ اودھ کا نام آتے ہی ۱۸۶۳ء کے ایک قدیم نقشے کے مطابق اس میں بارہ اضلاع کا نام ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے یعنی اُناؤ، بہرائچ، پرتاب گڑھ، دریاباد (بارہ بنکی)، رائے بریلی، سلطان پور، سیتاپور، فیض آباد، گونڈہ، لکھنؤ، لکھیم پور، ہردوئی آتے ہیں۔ یہ نقشہ تواریخ نادر العصر منشی نول کشور پریس، لکھنو طبع اول ۱۸۹۰ء اور طبع اول، مطبع ندارد ۱۸۶۳ء کے ابتدائی صفحات میں شامل اودھ کے نقشہ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

اعظم گڑھ کو دبستان شبلی یا دبستان اعظم گڑھ کے نام سے موسوم کیا جانا حق بجانب ہے۔ جس میں پانچ اضلاع کو شامل کیا جانا چاہیے جن کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ دبستان اعظم گڑھ کے ماضی میں مولانا فاروق چریاکوٹی، محمد رضا شمس پوری، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا احسن ببھی، اسلم جیراج پوری، مولانا عبدالسلام ندوی، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، شمیم کرہانی، ناطق اعظمی، وغیرہ وغیرہ کے ذکر کے بغیر تاریخ ادھوری اور ناقص کہلائے گی۔ انھیں نابغہ روزگار ہستیوں میں علامہ اقبال سہیل کا نام نامی اسم گرامی تابندہ اور درخشندہ ہے۔

علامہ اقبال سہیل کی شعری کائنات، نظم، غزل، نعت، منقبت، مثنوی، قصیدہ، قطعہ اور رباعی پر مشتمل ہے۔ کلیات سہیل میں ایک حصہ ''نوائے شیراز'' بھی شامل ہے جس میں اُن کی فارسی شاعری کے جلوۂ صد رنگ نمایاں ہیں۔ کلیات سہیل کا مطالعہ موصوف کے افکار و نظریات کی گراں قدر ترجمانی کرتا ہے۔ وہ ایک منفرد فکر و فن کے شاعر کی حیثیت سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اُن کا شعری اور ادبی اُفق ہشت پہل ہے۔ حالانکہ وہ کسی تحریک کا نتیجہ نہیں ہیں، وہ کسی بندھے ٹکے نظریات سے وابستہ نہیں بلکہ خود ایک عہد آفریں شاعر کے طور پر مطلع شعر و ادب پر نمودار ہوتے ہیں۔ جس میں عرب کا تجمل، عجم کی رعنائی اور سرزمین ہند کی برنائی کا حسین امتزاج ہے۔ وہ فطری شاعر تھے، اُن کے استاد علامہ شبلی نعمانی نے سہیل کی بدیہہ گوئی کی تعریف کی ہے۔ جب باکمال اُستاد شاگرد کے کلام پر مہر تصدیق و توصیف ثبت کردے تو پھر کسی کی سند کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ علامہ شبلی کی سند کے بعد سہیل نے کسی اور سے اصلاح اور مشورہ نہیں کیا۔ اور یہ مصرع صادق آتا ہے۔ ع:

''خود طبع سخن سنج ہے استاد ہماری''

غزل میں سہیلؔ نے کسی اسکول کا تتبع نہیں کیا ہے بلکہ تمام دبستانوں سے علاحدہ اپنی فکر کی جولانیاں نظم کی ہیں، انھوں نے جذبات کی فراوانی، حالات حاضرہ کا مشاہدہ اور اثرات، واردات قلبیہ کو بڑے فن کارانہ انداز سے پیمانۂ غزل میں ڈھال دیا ہے، دوراز کار آفرینی اور لفظی بازی گری سے ان کی غزل مبرا ہے، انھوں نے غزل کو داخلیت اور خارجیت کے تنگ دائرے سے نکال کر فطرت انسانی کے قریب کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اتنا تو ہوش ہے، اُسے دیوانہ کیوں کہیں　　جو توڑتا ہے سر تری دیوار دیکھ کر
ردّ و قبول خلق سے شاعر کو کیا غرض　　سودا نہیں سجائیں جو بازار دیکھ کر
کچھ امتیاز شیخ و برہمن نہیں یہاں　　جی کیوں نہ خوش ہو خانۂ خمار دیکھ کر

یہ امتیاز من و تو مٹا محبت میں　　کہ آپ پر مجھے ہونے لگا گماں اپنا

وارفتگی شوق اور خود سپردگی غزل کی بنیادی روح ہے، سہیلؔ نے لفظ و معنی کو سمو کر معنویت کی گہری تہیں پیش کر دی ہیں ان کے اشعار احساس اور فکر کے دامن کو بڑی دل کشی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔

حسن کا نقش لم یزل، برگ و گل و گیاہ پر　　عشق کی صوت سرمدی، زمزمۂ طیور میں

شیخ کی شان زہد ہے پردہ رند مشربی　　ورنہ یہ جوش طبع کیوں، ذکر جمال حور میں
ہر ایک ساز سے سنتا ہوں اپنی ہی آواز　　فضا میں گونج رہی ہے فقط صدا میری

وارفتگان شوق کو کیا دیر، کیا حرم؟
جس در پہ دی صدا، در جاناں بنا دیا

کلیات سہیلؔ ہمیں شعری محرکات کو نئے زاویوں سے روشناس کراتی ہے۔ جذبہ اور احساس توانائی افہام و تفہیم کے منطقی اور استنباطی باب وا کرتی ہے۔ اس میں ناسخؔ و آتشؔ یا میرؔ و مومنؔ کا انداز نہیں بلکہ غالبؔ اور اقبالؔ کا پرتو ہے۔ اقبالؔ کے شعری افکار اور کردار کے اثرات ہر منزل پر نمایاں ہیں۔ خارجی اسباب و عوامل کی غیر شعوری کارفرمائیاں شدت جذبات کو مہمیز کرتی ہیں۔

درسِ جنون عشق کو کچھ ظرف چاہئے دیوانہ کیا بنے گا جو عاقل نہیں رہا

پہنچی وہاں بھی شیخ و برہمن کی کشمکش
اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

حسن کو اب سلام کر، عشق کا احترام کر
درس جنوں کو عام کر، عشق کی بے کسی نہ دیکھ

خدا کی شان وہ سجدے کے طالب آج ہیں مجھ سے
ابھی کل تک تو مسجودِ ملک تھا آستاں میرا

غزل میں بادہ وساغر کے بغیر کوئی شاعر شعر گوئی کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ سہیل اپنے تمام تر روحانی اذکار اور انوار کے ساتھ لب ورخسار کی حکایت سے خود کو علاحدہ نہیں کرپاتے ہیں۔

گرہ کھلی نقاب کی وہ ضد گئی حجاب کی
بلائیں لے رہا ہے دل، نگاہِ کامیاب کی
ادھر ہے چتونوں پہ بل، ادھر تبسم آنکھ میں
عجیب کشمکش سی ہے عنایت و عتاب کی

خدا رکھے شباب آیا تو اندازِ حجاب آیا
لب نازک سے ہاں بھی اب نکلتی ہے نہیں ہوکر

سو جفاؤں پر بھی رکھا حسن کا پاس ادب
کب کہا، کچھ میں نے ان کو بندہ پرور چھوڑ کر

حیا کے ساتھ ہو شوخی، ادب کے ساتھ ہو شوق
کمال حسن و محبت ہے اعتدال نظر

سہیل خود اپنی غزل گوئی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ۔

سنی غزل سہیل کی تو بول اٹھے جوہری
یہ نظم ہے کہ اک لڑی لالی خوش آب کی

سہیل کی نظمیں بھی قوم وملت کے درد کے ساتھ وطنیت کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ نظموں میں ماضی کی سربلندیاں اور حال کی زبوں حالیاں بہت ہی دل خراش ہیں ۔ بندگی اور بیچارگی کی کلفتیں سمند نازپہ تازیانے کا کام کرتی ہیں نظموں میں ذوقِ آزادی اور غم سود وزیاں نمایاں ہے۔

نظم ''یاد ماضی'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سنا چاہو تو سن لو قصۂ جور خزاں ہم سے
نہ پوچھو عندلیبو!، عہد گل کی داستاں ہم سے
سیاست میں تجارت میں، فلاحت میں صناعت میں
نہ تھا پلہ کسی ملت کا دنیا میں گراں ہم سے
سبق ہم نے پڑھایا آکے تہذیب و تمدن کا
ہوا آراستہ یہ گلشن ہندوستان ہم سے
خبر کیا تھی کہ ایسا دور بھی اک آنے والا ہے
کہ رفتہ رفتہ چھن جائیں گی ساری خوبیاں ہم سے

''خطاب بہ مسلم''، فتح سمرنا'' نوائے وطن، صدائے سروش، اہم نظمیں ہیں۔ سہیل کی نظم ''زمیندار اور کسان'' بہت ہی تلخ حقائق پر مبنی ہے جو قرآن الحکیم کی آیت ''الارض لِلّٰہ'' کی روشنی میں ہے یہ نظم قیامت تک کے لئے شمع ہدایت ہے ۔ یہ عہد زمینداری سے لے کر آج تک کے سیاسی نشیب وفراز کا آئینہ ہے۔ اترپردیش اسمبلی میں اس نظم نے تہلکہ مچادیا تھا۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

زیارت کل ابھی مشکل تھی جن کے آستانوں کی
وہی اب جاکے چوکھٹ چومتے ہیں قلبہ رانوں کی
جو اپنے ظلم کی فریاد کل ہم سے نہ سنتے تھے
وہی اب ہم کو مظلومی سناتے ہیں کسانوں کی

اگر راجے، مہاراجے بھی حامی ہیں رعایا کے
تو بے شک بجلیاں بھی پاسباں ہے آشیانوں کی
زمینیں جن کی تھیں پہلے زمیندار اب کہاں وہ ہیں
ہوئی نذر مہاجن جائیداد اگلے گھرانوں کی
بہت وہ ہیں جنھوں نے ملک سے غداریاں کی ہیں
زمینیں لیں مٹا کر آبروئیں خاندانوں کی

اس شعر میں زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم و بربریت کی طرف بھرپور اشارہ ہے۔ وطن کے غداروں کی طرف بھی اشارہ ہے، جنھوں نے برطانوی حکومت کی وفاداری میں وطن عزیز کی حرمت کو نیلام کردیا تھا۔ اس نظم میں جوش ملیح آبادی کا انداز نمایاں ہے۔ فرماتے ہیں۔

جماعت جن کی برٹش پہلے ہے اور انڈین پیچھے
وہ اٹھے ہیں حمایت کو وطن کے ناتوانوں کی
یہ برٹش انڈین کی دورخی ترکیب کیا کہنا
وطن سے لاگ بھی ہے اور لگن بھی حکمرانوں کی
رعایا کو تو سائے کے لئے چھپر نہیں ملتا
ادھر چھت تک منقش ہورہی فیل خانوں کی
زمین اللہ کی پیدا ہوئی جمہور کی خاطر
مگر دعویٰ کہ ملکیت یہ ہے خلد آشیانوں کی
پیام انقلاب نو زمانہ دینے والا ہے
بدل دے گی زمیں کا رنگ گردش آسمانوں کی
حصول حق کی خاطر لشکر جمہور اٹھا ہے
جلو میں لے کے ہیبت ناکیاں آتش فشانوں کی
بھلا نواب و راجہ کیا مقابل اس کے آئیں گے
شہنشاہی مٹا کر جس نے رکھ دی قہر مانوں کی

اس نظم میں کئی تہہ دار پہلو ہیں۔ جو بڑے تلخ حقائق کو آئینہ دکھلا رہے ہیں۔ اس نظم سے سہیل کی غربا پروری اور جمہوری قدروں کے احترام اور انصرام کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے علاوہ ''یوم آزادی'' آزادی ہند'' جگنو'' وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔

سہیل کا نعتیہ کلام بھی بڑی قدر و قیمت کا مالک ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں ''موج کوثر'' کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے، لیکن ان کے دیگر نعتیہ کلام بھی فکر و فن کو جولانیاں عطا کرتے ہیں۔ اس ذیل میں سہیل کا خود فرمانا ہے کہ:

''موج کوثر'' میں ایک خوبی تو ضرور ہے کہ درود شریف ہر شعر میں ردیف ہے ورنہ میری دوسری نعتیں اور منقبتیں ادبی اور فنی حیثیت سے اس نظم سے بدرجہا بلند تر ہیں۔ حدود شریعت کی پابندی کا لحاظ دوسری نظموں میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ اور عام طور پر نعتوں میں جو حسن صورت کی مداحی اور تغزل کا انداز مولانا جامی کے عہد سے آج تک معمول پہ تھا یا دوسرے انبیاء و رسل کا استخفاف، غیر ضروری اور بے معنی مبالغہ یا لفظوں کی صنعت گری اور خیال آفرینی جو عرفی وغیرہ نے رائج کی اور محسن کا کوروی مرحوم نے اردو میں منتقل کی، ان سے قطعی احتراز ہے۔ (کلیات سہیل، ص: ۲۲)

ذات حضور سرور کائنات لولاک لما خلقت الافلاک ہے۔ سہیل مدح حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں نظم خواں ہیں ؎

پیکر انساں میں ہو اس نور وحدت کا ظہور
جس کے صدقے میں ہوا ہے بزم کثرت کا ظہور
استجابت ہو دعائے پاک ابراہیم کی
میم احمد میں جھلک ہو احمدؐ بے میم کی

محمدؐ وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی
محمدؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی
محمدؐ یعنی وہ حرف نخستیں کلک فطرت کا
محمد یعنی وہ امضائے توقیعات ربانی

عظمت محمدؐ کے جو انداز و معیار سہیل کی نعتوں میں ملتے ہیں وہ کسی دوسرے نعت گو شعراء کے

یہاں تلاش کرنا عبث ہے۔ سہیل کا عرفان و آگہی اس منزل پر پہنچ کر نعت سید الکونین میں رطب اللسان ہیں جہاں بڑے بڑے شعراء، خطیب، مفکرین اور علمائے کرام کے افکار دم توڑنے لگتے ہیں۔

معراج النبیؐ کے ذیل میں کچھ مباحث بھی ملتے ہیں جن کو سہیل کی نظر عمیق نے منطقی استدلال سے بہت خوش اسلوبی سے حل کر دیا ہے جسمانی یا روحانی معراج کے مباحث کا خاتمہ درج ذیل اشعار کی روشنی میں آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

شہنشاہ سریر قاب قوسین احمد مرسلؐ
شب اسریٰ میں جس کا فرش رہ تھا کاخ کیوانی
وہ جسم پاک خود سر تا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی
رجب کی بست و ہفتم بارہواں سال نبوت تھا
کہ بخشا خلوت آرائے ازل نے فخر مہمانی
حریم ام ہانی میں حضور آرام فرما تھے
در دولت پہ قدسی و ملک تھے محو دربانی
ادب سے آکے جبرئیل امیں نے یہ گزارش کی
کریں سرکار بزم نور تک تشریف ارزانی
سنی روح القدس سے جب طلب بزم حضوری کی
اٹھے اور دی براق پاک پر داد سبک رانی

درج بالا اشعار میں جو علوئے فکر اور سورۂ سبحٰن الذی کے مدارج کو فنی لطافتوں اور حرمتوں کے ساتھ نظم کیا گیا ہے وہ اعجاز سخن کی دلیل محکم ہے۔

سہیل کی نعت پاک کے درج ذیل اشعار بڑے بڑے نعتیہ دیوان پر بھاری ہیں۔

کتاب فطرت کے سرورق پر جو نام احمدؐ رقم نہ ہوتا
تو نقش ہستی ابھر نہ سکتا وجود لوح و قلم نہ ہوتا

یہ محفل کن فکاں نہ ہوتی جو وہ امام امم نہ ہوتا
زمیں نہ ہوتی فلک نہ ہوتا، عرب نہ ہوتا عجم نہ ہوتا
کمال انسانیت کا پیکر جمال وحدانیت کا مظہر
سوائے ذات حضور انورؐ کوئی خدا کی قسم نہ ہوتا

درج بالا اشعار میں قرآن کریم کی روح، حدیث پاک کا وفور اور تاریخی استنباط ہے۔

''نوائے شیراز'' کے ذیل میں فارسی کلام ہے جس سے موصوف کی فارسی شعر گوئی کے جلوۂ صد رنگ نظر آتے ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو کی خیر مقدمی نظم میں سہیل کی مضمون آفرینوں کی رعنائیاں جلوہ فگن ہیں۔

اقبال سہیل کی شعری کائنات اپنے جلو میں فکر کی رفعتیں، شعور کی بالیدگی اور فن کی عظمتوں کو سموئے اور بکھیرے ہوئے ہے جس پر دبستان اعظم گڑھ کو بجا طور پر فخر ہے۔ آخر میں سہیل کی اس رباعی پر مضمون ختم کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے:

رباعی

ہر بات میں اندازِ جداگانہ ہے ہے دہر میں اور دہر سے بیگانہ ہے
کچھ اس میں حقیقت ہے کچھ افسانہ ہے کہتے ہیں زمانے میں یگانہ ہے سہیلؔ

یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی کے صحیفہ کمالات کی آخری آیت اقبال سہیل تھے۔

☆☆☆

علامہ اقبال سہیل کی زندگانی حیرت کی فراوانی

مولانا عمیر الصدیق ندوی ☆

۱۸۸۴ء سے ۱۹۵۵ء تک کل اکہتر سال کی عمر کا سارا سرمایہ کلیات سہیل اور چند مضامین اور ایک کتاب ہیں۔ بظاہر یہ کمیت اور مقدار کے لحاظ سے بہت کم ہیں، لیکن کیفیت و معیار کے لحاظ سے جس قدر بلند اور فائق اور بھرپور ہیں، اس کو آسان لفظوں میں حیرت انگیز کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ دیکھا جائے تو اقبال سہیل کا پورا وجود ہی حیرت و حیرانی سے عبارت ہے، نو برس کا بچہ اپنے والد کی زبان سے سنتا ہے کہ "ترحم علی حالیا یا الٰہی" تو برجستہ اس کی زبان اس جملہ کو مصرعہ بنا کر اس طرح شعر میں ڈھال دیتی ہے کہ "طفیل جناب رسالت پناہی"

بارہ برس کی عمر میں ایک لڑکے کی زبان پر اگر ایسا شعر آجائے کہ

عندلیب گلشن فردوس ہستم حامداً مدح خوانی نبی کار است طوبیٰ جائے من

یہ کون سی اٹھان تھی اور کس دل کی پاکیزہ ترجمان تھی؟ اس سوال کا جواب حیرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اقبال سہیل کا نعتیہ اور منقبتی کلام برسوں بعد اپنی معراج کو پہنچا، لیکن اس سفر معراج کی نو برس میں ابتدا، شاید ہی کسی اور خوش نصیب کے نصیب کو ملی ہو۔ حیرانی تو ہونی ہی ہے۔

یہ تحیر، یہ استعجاب ہمارا ہی نہیں، علامہ شبلی سے جب انھوں نے شعر و ادب و فلسفہ کی بنیادی کتابیں چودہ پندرہ برس کی عمر میں پڑھیں اور ان کی مجلسوں میں ان کی باتیں سنیں، ایسی باتیں جوان کے لئے اس آب حیات کی مانند تھیں جن کا ہر جرعہ اور بھی تشنگی بڑھاتا، عین اس نوعمری کی شاگردی میں جب انھوں نے اپنے والد کا مرثیہ لکھا اور شبلی نے اس کو پڑھا تو خود شبلی حیران رہ گئے۔ اور کہہ اٹھے کہ تیری شاعری پر مجھ کو خود اپنے کلام کا دھوکا ہو رہا تھا، آخر یہ رنگ سخن تو نے کب اور کیوں حاصل کیا۔

☆ رفیق دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

سچ کہیں تو نوعمر اقبال سہیل کی پوری زندگی شبلی کے اسی سوال کی تصویر بن گئی، تصویرِ حیرت۔

عربی وفارسی یا مشرقی تعلیم پوری ہوتے ہی شادی ہوگئی، کمال یہ ہے کہ عائلی زندگی کا موڑ ان کی علمی زندگی کا بھی موڑ بن گیا، مشرقی سے مغربی تعلیم کے اس موڑ نے ان کو ایم اے ایل ایل بی تو بنایا ہی، علی گڑھ کی زمین نے فارسی شاعری کے ایسے آسمانوں کا نظارہ کرنا شروع کر دیا جن کی رفعتوں سے صدیوں پہلے سعدی وعرفی کی شناسائی ہوئی تھی، نوائے شیراز پھر بلند ہوئی، مگر یہ ایران نہیں شیرازِ ہند کی نور تھی، دانش گاہ علی گڑھ کی مدح کا قصیدہ ہو یا پیش گاہ نظام حیدرآباد میں نذرِ تبریک، ذاکر حسین کی تہنیت ہو یا اورنگ زیب خاں کے لئے قصیدہ بہاریہ یا پھر وہ مشہور خیر مقدمی اشعار ہوں جو سروجنی نائیڈو کی قسمت میں آئے۔

کنوں بہ چشم روشنی چو جلوہ زد سروجنی　　فلک بہ سطح سوسنی بساط ماہتاب زد

تبسمش تکلمے، تکلمش ترنمے　　سزد اگر تلاطمے بہ جان شیخ وشاب زد

ایسے قصائد کہ اہل نظر کہہ اٹھے کہ اس باب میں وہ یقیناً یگانہ ویکتا تھے کہ ان کے فارسی قصائد، اساتذہ ایران کے قصائد کے پہلو بہ پہلو رکھے جاسکتے ہیں اور یہ امتیاز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اہل زبان کا کلام نہیں۔ اور یہ کہ زورِ بیان اور لطف زبان میں یہ کسی طرح عرفی، خاقانی اور قاآنی کے قصائد سے کم نہیں۔ یہ خوبی شاید ہی اقبال سہیل کے علاوہ کسی اور ہندوستانی فارسی شاعر کے لئے کیا گیا ہو۔ خاقانی ہند اور عرفی ہندوستان کے یہ خطابات اور یہ اعتراف کہ:

اکنوں بہ چرخ علم نہ رخشد مگر سہیل　　ورد از خاک ہند نہ تابد دگر سہیل

پھر اسی عالم میں لے جاتے ہیں جس کو عالمِ حیرت کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتے۔ جہاں کسی بھی حیرت زدہ کے لئے غیب سے آواز آتی رہتی ہے کہ

سہیل ناتواں و اوج اقبالش تماشا کن

تماشا کے لئے اقبال سہیل کے پاس اگر یہی متاع قلیل ہوتی تو ان کی عظمت کے لئے کافی تھی، ان کی اردو شاعری غزل، قصیدہ، سہرا، مرثیہ، قطعات، تو سراسر فیضان تجلی سہیل ہے، لیکن شاعر اقبال سہیل کلاہ افتخار کے لئے اور بھی کچھ اسی سے سوا موجود کیا ذہن تھا اور کیا طباعی، جو کچھ لکھا گیا وہ حقیقت کے باوجود فسانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

علی گڑھ میں ان کی زندگی، انسانی سے دیومالائی کیسے ہوئی، اس کے لئے رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ثقہ اور صدق مقالوں کے نام ہی کافی ہیں اور ہم سب کے لئے وہی عالم حیرانی میں سرگردانی کی کیفیت لانے والی ہیں۔

اقبال سہیل اعظم گڑھ واپس آئے، وکالت کی دنیا میں خدا جانے کیا جاذبیت یا مقناطیسیت تھی کہ جس شبلی کو وہ اپنانہ سکی، اقبال کو پانے میں وہ کامیاب ہوگئی، ہمارے لئے اقبال سہیل کی تمام فتوحات میں یہی وکالت معرکۂ حنین کو یاد کرانے والی ہوگئی۔ اور شاعری بہر حال اقبال کے در پر کھڑی رہی اور ان کی بے نیازی کے باوجود اپنے دامن کی ثروت میں اضافہ کرتی رہی، دامن میں غزلیں بھی آئیں اور دوسری اصناف بھی ان کی کیفیت اور قسمت کے بارے میں پرکھنے والوں نے کبھی دبے انداز میں کہا کہ قصائد میں تو وہ خاتم الشعراء تھے ایسے کہ آئندہ کوئی مشکل سے ان جیسا ہوگا، ہاں غزل سے طبعاً مناسبت کم تھی، لیکن یہ ان کی جدت طرازی تھی جس نے غزلوں کے اس رنگ کو جس کے موجد حسرت تھے، اس کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا، بات وہی ہے کہ حسرت، اصغر، فانی، جگر اور سب سے بڑھ کر اقبال کی موجودگی میں ایک مجسم دماغ شعور کے لئے ایک الگ طرز نو ہی انفرادیت کی ضمانت تھی، اقبال سہیل کی انفرادی شان نے غزل اور پھر نظم کو اس رنگ میں پیش کیا جوان ہی کو زیبا تھا، اب کوئی کچھ بھی کہے کہ وہ جذباتی اور خیال پرست نہیں تھے، حقیقت پسند تھے، ان کے دل پر دماغ کی حکمرانی رہی، غزل تو ان جذبات کی طالب ہوتی ہے جن کا سرا اور سراغ تصوف کی گرم انگیٹھیوں سے جاملتا ہے، سب جانتے ہیں کہ تصوف کا مایہ خمیر عشق و محبت ہے جس سے شاعری کا سارا زور درد اور سوز و گداز ہے اور اس کے لئے غزل سے زیادہ موزوں کوئی چیز نہیں، لیکن تصوف اور سہیل دونوں متضاد رویے تھے، ایک موقع پر بات تھی شیطان کو معلم الملکوت کہے جانے کی، اقبال سہیل اس کو ان اغلاط میں رکھتے تھے جو عوام میں بے سروپا افسانوں کی طرح عام ہیں، انھوں نے کہا کہ قرآن کی صراحت ہے کہ آدم کو اجنہ اور ملائکہ پر تفوق محض علم اسماء کی بنا پر ہوا، تسبیح و تہلیل تو ملائکہ کی فطرت ہی میں داخل تھی، پھر آخر وہ کون سے فنون تھے جن کا درس ابلیس کے سپرد تھا، لکھتے ہیں غالباً تصوف ہوگا۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ اقبال سہیل کی غزلوں میں وہ بات نہیں جس نے اصغر و فانی، حسرت اور جگر کو اپنا اسیر کر رکھا تھا۔ قرین قیاس ہے، لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اقبال سہیل غزل کے مزاج داں

ایسے تھے کہ ان کی نظر میں اگر شاعر قادر الکلام ہے تو دنیا کا کون مضمون ہے جو غزل میں ادا نہیں کیا جا سکتا، ان کے نزدیک سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ غزل گوئی نے سات آٹھ صدیوں کے اندر اکثر الفاظ میں وہ مفہوم پیدا کر دیئے اور کفایت یا بہ اصطلاح حال اشاریت کے لئے ایسے ایسے اسلوب پیدا کر دیئے جو ہر طرح کے خیال کو رنگ تغزل میں ادا کر دینے کے ضامن ہیں۔ تغزل کا یہی ابہام یا اشاریت تو ہے جس پر اس کی ہزاروں تفصیلیں نثار کی جا سکتی ہیں۔

اقبال سہیل کے اس قسم کے خیالات اور تنقیدی تاثرات کا خزانہ ان کے وہ مفید مضامین ہیں جو تبصروں یا مقدموں کی شکل میں ہیں، نشاط روح پر تبصرہ کرتے وقت کیا کیا نکتے وہ بیان کر گئے ہیں جیسے تاثیر و تنقید دو مختلف شعبے ہیں جو ایک دوسرے سے بمراحل دور ہیں، بہت ممکن ہے کہ ایک نغمہ دلکش میری روح پر رقص پیہم کی کیفیت پیدا کر دے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس نغمہ کی تاثیر اور میری روح کی تاثیر میں جو ربط معنوی ہے اس پر میں حکیمانہ اور فلسفیانہ نظر بھی رکھتا ہوں یا اس کے مخفی اسباب و علل کو الفاظ میں ظاہر کرنے پر قادر ہوں۔

اس طرح بیخود موہانی کی گنجینۂ تحقیق پر ان کا تبصرہ اردو تنقید کے شاہکاروں میں ہے، اس میں کیا نہیں، دقت نظر، اصابت رائے وغیرہ اپنی جگہ لیکن کہیں کہیں طنز یہ، اس تبصرہ کو جان لیوا بنا تا جاتا ہے، غالب کی شرحوں کی بات آگئی تو یہ جملے بھی قلم کی نوک پر نشتر بن گئے کہ ''غالب مرحوم کو کیا خبر تھی کہ مقبول عام ہونے کی مصیبت جس سے وہ جیتے جی ہمیشہ پناہ مانگتے اور دامن بچاتے رہے، مرنے کے بعد ان کے سر پڑے گی اور نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ ذوق سخن کی بنا پر نہیں بلکہ محض تجارتی اغراض سے دیوان غالب کے رنگارنگ ایڈیشن شائع کئے جائیں اور عجیب و غریب شرحیں لکھی جائیں گی جن کو دیکھ کر اگر غالب زندہ ہوتے تو سر پیٹ لیتے۔

تنقید میں کاش ان کی اور بھی تحریریں ہوتیں لیکن کیسے ہوتیں ان کا تو ماننا تھا کہ تنقید نگاری اور وہ بھی اپنے ہم عصروں کے نتائج فکر پر، ممکن ہے کسی کے لئے دلچسپی کا باعث ہو مگر میرے خیال میں تو اس سے زیادہ صبر آزما اور حوصلہ شکن کوئی ادبی مشغلہ نہیں ہے، اس اجمال کی تفصیل کے لئے دل شاہ جہاں پوری کے نغمہ دل پر ان کے تبصرہ کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ضرورت تو ان کے ہر لفظ کو گوہر و لعل سمجھ کر سمیٹنے کی ہے۔

اب یہ چھوٹا منھ بڑی بات ہوگی مگر کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ ان کی شاعری سے زیادہ ان

کے یہ مضامین قیمتی ہیں، ان چند مضامین سے خدا جانے کتنی کتابیں تیار کی جا سکتی ہیں۔

اقبال سہیل کے آئینہ خانہ حیرت میں عقل کے گم ہونے کی وجہ ایک نہیں، خدا جانے کتنی ہیں، ان میں سے ایک کتاب حقیقۃ الربوا ہے، کچھ کہتے ہیں کہ فتوحات سہیل میں یہی کم تر کہی جا سکتی ہے، ردو قبول سے ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ کتاب ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت استدلال کی بڑی نشانی ہے، قانون کی عملی زندگی کا اثر فقہ پر ہونا ایسی تعجب کی بات نہیں، لیکن قرآن وحدیث اور فقہی مسالک کا ان کا مطالعہ کس غضب کا رہا کہ دارالمصنفین کے بزرگ ان کی نکتہ آفرینی سے عالم حیرت میں چلے جاتے تھے، کہتے تھے کہ اگر ان کو ان کے مطلب کا کوئی جزئیہ مل جاتا تو اس کی بنیاد پر اپنی ذہانت سے عظیم الشان عمارت کھڑی کر دیتے۔ ان کے دلائل کا جواب آسان نہ ہوتا، مولانا سید سلیمان ندوی بھی ان کی تشفی نہ کر سکتے تھے۔

ان کی ساری علمی، عملی، عائلی زندگی واقعی حیرت کا جہان ہے، لیکن اس میں ایک مقام ایسا بھی ملتا ہے جہاں یقین کی تابش ہے، ان کی مشہور نعت کا ذکر مبارک بار بار آیا، وہی ''احمد مرسل فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم'' وقت کے محدث شہیر و کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے دل و دماغ پر اس نعت نے یہ اثر کیا کہ شاعر نہ ہونے کے باوجود ان کے تاثرات خود بخود موزوں ہو گئے۔ شاعر، نقاد، وکیل، سیاست داں، اقبال سہیل کے لئے ایک ممتاز ترین عالم ومحدث کے دل سے یہ جذبات اس طرح اٹھے اور برسے کہ ابر کرم بھی جھوم اٹھا ہو

اے اقبال اے شاعر ملت نازش قوم اور فخر ملت
مدح نگار مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
تجھ کو مبارک مدح نگاری تجھ پر سایۂ رحمت باری
تجھ سے راضی ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم

یہ بشارت ہی تو زندگی کا حاصل ہے لیکن یہ آخری شعر تو اقبال کی اصل اور دائمی زندگی کے لئے محدثانہ نوید بن گیا کہ

انک أن تقرأہ علیہ یوم المحشر حین تراہ
أرجو منہ أن یبتسم صلی اللہ علیہ وسلم

حیرت کی فراوانی اب اور کیا بیان کی جائے۔

☆☆☆

اقبال سہیل کی چند نظموں پر ایک مختصر نوٹ

پروفیسر علی احمد فاطمی ☆

اقبال سہیل ایک مذہبی پس منظر کے شاعر تھے، غالباً اسی لئے ان کے سرمایۂ شاعری میں حمد ونعت منقبت وغیرہ کثرت سے ملتی ہیں، لیکن یہی مذہبی، لیکن روشن خیال شخص وشاعر جب بغرض تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی پہنچتا ہے تو وہاں کے بیدار ادبی وعلمی ماحول میں اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کروٹ لیتی ہے اور اس میں ابتداءً صوفیانہ رنگ آمیزی اور سنجیدگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، کچھ سماجی اور سیاسی اتھل پتھل انھیں پریشان کرنے لگتے ہیں، شبلی اور اقبال کی قومی نوعیت کی نظموں کی گونج انھیں متوجہ اور متاثر کرنے لگتی ہے۔ شبلی تو خیر اُن کے استاد ہی تھے۔ اور شبلی جیسے جید شاعر، دانشور، مورخ کا شاگرد ہونا بھی اپنے آپ میں ایک اعزاز وامتیاز ہے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم، ۱۹۱۷ء میں روس کا انقلاب کہ جس سے پوری دنیا متاثر ہو رہی تھی۔ ہندوستان کی کروٹ لیتی سیاست اور معتدل معاشرت کا متاثر ہونا فطری تھا، لیکن ساتھ ہی فکری بھی۔ پھر مقامی سطح پر جلیان والا باغ کا دل ہلا دینے والا حادثہ جس سے شعراء بیحد متاثر ہوئے، روشن خیال اور ترقی پسند جماعتوں کا احساس واضطراب، گاندھی جی کی سیاست میں آمد اور جواہر لعل نہرو کا سفر روس، ترقی پسند تحریک کے قیام نے تمام ہوش مند اور ذمہ دار شاعروں کی طرح اقبال سہیل کو غزل کے مقابلے نظم، عشقیہ وصوفیہ مضامین کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی اور قومی موضوعات پر سوچنے اور اپنی تخلیقی بصیرت کا حصہ بنانے پر مجبور کردیا، ان تغیرات اور حالات نے ایک نئے شاعر اور دانشور اقبال سہیل کو پیدا کیا یا یوں کہیے کہ شاعری اور دانشوری جو ان کی گھٹی میں تھی اس کو ایک نیا قومی وانقلابی روپ دیا۔ اسی لئے کچھ لوگ ان کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ۳۵ء سے قبل کی غزلیہ وعشقیہ شاعری اور ۳۵ء کے بعد سیاسی، قومی افکار ونظریات کی

☆ صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف الہ آباد

شاعری اس مختصر سے مقالہ میں دوسرے دور کی شاعری پر مختصری ہی گفتگو کی جائے گی۔ یہ گفتگو اس لئے بھی ضروری ہے کہ اردو میں معیار پرست ادیبوں ونقادوں اور معیاری تہذیب پسند بلکہ بصد معذرت تعیش پسند شاعروں نے ہجر ووصال اور زلف ورخسار میں ان کے بلکہ الجھے شاعروں نے اس نوع کی بامقصد باعمل شاعری کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ اسی لئے نظیرا کبر آبادی جیسے بے مثال انسانی وعوامی شاعر کو بازاری شاعر کہہ کر راندۂ درگاہ کردیا گیا۔ اسی لئے مدتوں آزاد، حالی، شبلی وغیرہ کی دانشوری تو تسلیم کی گئی لیکن اس کے مقابلے شاعری کو وہ درجہ نہیں دیا گیا جس کی وہ حق دار تھی، چکبست، اسمٰعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی وغیرہ بھی نظر انداز رہے اور آج بھی ہیں۔ وہ تو کہئے علامہ اقبال نے ان موضوعات کو جو عظمت ورفعت عطا کی، فکر وفلسفہ کے جو معیار قائم کئے اور آگے بڑھ کر ترقی پسند شعراء نے جو ایک نیا تصورِ جمال پیش کیا جس میں جلال بھی شامل تھا اور اقبال بھی، یہ قیمتی بات کہہ گئے تھے۔

شاعری بے قاہری جادوگری است | شاعری باقاہری پیغمبری است

بہر حال ان غیر معمولی تغیرات وانقلابات نے، اقبال کی مکمل شاعری نے تو اپنا ایک منفرد وممتاز مقام بنایا ہی نیز ان کے ہم عصروں کو بھی ایک مقام عطا کیا، اقبال سہیل نہ صرف ہم نام تھے، بلکہ ہم عصر اور ہم مذاق بھی۔ صرف مزاج میں مختلف تھے، یعنی بے نیاز اور لاابالی۔ غالباً اسی لئے نظر انداز رہے اور ان کی شاعری پر ناقدانہ گفتگو کم ہو سکی۔

ذہنی طور پر ایک بیدار فرد اور شبلی کے شاگرد ہونے کے ناتے یوں تو اقبال سہیل ابتدا سے ہی حقیقت پسند شاعر تھے، لیکن کہا جاتا ہے کہ سیاست پسندی کا سلسلہ ۱۹۳۵ء کے آس پاس ہوتا ہے۔ جب تحریک آزادی زور پکڑتی ہے اور مسلم لیگ جداگانہ نظریہ قومی پیش کر کے کانگریس کے موقف کے خلاف ہوگئی تھی، ہر قوم پرست اور وطن پرست شخص وشاعر کی طرح اقبال سہیل بھی کانگریس کے حمایتی تھے، فکری سیاست کے ساتھ ساتھ جلد ہی وہ عملی سیاست میں بھی حصہ لینے لگے۔ الیکشن بھی لڑا، جیتے اور یوپی اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک منظوم تقریر بھی کی، ایک سیاسی غزل بھی کہی۔ ساری زندگی کانگریس کے ساتھ رہے۔ تقسیم کی سخت مخالفت کی، مذہب اور سیاست کو ہم آہنگ کر کے جنگ آزادی کو ایک دینی اور انسانی فریضہ قرار دیا، شاید اسی لئے وہ حسرت اور جوہر کو معقول ومناسب رہبر مانتے تھے اور کہتے تھے "قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی سی آزادی اور قلندری ان میں ہے۔" کہا جاتا ہے کہ

ملک کی آزادی نے جہاں انھیں شگفتہ کیا، تقسیم نے اتنا ہی رنجیدہ و دل شکستہ کر دیا۔ وہ خاموش ہو گئے اور بعد میں صاحب فراش بھی۔ ۷ر نومبر ۱۹۵۵ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

اب میں یہاں ان کی چند سیاسی اور قومی نوعیت کی نظموں پر مختصر گفتگو کروں گا۔ یہ گفتگو جذبہ ورویہ پر کم فکر وفن پر زیادہ ہوگی۔ اقبال سہیل نے غزلوں کے مقابلے نظمیں کم کہی ہیں لیکن جو ہیں ان میں بیشتر سماجی، سیاسی اور قومی مزاج کی ہیں، یوں تو اردو زبان و ادب میں قومی، وطنی اور زمینی شاعری کی روایت پرانی ہے اور اس کے اب تک رنگارنگ روپ بھی ہیں لیکن نقادوں، مورخوں نے اس نوع کی شاعری پر کم سے کم گفتگو کی ہے، اسے غیر اہم اور کہیں کہیں تو غیر ادبی قرار دیا ہے لیکن ان تمام اعتراضات اور خیالات سے بے نیاز حق پسند اور وطن پرست شعراء اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتے رہے۔

حالی، شبلی، چکبست کی روایات سے اپنے آپ کو جوڑتے ہوئے اقبال سہیل نے ایک دو نہیں تقریباً بیس پچیس نظمیں کہی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی باضابطہ نظم ہے "عوض خاک وطن کے میں نہ لوں ملک سلیماں بھی" عنوان بظاہر شاعرانہ ہے لیکن خاکِ وطن سے انسان کو جو فطری محبت ہوا کرتی ہے اس کے پیش نظر نظم کا پہلا شعر ہی انسانی نفسیات کی عمدہ مرقع کشی کرتا ہے۔ شعر دیکھیے ؎

عجب نیرنگ فطرت ہے سرشت نوع انساں بھی
یہی خود اہرمن بھی ہے یہی تصویر یزداں بھی
اسی کی جستجو میں کفر بھی سرگرم ایماں بھی
بظاہر کشمکش سی بھی مگر اک ربطِ پنہاں بھی

ان دونوں اشعار کو بغور ملاحظہ کیجیے۔ ان میں خاک وطن سے زیادہ انسانی فطرت اور اس کے کیف وکم کو ماہرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس فطرت کے تحت کچھ آبادیاں ہیں تو کچھ بربادیاں بھی جس کو شاعر نے فطرت اور فلسفہ کی مزاجی کیفیت میں مدغم کر کے جذبۂ وطنی کو آشکار کیا ہے۔ ایسے اشعار اکہرے نہیں ہوتے بلکہ ان میں انسانی فکر وفطرت کی گہرائی اس جذبہ کو دبیز بناتی ہے جسے جذبۂ وطنی کہتے ہیں، نظم اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

سہیل اس بے نوائی پر بھی ہمت کا یہ عالم ہے
عوض خاکِ وطن کے میں نہ لوں ملک سلیماں بھی

یہ اقبال سہیل کا اپنا مخصوص انداز ہے جس میں شاعری کا لحن آزادی میں جذب ہو جاتا ہے۔
بظاہر راست نوعیت کی نظم ہے، ''نوائے وطن'' جس کی ابتدا ہی راست بلکہ سپاٹ انداز میں ہوتی ہے،
لیکن ان کا مخصوص شعری اسلوب، لفظیات کی تخلیقی دروبست اور اساتذہ کے غیر معمولی اثرات ایسی
سادہ اور جذباتی نظم میں بھی تخلیقیت بھر دیتے ہیں اور نظم کو سنبھالا مل جاتا ہے۔ ایک کیفیت پیدا ہو جاتی
ہے۔ یہ شعر دیکھئے ۔

گو مری کشتی سے کھیلے موج طوفانِ وطن — غیر میرا نا خدا ہو اے خدا ایسا نہ ہو
جگمگا اٹھے ترے دم سے شبستانِ وطن — آتش غم سے تجھے جلنا مبارک ہے اگر

اس نظم کا آخری شعر دیکھئے ۔

فیض سے اُستاد کے یہ نام روشن ہے سہیلؔ
آج کہتا ہے زمانہ مجھ کو سحبانِ وطن

استاد ظاہر ہے حضرت شبلی کی طرف اشارہ ہے اور اقبال سہیل پر شبلی کے اثرات خوب سے
خوب تر کی طرح پائے جاتے ہیں، آل احمد سرور کی زبان میں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ''نئی نسل پر سرسید
سے زیادہ شبلی کا اثر ہے۔'' اقبال سہیل کی عقیدتیں کچھ زیادہ تھیں، اس لئے اثر بھی زیادہ، لیکن اقبال
سہیل کی عقیدتیں اپنی جگہ اور ان کی تخلیقی جودت اور ندرت اپنی جگہ۔ ان کی قومی اور وطنی شاعری ان کی
اپنی ہے۔ ان کا اپنا انداز، اسلوب و آہنگ بھی۔ ''بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے'' نظم کا عنوان ہی
لارڈ سا ہے کہ اس میں آگ ہے تو شعلے بھی ہوں گے، اور دھواں بھی لیکن اقبال کی غزلیہ شاعری کی
تربیت کا رچاؤ اور تخلیقی الفاظ کا دباؤ انھیں زیادہ لارڈ نہیں ہونے دیتا۔ دیکھئے نظم کا پہلا بند ۔

یا شعلۂ گل اٹھ کے اسے درسِ فنا دے — یا برق قضا گر کے نشیمن کو جلا دے
کوئی تو جگر سوزیٔ بلبل کا صلا دے
کوئی تو اسے پھونک کے اکسیر بنا دے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

دیکھئے ایک طرف آگ ہے، جلانا ہے، پھونکنا ہے تو دوسری طرف برق قضا۔ شعلۂ گل اور
سوزیٔ بلبل اور پانچویں مصرعہ میں نشیمن کا بننا بھی ایک تعمیری عمل۔ قومی نظموں میں اکثر للکار کی سی
کیفیت ہوتی ہے اور یہی اس کا وصف ہے لیکن غزلیہ شاعری میں ہم فریاد کے عادی رہے ہیں، اس لئے

للکار میں نعرہ بازی نظر آنے لگتی ہے۔ غزل سرگوشیوں کی شاعری ہے اور قومی، سیاسی و اجتماعی نظموں میں بلند آہنگی ہوتی ہے، یہی اس کی جمالیات ہے اور شعریات بھی۔ اس فرق کو سمجھے بغیر ہم آسانی سے فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اقبال سہیل اصلاً غزل کے شاعر ہیں اس لئے غزل کی لفظیات اس نوع کی نظموں میں بھی بڑے سلیقہ سے در آئی ہے، تخلیق کی سطح پر وہ نعرے سے کم، جذبہ رومان اور وجدان سے زیادہ کام لیتے ہیں، اس لئے اس میں نظم کی خارجی کیفیت کم غزل کی داخلی کیفیت زیادہ ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وطنی شاعری میں بھی ایک خاص قسم کا جذبہ نظر آتا ہے، پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اچھی بات کہی ہے۔

> ''اقبال سہیل بڑے باہمت اور بے باک قوم پرست تھے، ان کے یہاں حب الوطنی کی عارضی کیفیت نہیں بلکہ ایک مستقل بہنے والی جوئے رواں ہے۔''

کبھی جوش ملیح آبادی نے شکست زنداں کا خواب جیسی نظم کہی تھی جس کو اپنی گھن گرج کی وجہ سے خوب شہرت ملی، اقبال سہیل کی بھی اسی مزاج کی ایک نظم ہے ''نغمۂ بے تاب'' لیکن اس کا اسلوب و آہنگ ملاحظہ کیجئے، جوش کا سا آہنگ نہیں لیکن بیتابی کا جو نغمہ ہے اس میں نغمگی ہے، خستگی ہے اور شاعری بھی ہے، چند شعر دیکھئے۔

تیور جو اسیروں کے بگڑے صیاد کی ہمت چھوٹ گئی
اے ذوق جنوں تیرے صدقے زنجیر غلامی ٹوٹ گئی
باندھے ہوئے اپنے سر سے کفن نکلے جو فدا کارانِ وطن
صیاد کا زہرا آب ہوا نبض اہلِ وفا کی چھوٹ گئی
پھر جوش پہ ہے دریائے سخن پھر دور میں صہبائے سخن
قفل در زنداں کیا ٹوٹا اقبال کی تو بہ ٹوٹ گئی

حصول آزادی یا مبارک باد آزادی پر نظمیں بہت کہی گئی ہیں، اقبال سہیل نے بھی ایک نظم کہی ہے لیکن اقبال کی وہ نظم قابلِ ذکر ہے جو انگریزوں کے رخصت پر کہی گئی ہے۔ یہ ایک نئے طرح کی نظم ہے۔ دو شعر اس نظم کے بھی دیکھئے۔

اے اہل وفا ماتم نہ کرو وہ وعدہ شکن گر جاتا ہے
جاتا ہے مسافر غم نہ کرو، مہمان ہی تھا گھر جاتا ہے

کچھ سرو نہیں شمشاد نہیں اجب ہے گلستاں زاد نہیں
کیا اس کے مظالم یاد نہیں جانے دو ستمگر جاتا ہے

پوری نظم میں غزلیہ انداز، ہجر و وصال کا سا اسلوب، وفاداری اور بے وفائی کے رویوں میں سیاسی بازی گری، ظلم واستبداد کا اشاراتی انداز۔ یہ تخلیقی عمل ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسا اسلوب وہی شاعر اختیار کر سکتا ہے جس نے فارسی شاعری، کلاسیکی شاعری پڑھ رکھی ہو۔ زبان و اسلوب کے قدیمی، تخلیقی انداز سے گہری واقفیت رکھتا ہو، جس نے غزل کے پیمانے ڈھالے ہوں۔ جس نے حالی، شبلی، اقبال کے کارنامے جذب کیے ہوں، وہی شاعر غزل کے اشعار میں بھی یہ صدا بلند کی ہو۔

محبت ہے وطن کی گل زمیں سے   ہمیں اب کیا غرض خلد بریں سے
یہ عالم ہے جمال ہم نشیں سے   کہ ہاں کہنے کو ہیں لیکن نہیں سے

ایک دوسری غزل کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

آیا نہ انقلاب اُس اُجڑے دیار تک
بدلا اگرچہ خود چمن روز گار تک
اس فصل میں بھی جا نہ سکے شاخسار تک
زنداں نصیب کاش نہ جیتے بہار تک

اقبال سہیل نے مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، محمد علی جوہر وغیرہ پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان نظموں کا انداز جداگانہ ہے لیکن ان نظموں کو بھی اقبال کے فکر و نظر، بے باک نڈر رویوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، اقبال سہیل تو وہ شخص و شاعر ہیں جنھوں نے اسمبلی میں منظوم تقریر کر دی اور ایک نیا آئین پیش کر دیا۔ میں اقبال سہیل کی چند اور نظموں پر مکتبی انداز کی گفتگو کر سکتا ہوں لیکن میرے خیال میں اس سے زیادہ ضروری گفتگو یہ ہے کہ اردو شعر و ادب میں قومی، وطنی اور زمینی شاعری کا اتنا بڑا ذخیرہ اور کثیر سرمایہ ہونے کے باوجود اس نوع کی سچی اور حقیقی اردو کی تاریخ و تنقید میں وہ مقام کیوں نہ مل پایا جو دنیا کے دوسرے زبان و ادب میں ملا، اسے معیاری ادبی و اقداری شاعری کیوں نہیں سمجھا گیا، امیر خسرو سے لے کر قلی قطب شاہ تک اور نظیر اکبرآبادی سے لے کر نذیر بناری تک ایک لمبا سلسلہ ہے لیکن تنقید اتنی ہی مختصر برائے نام، یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ قومی

شاعری کو دو جلدوں میں انتخاب کرتے ہوئے ممتاز ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔

''دور قدیم سے ہی اردو شاعری براہ راست وطنیت اور قومیت کے جذبے سے سرشار ہونے لگی تھی، حب وطن کی جو بے حالی، آزاد اور اسماعیل، سرور اور چکبست سے چلی اس کے پیچھے ملک کے سماجی اور سیاسی عوامل کارفرما تھے۔ یہ لے زمانے کے ساتھ بڑھتی چلی گئی اور ہندوستان کی تمام سیاسی تحریکات کو اپنے میں سموتی گئی، ہر سماجی اور سیاسی واقعہ جیسے اردو شاعری کو ازبر ہو، کوئی منزل اور کوئی موڑ ایسا نہیں ہے جہاں اس نے ساتھ نہ دیا ہو، اسے اپنے دل کی آواز میں نہ ڈھالا ہو، انقلاب زندہ باد تک کا نعرہ اردو زبان ہی نے ہماری جنگ آزادی کو دیا''

پروفیسر نجار حسین رضوی نے ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر'' کے موضوع پر وقیع تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں۔

''اردو اپنے آغاز سے ہی مشترکہ کلچر کے اہم مظہر اور یک جہتی کے اہم ترین عنصر کی حیثیت سے سامنے آئی تھی، خصوصاً اردو شاعری نے قومی یک جہتی کے عناصر کو اپنے دامن میں سمیٹ کر ملک کو ''کثرت میں وحدت'' اور رنگارنگی میں یک رنگی کا پیغام دیا تھا ــــــ لیکن ہندوستان کی تہذیبی زندگی کا یہ بدترین المیہ تھا کہ یک جہتی کی علامت اور قومی ہم آہنگی کی علم بردار اس زبان کو سیاسی مصلحتوں کی قربان گاہ پر شہید ہونا پڑا۔''

مثالیں اور بھی ہیں، جواب بھی تفصیلی ہوگا۔ یہاں تو ایک مسئلہ اور رہا ــــــ اردو شعر و ادب ایک متمدن تہذیب کا پروردہ رہا ہے۔ اس کی تعمیر و تخلیق میں سرمایہ کاری کا نظام، نوابین و سلاطین، امراء و روساء کے مابین عشق و محبت کے کھیل زیادہ رہے۔ مدتوں ہجر و وصال، عارض و رخسار ہی شاعری کے مرکز و محور رہے، اس لئے کہاں زمینی آزار اور ریگزار کا ذکر ممکن تھا، اس لئے یہ عمومی موضوعات نظر انداز رہے، شیفتہ نے اپنے تذکرے گلشنِ بے خار میں عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہ بازاری شاعر ہے۔ حالی، غالب اور شیفتہ جیسے جید غزل گویوں کی صحبت میں رہ کر بھی بغیر ملے نظیر سے

متاثر ہوئے اور اپنی سادگی اور دردمندی سے مجبور ہو کر معشوق کے بجائے ماں بہن بیٹی کی طرف متوجہ ہوئے اور جب انھوں نے بیوہ کو بھی مخاطب کیا تو اردو کے روایتی اور تعیش پسند قارئین اور شائقین پریشان ہوا تھے ـــــ لیکن حقیقت وصداقت کی اپنی مقصدیت اور اہمیت ہوتی ہے، اپنی جمالیات ہوتی ہے، پوری ترقی پسند شاعری کو نعرہ بازی کی شاعری کہا ضرور گیا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حالی شبلی سے لے کر کیفی اور وامق تک کی شاعری کا دامن موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر جس قدر وسیع ہوا ہے، اردو غزل میں بالعموم اور نظم میں بالخصوص جو وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی ہے وہ اب ایک زندہ تاریخی حقیقت بن چکی ہے اور قومی شاعری، احتجاجی وانقلابی شاعری بھی اب ایک ضرورت اور حقیقت بن چکی ہے۔ اس سے بھی انکار ممکن نہیں، حالی، شبلی، اقبال، جوش، فیض اور پوری ترقی پسند شاعری اب اردو شعروادب کا ایک بے حد قیمتی اور ناقابل فراموش سرمایہ ہے۔ اقبال سہیل کی قومی ووطنی شاعری اسی روایت اور حقیقت کا اہم حصہ ہے۔ جس پر گفتگو کم ہوئی لیکن سچ یہ ہے کہ جب بھی اس نوع کی شاعری کا ذکر ہوگا اقبال سہیل کا ذکر بھی ہوگا، اب یہ ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج ہم جس دور وحالات سے گذر رہے ہیں، سیاست اور صارفیت، تشدد اور قتل وخون کا جو ماحول ہے اس میں سرگوشی، خاموشی اور نرمی کی شاعری کی ضرورت کم سے کم رہ گئی ہے۔ آج انسانیت کی شاعری پیامی وپیمبری کی شاعری کی کل سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ کلیات اقبال سہیل میں عرض ناشر میں عمدہ بات کہی گئی ہے اس کے چند جملے پیش کر کے اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں:

> ”تمام انسانیت پر تشدد فرقہ واریت اور خود غرضی کی جو غبار آلود فضا سی چھا رہی ہے اس میں تابش سہیل کی جلوہ باریوں کی اشد حاجت ہے۔ سہیل کی پیغامی شاعری ان کا سیاسی شعور اور دل دردمند جو انسان دوستی کا مرقع ہے ان اوراق کے حرف حرف سے آشکارا ہے۔ شاید اس ماحول کی کثافت دور کر سکے۔“

☆☆☆

علی گڑھ اور اقبال سہیل

پروفیسر محمد زاہد☆

علی گڑھ تحریک محض علمی وادبی تحریک نہیں تھی۔ اس کا دائرہ وسیع سمندر کے مانند پھیلا ہوا ہے۔ اسے ایک محدود سیاسی و تعلیمی دائرے میں نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی اہمیت و معنویت کو سمجھنے کے لئے قاری کے اندر بھی گہرائی اور گیرائی ہونی چاہئے۔ یہ تحریک قاری سے خاص غور وفکر کا تقاضہ کرتی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک جامع ذہنی تحریک تھی جس کا مقصد سماجی بیداری اور تہذیب کا ایک نیا تصور پیش کرنا تھا۔ اس انقلابی تصور کو پیش کرنے کے لئے سرسید نے مشرق کی مضبوط بنیاد پر مغربی فکر و تجربے کی ایک نئی عمارت تعمیر کی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید اور ان کے نامور رفقاء کا ادبی اور علمی اثاثہ اس امر کی توضیح کرتا ہے کہ یہ تحریک سماج میں اصلاح و بیداری، مذہب میں اجتہاد اور اردو زبان وادب میں وسعت خیال، افادیت، اسلوب میں سادگی اور صفائی کی علمبردار ہونے کے ساتھ تہذیب کے ایک نئے رویّے کو جنم دیتی ہے۔

سرسید کے رفقاء میں حالیؔ، شبلیؔ، محسن الملکؔ، وقار الملکؔ، ڈپٹی نذیر احمدؔ، مولوی ذکاء اللہؔ جیسے اہم مایہ ناز ادیب، ماہرین علوم وادب اور معزز ہستیاں شامل تھیں جو باہم انفرادی تصورات و خیالات رکھنے کے باوجود اس تحریک کے زبردست حامی اور اہم ستون تھے۔ ان کے بعد کی نسل نے نہ صرف اس تحریک کو فروغ دیا بلکہ اپنی صلاحیتوں اور کاوشوں سے اس کے اثرات کو عالمگیریت عطا کی۔ ان ہستیوں میں حسرت موہانیؔ، سجاد حیدر یلدرمؔ، رشید احمد صدیقیؔ، ڈاکٹر ذاکر حسینؔ کے نام بے حد اہم ہیں ان ہی اکابرین میں اقبال سہیلؔ کا نام بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ گو کہ ان پر شبلی مکتبِ فکر کا اثر

☆ ڈین فیکلٹی آف آرٹس و سابق صدر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بے حد نمایاں ہے۔ مگر علی گڑھ تہذیب کی شناخت جن اصولوں پر قائم ہے اس کا نمایاں اثر اقبال سہیل کی شخصیت میں بھی نظر آتا ہے۔

اقبال سہیلؔ ۱۸۸۴ء میں ۱۱ر ربیع الآخر کو ضلع اعظم گڑھ میں بمقام بڈھیڑیا پیدا ہوئے، والد محترم نے ان کا نام ابوالظفر حامد رکھا مگر دادا امانت اللہ خاں انھیں اقبال کے نام سے پکارتے تھے۔ اقبال کی تعلیم وتربیت کا آغاز خود ان کے والد محترم جناب عزیز اللہ خاں صاحب اور مدرسۃ الاصلاح کے بانی مولانا شفیع مرحوم کے زیر سایہ ہوا، بعد میں علامہ شبلیؔ سے تلمذ اختیار کیا اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر علمی وادبی ذوق شبلی کے ہی خصوصی فیض تربیت کا رہین منت ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ علی گڑھ تہذیب سے انسلاک کی پہلی کڑی یہی تھی جس نے آگے چل کر علی گڑھ کی درسگاہ اور تحریک کا ان کو ایک جزو بنادیا تو بے جانہ ہوگا۔ یہاں افتخار اعظمی کا ایک اقتباس پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

''ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد سہیل نے عربی ادبیات کی طرف توجہ کی جب وہ شباب کی سرحدوں میں داخل ہوئے تو اعظم گڑھ میں اپنے نانا شیخ عبدالرحیم کے پاس جو مشہور وکیل مرزا محمد نعیم کے محرر تھے چلے گئے سہیل کی والدہ کی خالہ مرزا محمد نعیم سے منسوب تھیں۔ مرزا صاحب شعر وادب کے بڑے قدر شناس تھے۔ اس لئے سہیلؔ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ علامہ شبلیؔ کی آمد ورفت ان کے یہاں اکثر رہتی تھی۔ مرزا صاحب نے سہیلؔ کو شبلی کے حلقۂ تلمذ میں داخل کردیا۔ اس وقت سہیلؔ چودہ پندرہ برس کے تھے انھوں نے تاریخ کے اس معلم اول سے عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں''۔ (حیات سہیلؔ، افتخار اعظمی ص:۶،۷)

خود علامہ سہیلؔ کا یہ اقتباس اس بیان کی وضاحت کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''اساتذہ کے اکثر اشعار جو ان صحبتوں میں سنتا یا جو تنقیدی نکتے استاذ مرحوم فرماتے حافظہ میں نقش ہوجاتے۔ اس آب حیات کا ہر جرعہ اور بھی تشنگی بڑھاتا اور اسی آرزو میں کہ شاید مولانا کی زبان سے کوئی شعر یا حکیمانہ نکتہ ادب کا سننے کو مل جائے، اکثر پورا دن اسی بزم شرف میں گزار دیتا''۔

(حیات سہیلؔ، افتخار اعظمی بحوالہ تابش سہیلؔ ص:۷)

علامہ سہیل کی انقلابی شخصیت کو پروان چڑھنے کا موقع علی گڑھ میں نصیب ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں علامہ نے علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا اور یہاں سے وکالت مکمل کر کے ۱۹۱۸ء میں اعظم گڑھ واپس ہوئے۔ علی گڑھ میں ان کو علامہ حمید الدین فراہی، حسرت موہانی اور رشید احمد صدیقی جیسے فاضل کی صحبت نصیب ہوئی۔ یہیں حالی سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جب مولانا حمید الدین علی گڑھ میں پروفیسر تھے اور تفسیر و حدیث کے علاوہ عربی ادب و مشرقی علوم کی تحصیل کی غرض سے سہیل ان سے مستفیض ہو رہے تھے۔ حسرت موہانی اردوئے معلّیٰ نکال رہے تھے اور وحید الدین سلیم علی گڑھ گزٹ کے ایڈیٹر تھے۔ مولوی رشید احمد انصاری عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کرتے تھے۔ علامہ فراہی محلہ بنی اسرائیل میں مقیم تھے۔ رشید صاحب رسل گنج میں رہتے تھے۔ یہ اکابرین اپر کوٹ میں ساتھ بیٹھتے۔ علامہ سہیل بھی ان محفلوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور ان حضرات کی گفتگو اور مذاکرات سے مستفیض ہوتے۔

ایک مرتبہ کسی نے علامہ سہیل سے سوال کیا کہ علی گڑھ سے آپ نے کیا حاصل کیا؟ یہ سنتے ہی علامہ اٹھ بیٹھے اور بولے یہ پوچھو کہ علی گڑھ نے مجھ سے کیا حاصل کیا؟ ان کا یہ بے ساختہ جواب محض تعلّی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان کے قیام علی گڑھ کے چند برسوں کا مطالعہ کریں تو ان کا قول حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے باصلاحیت حلقۂ احباب میں شاعری، خطابت، تنقید اور عربی و فارسی زبان و ادب کا صالح ذوق عام کیا۔ یونین کے جلسے ہوں، مذاکرے اور مباحثے ہوں یا ادبی محفلوں کے ہنگامے ہوں، ہر گام پر حسن استدلال اور حسن اظہار کا شاندار نمونہ پیش کیا۔ اور ان کے علمی، ادبی اور شاعرانہ ذوق و کمال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسز سروجنی نائیڈو کی آمد پر اسٹریچی ہال میں منعقد جلسے میں فارسی نظم پیش کی جس کے اندر بلا کی معنویت اور غنائیت تھی۔ مسز نائیڈو اس نظم سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان کو یہ نظم تاحیات یاد رہی اور اعظم گڑھ میں جب مسز نائیڈو کی آمد ہوئی تو دوبارہ علامہ سے اسی نظم کی فرمائش کی اور اسے نہایت شوق سے سماعت فرمایا۔ اسی طرح اسٹریچی ہال میں نظام حیدر آباد کی شان میں کہا گیا قصیدہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال اور الطاف حسین حالی جیسے نادرۂ روزگار بھی اقبال سہیل کی استعداد علمی، ادبی اور شاعرانہ فضل و کمال کے قائل تھے۔ حالی سے علی گڑھ میں ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے خود علامہ کے الفاظ ملاحظہ کیجئے۔

''مولانا حالیؔ کی زبان سے اپنی ناچیز شاعری پر چند کلماتِ تحسین سننے کا شرف حاصل ہوا اور مولانا نے اپنی خاص شفقت آمیز اور سراپا خلوص لہجہ میں چند دعائیں بھی میرے لیے مرحمت فرمائی''۔ (بحوالہ افتخار اعظمی ص:۱۰)

علامہ علی گڑھ میں اپنی خطیبانہ شان اور شاعرانہ عظمت کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کے حریف بھی ان کی تمام تر علمی و ادبی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ یہاں خواجہ کمال الدین کی آمد کا واقعہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں خواجہ کمال الدین کے اعزاز میں جلسہ ہوا اور انھوں نے اس جلسے میں علامہ کی تقریر سماعت فرمائی علامہ سہیلؔ کا انداز بیان اتنا موثر تھا کہ خواجہ کمال الدین نے انھیں سینے سے لگا کر کہا:

''تمہارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کر دوں''۔

رشید احمد صدیقی نے علامہ کا بہترین خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ خاکہ علامہ کی شخصیت کے کئی گوشوں کو منور کرتا ہے انھوں نے اپنے خاکہ میں علامہ کے معمولات روز و شب، اخلاق و عادات، گفت و شنید، خدوخال اور دیگر معاملات زندگی کا بڑی عمدگی سے نقشہ کھینچا ہے۔ یہ خاکہ اس اعتبار سے اور بھی اہمیت کا حاصل ہے کہ رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کالج کے شب و روز کی تفصیل پیش کی ہے۔ جن میں علامہ کی پوری شخصیت کی متحرک تصویر اپنی آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے اس خاکہ میں علامہ کی علی گڑھ کی زندگی اور علی گڑھ تہذیب میں رچ بس جانے والے اس عالم اور ادیب کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ کہیں وہ یونین میں تقریر کر رہے ہیں، کہیں اسٹریچی ہال میں قصیدہ پڑھ رہے ہیں۔ کہیں ان کی عربی اور فارسی دانی کے چرچے عام ہو رہے ہیں تو کہیں ان کا لاابالی پن اور بے ہنگم و غیر منظم زندگی کے خدوخال سامنے آ رہے ہیں، دوسروں کو قائل کرنے والی بحث کے مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ خاکہ میں موجود اس تفصیل سے علامہ کی شخصیت کے مختلف زاویوں پر روشنی پڑتی ہے۔ علی گڑھ میں ان کی خطیبانہ شان و انداز کے متعلق رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''یونین میں ایک موضوع پر دیر تک جوشیلی تقریریں ہوتی رہیں۔ مولانا بغیر درخواست اور اصرار کے تقریر نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا بھی یہی دستور تھا۔

اصرار بڑھا تو مولانا آمادہ ہو گئے تقریر اس شعر سے شروع ہو گئی:

قمریاں پاسِ غلط کردۂ خود می دارند
ورنہ یک سرو، دریں باغ باندامِ تو نیست

"اردو کا کیا ذکر، طلبہ میں فارسی کے ایسے اور اتنے سخن فہم موجود تھے اور بحث میں حصہ لینے والوں پر یہ شعر اس درجہ چسپاں ہوتا تھا۔ اس پر تقریباً آدھے گھنٹے تک مولانا کی حکیمانہ، کبھی شاعرانہ تقریر۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آج جیسی پر لطف اور پر مغز تقریر یونین میں کبھی نہ ہوئی ہو"

(مولانا سہیل میری نظر میں، رشید احمد صدیقی، بحوالہ تابش سہیل ص: ۲۴،۲۵)

علامہ اقبال سہیل عبقری شخص تھے۔ ان کی تمام تر علمی و ادبی صلاحیتیں وہبی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان کو علامہ شبلی اور حمید الدین فراہی جیسے اساتذہ میسر آئے، اسی کا اثر تھا جس نے علی گڑھ کے ادبی ماحول کو گرم کر دیا۔ اور پورا علی گڑھ علامہ کی ان صلاحیتوں سے مستفیض ہوا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علی گڑھ کی زندگی اور تہذیب نے انھیں معاصر حقیقی رویوں اور زندگی کی حقیقتوں اور موجودہ مسائل وحقائق سے آگاہ کیا یا یوں کہہ لیں کہ ان کی شخصیت کو انقلاب اور تحریک آزادی اور صحتمند سیاست سے آشنا کیا۔ اور ان کی ذہن سازی کی، علی گڑھ کی متحرک فضا نے ان کے سیاسی شعور میں پختگی پیدا کی جسے سیاسی عرفان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ علامہ نے علی گڑھ کی جس فضا میں اپنے شب و روز گزارے تھے اس میں وحید الدین سلیم، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی اور ذاکر حسین جیسے رفقاء اور اکابرین بھی دادِ عیش دے رہے تھے۔ یہ اسی صحبت کا اثر اور اسی ماحول کا نتیجہ تھا کہ ان کی شاعری میں وطن کی سربلندی و سرفرازی کا سچا احساس جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ جذبۂ انقلاب کو ملک میں عام کر دیا اور رجائیت، حرکت و عمل کے تصورات پر زندہ شاعری پیش کی۔ انگریزوں سے مخالفت کا جذبہ سہیل کو ورثہ میں ملا تھا۔ اس سے بھی ان کے سیاسی نظریات کو تقویت ملی۔

سر سید اور ان کے نامور رفقاء نے جس طرح زندگی اور ادب کے تمام شعبوں میں بیداری پیدا کی بالکل اسی طرح آئندہ نسل نے ملک کی آزادی کے حصول کی خاطر سیاسی و سماجی انقلاب کی نئی تصویر پیش کی اور شاعری اور نثر کو نیا آہنگ اور نئے موضوعات عطا کئے۔ علامہ سہیل اسی نسل کا ایسا روشن

چراغ ہیں جسے شبلی نے منوّر کیا اور علی گڑھ نے اس کی لو کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ سوال یہ قائم کیا جائے کہ علامہ سہیل نے علی گڑھ کو کیا دیا تو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ علی گڑھ کو نئی رفتار عطا کرنے میں انھوں نے اہم رول ادا کیا، علمی و ادبی کارگزاریوں سے پورے علمی و تعلیمی منظر نامہ کو متاثر کیا۔ علی گڑھ کی نئی نسل کو پروان چڑھانے میں ان کی اہم معاونت رہی۔ اور اگر یہ دیکھا جائے کہ علی گڑھ نے علامہ کو کیا کچھ عطا کیا تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ علی گڑھ نے ان کے ذوقِ سلیم کی تربیت کی۔ ان کے اندر ذہنی پختگی پیدا کی۔ سیاسی عرفان بخشا، ان کی شخصیت کی ترقی کے مدارج طے کرنے کے لئے ایک بہتر ماحول اور سازگار فضا عطا کی۔

مختصر یہ کہ اقبال سہیل اور علی گڑھ کے درمیان وہی رشتہ ہے کہ دونوں کا ذکر ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے۔ علی گڑھ کی علمی، تعلیمی اور تہذیبی فضا نے اگر اقبال سہیل کے قلب ونظر اور فکر و بصیرت کو جلا بخشی تو اقبال سہیل نے بھی اپنی جودتِ فکر، علمی تبحر اور شانِ عبقریت سے علی گڑھ تحریک کے ہمہ گیر اثرات کو دور دور تک پہنچانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس کی نیک نامی میں اضافہ کیا۔ بالخصوص اعظم گڑھ میں علی گڑھ تحریک کے نمایاں ترین علمبرداروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ شبلی کالج جو ان کا اپنا ادارہ تھا اور جس کے وہ ممبر بھی تھے میں اگر اس تحریک کا کچھ اثر موجود ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اقبال سہیل کی دین ہے، اور یہ علی گڑھ سے ان کے خصوصی تعلق کی علامت ہے۔

سیرت شبلی کا تنقیدی جائزہ

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی☆

علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴ء-۱۸۵۷ء) کی شخصیت اور ان کے علم و فضل پر مختلف زبانوں میں ہزاروں صفحات سیاہ کیے گئے، ان سب تذکروں میں علامہ اقبال احمد خاں سہیل (۱۹۵۵ء-۱۸۸۴ء) کی سیرت شبلی اور سید سلیمان ندوی (۱۹۵۳ء-۱۸۸۴ء) کی حیات شبلی کو اولیت وافضلیت حاصل ہے، ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سیرت شبلی کی ترتیب وتسوید کے ماوراء منصوبہ بند کاوشیں نہیں رہی ہیں، اس تصنیف کے پیچھے ذہانت، علامہ شبلی سے تعلق خاطر اور مختلف اوقات میں کیے گئے مطالعات شبلی کی کارفرمائیاں جلوہ فرما ہیں اور موضوع کی مناسبت سے علامہ شبلی کی تصانیف، مکاتیب اور شاعری نیز ذاتی مشاہدات سے بھی مدد لی گئی ہے، اور خاص بات یہ ہے کہ اس کے ارتباط وانضباط میں متعدد انگریزی مصادر بھی اقبال سہیل کے پیش نظر رہے ہیں، سیرت شبلی کی اساسی شناخت یہ ہے کہ خاں صاحب دراصل علامہ کے ہم وطن تھے، دبستانِ شبلی میں آنکھیں کھولیں، اسی علمی وادبی ماحول میں سانسیں لینی شروع کیں، علامہ سے شرف تلمذ بھی انھیں حاصل تھا، ان کی شخصیت کو نہ صرف بڑے قریب سے دیکھا بلکہ ان کے افکار وخیالات کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا، علامہ کی شخصیت کے بہت سے ابعاد واکناف کو علی گڑھ نے بھی ان کے سامنے لاکھڑا کیا تھا، چونکہ اقبال سہیل علیگ تھے اور علی گڑھ سے علامہ کے جانے کے بعد بھی وہاں ان کا ذکر عنفوانِ شباب پر رہا، واقعات شبلی سنے اور سنائے جاتے، سرسید اور شبلی کے تعلقات کا چرچا رہتا، اسی لئے اقبال سہیل نے شبلی اور علی گڑھ کے حوالے سے بہت بنیادی باتیں کہی ہیں، جو درجہ اساس پر فائز ہیں۔

سید سلیمان ندوی کو شبلی سے ضرور تلمذ حاصل تھا، لیکن نہ تو وہ ان کے ہم وطن تھے، نہ ہی انھوں

☆ شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نے دیارِ شبلی میں آنکھیں کھولی تھیں اور نہ ہی ان کا علی گڑھ سے تعلق تھا، اس تناظر میں دیکھا جائے تو سیرت شبلی اور حیات شبلی میں واضح فرق محسوس ہوگا، سیرت شبلی میں ایک بہاؤ اور بیانیہ کشش ہے جو زیادہ تر مشاہدات و مسموعات پر مشتمل ہیں، یہ کاوشیں ادارۂ سرسید کے تعلق سے بیشمار معلومات کا ذخیرہ ہے اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ نامکمل ہے اور حیات شبلی مکمل ہے، نیز اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اعظم گڑھ کی تاریخ کے بارے میں ایک مستند دستاویز ہے اس کا ایک غیر مستحسن پہلو یہ ہے کہ سرسید اور شبلی کے علمی اختلافات کو مخاصمت کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے، جب کہ سیرت شبلی میں ان باہمی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اسباب بھی بتائے گئے لیکن اس سے یہ تاثر نہیں ابھرتا کہ دونوں میں شدید تر جنگ و جدال برپا تھی یا ان اختلافات نے دونوں کو بغض و عناد کی بلندیوں پر لا کھڑا کیا تھا۔ اقبال سہیل خاں نے دونوں محسنین ملت کے باہمی اختلاف کا بڑے سلیقے سے ذکر کیا ہے۔ ایک تو بنیادی سبب یہ ہے کہ انگریز اپنی شاطرانہ چالوں کے ذریعہ سرسید کو علماء کرام کے بیانات، فتاوے اور تحریروں سے بیزار کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ سرسید کے یہاں زبردست تحمل تھا پر اس کے باوجود ان کی مستقل مزاحمتوں نے اس تحمل کو قدرے جراحت پہنچا ہی دی۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر مغربی اقدار کی چاہت کے بال و پر نکلنے لگے اور مشرقی اقدار کی کہتریت ان کے ذہن و فکر میں نمو پانے لگی۔ جب کہ علامہ شبلی کسی طرح بھی مغربی اقدار کی برتریت کے قائل نہ تھے۔ سرسید کے اس ارتقائی فکر کے پیچھے خصوصاً پرنسپل مسٹر بک کی چالبازیاں تھیں۔ جن کے متعلق اقبال سہیل کا کہنا ہے کہ ''مسٹر بک جو کہ مدتوں تک کالج کے پرنسپل رہے، اعلیٰ درجے کے سیاسی شاطر تھے، انھوں نے سرسید کی اس مزاجی کیفیت سے خوب فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ علی گڑھ کی سیاسی بساط پر اپنے آپ کو فرزیں اور سرسید کو شاہ شطرنج بنا کر چھوڑا۔

الٰہی خیر شیخ و برہمن کے دین و ایماں کی
وہ چھائے جاتے ہیں سب پر جمال ہم نشیں ہو کر

علامہ شبلی نعمانی کو ایسی مغربیت آمیز فضا کبھی راس نہیں آسکتی تھی۔ اس فضاء کا تعارف کراتے ہوئے اقبال سہیل لکھتے ہیں!

''اب غلامانہ اتباع اور پرستانہ تقلید میں بدل گئی اور ظاہری نقالی اور صورتی تتبع نے حقیقی نیاز

مندی اور معنوی غلامی کی بنیاد ڈالی، طلبہ مغربیت کو ترقی اور فرنگیت کو تمدن کا مترادف سمجھنے لگے اور اپنی قومی روایات اور قومی تمدن سے بیزاری ہوگئی۔ قدرتی طور پر یہ منظر مولانا کو ناگوار تھا۔

سرسید اور شبلی کے احساسات میں دوری کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں کے سیاسی مسلک جداگانہ تھے۔ سرسید انگریزوں کے وفادار رہ کر سفینہ ملت کو آگے بڑھانے کے خواستگار تھے۔ اس وفاداری کی توجیہہ مذہبی اور عقلی اعتبار سے کرتے تھے اور علامہ کے نزدیک یہ انگریز غاصب تھے اور وہ ان سے اپنے ملک وملت کی آزادی کے خواہاں تھے۔ اس سیاسی تصادم نے دونوں کی فکری سوچ کو دو دھاروں میں تقسیم کردیا۔ اسی طرح یہاں کے مستشرق اساتذۂ کرام نہایت خاموشی سے ملت اسلامیہ ہند کے اندر سے جذبۂ جہاد کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب Preaching of Islam کے ذریعہ یہی کام انجام دینے کے لئے کوشاں تھے۔ مولانا فراہی کا بھی اس کتاب کے متعلق یہی خیال ہے۔ (۳)

ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی کہ کالج کے نظم ونسق میں جو اہمیت انگریز اساتذہ کرام کی تھی وہ دیگر اساتذہ کو ہرگز حاصل نہ تھی۔ سرسید اور شبلی کے مابین بعد کی ایک وجہ یہ بھی اقبال سہیل نے بتایا کہ وہ شبلی سے اپنی لائف لکھوانے کے خواست گار تھے۔ اس کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھے، اس طرح سرسید اپنی تفسیر کو عربی میں منتقل کرانے کے خواہاں تھے لیکن شبلی نے اپنے مشاغل ومصارف کا ذکر کرتے ہوئے اس سے اپنی جان بچالی، اس کے بعد آپ کی نگہ التفات میں کالج کے طالب علم مولانا حمید الدین فراہی آئے اور ان کے سامنے تفسیر کی منتقلی کا مسئلہ رکھا گیا تو انھوں نے خود کو اس سے علاحدہ رکھنا ہی پسند کیا اور جب بہ اصرار سرسید نے اس کی وجہ جاننی چاہی تو مولانا فراہی نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اشاعت باطل اور تعاون علی الاثم کی معصیت میں حصہ لینا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ سے سرسید اور شبلی کے درمیان فاصلہ مزید بڑھتا گیا غالباً ان کے ذہن میں یہ بدگمانی درآئی کہ اس انکار کی اصل جڑ شبلی ہیں جب کہ مولانا فراہی کے اس جرأت مندانہ اقدام میں آپ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ (۴) یہ سب اقبال سہیل کی مذکورہ وجوہات تھیں جس کی وجہ سے دونوں کی طبیعتوں میں تکدر آیا لیکن اس تکدر وتنفر کو معاندت ومخاصمت کا رنگ دینا مناسب نہیں ہے۔ جس کا اندازہ مقالات شبلی کے مقالہ بعنوان ''سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر'' (۵) سے لگایا جاسکتا ہے۔ سیرت شبلی کا ایک امتیاز یہ ہے کہ مصنف نے

ان کے خاندان، والد، والدہ اور بھائیوں کے بارے میں اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ علامہ شبلی کے والد محترم شیخ حبیب الرحمٰن کی شخصیت پورے علاقے میں قابل ذکر اور لائق احترام تھی، ہائی کورٹ الہ آباد کے سند یافتہ تھے۔ اعظم گڑھ کی عدالت میں انھیں وہ مقام و مرتبہ اور اثر و رسوخ حاصل تھا کہ انھیں الہ آباد ہائی کورٹ کی طرف توجہ دینے کی ضرورت پیش نہ آئی، آپ کے والد محترم کی تعریف و توصیف میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''فیض فطرت نے فراخ دستی کے ساتھ فراخ دلی بھی عطا کی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ صاحب مرحوم گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نگاہ میں یکساں محترم اور ممدوح تھے، قابلیت علمی، شرافت، اخلاق دنیاوی وجاہت و اقتدار، دولت و ثروت اور سعادت مند اولادیں، غرض خدا نے وہ سب کچھ دے رکھا تھا جس کی تمنا انسان کو ہونی چاہئے، یہی وجہ ہے کہ خوش نصیبی کے لئے شیخ صاحب مرحوم کا نام اب تک ہمارے دیار میں بطور ایک منفرد مثال کے پیش کیا جاتا ہے، مولانا کے چچازاد ماموں مولوی شیخ توجہ حسین اور حقیقی ماموں، حاجی محمد سلیم مرحوم اعظم گڑھ میں چوٹی کے وکیل تھے، اس طرح یہ پورا خاندان زمانہ قدیم سے مخصوص طور پر ممتاز چلا آتا ہے۔'' (۶)

آپ کے والد محترم کی شہرت نہ صرف اپنے دیار تک محدود تھی بلکہ اپنے دیار سے باہر بھی اچھی طرح جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ سرسید سے ان کے مراسم تھے۔ وہ ان کی ضیافت سے شرف یاب بھی ہوئے۔ سیرت شبلی میں علامہ کی خاندانی وجاہت کے ساتھ آپ کے بھائیوں کا ذکر بھی تفصیل سے ہوا ہے۔ ان کی لیاقت اور تعلیم و تربیت کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بالخصوص مسٹر مہدی حسن مرحوم کے متعلق بتایا گیا کہ انھوں نے ولایت سے بی اے کیا اور اس کے بعد بیرسٹری پاس کیا۔ جو اس علاقے کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ چنانچہ شیخ صاحب نے ان کی واپسی پر بڑے دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا۔

صاحب کتاب نے علامہ کے استاذ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ مولانا سہارنپوری کے تلامذہ میں سرسید، مولانا فراہی اور علامہ اقبال کے اسماء گرامی شامل ہیں، مولانا فیض الحسن سے تلمذ کے سبب علامہ کے فکر و نظر میں غیر معمولی توسع و تعمق پیدا ہوا۔ چنانچہ عربی ادب خصوصاً جاہلی دور کی شاعری کے خصوصی مذاق کی نشو و نما ان کے اندر شروع ہوئی۔ اس زاویے کو

سیرتِ شبلی میں بڑے سلیقے سے قلم بند کیا گیا ہے۔علامہ کے اسی رشتۂ تلمذ نے ان کے شاگرد رشید مولانا حمید الدین فراہی کو مجبور کیا کہ علم و ادب کے اس بحرِ ناپیدا کنار سے وہ بھی فیضیاب ہوں۔علامہ اور مولانا فراہی دونوں اپنے استاذ محترم کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے علامہ نے ان کے انتقال کے بعد ان کے علمی مزاج کی تصویر کشی کی ہے۔علامہ کے اس تلمذ مثمر کو اس اسلوب میں پیش کیا گیا ہے:

''مولانا کے لئے لاہور کا یہ چند روزہ قیام بہت کچھ مثمر سعادت ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ اسی درس نے مولانا میں عربی علم ادب کا صحیح مذاق حد کمال کو پہنچایا، مولانا فاروق مرحوم معنی آفرینی کے دلدادہ تھے اور متاخرین شعرائے ادب کو جن کا سرخیل متنبی ہے شعرائے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کا بھی ابتدائی مذاق غالباً یہی رہا ہوگا مگر لاہور میں آئے تو دنیا بدل گئی، شعرائے جاہلیت کی تاثیر کی ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور شستہ اور رفتہ زبان دل میں اتر گئی، یہاں تک کہ مولانا نے حماسہ تک حفظ کر ڈالا اور آخر تک بلا ناغہ صبح کی تلاوت کے بعد حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے۔''(۷)

بالعموم علامہ کے تدین کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کیا جاتا۔لیکن یہاں صاحب کتاب نے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر صراحت کی ہے کہ مولانا کو قیام لیل کی عادت تھی، صلوٰۃ فجر سے بہت پہلے وظائف سحری میں مشغول ہو جاتے، تلاوت کرتے اور اشعار بھی گنگناتے۔اس تحریر کی روشنی میں ان کے تدین و تعبد ربانی کے تعلق سے جو بے سروپا گفتگو کی جاتی ہے وہ بے بنیاد ہے۔(۸) اسی طرح عطیہ فیضی کے ضمن میں علامہ کی شبیہہ بگاڑنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں وہ انتہائی قابل مذمت ہیں۔ علامہ نے اپنے خطوط یا اپنے اشعار میں عطیہ کی حسین و جمیل شخصیت کا جو ذکر کیا ہے وہ صرف ان کا اعلیٰ ادبی ذوق اور شاعرانہ کمال ہے۔اس کا ابتذال اور فسق و فجور سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔عطیہ کے تعلق سے علامہ کی ذات کو داغ دار کرنے کی جو ذلیل اور سطحی حرکتیں کی گئیں ان کی بھی اقبال سہیل نے تردید کی ہے۔قبل تردید علامہ کے کچھ خیالات کی تشریح کرتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ مولانا کے نزدیک بے حجابی مکمل طور سے غیر مستحسن تھی لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ بے پردہ خاتون کو عصمت فروش قرار دے ڈالیں۔
''نہ ان کے سینے میں ایسا بے قابو دل تھا جس کے پھسل جانے کا خوف ایسی خواتین سے ملنے جلنے میں

مانع ہو۔"(۹) علامہ مرحوم اکثر یہ شعر پڑھا کرتے:

در کفے جام شریعت، در کفے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

اقبال سہیل نے ایک طرف علامہ کے ادبی مزاج اور شئی لطیف پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی ذہنی شفافیت اور باطنی پاکیزگی کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے کہ جو علامہ کے شب و روز میں شامل رہا ہو، اور ان کی ترجیحات کا اندازہ نہ صرف ان کی تصانیف یا ان کے رسائل سے لگائے بلکہ وہ ان کی صحبتوں اور محفلوں کے مناظر کا بچشم خود جائزہ لے چکا ہو۔ صاحب سیرت شبلی لکھتے ہیں:

"بیشک مولانا کو فیض فطرت نے دل زندہ اور شیوۂ اہل نظر عطا کیا تھا مگر اس کے ساتھ یہ قدرت بھی دی تھی کہ قعر دریا میں رہ کے بھی اپنا دامن تر نہ ہونے دیں۔"

(۱۰) مولانا کو موسیقی سے عشق تھا لیکن وجد و سماع کہ لاطائل مجلسوں سے ہمیشہ گریز کیا۔"مولانا فاضل تبحر اور عالم متورع ہونے کے ساتھ ایک بذلہ سنج ادیب اور ایک رنگین نوا شاعر بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ شاعری وہ بھی فارسی کی، شاعری وہ حمام ہے جہاں بقول علامہ مرحوم "سعدی و حافظ بھی آ کر ننگے ہو جاتے ہیں"(۱۱)

علامہ کی غزلوں کا رنگ انتہائی شوخ اور چوکھا ہے جو ان کی دستار فضیلت اور قبائے ورع سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے شاگرد مولانا فراہی کی غزل کے جواب میں خود بھی ایک غزل منظوم کی جس کے دو شعر اس طرح ہیں:

شب وصل است حبا گہ تگزاری چہ شود — یک دلم تنگ در آغوش فشاری چہ شود
تو بدیں حسن تو نگہ چہ زیاں برداری — یک دو سہ بوسہ اگر خود نہ شماری چہ شود (۱۲)

اقبال سہیل نے اس لمبی تمہید کے بعد مسئلہ عطیہ کو موضوع بحث بنایا ہے اور ان حیا باختہ غیر مصنفین کے خیالات کی تردید کی ہے۔ یہ استدلال چونکہ زبان و بیان اور ادب و انشاء کے اعتبار سے انتہائی خوبصورت اور اپنی منطقیت کے نقطۂ نظر سے باوزن ہے اس لئے اس طویل اقتباس کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے تا کہ قارئین اقبال سہیل کی سلاست و رعنائی کا مزا اٹھاتے ہوئے معاندین شبلی کی شاطرانہ چالوں سے بھی باخبر ہو سکیں۔

''مولانا نے یہ غزل مجھ کو سنائی تو میں خاموشانہ سنتا رہا۔ جب مقطع کی نوبت آئی تو میں نے آہستہ سے عرض کیا کہ مقطع غلط ہے، مولانا نے میری اس غیر معمولی جسارت پر ذرا تند لہجہ میں پوچھا فرمایئے کیا غلطی ہے میں نے آہستگی سے عرض کیا تخلص صحیح نہیں ہے۔ شبلی کی جگہ حامد یا اقبال ہونا چاہیے تھا، ارشاد ہوا میاں یہ فارسی غزل ہے، درس ہدایہ نہیں ہے۔

مگر یہ رنگین نوائی صرف شاعری کی دنیائے تخیل تک محدود تھی اور وہ بھی اس وقت بروکار آئی جب اپالو اور چوپاٹی کے جان بخش قدرتی مناظر دیدہ و دل کو پیام بے خودی دیتے، بعض کینہ پرور اشخاص محض اپنی پستی مذاق اور فطرت کی بان پر بمبئی کی غزل گوئی کا روڑا اور خطوط شبلی موسومہ عطیہ کی ''اینٹ'' لے کر بھان متی کی طرح فریب کا ایک کنبہ جوڑنا اور اتہام کا ایک ہوائی قلعہ بنانا چاہتے ہیں لیکن ان دشنام طرازوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دروغ کا فروغ عارضی ہوتا ہے اور جھوٹ کی عمر چند روزہ، زلیخا کی بہتان تراشی دامن یوسف کی عصمت کب تک مشکوک رکھ سکے گی، انشاء اللہ کذب و افترا کا یہ دفتر بے معنی ایک دن غرق مے ناب ہو کر رہے گا اور جب تک دلوں میں ایمان و دیانت کا ایک ذرہ اور دماغوں میں حق و انصاف کی ایک کرن باقی ہے یہ خناسی وساوس معوذتین کی ایک تلاوت میں ہباءً منثورا ہو کر رہیں گے۔'' (۱۳)

اقبال سہیل نے اس باب میں مولوی عبدالحق کی خفیف نقطۂ نظر کا جواب دینے کی قابل قدر کاوش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ علامہ کے خلاف انھوں نے اپنا یہ موقف اس لئے اختیار کیا کہ انھیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ شبلی، حالی کے مخالف ہیں۔ جب کہ وہ حالی کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کی شرافت اور اعلیٰ نفسی کے قدرداں تھے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ انھیں ''حیات جاوید'' کے بہت سے خیالات سے اتفاق نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنے ایک خط میں اسے ''مدل مداحی'' (۱۴) قرار دیا۔ علامہ سے مولوی عبدالحق کے عناد کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ سرسید کو معصوم عن الخطا تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک سرسید کا تقدس تمام عیوب و نقائص سے بالکل مبرا تھا جب کہ علامہ نے انھیں ایک انسان کی صورت میں دیکھنا پسند کیا ہے اور ایک تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ علامہ کا سیاسی نظریہ مولوی عبدالحق کے

برعکس تھا (۱۵) علامہ کانگریس کے موید تھے اور مولوی صاحب پکے لیگی تھے۔ ان سب نظریاتی اختلافات نے مولوی صاحب کو یہاں تک آمادہ کر ڈالا کہ وہ علامہ کے تقدس و تورع کو داغ دار کرنے پر جٹ گئے جب کہ مولوی صاحب علامہ کے فیض یافتہ تھے، ان کے اعزاء اور تلامذہ کے مخلص دوست تھے اور انجمن اردو ترقی کی مسند نظامت پر علامہ کے جانشین بھی۔ ان سب تلازمات اور تعلقات کے باوجود علامہ کے تئیں ان کا تنقیصی اسلوب جاری رہا۔ اقبال سہیل نے اس سعی مذموم کی کس طرح تردید کی ہے اسے ملاحظہ کریں: ''ان خطوط کو دوسرے زوایۂ نگاہ سے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ سعی نامشکور سے ان کی اصلی مراد یعنی علامہ مرحوم کی رسوائی تو پوری ہوتی نہیں اور ہو بھی جائے تو لاحاصل ہے کیوں کہ خدانخواستہ علامہ مرحوم کوئی شیخ طریقت تو تھے نہیں کہ مریدین بدگمان ہو کر فسخ بیعت کر لیں گے اور صاحب سجادہ کی فتوحات میں کمی آجائے گی، رہا مولانا کا علم و کمال وہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس کو مولوی صاحب کیا، ان جیسوں کی ایک فوج کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی البتہ دو محترم مسلمان بہنوں کے متعلق بے جا سوئے ظن کی اشاعت اور ''چشم بد اندیش'' کے حق میں دعائے سعدی کا اعادہ لازمی ہے۔'' (۱۶)

یہ بات اوپر آچکی ہے کہ علامہ نے اپنے سرسید کو ایک مصلح امت اور مصلح زبان و ادب کی حیثیت سے محسن قرار دینے میں کسی بخل کا ثبوت نہیں دیا لیکن ان کی قیادت و سیادت کا تسلسل نبوت و رسالت تک پہنچتا ہو یہ انھیں کسی طرح گوارہ نہ تھا۔ مولوی عبدالحق نے سرسید کی شخصیت کا تعارف کچھ اس طرح پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ مولوی عبدالحق کا یہ انداز فکری سے زیادہ جذباتی ہے۔ اس کا تجزیہ اقبال سہیل نے اس انداز سے کیا ہے:

> ''ہاں اگر مولوی عبدالحق صاحب علامہ شبلی سے اس لئے برہم ہیں کہ علامہ مرحوم سرسید کے مذہبی عقائد اور سیاسی طرز عمل یا دوسرے لفظوں میں شریعت علی گڑھ کی صراط مستقیم سے منحرف تھے اور نہ صرف خود ہوئے بلکہ ایک بڑی جماعت کو اپنے زور قلم سے انحراف پر آمادہ کر دیا تو ہم کو مولوی صاحب سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ علامہ شبلی کا یہ جرم بھی ہم کو تسلیم ہے، ارباب علی گڑھ کی طرف مولانا نے خود فرد قرارداد جرم ان اشعار میں مرتب کر دی ہے۔'' (۱۷)

عالم میں ہیں ہر اک فرائض جدا جدا
یہ مسئلہ مسلمۂ خاص و عام ہے

ہے مقتدی کا فرض فقط امتثال امر
ارشاد و حکم منصب خاص امام ہے

تھا قوم کا جو فرض وہ تھا عطائے زر
آگے مقدسین علی گڑھ کا کام ہے

یہ بارگاہِ خاص نہیں، مجلس عوام
سمعاً و طاعۃً، یہ ادب کا مقام ہے

مخصوص ہیں مناصب خاصان بارگاہ
تم کون ہو جو تم کو یہ سودائے خام ہے

(۱۸)

سیرت شبلی میں علامہ کے حب رسول کو بھی منظر عام پر لایا گیا ہے۔(۱۹) ضروری تھا کہ یہ بتایا جاتا کہ شبلی کے حب رسول کی تحریک وتحریض میں سرسید اور علی گڑھ کا انتہائی اہم رول رہا ہے۔ یہیں پر علامہ نے میلادالنبی کا آغاز کیا، دوسرے سرسید کی خواہش کے مطابق انھوں نے کالج کے طلبہ کے لئے ''تاریخ بدء الاسلام'' ترتیب دیا۔ انہی سیرتی سرگرمیوں اور سرسید کے حب رسول نے ان کے اندر سیرت مقدسہ کی عقیدت ومحبت کے عناصر انڈیل دیئے۔ سرسید کی سیرت نگاری نے انھیں علمی سیرت نگار بنایا۔ حدیث کے پرکھنے کے اصول وقواعد کو جاننے کے لئے ان کے اندر فکر پیدا کی، اسی طرح انھیں سرسید کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو دنیائے استشراق کی غیر عادلانہ بادتند سے واقف نہ ہوتے۔ ضروری تھا کہ ان عوامل ومحرکات کا اقبال سہیل ذکر کرتے لیکن شبلی کی محبت نے ان کی آنکھوں کو ادھر دیکھنے کی اجازت ہی نہ دی۔ سیرت شبلی میں شبلی کی مدلل مداحی تو ہے لیکن سرسید کے تئیں میزان عدل کا مظاہرہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود کتاب میں جابجا سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی ستائش کی گئی ہے اور اس شخصیت کا اعجاز یہ تھا کہ بڑی سی بڑی شخصیت کا سر نیاز دربار سید میں خم تھا۔ اس کی عظمت ورفعت کہ قصہ خوانی سیرت شبلی میں یوں کی گئی ہے۔

> ''بہر حال حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی ذات گرامی انیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں اسلامی ہند کی سب سے زیادہ نمایاں شخصیت تھی، وسعت خلق، رفعت خیال، جودت فکر اور جرأت اظہار کے علاوہ قومی اور سیاسی بصیرت، نسبی سیادت اور ذاتی وجاہت نے ان کی نگاہ میں ایک مقناطیسی کشش پیدا کر دی تھی، یہی جاذبیت تھی جس نے ان کے گرد بھی اکبر اعظم کی طرح ایک نورتن جمع کر رکھا تھا اور یہی کہربائی

اثر تھا جس کے آگے بڑی سی بڑی ہستیوں کو سر نیاز خم کرنا پڑا، محسن الملک ہوں یا چراغ علی، حالی ہوں یا شبلی، جو بھی سامنے آیا مسخر ہو کر رہا۔" (۲۰)

اسی تعلق سے علامہ کا عربی قصیدہ بھی نقل کیا گیا ہے جب پہلی مرتبہ اپنے والد محترم کے ساتھ خدمت سر سید میں حاضری دینے جا رہے تھے تو یہ قصیدہ منظوم کر کے اپنے ساتھ لے گئے تا کہ سر سید کی تعلیمی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے یہ سپاس نامہ انھیں پیش کر سکیں۔ اس قصیدے سے دو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں ایک تو علامہ کی شعری افتاد طبع، وہ بھی عربی زبان میں، گویا جس طرح انھیں شعری قدرت فارسی اور اردو شاعری پر حاصل تھی یہی تفوق و ترفع انھیں عربی زبان میں بھی دستیاب تھا، سر سید نے اس کو پسند کیا اور اس پسند سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی تزئین و تلوین کی گئی، گویا سر سید پہلے شخص ہیں جو اس گہر نایاب کو عامۃ الناس میں لے آئے۔ سر سید چاہتے تھے کہ در مکنون کو منظر عام پر لایا جائے اور اس سے ملت کو فائدہ پہنچایا جائے یعنی اس آفتاب علم و ادب سے دنیائے دانش وراں کو روشن کیا جائے۔ اقبال سہیل کو سر سید کی اس تربیت کا اندازہ تھا۔ جس کا تذکرہ سیرت شبلی میں یوں ہے:

"سر سید کے ساتھ روزانہ کے علمی اور سیاسی مذاکروں نے اس شعلہ کو اور بھی تیز کر دیا اور مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر علمی اور تاریخی حیثیت سے صرف توجہ کی ضرورت پیش آئی، علی گڑھ کی آزاد فضا میں علمی تگ و دو کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا اور تحقیق و تفحص کی نئی شاہراہیں کھل گئیں۔

قوت آخذہ فطری تھی اور موقع خداداد، فرصت کافی تھی اور سر سید کے کتب خانہ میں نوادر کا اچھا ذخیرہ تھا، شوق مطالعہ کی سیری کے لئے حسن اتفاق ایک اور سامان ہو گیا، عبد المجید نام کے ایک صاحب مولانا کے شناسا تھے جو ادھر اُدھر سے نایاب کتابیں تلاش کر لاتے اور مولانا کی خدمت میں فخریہ پیش کرتے۔

ادھر جوں جوں مولانا کی غیر معمولی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے جاتے سر سید کی گرویدگی بڑھتی جاتی، ادھر اسٹیج کے اندر داخلہ کے بعد خود مولانا کی نگاہوں سے منظر کا رعب کم ہوتا گیا، اس طرح سید و شبلی روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہو رہے تھے مگر قرب کے ساتھ کشش اور کشش کے ساتھ کشمکش کا بڑھنا بھی قدرت کا عالمگیر

اصول ہے۔"(۲۱)

سیرت شبلی میں علی گڑھ کی افراد سازی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی کے ساتھ یہ وضاحت بھی کی گئی کہ شبلی کی تعمیر و تشکیل میں ادارے کا اہم رول رہا ہے لیکن ان کی تشکیل کا سہرا تمام علی گڑھ کے سر منڈھ دیا جائے یہ بھی مناسب نہیں ہے۔ ''یوں تو سننے کو تو ہم بھی سنتے آئے ہیں فلاں صاحب نے دو سنگ ریزے کو جلا کر نگینہ کر دیا'' لیکن آج تک دیکھا نہیں کہ آب وہوا کے نبض نے گیدڑ کو شیر نیستان کر دکھایا ہو یا استاد کی تربیت نے کوے کو بلبل ہزار داستان بنا دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی کے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں فطرت کا عطیہ تھیں'' (۲۲) اقبال سہیل کا یہ دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے کہ آج تک ادارہ علی گڑھ سے کوئی دوسرا شبلی نہ اٹھ سکا۔ اپنے اس ادعاء کو بانگ دہل پیش کیا ہے۔

''نقد اجتہاد کا ملکہ اور اخذ مطالب کی بے مثل قابلیت، شفیق اساتذہ کی تربیت اور اپنی محنت و دماغ سوزی کے ثمرات تھے لیکن ان تمام فطری اور اکتسابی کمالات کو صحیح اور نتیجہ خیز منزل کی جانب رہبری کرنے والا علی گڑھ، ورنہ کیا وجہ ہے کہ آج تک پھر علی گڑھ سے کوئی دوسرا شبلی نہ اٹھ سکا۔

علی گڑھ جس طول البلد اور عرض البلد پر پہلے تھا وہیں آج بھی ہے البتہ اگر پہلے ایک تھا تو آج سو ہے، اگر پہلے ایک معمولی اسکول تھا تو آج خدا رکھے ایک وسیع یونیورسٹی ہے، عربی کے سینکڑوں فارغ التحصیل مولوی یہاں آئے اور پوری زندگیاں گزار دیں مگر آخر اس کا کیا سبب ہے کہ جیسے تہی مایہ آئے تھے ویسے ہی تہی دست گئے، علی گڑھ تنخواہیں بڑھا سکتا تھا بڑھا دیں، خطاب دلوا سکتا تھا دلوا دیے، مگر قابلیت بازار کا سودا نہ تھا علی گڑھ خرید کر حوالے کر دیتا''۔ (۲۳)

سیرت شبلی کا ایک بنیادی امتیاز یہ ہے کہ علی گڑھ کی خاصی داستان سرائی کی گئی ہے، علی گڑھ کی تاریخ اور روایات کا ایک بڑا ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ سرسید کے محاسن بیان کئے گئے۔ ان کے افکار و خیالات پر روشنی ڈالی گئی اور ''خطبات احمدیہ'' کے متعلق بتایا گیا کہ یہ مولانا عنایت رسول کی ''بشریٰ'' سے ماخوذ ہے۔ (۲۴) اقبال سہیل کا یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے۔ سرسید نے عنایت رسول سے اپنے استفادے کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علم و فضل پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن خطبات احمدیہ کو ماخوذ بتانا قطعاً غیر مناسب ہے کیوں کہ سرسید کی طبیعت میں استفادہ تو تھا لیکن سرقہ اور نقل سے ان کی طبیعت ابا کرتی تھی۔ دونوں کا موازنہ کیا جائے تو یہ نکتہ کھل کر سامنے آجائے گا۔ ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ

''تبیین الکلام'' کے باب میں بشریٰ ضوران کے پیش نظر تھی۔ لیکن انھوں نے اپنی اس بے مثال کتاب سے تقابل ادیان کی ایک نئی بنا ڈالی۔

علی گڑھ کا ذکر کرتے ہوئے اقبال سہیل نے یہ بھی وضاحت کی کہ علامہ نے پروفیسر آرنلڈ سے خوب استفادہ کیا۔ جدید تحقیق کسے کہتے ہیں؟ اس کے لیے کن کن اقدار و آلات کی ضرورت ہوتی ہے؟ یہ سب توجیہات علامہ کے حضور پروفیسر آرنلڈ نے پیش کیں۔ چنانچہ حذاقت شبلی نے ان میں سے کارآمد چیزوں کو قبول کیا اور بہت سی چیزوں کو ان کے قوت فکری نے تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ خود آرنلڈ نے بھی علامہ سے عربی زبان و ادب کے رموز تک رسائی حاصل کی اور انھیں بتایا گیا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنے مذکورہ بالا خیالات کا ذکر اپنے مضمون انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں کیا ہے۔ (۲۵) اقبال سہیل نے مولانا شروانی کے ان خیالات کو نقل کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اور یہ بتایا کہ علامہ شبلی نے علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ وہ عہد زریں تھا جس میں آرنلڈ، سر والٹر ریلے اور علامہ شبلی جیسے یگانگان روزگار موجود تھے۔ اور ان عباقرو اکابر سے جو نسل تیار ہوئی تو آج تک دوبارہ علی گڑھ اس کی مثال پیش نہ کرسکا۔ اس فصل بہاراں کے پھولوں میں مولانا حمید الدین فراہی، مولوی بہادر علی، مولوی داؤد بھائی، چودھری خوشی محمد خان، مولوی سید محفوظ علی نقاش بدایونی، سید سجاد حیدر یلدرم، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی مرحوم اور مولوی عبدالحق حیدر آبادی جیسے پھول شامل ہیں۔ (۲۶) انھیں شخصیات نے علی گڑھ کی تحریک کو اعتبار استناد بخشا اور سرسید کے علمی کارواں کو آگے بڑھایا۔

اقبال سہیل نے علی گڑھ کے تعلق سے علامہ کی مختلف الجہات خدمات کی عکاسی کی ہے۔ ایک اسلامی اسکالر، ادیب، ناقد اور شاعر کی حیثیت سے علامہ بلندیوں پر فائز ہیں۔ اسی کے ساتھ میدان خطابت میں بھی آپ نے صلاحیت کا ثبوت دیا۔ ان تقاریر میں ملی مسائل پر زور دیا جاتا۔ مولانا کی تقاریر پہلے سے منضبط نہیں ہوئیں اور نہ ہی وہ بعد میں مرتب کی گئیں۔ مولانا براہ راست بولنے کے عادی تھے۔ ان تقاریر کے ذریعہ آپ نے علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھایا۔ اسی طرح مختلف مضامین کے ذریعے سرسید کی اصلاحی و تعلیمی تحریکوں کی مساعدت کی۔ ایک دوسرا کام علامہ کا یہ رہا کہ کالج میگزین کا اجراء کیا۔ اس ماہوار میگزین کے مدیر خود تھے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے بعد کالج کا یہ

نقیب تھا اس کی وجہ سے یہاں کی ادبی وعلمی سرگرمیاں تیز ہوئیں۔ اسی طرح اخوان الصفا اور لجنۃ الادب جو اردو زبان وادب اور عربی زبان وادب کی دو تنظیمیں تھیں علامہ نے ان دونوں کی تاسیس سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ بالخصوص لجنۃ الادب ہندوستان کی پہلی عربی سوسائٹی تھی جس نے جدید زبان و ادب اور طلبہ کے اندر ملکۂ خطابت اور قوت تحریر پیدا کرنے میں گراں قدر خدمات دیں۔

علی گڑھ کے قیام کے ہی دوران علامہ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا اور واپسی پر اپنی روداد سفر کو ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' کے عنوان سے ترتیب دیا۔ وہاں کی علمی واصلاحی شخصیات، کتب خانوں اور درس گاہوں کا جائزہ لیا۔ بیشمار تصانیف کے متعلق معلومات فراہم کیں، جامعہ ازہر کے احوال اور اس کے معلمین ونصاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے جامعہ ازہر کو بربادی کا سامان قرار دیا۔ وہاں سے سرسید کو خطوط کے ذریعہ علمی سرگرمیوں سے باخبر کرتے رہے۔ ایک خاص نکتہ اس سفرنامے کا یہ ہے کہ ترکی کے حسن انتظام اور اس کے مخصوص انداز کی ستائش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت اسلامیہ یا عثمانیہ کے زوال پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا ہے۔ وہاں پر سلطان کی جانب سے علامہ کو انتہائی باوقار انعام ''تمغۂ مجیدی'' سے نوازا گیا، غریب الدیار میں ایسا سب کچھ علامہ کی عبقریت اور دانشوری کے سبب ہوا۔ اور اس کی وجہ سے سرسید اور ادارۂ سرسید کے ناموں میں اضافہ ہوا۔ اقبال سہیل نے اس کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔

جس طرح مولانا کا سفر خالص علمی مقصد کے لئے تھا جس میں کسی طرح خود غرضی یا دنیا طلبی کا لوث نہ تھا، اسی طرح تائید غیبی نے ان کی وہ عزت افزائی کی جس کے حصول کی خواہش یا کوشش تو بڑی چیز ہے وہم وگمان بھی مولانا یا کسی غریب الدیار کو نہیں ہوسکتا اور جس کے عطا میں بجز اعتراف کمال کے معطی کی بھی کوئی سیاسی مصلحت مضمر نہیں ہوسکتی۔ ایک شہرۂ آفاق اسلامی جنرل کے شوق زیارت اور ان کے ذریعہ سے کتب خانوں اور مدارس کے مطالعہ میں حصول سہولت کے خیال سے مولانا نے غازی عثمان پاشا شیر پلونا سے ملاقات کی، پاشائے ممدوح نے پہلی ملاقات کے بعد دوبارہ ملنے کی خواہش کی، اب کی بار جب مولانا ملنے گئے تو نہایت احترام سے استقبال کیا، بڑے تپاک سے ملے اور یہ خواہش کی کہ قسطنطنیہ سے واپسی کے قبل مولانا ان سے مل لیں۔ اسی اثنا میں حضرت سلطان المعظم سے انھوں نے مولانا کو تمغۂ مجیدی عطا کرنے کی تحریک کر رکھی تھی جو منظور بھی ہوگئی مگر مولانا کو اس کی خبر نہ تھی، ایک دن

دوپہر کے وقت مولانا اپنی قیام گاہ پر آرام فرمارہے تھے کہ ایک دوست نے آکر جگایا اور یہ بشارت دی ''یاشبلی واللہ لقد طلع لک البشان'' مولانا کو اس پر تعجب ہوا مگر قرأت خانے میں جاکر اخبارات دیکھے تو خبر کی تصدیق ہوگئی، دوسرے دن تمام احباب مبارک باد دینے آئے، احباب کے اصرار پر مولانا نے ایک مختصر سا جلسۂ دعوت ترتیب دیا، دعوت کی صبح کو مولانا عثمان غازی پاشا کی ملاقات کو گئے تو سب سے پہلے دربان نے عطائے تمغۂ مجیدی کی مبارک باد پیش کی، پاشائے موصوف نے بھی ملاقات کے ساتھ ہی مبارک باد دی ـــــ تمغہ سامنے میز پر رکھا تھا، بکس سے نکال کر پہلے آنکھوں سے لگایا، پھر مولانا کے حوالہ کیا اور ایک فرمانِ سلطانی بھی اسی کے ساتھ عنایت کیا، رخصت کے وقت پاشائے ممدوح نے اپنی عکسی تصویر بھی مرحمت کی۔ (۲۷)

اقبال سہیل خاں نے اسے علی گڑھ کے اکتسابات میں شمار کیا ہے اور بتایا کہ علامہ نے یہ سفر تفریح کے لئے نہیں بلکہ ممالک اسلامیہ کے کوائف کا بچشم خود جائزہ لینے کے لئے کیا تھا۔ اس کے علاوہ کتب خانۂ اسکندریہ اور الجزیہ جیسے مقالات کی تحریر بھی سرزمین علی گڑھ پر ہی کی گئی۔ اسے اہل علم نے ایک اہم علمی اور ملی خدمت قرار دیا۔ سیرۃ النعمان، المامون اور الفاروق جیسی گراں قدر فتوحات اسی سرزمین پر منصۂ شہود پر آئیں۔ علامہ کی انہی علمی جلوہ افروزیوں کے سبب تمغۂ مجیدی کے بعد انھیں حکومت برطانیہ نے ''شمس العلماء'' کے خطاب سے نوازا اور یہ خطاب مصلحتاً دیا گیا تاکہ تمغۂ مجیدی کی شہرت نہ ہوسکے۔ علامہ خلیفۃ المسلمین کے اس اعزاز کو پبلک میں پیش کرنا چاہتے تھے لیکن مقامی ذمہ داران حکومت نے اس کی اجازت دینے سے انکار کیا۔ (۲۸)

بہرکیف علی گڑھ میں علامہ کو ''شمس العلماء'' کا خطاب دیئے جانے پر تہنیت پیش کرنے کے لئے ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا اقبال سہیل نے اپنے مخصوص انداز میں یوں روداد محفل قلم بند کی ہے۔ ''چنانچہ ۱۹/جنوری ۱۸۹۴ء کو کالج کی دو علمی مجلسوں یعنی ''انجمن اخوان الصفا'' اور ''لجنۃ الادب'' کی طرف سے مولانا کو مبارک باد دینے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں کالج کے تمام سربرآوردہ اشخاص مثلاً سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولوی سید کرامت حسین جو اس وقت قانون کے پروفیسر تھے، مجلس اخوان الصفا کے رکن اور لجنۃ الادب کے صدر تھے اور بعد کو جج ہائی کورٹ الہ آباد ہوکر وفات پائی، مسٹر بک پرنسپل، پروفیسر آرنلڈ رکن اخوان الصفا، اور نواب سرمزمل اللہ خاں بہادر

وغیرہ شریک ہوئے، حاضرین نے بالاتفاق نواب محسن الملک مرحوم کو اس جلسہ کا صدر منتخب کیا اور سچ تو یہ ہے کہ اس جلسہ کے صدارت کے لئے اس سے بہتر انتخاب ہونا ممکن بھی نہ تھا، دنیاوی وجاہت کے علاوہ نواب صاحب مرحوم علوم عربیہ کے مستند عالم، وسیع النظر مصنف، نکتہ سنج ادیب اور جادو بیان خطیب تھے، مخالف ماحول ان کی حق طلبی وحق پسندی میں سنگ راہ نہ ہو سکتا تھا اور بڑی سے بڑی شخصیت ان کو حق گوئی سے روک نہ سکتی تھی اور کمال یہ تھا کہ وہ حق کی تلخی کو بھی اپنے پیرائے بیان کی حلاوت سے شیریں بنا سکتے تھے، اس جلسہ میں نواب صاحب نے بحیثیت صدر حسب ذیل افتتاحی تقریر فرمائی، تقریر کا ہے کو ہے، صداقت، خلوص اور اعتراف کمال کا ایک دریا ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر موجیں مار رہا ہے اور دل ہی کے سمندر میں جا کر گر رہا ہے۔" (۲۹)

مذکورہ بالا اسلوب سے واضح ہے کہ اس پر وقار تہنیتی نشست کے صدر نواب محسن الملک تھے جن کی صدارتی تقریر انتہائی جذباتی اور عقیدت مندانہ تھی جو مسرت آمیز جذبات وحقائق سے معمور تھی۔ اس میں علامہ کی علمی، ادبی اور ملی خدمات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ انھوں نے ادارۂ سرسید اور ملت اسلامیہ ہند کو کن کن خلعتوں اور سرفرازیوں سے ہم کنار کیا، نواب صاحب نے انھیں بھی اپنے جذبات کا حصہ بنایا ہے۔ طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے علامہ کی معلمانہ عظمت کو بڑے حسین طرز میں بیان کیا ہے۔ اس پر مغز عقیدت وحقیقت پسندانہ خطاب کی آخری سطور انشراح قلب کے لئے پیش کی جارہی ہیں:

"اے میرے عزیزو! اور اے میرے مدرسۃ العلوم کے طالب علمو! تم نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاذ تم کو ملے ہیں اور آفتاب کی روشنی تم کو پہنچتی ہے، تم اس زمانے کو غنیمت سمجھو جب تم کالج میں ہو اور ایسے استادوں کی تعلیم وصحبت سے فائدہ اٹھا رہے ہو اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور اپنے استاد کے قدم بقدم چلنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھو، تمہارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود ہے، تمہارے دلوں کو منور کرنے کے لئے ایک آفتاب روشن ہے، تم ایسا وقت ہاتھوں سے نہ جانے دو اپنے استاذ کے خصائل اور صفات سیکھنے اور علم حاصل کرنے اور پھر اسے کام میں لانے کی کوشش کرو تا کہ ہم اپنی قوم میں صرف ایک آفتاب کو دیکھیں بلکہ ہمارے چاروں طرف سینکڑوں چاند ستارے نظر پڑیں، خدا کرے ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہے، اور اس کا سایہ تم پر پڑے۔" (۳۰)

اس تہنیتی جلسہ میں عربی، فارسی اور اردو میں کئی تقاریر اور نظمیں پیش کی گئیں یہ درحقیقت علامہ کی جلیل القدر شخصیت اور آپ کے حقیقی عزو وقار کو منظرِ عام پر لانے کی ایک مستحسن کوشش تھی۔ مناسب ہوگا کہ کچھ ان محاسن ومحامد کے تراشے آپ کے حضور سجا دیئے جائیں۔ جناب ولایت اللہ صاحب کی نظم کے چند آخری اشعار مندرجہ ہیں:

"فخر کرتا ہے جن پر علی گڑھ کالج — بلکہ یوں کہئے کہ ہے ہند بھی جن پر نازاں
مصر اور شام خجل ہیں عربی سن کے اگر — فلسفہ دیکھ کے شرمندہ ہے ملک یوناں
فارسی کی جو بھنک کان میں پڑ جائے کبھی — پھر کبھی نام نہ لے شرم سے اپنا ایراں
تم کو شمس العلماء یہ مبارک ہو خطاب — جب تلک شمس رہے اوج سماء پر رخشاں
پس دعا ہے یہ ولایت کی ہمیشہ یا رب — یہ لقب پھولے پھلے آپ کے زیرِ داماں
سبز و شاداب یہ جب تک کہ رہے باغ علوم — شمس کی طرح رہیں آپ بھی سر پر تاباں"
(۳۱)

مولانا حمید الدین فراہی نے بھی اپنے استاذ محترم کے مقام ومنزلت کی تقدیم کے لئے ایک عربی قصیدہ منظوم کیا۔ اس میں علامہ کی علمی کارفرمائیوں کے ساتھ شخصی وجاہت کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ صرف دو شعر پیش کرنا چاہوں گا:

ان كان تلك الشمس شمس سمائها — فلصرت شمس العلم والعلماء
اذ أنت شمس والعلوم سماء كم — فالشمس شمسى والسماء سمائى
(۳۲)

مولانا الطاف حسین حالی نے بھی ایک عربی قصیدہ (۳۳) پیش کیا جس کے چار اشعار ملاحظہ ہوں:

انت طهرت ذيل دين مبين — لوثته اللئام بالتدليس
فتقلدت والتزمت لزوما — خدمة المسلمين بالتدليس
تمت بالدرس و الدراسة فيهم — فارغا عن رياسة و رئيس
وجعلت الكمال غاء بينهم — واتخذت الكتاب خير جليس (۳٤)

معروف عالم، صحافی اور ملت اسلامیہ کے نبض شناس شاعر ظفر علی خان نے بھی علامہ کے لئے فارسی زبان میں تہنیتی کلمات پیش کئے۔ اس نظم میں بھی علامہ کی علمی شوکت وصولت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہاں صرف تین اشعار قارئین کی نذر کئے جائیں گے:

نہ یارائے ثنائے تو قلم رانے زبانم را — قطار عالماں انجم میانش شمس تابان

زمین شعر از فضیلت پیہر از گلہائے گوناگوں — سخن را دادۂ سرمایہ اے بحر سخندانی

چشم زخم دوران در سلامت باشی وایمن — معین و یاور و ناصر ترا تائید ربانی

(۳۵)

علی گڑھ کالج کے حوالے سے بھی اقبال سہیل نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ بڑی شخصیات بالخصوص محسنین ادارہ کی جب کالج میں آمد ہوئی تو ان کے سامنے کالج کے اغراض و مقاصد کو بزبان فارسی منظوم صورت میں پیش کرنے اور ان سے ادارہ کے تئیں اعانت و اعتناء کے لئے درخواست گزار ہوتے۔ ان نظموں کے تعلق سے سیرت شبلی میں لکھتے ہوئے اور یہ نکتہ بالخصوص ابھارا گیا ہے کہ مولانا نے اپنی خودی کا ہمیشہ پاس ولحاظ کیا، کبھی خود کو محکوم و مفلوک بتا کر پیش نہ کیا۔ کالج میں آنے والے رؤسا ونوابین کے حضور صرف کالج کے مسائل کو پیش کیا۔ خود کبھی ان کے سامنے کشکول بدست نہیں ہوئے قصیدہ خوانی ان کے مزاج کا حصہ تھی ہی نہیں وہ ایک ملی شاعر تھے۔ اسی طرح یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے کسی انگریز مہمان کی آمد پر کوئی نظم منظوم نہیں کی کیونکہ وہ ان کے نزدیک غاصب تھے اور سرسید ان غاصبین کے ساتھ وفاداری کی بات کرتے۔ سرسید کا یہ موقف علامہ کے لئے باعث نکیر رہا۔ (۳۶)
سرسید کی ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے بھی علامہ نے کئی نظمیں لکھیں اور اس کے تعلیمی اغراض کے اشتہار میں ہمیشہ فعال رہے۔ اقبال سہیل نے علامہ کی ان خدمات کا بڑے واضح انداز میں ذکر نہیں کیا ہے۔ علامہ نے کالج میں درس قرآن کریم کا بھی آغاز کیا تھا جس کا طلبہ پر خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

علامہ کی دوسری قابل ذکر خدمت یہ رہی کہ کالج میں جلسہ سیرۃ النبی کا آغاز کیا یہ مبارک سلسلہ آج تک تزک واحتشام سے منایا جارہا ہے اور اس کی وجہ سے سیرت پاک کے بہت سے مطالبات کے تئیں خوشگوار کارروائیاں انجام پذیر ہوئی ہیں۔ افسوس کہ موجودہ انتظامیہ نے سیرت النبی کے تقدس کا

پاس ولحاظ نہ کیا اور پانچ سالوں میں اس کا بجٹ کم کرتے گئے لیکن آفریں صد آفریں اساتذۂ کرام او
طلبہ ہیں کہ جنھوں نے سیرت النبی کی لو مدھم نہ ہونے دیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے پہلو رہے
ہیں جن کو قابل اعتنا قرار نہ دیا گیا۔ اسی طرح ''بدء الاسلام'' رسالہ کے سلسلے میں بھی اقبال سہیل کی مکمل
خاموشی ہے۔ اسے سرسید نے علامہ سے طلبہ کے لئے تیار کرایا تھا جسے بعد میں مولانا فراہی نے فارسی
زبان میں منتقل کیا اور اب یہ اردو میں بھی موجود ہے۔ (۳۷) یہی وہ رسالہ ہے جہاں سے علامہ کی
سیرت پیغمبر خاتم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اقبال سہیل نے علامہ کے متعلق یہ بھی تحریر کیا ہے کہ قادیانیوں اور شیعوں کی تکفیر میں علامہ نے
عام علماء کرام کی رائے سے کبھی اتفاق نہیں کیا۔ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں قادیانیوں کے ساتھ
نکاح کا مسئلہ موضوع بحث آیا تو وہاں انھیں دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا گیا۔ اس تحریک میں مولانا
حبیب الرحمٰن خاں بھی شامل تھے۔ آپ کی شمولیت علامہ کے لئے باعث اذیت ثابت ہوئی۔ (۳۸)
اپنی اس تحریر میں اقبال سہیل نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''خواجہ (خواجہ غلام الثقلین) صاحب کی ممانعت تو
مختلف وجوہ سے حق بجانب کہی جاسکتی ہے، ظاہر ہے کہ الفاروق کا مصنف اس جماعت میں جس کے
رکن خواجہ صاحب تھے۔ کس نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ مولانا مرحوم نے غازی اورنگ
زیبؒ اور شہنشاہ جہاں گیر کے متعلق مجتہدانہ مقالات لکھ کر شیعہ مؤرخین کی صدیوں کی کمائی رائگاں
کردی تھی۔ (۳۹)

یہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ اقبال سہیل خاں ایک مرتبہ اسمبلی الیکشن میں امیدوار بنے تو
آپ کے بالمقابل امیدوار کا تعلق برادران اہل تشیع سے تھا۔ انتخابی مہم میں اقبال سہیل نے اپنے حریف کو
شکست دینے کے لئے متعدد نظمیں کہیں جو حوادث روزگار کی نذر ہوئیں۔ اگر یہ صفحہ قرطاس کی زینت
بنتیں تو آج اسے مزاحمتی ادب یا معارک ادبیہ میں ضرور ایک نمایاں مقام حاصل ہوتا۔ اس تناظر میں
اقبال کا شعر ذو معانی حیثیت کا حامل ہے۔ اقبال سہیل دراصل ''قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے'' کے
نقطۂ نظر کے کلیتاً مخالف تھے کیونکہ اس کا تعلق تاریخ اسلام کے حقائق سے بہت کم ہے۔ چونکہ یہ شاعری
درحقیقت مسلک کی ترجمانی ہے۔ خاں صاحب نے اپنے موقف کو اس انداز میں منظوم کیا ہے۔
سیرت شبلی میں، تین مضامین شبلی کی جامعیت، داستان تاریخ اردو اور علامہ شبلی کے مکاتیب

شامل ہیں۔ مقالہ ''شبلی کی جامعیت'' گو کہ تاثراتی ہے لیکن ان تاثرات میں شبلی کی ہمہ جہتی اور ہمہ دانی کی بھرپور نمائندگی کی گئی ہے۔ اگر جائزہ لیا جائے تو شبلی کی بوقلموں شخصیت سے متعلق ''تاثراتی تفسیریں'' دیگر عام تحریروں پر فوقیت کی حامل ہیں۔ ایک تو یہی اقبال سہیل کی شبلی کی جامعیت اور دوسرے مولانا دریابادی کا خراج عقیدت ''شبلی، انسان، مصنف، مصنف گر'' جو معارف میں شائع ہوا ہے۔(۴۰) اور تیسرے راقم الحروف کی ایک خامہ فرسائی ''شبلی کی دانشوری'' (۴۱) کو بھی اگر مناسب سمجھیں تو اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ خاں صاحب کے مقالے سے دو اقتباس یہاں نقل کیے جا رہے ہیں تا کہ مضمون کے تیور اور خاں صاحب کی داخلی کوائف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''اور عرفان نفس کی پہلی منزل اپنی کوتاہیوں کا اقرار ہے، اس کے علاوہ علامہ شبلی کی پایہ شناسی اور ان کے کمالات کا احساس بجائے خود ایک اتنی بڑی سعادت ہے جو عصر حاضر کے بڑے سے بڑے مدعی کمال کے لئے موجب شرف ہو سکتی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو اتنی بڑی بصیرت عطا کی ہے کہ علامہ شبلی کا مرتبہ کسی قدر سمجھ سکتا ہوں اور اس خاک آستان کے فیض نے آنکھیں اتنی کھول دی ہے کہ آج کے موضوع بحث کی اہمیت کا کافی احساس رکھتا ہوں، سورج کی حرارت اور روشنی سے اپنا بازار گرم اور اپنا نام روشن کر لینا تو بہت آسان ہے لیکن اس کی نظر سوز تابانیوں کا تحمل ہر نگاہ کا کام نہیں بعض نگاہیں تو اتنی کمزور ہوتی ہیں کہ مسلسل روشنی سے گھبرا کر تاریکی کے دامن میں پناہ لینا چاہتی ہیں، میرے لئے یہی شرط کیا کم ہے کہ استاذ مرحوم کے جہاں تاب فیضان کمال کا احساس اب تک باقی ہے اور جاں نواز جلوؤں سے ہنوز سیری نہیں ہوتی۔'' (۴۲)

اس مضمون کا دوسرا اقتباس قارئین کے حضور اس لئے حاضر کیا جا رہا ہے کہ اس مقالہ کو عبارت آرائی پر محمول نہ کیا جائے۔ علامہ کی مختلف الجہات شخصیت جس کی نظر میں ہوگی اسے اس عبارت آرائی میں لطف و لذت کا احساس ہوگا۔ چونکہ اس کے ایک ایک جملہ میں مولانا کے محاسن کو قید کرنے کی ایک کامیاب کاوش ہے۔ اس اقتباس سے یہ بھی مترشح ہے کہ خاں صاحب کے استحضار میں ذخیرۂ الفاظ کی دنیا معمور ہے اور استعمال مفردات کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''حد سے زیادہ خوددار بھی اور غیر معمولی طور پر متوازن اور خاکسار بھی اظہار حق میں بے باک بھی اور انداز بیان میں محتاط بھی، اپنے عقائد میں متشدد بھی اور دوسروں کے ساتھ وسیع المشرب بھی، جمالیات کے نکتہ شناس بھی اور مدعیانہ تقویٰ سے زیادہ پاک باز بھی، خم خانہ کہن کے ساقی بھی اور بادۂ نو کے جرعہ کش بھی، اکابر اسلاف کے رتبہ شناس بھی اور کورانہ تقلید سے بیزار بھی، اسرار شریعت کا پردہ کشا بھی اور معالات دنیاوی کا نباض بھی اور جس کا قلم ہر رقص اور جس کی زبان ہر جنبش ایک مستقل نغمۂ رنگیں ہو مگر جس کا تقویٰ بزم چنگ و رباب تو کیا مجلس حال وقال تک جانے کی اجازت نہ دے۔'' (۴۳)

''داستان تاریخ اردو اور ''یوپی کے مشرقی اضلاع کے کچھ اہل قلم'' دراصل نواب نصیر حسین خاں خیال کی تالیف ہے۔ اس پر خاں صاحب نے تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ اس بات کا غماز ہے کہ آپ کا مطالعہ انتہائی وسیع اور گہرا ہے۔ اس پوری کتاب سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ماٰخذ و مصادر پر آپ کی گرفت مضبوط تھی۔ اسلامیات اور ادبیات کا ایک وقیع حصہ ان کی یادداشت میں مدون ہو چکا تھا۔ اسی تدوین کی جلوہ آرائیاں جگہ جگہ اس کتاب میں نظر آئیں گی۔ اسی وسعت مطالعہ کی بنیاد پر انھوں نے بہت سی ایسی شخصیات اور بہت سی ایسی تصانیف کی رہنمائی کی ہے جس کی بنیاد پر اردو زبان وادب نے چلنا سیکھا ہے اور چل کر درجۂ اعتبار و استناد حاصل کیا ہے۔ اردو والوں کی یہ ایک عام بیماری ہے کہ وہ اسلامیات سے متعلق لٹریچر کو نا قابل اعتناء تصور کرتے ہیں خواہ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ تصانیف سدرۃ المنتہیٰ ہی پر کیوں نہ فائز ہوں۔ مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن، مولانا مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن، ماہر القادری کی در یتیم، سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس، مولانا وحید الدین خاں کی علم جدید کا چیلنج، مولانا امین احسن اصلاحی کی تزکیہ نفس اور مولانا عنایت اللہ سبحانی کی جلوۂ فاراں اور محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثالیں اردو کے اہل نثر پیش کرنے پر قادر ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام پسند مصنفین کی تحریروں نے ہی اردو کو علمی طرز عطا کیا ہے۔ اقبال سہیل نے اپنے اس تبصرے میں بہت سے ایسے گوشوں کی نشان دہی کی ہے جن کی طرف مؤلف کی نگہ التفات نہ جا سکی۔ ان کے نزدیک مولانا سخاوت کے رسالہ ''تقویٰ'' مولانا کرامت علی کی ''مفتاح الجنۃ'' مولانا لطف اللہ

کی تفسیر فاتحہ ''مظہر العجائب'' مولانا عنایت رسول کی ''بشریٰ'' کا ذکر نہ کرنا باعث حیرت ہے۔ اور مولانا ابوالفضل احسان اللہ عباسی ایک بہترین مترجم اور اردو کے محسن تھے انھیں لائق توجہ نہ قرار دینا باعث تاسف ہے۔

خاں صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ مغربی اضلاع کی بہت سی اہم شخصیات بھی نظر انداز ہوگئی ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم، سید محفوظ علی نقاش بدایونی کا ذکر بھی اس تاریخ میں آنے سے رہا اودھ کے تعلق سے مولانا سید عبدالحی لکھنوی کو قابل ذکر تصور نہ کیا گیا نیز نواب صدیق حسن، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مصنف حسن البیان، نذیر حسین دہلوی، خلیفہ محمد حسین مصنف اعجاز التنزیل مولانا قاسم دیوبندی اور مولوی عبدالحق حقانی قابل تذکرہ تھے۔ اور مہدی حسن افادی الاقتصادی سے یہ بے خبری بھی باعث استعجاب ہے کہ یہ تاریخ اردو ان کے نام نامی سے خالی ہے۔ جن کی گل فشانیوں سے ''صدائے عام'' اور ''نقاد'' کے صفحات اب بھی گمگمار ہے ہیں۔ ان کے مجموعۂ مضامین ''افادیت مہدی'' اردو ادب کی پہچان نیز شبلی کے اکتسابات کی تشریح میں ایک دستاویز ہے۔ اقبال احمد خاں نے اپنے اس تبصرے میں اور بہت سے نکات ابھارے ہیں جن کی افادیت سے انکار ناممکن ہے اور زبان کی نفاست و نزہت تو اوج کمال پر ہے۔

بالعموم اقبال احمد سہیل خاں کو شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ شاعری میں ان کی انفرادیت و یکتائیت کا اصل راز ان کا نعتیہ کلام ہے۔ ان کے نعتیہ مضامین اور اس میں تراکیب و تعبیرات کی ابداعیت و خلاقیت کی مثال پوری نعتیہ شاعری میں ملنی مشکل ہے۔ اسی طرح ان کی نظموں میں جو بہاؤ اور رچاؤ ہے وہ بھی اپنے آپ میں تنہا ہے۔ ترقی پسند شعراء نے نظموں کے تعلق سے گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ ان ترقی پسند شعراء سے خاں صاحب کا موازنہ کیا جائے تو انھیں درجۂ امامت ضرور فائز کیا جائے گا لیکن افسوس کہ ناقدین نے ان کے شاعرانہ کمال سے اغماض برتا ہے۔ یہاں بتانا تو صرف یہ ہے کہ انھیں محض شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا جبکہ ان کی معرکہ آراء تصنیف ''ربا'' (۴۴) سے مترشح ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے محقق اور فقیہ بھی تھے لیکن علماء کرام کا تنگ فقہی دائرہ اسے کیونکر تسلیم کرے گا۔ اور اب ''سیرت شبلی'' کے منظر عام پر آنے کے بعد انھیں ایک اچھا نثر نگار بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس نثر میں سر سید اور شبلی دونوں کے واضح اثرات نمایاں ہیں۔ لیکن افسوس کہ خاں صاحب نے

پوری کتاب میں اپنی مادرِ علمی کے فیوض اور سرسید سے استفادے کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے جب کہ شبلی کی سحر اثر اوران سے اپنے تلمذ کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے۔ علامہ کے علمی محاسن اور خاندانی وجاہت کا طمطراق سے ذکر کیا ہے اور سرسید کو انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ادارۂ سرسید میں مشرقی اقدار اور مشرقی علوم کے ساتھ بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ خاں صاحب کے یہ دینی تاثرات ہیں جن کا بالعموم تقلید پسند علماء کرام اظہار کرتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے سیرت شبلی میں سرسید کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔

سیرت شبلی کا انحصار تین نکات پر ہے ایک تو علامہ کے نسبی احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ اور علی گڑھ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور تیسرے علامہ کی چند تصانیف، سیاسی آراء اوران کے سفرنامہ کی اہمیت کو منظرعام پر لانے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں تحقیقی جزء رسی تو نہیں ہے۔ لیکن مذکورہ تینوں مسائل پر ان کی براہ راست معلومات ہیں۔ خاں صاحب علامہ کی برادری کے تھے، علی گڑھ اور ارباب علی گڑھ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل سے برتا تھا اس لئے علی گڑھ کے باب میں ان کی معلومات اساسی مأخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں "حیات شبلی" میں مفقود ہیں کیونکہ سید صاحب نہ تو برادری کے تھے اور نہ ہی علی گڑھ کے فیض یافتہ، اس لئے یہ دونوں چیزیں سید صاحب کو حاصل نہیں تھیں، ان دونوں پہلوؤں سے سیرت شبلی کو اپنی عدم تکمیلیت کے باوجود حیات شبلی پر اولیت حاصل ہے۔ رہا شبلی سے تلمذ کا مسئلہ تو دونوں کو حاصل ہے لیکن سید صاحب کے تلمذ کا دائرہ وسیع وعمیق ہے۔ سرسید کے تئیں سیرت شبلی اور حیات شبلی دونوں میں غیر عادلانہ موقف اپنایا گیا ہے۔ اقبال سہیل نے تصانیف شبلی کا غائرانہ مطالعہ کیا تھا لیکن تصانیف سرسید کے باب میں ان کی معلومات مختصر اور محدود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ "شبلی کی جامعیت" میں شبلی کو ہو بہ ہو لا کھڑا کیا ہے گویا شبلی کی شخصی وعلمی پورٹریٹ کو اسٹیج پر سجا دیا ہے۔ سیرت شبلی اور حیات شبلی میں ایک بنیادی امتیاز یہ بھی ہے کہ اول الذکر میں انگریزی مأخذ سے بھی استفادہ ہے اور مؤخر الذکر میں انگریزی مصادر سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔

سیرت شبلی اور اس کے ساتھ تین مقالات کی ترتیب وطباعت پر خاکسار مرتب کے لئے تہنیتی کلمات پیش کرتا ہے کیونکہ یہ تمام علمی نوادر اوراق پارینہ بن چکے تھے۔ اس کی طباعت سے اقبال احمد خاں کی شخصیت کا ایک واضح روپ اور سامنے آیا ہے اس کے لئے ارباب علم وفضل مرتب و مصلح جناب

فضل الرحمٰن اصلاحی کے شکر گزار ہیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ صاحب ترتیب قدرے تخریج وتحقیق کا بھی بیڑا اٹھا لیتے۔ سیرت شبلی کے اسی فیصد مأخذ دار المصنفین، مدرسۃ الاصلاح اور جامعہ اسلامیہ مظفر پور کے کتب خانوں میں مل جاتے۔ سیرت شبلی میں کلیات شبلی سے جگہ جگہ اشعار نقل کئے گئے، مکاتیب شبلی کے دیئے گئے اقتباسات، سفر نامہ روم ومصر وشام پر اس میں طویل بحث ہے، علماء غازی پور کی تصانیف کا ذکر بار بار آیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی بہت سی چیزیں سیرت شبلی میں نقل کی گئی ہیں۔ یہ سب مأخذ بآسانی مل سکتے تھے۔ اس کے باوجود یہ عدم اعتنائی حیران کن ہے۔ علامہ شبلی کا عربی قصیدہ جو سر سید کی شان میں کہا گیا تھا وہ گزٹ میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا ضروری تھا کہ اس کا حوالہ دیا جاتا۔ مولانا حالی کے بہت سے اشعار اور حیات جاوید کے خیالات کی تخریج دشوار نہیں تھی۔ اقبال سہیل نے بہت سے اشعار واقتباس شعراء اور مصنفین کے نام کے ساتھ ذکر کئے ہیں اس کے باوجود ان کی تخریجات پر توجہ نہیں برتی گئی۔ مثلاً صفحہ ۴۹، ۵۰ پر علامہ شبلی کے باب میں حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ایک اقتباس انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ سے لیا گیا ہے تو کیا اس کا حوالہ دینا دشوار ہے؟ علامہ کو شمس العماء کا خطاب ملنے پر مولانا ظفر علی خاں نے فارسی میں اور حالی نے عربی میں جو تہنیتی قصائد پیش کئے تھے اس کا حوالہ دینا بس سے باہر تھا؟ پروفیسر مختار الدین احمد نے حالی کے ایک عربی قصیدہ کو فکر ونظر علی گڑھ میں ترتیب دیا ہے اور پروفیسر سلیمان اشرف نے الطاف حسین حالی کی عربی شاعری پر ایک کتاب ''حالی والادب العربی'' کے عنوان سے تصنیف کی ہے۔ صفحہ سات پر مولانا آزاد بلگرامی کی معروف فارسی تذکرہ ''مآثر الکرام'' سے ایک اقتباس ہے جس کا حوالہ بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مرتب کتاب نے ان بکھیڑوں سے اپنے کو آزاد رکھا۔

سیرت شبلی تذکرہ کے ساتھ ساتھ اردو کی ایک شاہ کار تصنیف بھی ہے۔ اس میں جگہ جگہ مختلف شخصیات پر تبصرے ہیں۔ مثلاً مسٹر آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کے سبب تالیف کے متعلق بتایا گیا کہ مصنف کی یہ خواہش تھی کہ ملت اسلامیہ ہند کے اندر سے جذبہ جہاد فنا ہو جائے۔ ڈپٹی نذیر کے متعلق خاں صاحب کا خیال ہے کہ ''ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی بنات النعش اور مرأۃ العروس اپنی جگہ بے مثال کتابیں ہیں لیکن یہی جب چاوڑی بازار کے محاورے، ترجمہ قرآن پاک اور امہات الامت میں بھی برتے جاتے ہیں تو ذوق سامعہ پر گراں گزرتے ہیں'' (۴۶) ایک جگہ مولانا آزاد پر بڑا برمحل تبصرہ کیا

ہے۔ لکھتے ہیں: ''آزاد کا زور قلم صرف رنگین بیانی تک محدود ہے اور مولانا کا انداز بیان سلاست کے سوا بقیہ محاسن ادب سے عاری ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کی نثر تو وہ سہرا ہے جس کے متعلق ذوق صاحب فرماتے ہیں۔ (۴۷)

ایک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے، لے لے کے جو گوہر سہرا

علامہ شبلی کی ''ظہور قدسی'' سے متعلق تحریر کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''میلاد مبارک پر اردو زبان میں ایک دفتر بے پایاں موجود ہے، مگر کیا ظہور قدسی کا ایک صفحہ ان سب پر بھاری نہیں ہے، سیرت کے آغاز میں ایک سطر اردو ادب و انشاء کے لئے ہمیشہ سرمایہ ناز رہے گی اور بڑے سے بڑا ادیب بھی شاید مدۃ العمر میں ایک فقرہ بھی اتنا بلند، اتنا لطیف اور اتنا موثر لکھ سکے۔ سنئے اور سر دھنئے (۴۸)

''ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے۔ (۴۹)
''زچشم آستیں بر دار و گوہر را تماشا کن''

اس طرح کی قیمتی آراء اور انتقادات بلیغ سیرت شبلی میں بکھرے ہوئے ہیں، خاں صاحب چونکہ عربی، اردو اور فارسی زبانوں کے رموز سے واقف تھے اور اسلامیات کا رچاؤ ان کی شخصیت کا امتیاز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت شبلی تذکرہ کے ساتھ مجموعۂ نوادرات اور شاہ کلید بھی ہے۔ علی گڑھ کے تین ایسے ستون ہیں جن کی وجہ سے روایات علی گڑھ کا فروغ ہوا۔ مرحوم صدر ہند ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی اور اقبال سہیل کی شخصیات اور تصنیفات دونوں سے حسن علی گڑھ بہتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اقبال سہیل اپنے دونوں دوستوں سے فرزانگی میں کہیں آگے تھے۔ صرف ان کی غیر مرتب زندگی نے ان کے ملکہ علم وفن کو زنگ آلود کر دیا۔ علی گڑھ میں ذاکر حسین کی تقاریر وہی لکھا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب نے ان کے فہم و فراست کی تفسیر یوں بیان کی ہے۔ ''شعر و سخن سے قطع نظر ان جیسا ذہین شخص اب تک دیکھنے میں نہ آیا'' (۵۰) رشید احمد صدیقی نے ''آشفتہ بیانی میری'' میں تحریر کیا ہے کہ مولانا حمید الدین فراہی جیسا عربی داں اور اقبال سہیل جیسا فارسی داں میری آنکھوں نے نہیں دیکھا، (۵۱) اسی طرح سید صاحب نے بھی خاں صاحب کی رعنائی تحریر کو سراہا ہے۔ (۵۲) افسوس کہ خاں صاحب اپنی غیر منظم

ایامِ حیات اور شوق فضولیات کے سبب اپنی گراں قدر خدمت ''سیرت شبلی'' کو غایت اخیر تک نہ لے جاسکے۔ اگر یہ مرتب ہوجاتی تو تذکروں کی تاریخ اور شبلی کی علمی زندگی کی تشہیر میں ایک نئے سنگ میل کی بنا پڑتی۔ اقبال سہیل خاں دبستان سرسید اور دبستان شبلی کے سرمدی ہیرہ ہیں۔ (۵۳)

حواشی

(۱) سیرت شبلی۔ علامہ اقبال احمد خاں سہیل (تصحیح و ترتیب، فضل الرحمٰن اصلاحی) طبع اول، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، نومبر (۲۰۱۴، ص:۱۰۵ (۲) ایضاً، ص:۱۰۵

(۳) وضاحت کے لئے دیکھئے: تفسیر نظام القرآن، حمیدالدین فراہی، (ترجمہ از امین احسن اصلاحی) دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء، ص ۱۲

(۴) وضاحت کے لئے دیکھئے: سیرت شبلی، ص:۱۰۹-۱۰۵

(۵) وضاحت کے لئے دیکھئے: مقالات شبلی (ادبی) معارف پریس اعظم گڑھ طبع پنجم ۱۹۶۴ء، ۲/۶۶-۵۷

(۶) سیرت شبلی، ص:۱۹ (۷) ایضاً، ص:۳۰-۲۹ (۸) ایضاً، ص:۳۰

(۹) ایضاً، ص:۱۵۶ (۱۰) ایضاً، ص:۱۵۷ (۱۱) ایضاً، ص:۱۵۷

(۱۲) غزلیاتِ شبلی، شبلی نعمانی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۴

(۱۳) سیرت شبلی، ص:۱۵۹-۱۵۸۔ (۱۴) (۱۴) سیرت شبلی، ص ۱۶۱

(۱۵) وضاحت کے لئے: سیرت شبلی، ص:۱۶۲-۱۶۰

(۱۶) سیرت شبلی، ص:۱۶۱-۱۶۰۔ (۴۴) (۱۷) ایضاً، ص:۱۶۲-۱۶۰

(۱۸) کلیات شبلی (مرتبہ، مولانا سید سلیمان ندوی) مطبع معارف، اعظم گڑھ، طبع ششم، ۱۴۰۷ء، ص ۹۴

(۱۹) وضاحت کے لئے دیکھئے: سیرت شبلی، ص:۳۳-۳۱ (۲۰) سیرت شبلی، ص:۴۱

(۲۱) ایضاً، ص:۴۴-۴۳ (۲۲) ایضاً، ص:۴۸، ۴۷ (۲۳) ایضاً، ص:۴۸

(۲۴) ایضاً، ص:۴۴۱ (۲۵) وضاحت کے لئے دیکھئے: سیرت شبلی، ص۵۰-۴۹

(۲۶) وضاحت کے لئے دیکھئے: سیرت شبلی، ص:۵۱، ۴۸

(۲۷) ایضاً، ص:۸۱ (۲۸) ایضاً، ص:۸۲، ۸۱ (۲۹) ایضاً، ص:۸۷

(۳۷) سیرت شبلی ،ص:۸۹ (۳۸) سیرت شبلی ،ص:۱۵۳ (۳۹) ایضاً،ص:۱۵۵

(۴۰) وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۶۵ء، ۳/۹۵ ،ص۱۲۲-۱۲۰۔اسی مضمون کے لئے دیکھئے: العلم ،کراچی ،اپریل -جون ۱۹۶۵ ،۲/۱۴، ص،۷۷-۶۶،اسی مضمون کے لئے مزید دیکھئے: کریسنٹ (شبلی نمبر) لاہور ،جنوری ۱۹۷۱ء ص۳۸-۴۴

(۴۱) مطالعہ شبلی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، ادارۂ قرطاس، کراچی، طبع اول، جنوری، ۲۰۱۷ء، س۲۶۴-۲۶۰

(۴۲) سیرت شبلی ،ص:۱۲۶ ،۱۲۵ (۴۳) ایضاً،ص:۱۲۹ (۴۴) ایضاً،ص۱۲۹

(۴۵) ''حقیقۃ الرباء'' کو''ماہوالرباء'' کے عنوان سے عربی میں منتقل کردیا گیا ہے۔ دیکھئے: ماہوالرباء للعلامہ اقبال احمد خان، (ترجمہ وتحقیق: ظفرالاسلام خان) الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۹ء فراز میڈیا اینڈ پبلشنگ، پوسٹ بکس ۹۷۰۱ ،ڈی ،۸۴، ابوالفضل اینکلیو، جامعہ نگر، نیودہلی ،۱۱۰۰۲۰، انڈیا،صفحات ،۱۹۵، یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اسے انگریزی میں بھی منتقل کردیا گیا ہے ،اسے بھی مذکورہ پتہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(۴۶) حالی والادب العربی، حالی کی عربی تحریروں اور قصائد کو جمع کیا گیا ہے (دیکھئے حالی والادب العربی، البروفیسور محمد سلیمان اشرف، کوخ العلم، دہلی ،صفحات ۱۲۸

(۴۷) سیرت شبلی ،ص ۱۲۹۔ (۴۸) ایضاً،ص ۱۳۴۔ (۴۹) ایضاً،۱۳۶۔

(۵۰) سیرۃ النبی۔علامہ شبلی نعمانی، مطبع معارف، ۱۳۹۴ھ-۱۹۷۴ء، طبع ہشتم ،۱/۱۷۱-۱۷۰

(۵۱) اقبال سہیل کا فن: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی ،س،۹۰۔

(۵۲) آشفتہ بیانی میری، رشید احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ، دہلی

(۵۳) وضاحت کے لئے دیکھئے: حیات شبلی ،ص،۴۰۶۔

☆☆☆

اقبال سہیل بنام اقبالؔ

شمیم طارق☆

اقبال ہماری زبان کے وہ بلند اقبال شاعر ہیں جنھوں نے آنے والے زمانوں کی صورت گری میں ارتباط لفظ و معنی کے ذریعے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ وقت کے ساتھ ان کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا انکار ممکن نہیں ہے۔ گردش لیل و نہار اور انسان کے بدلتے ہوئے مذاق کے باوجود ان کا کلام سن کر ہر شخص یہی کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

کلام اقبال کی اس خوبی سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جس نے بھی اس رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی وہ اپنا رنگ بھی برقرار نہ رکھ سکا۔ سب سے بڑی مثال کیفی اعظمی کی تخلیق ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہے۔ مگر کم از کم ایک شاعر کی ایک نظم جو نہ صرف کلام اقبال کے رنگ میں ہے بلکہ اسی زمین اور ردیف و قافیہ میں اقبال کے کلام کا جواب ہے فکر اور فن دونوں لحاظ سے کلام اقبال سے کسی طرح بھی کم تر یا غیر موثر نہیں ہے۔ بظاہر یہ جملہ چھوٹے منہ بڑی بات کے مصداق ہے۔ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے راقم الحروف پر ایک قسم کا خوف طاری ہے۔ سننے والے بھی اس جملے کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے مگر اس جملے کو رد یا مسترد کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل میں جانے سے پہلے ایک سوال پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اقبال کی کسی شعری تخلیق کی معنویت یا معقولیت سے انکار ممکن نہیں؟ اور کیا اقبال نے جس کے بارے میں جو رائے دی اس پر وہ ہمیشہ قائم رہے؟ جواب ہے نہیں۔ اقبال کی ترجیعات و تنقیدات پر مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا

☆فلیٹ نمبر ۲۷، چوتھا منزلہ، مرزبان مینشن، بائیکلہ فروٹ مارکیٹ، بائیکلہ۔ ممبئی ۲۷

کیا جارہا ہے۔ پہلی مثال یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے ناگپور اجلاس میں مسٹر جناح نے مہاتما گاندھی کے نان کوآپریشن والے ریزولیوشن کی مخالفت کی تو ہر طرف سے شیم شیم کی آواز بلند ہوئی جس کے بعد انھوں نے کانگریس ہی نہیں ملک بھی چھوڑ دیا۔ سات آٹھ مہینہ بعد اکتوبر ۱۹۲۱ء میں واپس آئے تو ممبئی میں اعلان کیا کہ مسلم لیگ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے جب یہ اعلان پڑھا تو برہم ہوئے اور ایک قطعہ کہا جو روزنامہ زمیندار کے ۹ر نومبر ۱۹۲۱ء کے شمارے میں شائع ہوا:

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر ... اترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی بتا ہمیں ... اے جانِ برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیال دشت و بیاباں نکال دے ... مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب ... اس دین میں ہے ترکِ سوادِ حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظر مارسیدہ ہست ... یعنی حجاب غیرت کبریٰ دریدہ ہست

اسی طرح اپنی مثنوی ''اسرار خودی'' (۱۹۱۶ء) میں اقبال نے خواجہ حافظ شیرازی پر جو سخت تنقید کی تھی اس پر کچھ عرصہ تو وہ مصر رہے لیکن پھر وہ اشعار حذف کردیے۔ اس سلسلے میں ''نظام المشائخ'' دلّی اور ''وکیل'' امرتسر میں خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے مضامین سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ حافظ شیرازی اور مسٹر جناح کی مخالفت میں کہے ہوئے اشعار اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح کی کچھ اور مثالیں بھی ہیں لیکن مولانا حسین احمد مدنی کے خلاف اقبال کے تین شعر کلیات اقبال سے حذف نہیں کیے گئے ہیں حالانکہ اقبال مولانا مدنی سے اپنی غلطی کا اعتراف کرچکے تھے۔ اس معاملے کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں کسی سیاسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا حسین احمد مدنی نے کہہ دیا تھا کہ ''آج کل اقوام وطن سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں۔'' ایک اخبار نے قوم کی جگہ ملت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے لکھا کہ ''رات کے جلسے میں مولانا مدنی نے کہا کہ ملتیں وطن سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں''۔ اقبال ''وطن سے محبت'' یا ناموس وطن کے لیے جان تک قربان کردینے کے جذبے کے مخالف نہیں تھے۔ نیا شوالہ، ہمالہ، تصویر درد اور ترانۂ ہندی جیسی نظموں میں ان کا جذبۂ حب وطن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ''شعاع امید'' کا یہ شعر بھی ہندوستان سے ان کی محبت کا آئینہ دار ہے:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضاء کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب

جس وطنیت کے وہ مخالف تھے یا جس وطنیت کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

☆

رہ بحر میں آزادِ وطن صورت ماہی — ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی — ہے ترکِ وطن سنت محبوب الٰہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

☆

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس سے مراد وہ سیاسی تصور ہے جس میں اتحاد انسانی پارہ پارہ ہوتا اور مذہب شخصی عقیدہ بن کر رہ جاتا ہے اس لیے انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی سے منسوب بیان پڑھا تو طیش میں تین شعر کہہ دیے

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمد عربیؐ است
بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

مولانا مدنی کی نظر سے جب اقبال کے اشعار گذرے تو انھوں نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ وضاحت کردی کہ میں نے وطن سے قوم کو نسبت دی تھی ملت کو نہیں۔ اقبال سہیل نے اقبال کے تین شعر کے جواب میں ۲۰ شعر کی ایک نظم کہی جو علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے علاوہ کئی دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوئی۔

معاندے کہ بہ شیخ الحدیث خردہ گرفت — سبک ز چشم خرد زیں سباب بے سببی است
بیان او ہمہ تخئیل و بحث در تفسیر — زبان او عجمی و کلام در عربی است
کہ گفت برسر منبر کہ ملت از وطن است — دروغ گوئی و ایراد ایں چہ بوالعجبی است
درست گفت محدث کہ قوم از وطن است — کہ مستفاد ز فرمودۂ خدا و نبی است
زباں بہ طعنۂ پاکاں کشود و آگہ نے — کہ فرق ملت و قوم از لطائف ادبی است
تفاوتیست فراواں میان ملت و قوم — یکے ز کیش دگر کشوری است یا نسبی است
بہ ملت ارچہ براہیمیست سرورِ ما — ولے بقوم حجازی بہ نسل مطلبی است
ز قوم خویش شمرد اہل کفر را بہ احد — رسول پاک کہ نامش محمد عربی است
خدائے گفت بقرآں لِكُلِّ قَومٍ هَاد — مگر یہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است
بقوم خویش خطاب پیمبراں بنگر — پر از حکایت "یا قوم" مصحف عربی است
بلند تر بود از قوم رتبۂ ملت — کہ حبل دین قوی تر ز رشتۂ نسبی است
کسے کہ ملت اسلام نور سینۂ اوست — برادر است اگر زنگی است و ور حلبی است
ولے بہ ہم وطناں در مصافِ آزادی — مجاہدانہ تعاون جہاد حق طلبی است
سلوک رفق و مدارا بہ جارِ ذی القربی — عمل بحکم الٰہی و اتباع نبی است
محبت وطن است از شعائر ایماں — ہمیں حدیث پیمبر فدیتہٗ بابی است
خودت نہ بودن و بادیدہ ور در افتادن — دوگونہ شیوۂ بوجہلی است و بولہبی است
رموز حکمت ایماں ز فلسفی جستن — تلاش لذت عرفاں ز بادۂ عنبی است
خموشی از سخن ناسزا گزیدہ تر است — کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی و بے ادبی است
بہ دیوبند بگرا، گر نجات مے طلبی — کہ دیو نفس سلحشور و دانش تو صبی است
بگیر راہ حسین احمد اگر خدا خواہی — کہ وارث است نبی را و ہم ز آل نبی است

اقبال کی نظر سے مولانا مدنی کی وضاحت اور اقبال سہیل کی نظم گذری تو انھوں نے اخبار "مدینہ" بجنور کے ۵/ مارچ ۱۹۳۸ء کے شمارے میں اس مفہوم کی ایک تحریر شائع کرادی کہ مجھے غلط خبر پہنچی تھی اور میں نے وہ تین اشعار کہہ دیے تھے جس کے لیے میں مولانا سے معافی کا خواستگار رہوں۔

روزنامہ ''احسان'' لاہور کے ۲۸ / مارچ ۱۹۳۸ء کے شمارے میں بھی اقبال کا ایک بیان شائع ہوا کہ

''مجھے اس اعتراف کے بعد ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔''

ان بیانات کے علاوہ 'برہان' دہلی (اگست ۱۹۶۴ء)، بشیر احمد ڈار کی کتاب ''انوار اقبال'' جس میں پاکستان کے سابق فائنانس سیکریٹری ممتاز حسین کا پیش لفظ شامل ہے اور ہفت روزہ ''چٹان'' (۲۴ / مارچ ۱۹۷۵ء) میں مشمولہ تحریروں کی روشنی میں بھی یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اقبال نے تاسف کا اظہار کیا تھا اور ان کے اظہار تاسف کے بعد ان اشعار کے کلیات اقبال میں شامل رکھے جانے کی کوئی وجہ نہیں رہ گئی تھی مگر وہ اشعار ہر اڈیشن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسی لیے حافظ شیرازی اور مسٹر جناح کی مذمت میں کہے ہوئے اقبال کے اشعار سب کے ذہنوں سے محو ہو چکے ہیں مگر مولانا مدنی کے خلاف کہے ہوئے اشعار بار بار دوہرائے جاتے ہیں کیوں کہ وہ اشعار کلیات کا حصہ ہیں۔ یہ اشعار کلیات اقبال میں کیوں باقی رکھے گئے؟ انھیں ''باقیات'' میں بھی باقی رکھا جاسکتا تھا؟ یہ سوال تو اہم ہے ہی یہ سوال اور بھی اہم ہے کہ کیا ان کے معنی و مفہوم کو ذہن میں رکھا گیا؟ شاید نہیں، اگر اقبال نے اظہار تاسف نہ کیا ہوتا تب بھی ان کے پہلے دو شعروں سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پہلا ہی مصرعہ ''عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ'' محل نظر ہے کیوں کہ دین کا کوئی ایسا رمز نہیں ہے جس سے عرب واقف ہوں عجم واقف نہ ہو۔ حضور نبی کریمؐ کا ارشاد بھی ہے کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ 'عجم ہنوز نداند' کا طعنہ اگر جائز ہے تو امام بخاریؒ، امام ابوحنیفہؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے مسلمانوں کو اپنی عقیدت پر ''از سرنو غور کرنا پڑے گا۔ اور تو اور خود اقبال کی دین فہمی مشکوک ہو جائے گی کیوں کہ وہ خود بھی تو عجمی ہی تھے۔ ''سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است'' خلاف واقعہ ہے کیوں کہ مولانا مدنی کی تقریر کسی مسجد یا منبر سے نہیں ہوئی تھی بلکہ انھوں نے ایک سیاسی جلسے میں تقریر کی تھی اور اس کی بھی غلط رپورٹنگ ہوئی تھی۔ ان شعروں میں آخری شعر البتہ بہت قابل قدر ہے کیوں کہ نبی رحمتؐ کی اتباع کے بغیر مسلمان ہوا ہی نہیں جاسکتا۔ ''اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است'' کہہ کر اقبال نے نبی رحمتؐ کے اقوال، افعال اور احوال کی اتباع نہ کرنے والوں کی ہفوات کو بجا طور پر بولہبی کہا ہے مگر اس کا اطلاق مولانا مدنی پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا اطلاق ہوتا ہے تو منکر حدیث پرویز جیسوں پر جو اقبال کے مداح بلکہ پیروکار ہونے کے

مدنی تھے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کے سیاسی نظریے یا خیالات سے اختلاف کرنا جرم ہے نہ گناہ۔ ان پر تنقید ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ خود راقم الحروف آزاد ہندوستان میں جمعیۃ العلماء کی کانگریس سے غیر مشروط وفاداری کا نکتہ چیں رہا ہے۔ اقبال کو بھی اپنی رائے دینے یا تنقید کرنے کا پورا حق تھا مگر چونکہ اقبال کی تنقید غلط اطلاعات پر مبنی تھی، اس میں خلاف واقعہ باتیں نظم کی گئی تھیں اور پھر انھوں نے اس تنقید پر تاسف کا بھی اظہار کیا تھا اس لیے ان کی تنقید کو جو تین شعر کی صورت میں ہے کلیات اقبال سے خارج کر دیا جانا چاہیے تھا اگر باقی رکھنا ہی تھا تو ان کو باقیات میں شامل کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح اقبال کی شاعرانہ عظمت کے تمام تر اعتراف کے باوجود یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ اقبال کے تین شعروں کے جواب میں اقبال سہیل نے ۲۰ شعروں کی جو نظم اسی ردیف وقافیے میں کہی اس میں اول تو کوئی بات خلاف واقعہ نہیں ہے اور دوم اقبال کے الزامات کا جن کی وہ خود ہی تردید کر چکے تھے جس انداز سے جواب دیا گیا ہے اس سے اقبال سہیل کی شاعرانہ عظمت کی دلیل فراہم ہوتی ہے۔ کم از کم اس ایک نظم کی حد تک اقبال سہیل نے اس کلیہ کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ کلام اقبال کے رنگ میں شعر کہنے والے اپنا رنگ بھی برقرار نہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہ مصرعے تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو پڑھیے اور سر دھنیے:

درست گفت محدث کہ قوم از وطن است
کہ مستفاد ز فرمودۂ خدا و نبی است

☆

رسول پاکؐ کہ نامش محمد عربی است

☆

خدائے گفت بقرآں لکل قوم ہاد

☆

بلند تر بود از قوم رتبۂ ملت

☆

مجاہدانہ تعاون جہاد حق طلبی است

☆

محبت وطن است از شعائر ایماں

☆

نوٹ: راقم الحروف نے اقبال سہیل کی نظم ''کلیات سہیل'' مرتبہ عارف رفیع سے نقل کی ہے۔ بعض رسائل میں کچھ مصرعے الگ انداز سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ تبدیلی خود اقبال سہیل نے کی تھی یا بعد کے لوگوں نے کی، یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر داد تحقیق دیا جانا ابھی باقی ہے۔ یہاں نظم کے عموی تاثر کو ذہن میں رکھا گیا ہے۔

☆☆☆

جذبۂ حریت کی شدتِ احساس کا شاعر

اقبال سہیل

پروفیسر صغیر افراہیم☆

اقبال سہیل کا نام ذہن میں آتے ہی ماضی کے دروا ہوتے ہیں اور ایک بہت پرانی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس کا تعلق اس زبان زد شعر سے ہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

شعر کا خالق کون ہے؟ حسرت موہانی، بسمل عظیم آبادی یا اقبال سہیل۔ عام طور سے اسے پنڈت رام پرشاد بسمل سے منسوب کیا جاتا ہے مگر کم لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ اقبال سہیل کا نام بھی اس ضمن میں نہ صرف لیا جاتا رہا ہے بلکہ اس کے تعلق سے ایک مختلف اور متوازی روایت بھی مشہور ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تقریباً ۳۴ رسال قبل حسرت میموریل سوسائٹی (رجسٹرڈ) موہان کی جانب سے اردو ہندی میں ایک یادگار مجلّہ تیار کیا جا رہا تھا۔ اس مجلّہ کے لئے روز نامہ اناؤ ٹائمس کے ایڈیٹر جناب سوتنتر کمار کے والد پنڈت بھگوتی پرشاد مادھو کا چونکا دینے والا مضمون موصول ہوا جس میں انھوں نے مشہور غزل:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
رہروِ راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں — لذتِ صحرا نوردی دوریِ منزل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسمان — ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

☆ صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اے شہیدِ ملک و ملت تیرے جذبوں کے نثار　　تیری قربانی کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ　　ایک مٹ جانے کی حسرت اب دلِ بسمل میں ہے

کے تعلق سے لکھا کہ یہ انقلابی غزل اقبال سہیل کی ہے۔ چونکہ یہ اختلافی بات ہندی کے نامور ادیب وصحافی اور ''کرانتی آندولن کا آزادیگ'' کے مصنف نے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی تھی لہٰذا حسرت میموریل سوسائٹی کے صدر جناب ہدایت رسول نے مجھے بحیثیت مدیرِ اعلیٰ بی پی مادھو صاحب کے پاس انٹرویو کے لئے بھیجا۔ خاطر نشان رہے کہ مادھو جی تحریکِ آزادی کے قابلِ قدر مجاہد اور ہندی کے کہنہ مشق صحافی تھے۔ انقلابی تحریک کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے آپ چندر شیکھر آزاد اور مولانا حسرت موہانی سے براہ راست متعلق رہے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ حریت پسند انقلابیوں میں شامل ہوئے اور جب ۹/اگست ۱۹۲۵ء کو خزانہ لوٹا گیا تو آپ نے جانبازوں کی مدد کے لئے ممکن فرائض انجام دیئے۔ سخت پہرے میں انقلابیوں پر مقدمہ چلا تو مادھو جی نے کاکوری کیس کے ملزمان کی باقاعدہ پیروی کی۔ ۱۹/دسمبر ۱۹۲۷ء کو جب رام پرشاد بسمل، ٹھاکر روشن سنگھ، راجندر ناتھ لاہیری، اشفاق اللہ خاں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تو آپ جنوری ۱۹۲۸ء کو کلکتہ پہنچے اور پنڈت امبیکا پرشاد باجپئی کے روزنامہ ''سوتنتر'' کے ادارے میں شامل ہو گئے اور وہیں سے ''چابک'' ویکلی نکالا۔ ۱۹۲۹ء میں پارٹی کے حکم سے رنگون گئے اور گجراتی زبان کے ہفتہ وار اخبار ''برماورتمان'' سے منسلک ہو گئے۔ ان کے مطابق غالباً اسی زمانے میں کاکوری کیس کے تعلق سے مختلف واقعات اخبار ''بندے ماترم'' میں شائع ہوئے اور مذکورہ غزل بھی شہید بسمل کے نام سے چھپی جس کا علم انھیں نہیں تھا۔ ۱۹۳۳ء میں وہ پنڈت مدن موہن مالویہ کے ایما پر رنگون سے لاہور پہنچے اور ہفتہ وار ''وشو بندھو'' کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ مورخینِ صحافت نے ہی نہیں بلکہ پنڈت مدن موہن مالویہ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں بی پی مادھو کی کوششوں سے ''وشو بندھو'' ہفتہ وار سے روزنامہ بن گیا۔ تقسیم ہند کے بعد مادھو جی دہلی آ گئے اور گوسوامی گنیش دت کے روزنامہ ''امر بھارت'' کی ادارتی ذمہ داری سنبھالی۔ آپ بنارس کے روزنامہ ''آج'' میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۰ء تک، روزنامہ ''ہندوستان'' اور ''نو بھارت ٹائمز'' میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۸۱ء تک مستقل کالم لکھتے رہے۔ رابطے کے وقت یعنی ۱۹۸۳ء میں وہ سناتن دھرم پرتی ندھی سبھا کے سکریٹری کی حیثیت سے پہاڑ گنج، نئی دہلی میں مقیم تھے۔ اپنے بچوں سے ملنے کے لئے اکثر اناؤ آتے

رہتے تھے۔ مذکورہ غزل اور اقبال سہیل کے تعلق سے میں کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حوالے کے طور پر انھوں نے خصوصی طور سے حسرت موہانی، جگت موہن لال رواں اور ثاقب کانپوری کے نام لئے۔

تفصیل اس لئے کہ معاملہ کی نزاکت، صاحب معاملہ کی اہمیت اور منظر واضح ہو سکے، اور یہ بھی ذہن نشین رہے کہ دعوی کرنے والے کی تحریریں جنگ آزادی خصوصاً چندر شیکھر آزاد اور ان کے عہد پر معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اس شخص کا یہ بھی کہنا ہے کہ اقبال سہیل نام ونمود سے گریز کرتے تھے۔ شہرت و دولت سے انھیں کوئی خاص رغبت نہیں تھی البتہ ذہنی تربیت اور ادبی ماحول کو پروان چڑھانے میں خاصی دلچسپی تھی۔ حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے میں پیش پیش رہتے تھے۔ اس تناظر میں، زمانی و مکانی، ذہنی و فکری کسی بھی اعتبار سے دیکھیں تو اقبال سہیل کے حلقۂ احباب میں ایسے شعراء شامل تھے جو سرفروشی کی تمنا اپنے دل میں رکھتے تھے۔ حسرت سے ان کی شعر و ادب اور سیاسی ہم آہنگی کی وجہ سے دوستی تھی۔ وہ علی گڑھ میں مولانا حمید الدین فراہی کے ساتھ محلہ بنی اسرائیلان میں رہتے تھے اور حسرت ایم، اے، او، کالج سے نکالے جانے کی بنا پر رسل گنج کے احاطۂ دان پور میں اپنی بیگم نشاط النساء کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ دونوں کی رہائش مشکل سے دس منٹ کے فاصلے پر تھی لہذا قربت بڑھتی گئی جس کے ذکر سے رسائل بھرے پڑے ہیں۔ رواں سے بھی قربت کی وجہ ذہنی ہم آہنگی تھی۔ دونوں شاعر، پیشہ کے اعتبار سے وکیل اور انگریز حکومت کے مخالف، رواں کے بیٹے چودھری پربھان شنکر سروش اناوی نے اس قربت کا ذکر اپنی سوانح میں نہایت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے اپنے والد اور ان کے دوست مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور جلیل احمد قدوائی کے ساتھ اقبال سہیل اور حسرت موہانی کے جذبۂ حریت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ سروش صاحب نے یہ بھی کہا کہ میرے حافظہ میں یہی ہے کہ مذکورہ غزل اقبال سہیل کی ہے جسے مجاہدین گنگناتے ہوئے سولی پر چڑھ گئے۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ اس کی تصدیق سید ابو محمد ثاقب کانپوری صاحب سے کریں۔ ثاقب کانپوری، صوفی منش شاعر اور دوستوں کے دوست اور زبردست حافظے کے مالک تھے چونکہ وہ حیات تھے اور ان تک بآسانی میری رسائی تھی، اس لئے مذکورہ غزل کے خالق سے متعلق استفسار کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ثاقب صاحب نے نہ صرف مادھو جی کی بات کی تصدیق کی بلکہ عظمتِ وطن اور گلزار وطن کے

تعلق سے اقبال سہیل کے درجنوں اشعار سنائے اور یہ بھی کہا کہ حسرتؔ اور اقبال سہیلؔ کے قلم سے نکلی ہوئی چیزیں انقلابیوں تک ہاتھوں ہاتھ پہنچتیں اور نوجوانوں میں وطن کی آزادی کے لئے مر مٹنے کے حوصلے بلند کرتیں۔ ہدایت رسول صاحب کی طرح گئی اور دانشور بھی ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے۔ شش و پنج کی کیفیت کا اظہار مشہور صحافی اشتیاق عارف صاحب سے کیا جو مولانا شوکت علی کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے، وہ مجھے لے کر اپنے دوست ابوالخیر کشفی کے ساتھ ثاقبؔ صاحب کے حجرے میں داخل ہوئے۔ مدعا بیان کیا کہ مذکورہ غزل کے تعلق سے ہم سنتے آئے ہیں کہ یہ کاکوری کیس کے شہید پنڈت رام پرشاد بسمل کی ہے اور آہنگ بھی انھیں کا ہے مگر مادھوجی کا اصرار کہ یہ بسمل کی نہیں اقبال سہیل کی ہے۔ ثاقبؔ صاحب نے پھر مادھوجی کی تائید کی اور کہا کہ رنگ و آہنگ بھی سہیل کا ہے اور یہ بھی واضح کیا کہ بسمل اور ان کے ساتھی بیڑیوں کی جھنکار اور اپنی للکار کے ساتھ یہی غزل گاتے ہوئے عدالت کے کمرے میں داخل ہوتے تھے۔ ثاقب کانپوری کی طرح سروشؔ اناوی نے بھی مادھوجی کی بات کی تائید کی۔ سروشؔ صاحب کا کہنا تھا کہ اس دور میں شاید ہی جانتے تھے کہ مذکورہ ترانہ اقبال سہیل کا ہے، بسمل کا نہیں۔ انھوں نے اقبال سہیل کے کئی اشعار کی نشاندہی کی جس میں لفظ بسمل استعمال ہوا تھا:

رقصاں سرِ شہید نے پائی حیاتِ نو
تیغِ ستم کو ناز کہ بسمل نہیں رہا

اس زبانی روایت کے علی الرغم دستاویزی ثبوت رام پرشاد بسمل کے حق میں ہیں۔ ان کی شہادت کی دوسری برسی پر یہ غزل اولاً ۱۹۲۹ء میں بندے ماترم میں شائع ہوئی طویل عرصہ بعد جون ۱۹۷۵ء میں علی جواد زیدی کی کتاب ''ضبط شدہ نظمیں'' شائع ہوئی جس میں یہ ''سرفروشی کی تمنا'' کے عنوان سے رام پرشاد بسمل کے نام درج ہے۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ مذکورہ فن پارہ کو غزل، ترانہ اور نظم کے نام سے یاد کیا گیا ہے یہ غزل اقبال سہیل کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے خاطر نشان رہے کہ اقبال سہیل کی غزلوں، نظموں کے مجموعے ان کے انتقال (۱۹۵۴ء) کے بعد منظر عام پر آئے ہیں۔ اس کا اعتراف الگ الگ پہلوؤں سے متعین نے کیا ہے اقبال سہیل فیاض، دوست نواز اور وضع دار شخص تھے۔ ''اردوئے معلیٰ'' کے لئے حسرتؔ موہانی نے ایک عربی مضمون کا آزاد ترجمہ کرایا جو ان کے نام کے بغیر شائع ہوا۔ وہ مضمون مقبول بھی ہوا اور اسی باعث مدیر پر عتاب بھی نازل ہوا مگر نہ حسرتؔ

نے موصوف کا نام ظاہر کیا اور نہ سہیل نے کبھی یہ کہا کہ وہ میرا مضمون ہے۔ افتخار اعظمی، تابش سہیل، عارف رفیع، ضیاء الدین اصلاحی وغیرہ نے بھی اسے موضوع بحث نہیں بنایا ہے اور شاید اسی وجہ سے کئی قدآور ادیبوں کے انکشاف کے باوجود میں کل بھی مطمئن نہیں ہو سکا تھا اور آج بھی شبلی اور سہیل کی زمین پر، دانشوروں کی اس محفل میں تذبذب میں مبتلا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ دھندلایا ہوا منظر نامہ شاید اس دیار میں واضح ہو سکے۔

گوناگوں صفات کے مالک اقبال سہیل کے تعلق سے چونکہ مجھے دو اہم باتیں عرض کرنی تھیں۔ اس لیے مضمون دولخت ہو گیا ہے۔ پہلی بات اس لیے نامکمل محسوس ہو سکتی ہے کہ تلاش وجستجو اور تحقیقی شواہد کے امکانات ابھی روشن ہیں۔

دوسری بات اقبال سہیل کے جذبۂ حریت کی شدت احساس کے تعلق سے ہے۔ مذکورہ بالا گفتگو سے قطع نظر اقبال سہیل کے سوانحی کوائف اور عملی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو علم ہوگا کہ موصوف نے والد عزیز اللہ سے علم کی رغبت اور ماں ام کلثوم سے انسانیت کا درس لیا۔ صاف ستھرے ادبی مذاق اور انسانیت ومحبت سے بھرے ماحول میں پروان چڑھنے والے اقبال سہیل اساتذہ میں مولانا محمد شفیع، مولانا حمید الدین فراہی اور علامہ شبلی نعمانی پر ناز کرتے تھے جنھوں نے عربی وفارسی کے ساتھ تاریخ وتہذیب کے نکات سے واقف کرایا۔ ۱۹۳۶ء میں غزل کی ہیئت میں لکھی ہوئی نظم ''نوائے وطن'' کے ایک شعر میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

صفحۂ ہستی پہ جب تک ہے نشانِ علم وفن
نامِ نعمانی رہے گا زیبِ عنوانِ وطن

یہ نظم اساتذہ کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ حب الوطنی کے جذبات کی عکاس ہے۔ اس میں اتفاق واتحاد زندگی کے راز، ملک کی عظمت، یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی بات کی گئی ہے۔ وہ مقطع میں فرماتے ہیں:

فیض سے استاذ کے یہ نام روشن ہے سہیل
آج کہتا ہے زمانہ مجھ کو سبحانِ وطن

''کلیات سہیل'' کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال سہیل کے کلام کی درجہ بندی کی جائے تو سیاسی

رجحان اور اس سے وابستہ مسائل اور موضوعات کی ترتیب اس طرح ہو سکتی ہے:

۱۔ آزادیِ ہند کا تصور اور حصولِ آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد

۲۔ قوم پروری

۳۔ تقسیم ہند کی شدید مخالفت

۴۔ آزادیِ ہند کے بعد ملک کی سالمیت اور یکجہتی کی اہمیت

۵۔ جدید تعمیر و ترقی کے لئے فکر مندی

ان وقتی مسائل و موضوعات میں بھی حریت و آزادی کا جذبہ سرفہرست رہے گا کیونکہ جس والہانہ انداز میں انھوں نے سرفروشانِ وطن کو مہمیز کیا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ضیاء الدین اصلاحی نے ''انتخاب کلامِ اقبال سہیل'' میں ان کے جذبۂ حریت اور حب الوطنی کے تعلق سے لکھا ہے:

> ''انگریزوں سے نفرت، وطن سے محبت اور حریت پسندی اقبال سہیل کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی''۔ (ص:۱۰)

وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''برطانوی جبر و استبداد کے خلاف جو نعرۂ بغاوت اور جوشِ جہاد ان کے یہاں نظر آتا ہے اس سے اردو شاعری کا ذخیرہ خالی ہے''۔ (ص:۱۲)

اپنے سینئر علیگ برادران میں مولانا ظفر علی خاں کے کلام اور مولانا شوکت علی کے لطائف سے متاثر تھے۔ دوستوں کی فہرست طویل ہے مگر حسرت موہانی اور سید سلیمان ندوی پر ناز کرتے تھے جو شانِ خطابت اور شاعرانہ عظمت میں مددگار ثابت ہوئے تھے۔ جدت و ندرت کے ساتھ حُسنِ اظہار اور حسنِ استدلال کے لئے وہ محمد علی جوہر کو اپنے قلب و ذہن کے زیادہ قریب سمجھتے تھے۔ شاید اسی سبب ان کے لئے ''پاک گُہر، پاک باز، زندہ دل و زندہ ساز'' کا مصرعہ کہا ہے۔

شبلی ہوں یا ابوالکلام آزاد، شوکت علی ہوں یا محمد علی جوہر، حسرتؔ ہوں یا رواںؔ سبھی نے اقبال سہیل کے کلام میں جذبۂ حریت کی نشان دہی کی ہے اور کہا ہے کہ ملکی و قومی مسائل کا درد برقی رو بن کر تمام عمر ان کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لئے رہا اور حالات کے مطابق اشعار میں ڈھلتا رہا ہے۔ افتخار اعظمی نے ''حیات سہیل'' میں ان کی دلی کیفیت اور وطن سے محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''حریت پسندی اور وطن دوستی کا جذبہ سہیل کو اپنے خاندان سے ملا اور اسے تازگی وحرارت علامہ شبلی کی تربیت وصحبت نے عطا کی''۔ (ص:۱۷)

غور کیجیے سرسید کے رفیق اور درسگاہِ علی گڑھ کے بہی خواہ علامہ شبلی کی سرپرستی میں پروان چڑھنے والا یہ شاعر علی گڑھ کی انقلابی فضا میں ملک وملت کی بہبودی کے منصوبے بناتا ہے، آزادی اور خوشحالی کے خواب دیکھتا ہے۔ افتخار اعظمی لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کی فضا نے بھی ان کے سیاسی شعور کو قوت بخشی، بعد میں جب ملک کے اندر وطن کی سربلندی کا احساس جاگا اور حکومت برطانیہ کی مخالفت کا غلغلہ بلند ہوا تو سہیل بھی کاروانِ حریت کے ساتھ ہو گئے اور شعر ونغمہ کی صورت میں انھوں نے جذبۂ انقلاب کو ملک میں عام کیا''۔ (ص:۱۷)

''کالا پانی'' کی سزا سے ''جلیان والا باغ'' تک کی تاریخ کو سمیٹتے ہوئے اقبال سہیل لکھتے ہیں:

ہم نشیمن کو بھی روئیں تو خطا ہوتی ہے
پھونک ڈالیں وہ چمن بھی تو ہنر کرتے ہیں

تہذیبی، تمدنی اور انسانی زوال کے جو اشارے انگریزوں کی بدولت ذہن نشین کرائے جارہے تھے، وہ ان کے جواب میں کہتے ہیں:

قفس میں دیتے ہو کیا طعنِ ست پروازی
فضا کھلی ہوئی ملتی تو امتحاں ہوتا
تاراجِ نشیمن کھیل سہی، صیاد! مگر اتنا سن لے
جب عشق کی دنیا لٹتی ہے خود حسن کا ماتم ہوتا ہے

وہ جذبۂ حریت کو بیدار کرنے کے لیے عوام سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں:

زندگی کا راز یہ ہے، اے عزیزانِ وطن — جان جائے پر نہ جائے، حرمتِ شانِ وطن
غیر اگر دے گنجِ قاروں بھی تو پھیلاؤ نہ ہاتھ — چاہیے اتنی تو غیرت اے گدایانِ وطن
غیر میرا نا خدا ہو، اے خدا ایسا نہ ہو — گو مری کشتی سے کھیلے موجِ طوفانِ وطن
ننگ ہیں وہ عالمِ انسانیت کے واسطے — مل کے غیروں سے بنیں وہ وجہ حرمانِ وطن

ڈرتے ہیں مصائب سے کہیں طائرِ آزاد
پڑتی ہی رہا کرتی ہے افتاد پہ افتاد

شعلوں سے بھڑکتے نہیں مرغانِ چمن زاد
اپنا ہو کہ بے گانہ ہو گلچیں ہو کہ صیاد

مانا کہ قفس میں ہے بہت چین میسر
نے برقِ چمن سوز نہ صیادِ ستم گر

ہے زیست غلامی کی مگر موت سے بدتر
قابو میں رہے اپنے پر وبال تو کیا ڈر

قیدِ غلامی وحیات، ننگ ہے، ننگ کائنات
لعنت بندگی کے ساتھ صورت زندگی نہ دیکھ

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا
ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

کیوں کہ:

گائیں گے ہم آزادیٔ گلشن کا ترانہ
بے کار ہے اے برقِ بلا ہم کو ڈرانا

اس کے لئے وہ ہر پل دعا کرتے ہیں:

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے، اسیرِ غم اب تو چھوٹ جائے

جنوری ۱۹۳۷ء میں مثلث کی ہیئت میں لکھی ہوئی دس بند کی مختصر سی نظم ''ترانہ وطن'' غلامی سے نجات کی للکار اور جذبۂ حریت کی پاسدار ہے۔ اسی سال غزل کی ہیئت میں لکھی ہوئی نظم ''صدائے سروش'' آزادی کی الہامی آواز محسوس ہوتی ہے جس میں عزم ویقین اور خواہش وجستجو ہے۔

اقبال سہیل بخوبی سمجھتے تھے کہ دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیب کا سنگم ہوتا ہے۔ لہذا وطن کی آزادی کے لئے آپسی اتحاد بے حد ضروری ہے جو دشمن کو روزِ اول سے کھٹکتا رہا ہے۔ اس لئے اتحاد کو تقویت پہنچانے کے وہ امکانی جتن کرتے ہیں۔

ادھر ہندو کی جے کاریں، اُدھر مسلم کی تکبیریں
ملیں جس وقت باہم خود چمک اٹھیں گی تقدیریں
نظر آنے لگیں گی دورِ آزادی کی تصویریں
جنوں اپنا سلامت ہے تو کھل جائیں گی زنجیریں
ہم تم کو بسر کرنا ہے یہیں، جینا ہے یہیں مرنا ہے یہیں
اٹھو یہ چمن شاداب کرو، اب غاصب خود سر جاتا ہے

غاصب کے جانے اور زنجیروں کے کھلنے کی روداد وہ یوں بیان کرتے ہیں:

بجلیاں آئیں جو باہر سے وہ رخصت بھی ہوئیں
شعلہ افگن ہے مگر برق چمن زاد ابھی

طوفان آنے اور پھر اس کے گزرنے کے منظر و پس منظر میں برپا تباہی کے اسباب پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہوئے تنبیہ بھی کرتے ہیں کہ تم نے اتحاد اور یکجہتی کو فراموش کر دیا تھا۔

کوئی دیر و حرم تک یہ مری فریاد پہنچا دے
وہ شیخ و برہمن کیا، جو نہ رہ سکتے ہوں انساں بھی

کیوں کہ:

اٹھائے ہیں یہ فتنے نرگس غماز نے ورنہ
نہ بت سے شیخ کو ضد ہے، نہ کعبے سے برہمن کو

انقلابیوں کی لاکھ کوششوں کے باوجود دشمن اپنی چال چلنے میں کامیاب رہا۔ اقبال سہیل نظم ''منظر رخصت'' میں کہتے ہیں:

لالے کو دبایا سنبل سے، قمری کو لڑایا بلبل سے
جاتا تو ہے اب صیاد مگر، گلشن کو لٹا کر جاتا ہے

اقبال سہیل ہوں یا حسرت یا ابوالکلام آزاد یہ ملک کی آزادی چاہتے تھے تقسیم نہیں اور جیسے ہی تقسیم ہند کا اعلان ہوا، اذیت میں مبتلا ہو گئے۔ اقبال سہیل نے محض ناراضگی نہیں بلکہ اپنی ناپسندیدگی کا اسی شدت سے اظہار کیا ہے جس شدت سے وہ آزادی کا مطالبہ کرتے رہے تھے۔ افتخار اعظمی ان کے ایک خط کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''وطن کے ذبیحہ نے ملک کو دو ٹکڑوں میں اور مسلمانوں کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں کی تمدنی، سیاسی اور اخلاقی تباہی کے جو مواقع فراہم کر دیے ہیں اور جن کے آثار ابھی سے ظاہر ہیں اس نے آزادی کی مسرت کو کس قدر روا غدار بنا دیا ہے''۔ (ص: ۱۸)

حیرت و استعجاب کی کیفیت میں انھوں نے جو کچھ قلم بند کیا ہے وہ قابل رشک ہے:

تقسیم گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی
گلزار لٹ رہا ہے، کچھ اس کی خبر نہیں

تقسیم ہند کے عمل کو عملی جامہ پہنانے والوں نے اقبال سہیل اوران کے دوست مولانا حسرت موہانی کو اپنا ہمنوا بنانے کے امکانی جتن کئے، دباؤ ڈالا، مختلف عہدوں کی پیش کش کی مگر جذبۂ حریت سے سرشاران جانبازوں نے جاہ ومنصب کو ٹھکراتے ہوئے نئے تناظر میں، نئے عزم اور نئے ولولے کے ساتھ خدمت کا تہیہ کیا۔ اقبال سہیل کہتے ہیں:

سہیل اس بے نوائی پر بھی ہمت کا یہ عالم ہے
عوض خاکِ وطن کے میں نہ لوں مُلکِ سلیماں بھی

اسی نظم میں انھوں نے وہ شعر بھی کہا ہے جس نے لاہور میں سعادت حسن منٹو کو تلملا دیا تھا اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' جیسا شاہکار لکھنے پر مجبور کر دیا تھا:

جنوں میں چاک کر ڈالا مگر اب ہیں پشیماں بھی
کہ خود اپنے ہی پیراہن کا ٹکڑا تھا گریباں بھی

تاریخ گواہ ہے کہ نو آبادیاتی نظام میں ملک کی آزادی اور سامراجی حکومت کی بربریت کی عکاسی مختلف شعراء نے مختلف زاویوں سے کی ہے اوراس کے لئے بلیغ انداز اور پرزور علامات استعمال کی ہیں۔ سہیل کے بزرگ شعراء سیاسی طنز کو طنز ملیح کے طور پر استعمال کرتے تھے اوران کے معاصرین میں کچھ نے جذباتیت اور اُکتا دینے والی یکسانیت سے بھی کام لیا ہے لیکن سہیل کے یہاں واضح پیغام کے باوجود رمزیت ہے۔ وہ نشتریت کو بے کیف نہیں ہونے دیتے ہیں بلکہ بلاغت، نشتریت اور شعریت کا حسین امتزاج پیدا کر دیتے ہیں۔ اثر لکھنوی اپنے مضمون ''اردو غزل میں سہیل کا مرتبہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''جو نشتریت سہیل کے سیاسی تغزل میں پائی جاتی ہے وہ چکبست یا محمد علی کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ سہیل کے کلام میں سیاسی طنز شبلی کے یہاں سے آیا ہے لیکن سہیل نے اسے اور زیادہ بلیغ، لطیف اور موثر بنا دیا ہے''۔ (ص: ۳۸)

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''غزل گوئی کو رسمی اور روایتی طنز سے نکال کر سیاسی طنز سے اس طرح آشنا کرانا کہ غزل اور طنز، دونوں کا حق ادا ہو جائے، سہیل کا بڑا اہم اور قابلِ قدر کارنامہ ہے، اس

رنگ میں ان کا ہمسر اب تک نظر نہ آیا"۔(ص:۱۹)

(اقبال سہیل کا فن، مرتب ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی، ۲۰۰۷ء)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال سہیل نے اساتذہ کی سرپرستی میں کلاسیکی ادب کا خاصا مطالعہ کیا اور اپنے مزاج کے مطابق شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔ اس دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی کینوس کو سامنے رکھیں تو فضا اور ماحول نے انھیں سیاست کی طرف راغب کیا اور وطن کی آزادی کا شدت سے احساس ہونے لگا جس نے ان کی کیفیت میں انقلاب برپا کر دیا اور وہ انگریز سامراجیت کے خلاف شمشیر بکف ہو گئے۔ شاید اسی سبب انقلابی تحریک کو چندر شیکھر آزاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے والے بھگوتی پرشاد مادھو، اقبال سہیلؔ کو موثر اور منفرد شاعر تسلیم کرتے ہیں جس کے یہاں جذبۂ حریت کی شدت کا ایسا احساس ہے جس کی مثال محال ہے۔ ان کے قادر الکلام ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ بیانیہ انداز، جزوقتی موضوعات اور سپاٹ طرزِ تخاطب میں بھی قافیہ پیمائی نہیں، گہرائی اور تازہ کاری ہے۔ جذبۂ حریت کی شدت کے اس احساس کو ملاحظہ کیجیے:

جیوں تو کُلاہِ وطن زیبِ سر ہو
مروں تو کفن میں ردائے وطن ہو

☆☆☆

’’معارف‘‘ میں شعریاتِ اقبال سہیل

کلیم صفات اصلاحی☆

سرزمین اعظم گڑھ کو جن ناموروں کے علمی وادبی کمالات کے سبب شہرت وعزت ملی ان میں اقبال سہیل کا نام بلاشبہ شامل ہے۔ وہ شبلی وفراہی کے فیض یافتہ اور ناموران علی گڑھ میں ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر ان کو یکساں عبور ودست رس حاصل ہے۔ ان کے اندر تصنیف وتالیف کا نہایت عمدہ اور نکھرا ہوا ذوق تھا۔ اپنی فطری ذہانت وجودت طبع اور عبقریت کے سبب وہ اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ شاعری، نکتہ سنجی اور حاضر جوابی ان کے خمیر میں داخل تھی۔ نعت، منقبت، قصیدہ اور غزل گوئی میں وہ نہ صرف درجۂ کمال پر فائز تھے بلکہ بحیثیت فن ان اصناف پر ان کو ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ برجستہ گوئی، فکری بلندی، معنی آفرینی، سوز وگداز، واقعہ گوئی، معاملہ بندی، جدت اسلوب، تسلسل مضامین، زبان کی صفائی، روانی، شستگی اور تراکیب میں چستی وغیرہ جیسے اوصاف شاعری میں کون سا ایسا وصف ہے جو ان کے کلام میں حد کمال کو نہ پہنچا ہو۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ’’کلیات اقبال سہیل‘‘ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان کے کلام کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد یہ دعویٰ بے معنی نہیں لگتا کہ وہ فکر اسلامی کی توضیح وتشریح میں ’’اقبال ثانی‘‘ تھے۔ انھوں نے فارسی کے کلاسیکل شعرا عرفی، نظیری، سعدی شیرازی وغیرہ کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، ان کے اسلوب پر ان کی گہری نظر تھی، زبان وبیان کی لطافت، احساس وفکر کی جودت، طبع رسا، ناقدانہ صلاحیت، جوش، رعنائی، عہد وماحول کی خامیوں پر گرفت کا جذبہ انھیں فارسی کے کلاسیکل ادب کے مطالعہ سے ہی ملا تھا۔ جیسا کہ رشید احمد صدیقی

☆ رفیق دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

نے لکھا ہے کہ ''کم لوگوں کو فارسی کے کلاسیکل ادب پر اتنا عبور ہوگا جتنا مولانا سہیل کو تھا''۔(۱) اپنے عہد کی خامیوں پر تنقید کے لئے فارسی کے کلاسیکل شعرا نے جو اسلوب اختیار کیا وہ انتہائی عالمانہ، معیاری اور جامعیت سے پُر تھا۔ بالخصوص حافظ شیرازی نے واعظین کی پردہ وری اور علما کے اخفائے حق پر ملامت کا جو طرز و انداز اختیار کیا ہے، سہیل صاحب نے بھی اپنے عہد کی بعض ناہمواریوں بالخصوص برطانوی حکومت کی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینیوں کا وہی سنجیدہ اور معیاری اسلوب اپنایا ہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں البتہ سہیل صاحب کے فارسی قصائد پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے دوست اثر لکھنوی نے جو باتیں تحریر کی ہیں ان سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے ان کا کہنا ہے کہ متاخرین فارسی شعراء کے کلام کی جو خوبیاں تھیں وہی ان کے فارسی و اردو کلام میں بھی نظر آتی ہیں اور دونوں میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو کی غزلوں کے علاوہ اپنے فارسی کے قصائد بھی سناتے تھے اور یہ امتیاز مشکل ہو جاتا تھا کہ عرفی یا قاآنی نوا سنج ہے یا سہیل۔ فارسی میں کامل دست گاہ اور وسعت مطالعہ نے ان کے فطری ذوق شعری اور علوئے کردار سے مل کر ان کے اردو کلام میں وہی زور اور جوش و خروش بھر دیا تھا، وہی رفعت خیال و معنی آفرینی، وہی رعنائی و لطافت، وہی شیرینی و عذوبت، وہی جدت و ندرت پیدا کر دی تھی جو متاخرین شعرائے فارسی عرفی، نظیری، ظہوری وغیرہ کا طرائے امتیاز ہے۔''(۲)

اس جزوی اور مختصر تمہید کا مقصد محض اقبال کے شاعرانہ کمال کی ایک ہلکی سی جھلک ان کے معاصرین کے حوالے سے پیش کرنا ہے۔

دارالمصنفین اور معارف سے اقبال سہیل کا ادبی اور علمی تعلق اس کے آغاز سے ان کی وفات تک قائم رہا۔ وہ اس ادارہ کے بانی علامہ شبلی نعمانی، اس کے ناظم اول مولانا سید سلیمان ندوی اور اس کے دوسرے خدمت گذاروں بالخصوص مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی وغیرہم کے بڑے قدرداں تھے۔ دارالمصنفین کو وہ اپنا گھر سمجھتے تھے اور یہاں کے اصحاب علم وفضل سے ان کی

(۱) اقبال سہیل کا فن، ڈاکٹر ضیاءالرحمن صدیقی ص ۱۳، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲۰۰۷ء۔
(۲) ایضاً۔

خوب چھنتی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے تو ہم مشرب وہم پیالہ ہونے کے سبب خاص تعلق تھا۔ سید صاحب ان کے شاعرانہ کمالات اور عربی و فارسی زبان وادب پر ان کی گہری نظر کے قائل تھے۔ سید صاحب ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''موصوف سے میری ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی جب ندوۃ العلماء کا اجلاس بنارس میں ہوا تھا۔ وہ اس وقت بھی شاعر تھے اور صاحب تخلص کرتے تھے اور اسی نام سے پکارے جاتے تھے۔ پھر معلوم نہیں علی گڑھ یا اس سے پہلے ہی کب سہیل بنے۔ وہ اردو، عربی اور فارسی زبان وادب پر گہری نظر اور اردو و فارسی شعر و نظم پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں اور فی البدیہہ اشعار کہتے ہیں۔'' (۱)

اقبال سہیل بھی سید صاحب کے علم وتحقیق اور رموز و اسرار دین کی گرہ کشائی اور میدان علم وادب میں ان کی مرجعیت کے قائل تھے۔ چنانچہ انھوں نے سید صاحب کی بیماری کے بعد صحت یابی پر جو فی البدیہہ فارسی نظم لکھی تھی اور جس کو بعنوان ذیل ''نذر اخلاص قطعہ ذوقافیتین بہ تہنیت صحت یابی برادر مکرم علامہ سید سلیمان ندوی مدفیوضہم'' معارف میں شائع کرایا تھا۔ اس کے چند اشعار بطور ثبوت یہاں پیش خدمت ہیں:

للہ الحمد شب تار، بپایاں آمد — صبح چوں طالع بیدار، درخشاں آمد
شاہد لالہ زجلباب ورق رخ بہ نمود — یوسف مصر بہ بازار، زکنعان آمد
سزد از جن و پری سجدۂ شکرانہ کنند — کاندریں بزم دگر بار، سلیمان آمد
دیدہ از جلوۂ دیدار سعادت اندوخت — سینہ چوں عالم انوار، چراغاں آمد
کیست در ہند کنوں جز تو کہ در بزم کمال — کاشف عقدۂ اسرار، بدیشاں آمد
نوک کلک تو زبس لعل و گہر می پاشد — ہندرا برزن و بازار، بدخشاں آمد
مرجع علم وادب ہستی، وہموارہ ترا — کرم داور دادار، نگہباں آمد (۲)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معارف کے حصۂ ادبیات کو جن نامور ادبا و شعرا کی بدولت اوج

(۱) اقبال سہیل کا فن، ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی ص ۱۳، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲۰۰۷ء۔

(۲) معارف فروری ۱۹۳۶ء ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

وعروج نصیب ہوا، ان میں اقبال سہیل بھی شامل ہیں۔ سید صاحب ان کے کلام کو نہ صرف بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے بلکہ ان کو کسی نہ کسی عنوان سے معنون بھی کرتے تھے۔ مثلاً فکر سہیل، تابش سہیل وغیرہ۔

معارف ابھی صرف چار مہینے کا ہوا تھا کہ نومبر کا مہینہ آ گیا۔ اسی مہینہ میں مولانا شبلی کی رحلت ہوئی تھی۔ اقبال سہیل نے اپنے استاذ کا فارسی مرثیہ لکھا تھا جو اب تک غیر مطبوع تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس تقریب کی مناسبت سے اس کو معارف کے صفحات کی زینت بنانا مناسب خیال کیا اور درج ذیل نوٹ لگا کر اس کو شائع کیا اور اقبال سہیل معارف کے صفحات پر استاد کی یاد میں اشکوں کا موتی لے کر پہلی بار نمودار ہوئے۔ شبلی کے بعد اقبال سہیل پہلے شاعر ہیں جن کا فارسی کلام معارف میں پہلی بار شائع ہوا۔ سید صاحب کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

> ''مولانائے مرحوم کے ماتم میں جتنے مرثیے لکھے گئے وہ اکثر اخبارات میں چھپ چکے ہیں جن کا سلسلہ کئی مہینوں تک روزانہ اشاعتوں میں جاری رہا، یہ نوحہ اب تک غیر مطبوع تھا۔
>
> مولوی اقبال احمد مولانا کے ایک شاگرد عزیز ہیں، تحصیل عربیت کے بعد انھوں نے امسال علی گڑھ سے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ماہ نومبر مولانا کی رحلت کی تاریخ ہے۔ اس تقریب سے اس نوحہ کا اس نمبر میں درج ہونا مستحسن تھا۔'' (۲)

یہ مرثیہ معارف کے ساڑھے چار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ فارسی زبان کے ذوق شناسوں کو یہ خون کے آنسو رلاتا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کا ایسا سراپا اقبال سہیل نے کھینچا ہے کہ اس سے بہتر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ علامہ شبلی کے جاوداں کارناموں کی اہمیت، ان کے علم و فضل، ان کی انفرادیت، ندوہ، شبلی کالج اور سیرت کے ناتمام چھوڑ کر جانے کا ذکر ہے۔ چند اشعار جستہ جستہ ملاحظہ فرمائیں:

دانشور یگانہ بہ دارالقرار شد	زیبد اگر جہان ہمہ اش سوگوار شد
دردا کہ گنج دار معارف ز دہر رفت	واحسرتا کہ شبلی معجز نگار شد

(۱) ایضاً نومبر ۱۹۱۶ء ص ۵۶۔

دردا کہ وجہ نازشِ اہل جہاں نہ ماند / فخر زمیں ز عربدۂ آسماں نماند
از سر بپا است ماتم رازی و ابن رشد / کاں یادگار دانشِ پیشیناں نہ ماند
سیرت نشد تمام و دریغا کہ کس زما / شائستۂ نگارشِ آں داستاں نہ ماند
دردا کہ باز دامن اردو زباں تہی است / کلکے کہ بود شاخچۂ گلفشاں نہ ماند
آں ندوہ کز فیض تو مہد کمال بود / ہر خام را ستیز گہ آزموں شدہ است
واں نیشنل کہ ہمت تو دادہ اش وجود / یکسر خراب و خستہ و خوار و زبوں شداست

اقبال سہیل کی فارسی شاعری کے جو نمونے صفحات معارف کی زینت بنے ان میں دو قصیدہ اور ایک مرثیہ ''نوحہ'' ہے۔ ان میں سے دو کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ تیسرا قصیدہ ''قصیدہ تبریک'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ قصیدہ شبلی انٹر کالج کی تاسیس کے موقع پر انھوں نے لکھا تھا۔ اس کی پیشانی پر درج ذیل نوٹ مدیر معارف نے تحریر کیا۔

> ''قصیدۂ تبریک'' جس کو مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی، ایم ایل اے نے جلسۂ تاسیس شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ میں جس کے صدر نشیں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سابق صدر الصدور دولت آصفیہ تھے۔ پڑھا گیا۔''(۱)

اس قصیدہ میں بھی سہیل صاحب نے فارسی شعر و ادب سے اپنی گہری دلچسپی اور قدرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ زبان کی سلاست، علوئے فکر، تعبیرات، استعارات و کنایات کی ندرت اور تاریخ کے مطالعہ کا وہی اسلوب و انداز موجود ہے جو فارسی کے قدما و متوسطین کا خاص اسلوب تھا۔ شروع کے چند اشعار میں انھوں نے کنایات و تشبیہات کی جو ندرت دکھائی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

قتیل ناوک عشق تو ام نمی دانی / کہ چارہ سازیٔ در دم تو نیز نتوانی
دو صد بہشت معانی بہ سینۂ پنہا ست / مرا بہ دیدہ نہ گنجد بہشت رضوانی
زکوۃ خامہ بدر کردم و فلک می خواست / کہ قسمتش بہ سپارم بہ ابر نیسانی (۲)

(۱) اپریل ۱۹۴۰ء ص ۳۱۴۔

(۲) معارف اپریل ۱۹۴۰ء، ۳۱۴

درج بالا اشعار میں ''قتیل ناوک عشق''، '' بہشت معانی''، اور ''زکوۃ خامہ'' جیسے الفاظ وتعبیرات کا استعمال اقبال سہیل صاحب نے جس خوبی سے کیا ہے اس پر اہل ایران کو بھی رشک آجائے۔ اس سے نہ صرف ان کی معنی آفرینی کی لیاقت کا پتہ چلتا ہے بلکہ تشبیہات وکنایات میں ان کی ندرت کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اس قصیدہ میں اقبال سہیل نے اپنے جس فارسی ذوق شعر اور کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے اس سے خالص ایرانی رنگ کو محسوس کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ قصیدہ پڑھتے جائیے اور عرفی ونظیری اور قاآنی کی یاد تازہ کرتے جائیے۔ اس میں انھوں نے پہلے اپنی مدح سرائی کی ہے، پھر اصل مرکز فیض یعنی علامہ شبلی کی طرف رجوع کیا ہے۔ اس کے بعد اپنے استاد کو ہذیل وفارابی کا حریف، جریر وخاقانی کو ان کے خوان علم کا زلہ ربا، ان کی تصانیف کو صحیفہ رازی اور ذوق خطابت کو سحبانی کے کمال خطابت کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو شبلی کا محرم اسرار اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو شبلی کا ہم صفیر کہا ہے۔ آپ کی ضیافت طبع کی خاطر اس قصیدہ کے مزید اشعار حاضر ہیں:

گمان خویش ستائی بمن مبر کہ بود — مدیح من ہمہ راجع بہ ذات نعمانی
حریف بزم کمالش ھذیل و فارابی — گدائے خوان نوالش جریر وخاقانی
روایتے زکتابش صحیفۂ رازی — حکایتے زخطابش کمال سحبانی
کنوں کہ عالم نوراست از رخش روشن — بہ عاکفان حریمش سزد سلیمانی
حریف بزم کہن ہم صفیر نعمانی — جناب صدر شریعت حبیب شروانی

(۱)

معارف میں شائع شدہ ان فارسی قصائد کے بعد اب معارف ہی میں شائع شدہ ان کے اردو کلام کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ اقبال سہیل کے بعض اردو قصائد، نظموں اور نعتوں کو سب سے پہلے معارف نے اہل علم وادب کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ بعد میں وہ ان کے کلیات میں شامل ہوئیں۔ شعراء کے کلام کو خاص ناموں سے معنون کر کے شائع کرنے کی روایت معارف میں سید صاحب کے عہد ہی سے قائم ہے۔ چنانچہ اقبال سہیل کے اشعار جب معارف میں اشاعت کے لئے آتے تو سید صاحب اور شعرا کی طرح ان کو کسی نہ کسی نام سے معنون کر دیتے۔

(۱) معارف اپریل ۱۹۴۰ء، ۳۱۴۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال سہیل کے ہر شائع شدہ کلام کو سید صاحب ہی نے معنون کیا ہے بعض ایسے بھی ہوں گے جو خود سہیل صاحب کے معنون کردہ تھے، تاہم اس کی مکمل تحقیق مشکل ہے، البتہ یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کے بیشتر کلام کو سید صاحب ہی نے معنون کر کے شائع کیا۔ مثلاً فکر سہیل، مشاعرۂ اعظم گڑھ، تابش سہیل وغیرہ عناوین تو مدیر معارف کے ہی قلم کے معلوم ہوتے ہیں۔

جب اس خاص نقطۂ نظر سے اقبال سہیل کی شعریات معارف کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کا بیشتر کلام کسی خاص عنوان سے ہی شائع ہوا ہے۔ ذیل میں ان کی ایک فہرست دی جاتی ہے جو بالترتیب ہے:

حصہ اردو

عنوان	تاریخ
فکر سہیل	اگست ۱۹۱۹ء
مشاعرہ اعظم گڑھ	ستمبر ۱۹۱۹ء
جگنو	جنوری ۱۹۲۰ء
نغمۂ تہنیت بتقریب فتح سمرنا	نومبر ۱۹۲۲ء
شام غم اور صبح امید	فروری ۱۹۲۳ء
تابش سہیل	فروری ۱۹۲۴ء
تابش سہیل	اپریل ۱۹۲۹ء
فکر سہیل	اگست ۱۹۲۹ء
غزل	جنوری ۱۹۳۰ء
جنون آرزو	مئی ۱۹۳۰ء
مرگ حیات آفریں	مئی ۱۹۳۱ء
تابش سہیل	نومبر ۱۹۳۱ء
تابش سہیل	اپریل ۱۹۳۳ء
تابش سہیل	جنوری ۱۹۳۴ء
تابش سہیل	دسمبر ۱۹۳۴ء

تابش سہیل/ رباعی	مارچ ۱۹۳۵ء
تابش سہیل	اپریل ۱۹۳۵ء
تابش سہیل	مئی ۱۹۳۶ء
تابش سہیل	اپریل ۱۹۳۹ء
تابش سہیل	جون ۱۹۴۰ء
موج کوثر (نعت)	مارچ ۱۹۴۴ء
تابش سہیل	جون ۱۹۴۵ء
مبارک باد آزادی	ستمبر ۱۹۴۷ء
تابش سہیل صیاد و اسیر	اکتوبر ۱۹۴۷ء
تابش سہیل	دسمبر ۱۹۴۷ء
محسن انسانیت (گاندھی جی)	فروری ۱۹۴۸ء
گاندھی	اپریل ۱۹۴۸ء
غزل	ستمبر ۱۹۴۹ء

حصہ فارسی

نوحہ	نومبر ۱۹۱۶ء
نذر اخلاص	فروری ۱۹۳۶ء
قصیدۂ تبریک	اپریل ۱۹۴۰ء

عام اہل علم جنھوں نے کلیات سہیل کا مطالعہ کیا ہے اس فہرست سے ان کے سامنے یہ بات کھل کر آجائے گی کہ کلیات سہیل میں اقبال سہیل کی کون کون سی نظمیں معارف میں شائع ہو چکی ہیں۔
اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اقبال سہیل کے فارسی قصائد جن کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے کے ساتھ ساتھ ان کی بعض اردو نظموں پر بھی مدیر معارف نے گراں قدر اور قیمتی نوٹ تحریر کیے ہیں۔ ان نوٹس سے ان نظموں کے پس منظر اور اہمیت پر روشنی پڑتی ہے، یہاں ان کا ذکر ضروری ہے۔

[۱] جنون آرزو: اقبال سہیل کی ایک طویل نظم ہے۔ یہ نظم اقبال سہیل نے اعظم گڑھ کے ایک

جلسہ میں پڑھی، ابھی نظم مکمل نہیں تھی اس کے باوجود سید صاحب نے اس پر درج ذیل نوٹ لکھ کر اس کو شائع کیا۔ سید صاحب کے بیان کے مطابق نظم بھلے سے ہی نامکمل ہے لیکن اس میں ادا کئے گئے خیالات ناتمام نہیں ہیں، اس نظم میں الگ الگ قافیوں پر مشتمل کل تین بند ہیں۔ معارف میں صرف ۲ بند شائع ہوئے ہیں۔ بیچ کا بند ان کے کلیات میں شامل ہے۔ یہاں پہلے بند کے چند اشعار سے لطف اٹھانے کے بعد سید صاحب کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

دامن کہسار سے رقصاں چلی اک جوئے آب
جستجوئے منزل مقصود میں پا در رکاب
عزم راسخ جس کی سیرت، سعی پیہم جس کی خو
بیقراری جس کی طینت جس کی فطرت پیچ وتاب
دید کے قابل جنون شوق کی وارفتگی
چند قطروں کی جماعت اور جہان اضطراب
جھوم کر منبع سے نکلی ایسے لہراتی ہوئی
پی کے میخانے سے نکلے جس طرح رند خراب(۱)

مدیر معارف کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

''اقبال سہیل نے یہ نظم اعظم گڑھ کے ایک جلسہ میں پڑھ کر سنائی تھی۔ اس میں طبعیات کے ایک مسئلہ کو فلسفیانہ خیال کے قالب میں ڈھال کر ایک اخلاقی نتیجہ پیدا کیا گیا ہے۔ نظم ابھی ناتمام ہے تاہم ان بندوں میں جو خیال ادا کیا گیا ہے وہ ناتمام نہیں۔(۲)

[۲]موج کوثر: سید صاحب کا دوسرا نوٹ اقبال سہیل کی اس مشہور نعت بعنوان ''موج کوثر'' پر ہے جو ان کے کلاہِ افتخار و انفرادیت کا نگینہ ہے اور اس کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ اس کے اشعار بزرگوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی زبان پر تھے، اقبال سہیل نے یہ نعت اپنی بیٹی کے لئے خواتین کی مجلس میلاد میں

(۱) معارف مئی ۱۹۳۰ء، ص ۳۷۷۔

(۲) معارف مئی ۱۹۳۰ء، ص ۳۷۷۔

پڑھنے کے لیے لکھی تھی۔ ایک زمانہ تک جلسوں کے آغاز میں تلاوت کے بعد بھی اس نعت کو پڑھنے کا مدارس میں اہتمام کیا جاتا تھا۔ معارف میں عام طور پر مطبوعہ مواد شائع نہیں کیا جاتا لیکن عام اصول سے ہٹ کر اس کی اہمیت کے پیش نظر اس نعت کی عام اشاعت کے خیال سے صفحات معارف میں اس کو جگہ دی گئی۔ عام پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ یہ نعت اصحاب فضل وکمال کی نگاہ میں بڑی توقیر کی نگاہ سے دیکھی گئی، اس کا اندازہ اس طویل خط سے ہوتا ہے جو اقبال سہیل نے مولانا اسلم جیراج پوری کے نام اس خط کے جواب میں لکھا تھا جو انھوں نے انھیں اس نعت سے متاثر ہوکر لکھا تھا۔ سطور ذیل میں سید صاحب کا نوٹ اور اقبال سہیل کے خط کا بعض وہ حصہ جو نعت سے متعلق ہے، ملاحظہ فرمائیں، تاہم پہلے نعت کے چند اشعار سے لطف اٹھائیں:

احمد مرسل فخر دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم
مظہر اول مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
جسم مزکی، روح مصوّر، قلب مجلی، نور مقطر
حسن سراپا، خیر مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
طینت جس کی سب سے مطہر، بعثت جس کی سب سے موخر
خلقت جس کی سب پہ مقدم صلی اللہ علیہ وسلم
جس کی ہراول فوج سلیماں جس کے منادی موسیٰ عمراں
جس کے مبشر عیسیٰ مریم صلی اللہ علیہ وسلم (۱)

معارف کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

''مولوی اقبال احمد خاں صاحب نے حال ہی میں یہ پاکیزہ نعت لکھی ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہے لیکن ابھی اس کی عام اشاعت نہیں ہوئی ہے اور ناظرین معارف میں سے بہت کم اصحاب تک اس کے پہنچنے کی نوبت آئے۔ اس لئے ماہ مبارک کی تقریب میں یہ پاکیزہ تحفہ ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ

(۱) معارف مارچ ۱۹۳۴ء، ص ۲۲۲

نظم بہت طویل ہے اس لئے کل نہیں دی جارہی ہے۔''(۱)

یہ نعت کلیات سہیل میں ۸۶/اشعار پر مشتمل درج ہے(۲) لیکن معارف میں ۵۵/اشعار ہی شائع کیے گئے ہیں۔(۳)

مولانا اسلم جیراج پوری کی شہرت عالم دین کی حیثیت سے ہے۔ تاریخ اسلام اور ادب سے بھی ان کو خصوصی مناسبت تھی۔ شعری ذوق بھی نکھرا ہوا تھا۔ مزاج میں دین کا عنصر غالب تھا۔ لہٰذا ''موج کوثر'' سے ان کا متاثر ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ اقبال سہیل اور مولانا جیراجپوری دونوں ہم وطن بھی تھے، جب مولانا نے اس نعت کا مطالعہ کرنے کے بعد اقبال سہیل کو خط لکھا اور خط میں اس نعت کے متعلق کلمات تحسین ادا کیے تو اقبال سہیل نے بھی اس کا مفصل جواب دیا۔ جواب میں چوں کہ نعت کی مقبولیت، سبب تحریر اور اس کے اسلوب بیان کے متعلق بعض ضروری تفصیلات خود اقبال سہیل کے قلم سے آگئی ہیں، اس لئے یہاں اس خط کے بعض حصے کا نقل کردینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، ایک دلچسپ بات اس خط میں یہ ہے کہ خود اقبال سہیل کی نظر میں یہ نعت ادبی وفنی لحاظ سے ان کے دوسرے نعتیہ کلام سے کم رتبہ ہے۔

مخدوم ومکرم زادمجدکم

گرامی نامہ موجب سرفرازی ہوا ''موج کوثر'' کے متعلق آپ جیسے بزرگوں اور ارباب نظر کے کلمات تحسین اور مخلصانہ ہمت افزائی میرے لئے یقیناً ایک غیر مترقبہ نعمت ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں نے زندگی بھر شعر کہے اور کبھی اشاعت کی پروا نہیں کی بلکہ دوسروں کی محنت سے جمع شدہ سرمایہ بھی ضائع کردیا لیکن یہ نظم جو محض اپنی بچی کو ''برھرہ'' کی زنانہ محفل میلاد میں پڑھنے کے لئے لکھ دی تھی اور عبدالرؤف سلمہ مالک ''سودیشی دوکان'' کے اصرار پر چھپوادی، اس درجہ مقبول ہوئی کہ اب خیال ہوتا

---

(۱) معارف مارچ ۱۹۴۴ء ص ۲۲۲

(۲) کلیات سہیل، عارف رفیع بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ بلاسس روڈ، ممبئی ۱۹۸۸ء۔

(۳) ص ۲۲۲ تا ۲۲۵۔

ہے کہ کم سے کم نعت و منقبت کا مجموعہ تو چھپوا دوں۔

''موجِ کوثر'' میں ایک خوبی تو ضرور ہے کہ درود شریف ہر شعر میں ردیف ہے۔ ورنہ میری دوسری نعتیں اور منقبتیں ادبی اور فنی حیثیت سے اس نظم سے بدرجہا بلند تر ہیں، حدودِ شریعت کی پابندی کا لحاظ دوسری نظموں میں اس سے بھی زیادہ ہے اور عام طور پر نعتوں میں جو حسنِ صورت کی مداحی اور تغزل کا انداز مولانا جامی کے عہد سے آج تک معمول بہ تھا یا دوسرے انبیاء و رسل کا استخفاف، غیر ضروری اور بے معنی مبالغہ یا لفظوں کی صنعت گری اور بے خیال آفرینی جو عرفی وغیرہ نے رائج کی اور محسن کاکوروی مرحوم نے اردو میں بھی منتقل کی۔ ان سے قطعی احتراز ہے، مگر سادہ و بے نمک بھی نہیں، شکوہ بیان اور بلندی ادا کا دامن ہاتھ سے کہیں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ ان قیود کی پابندی سے زبان ضرور کسی حد تک مشکل ہے، مگر میرا عام اندازِ تحریر نثر اور نظم دونوں میں اب تک یہی تھا۔ علاوہ بریں ایک نعت کے سوا جس کو لکھے ہوئے بائیس سال ہو گئے بقیہ تمام نعتیں صحیح طور پر درود شریف کا ترجمہ ہیں۔''(۱)

آخری پیراگراف سے محسوس ہوتا ہے کہ مولانا اسلم صاحب نے نعتیہ نظموں میں ''سادگی زبان'' کا لحاظ کرنے اور نعتوں کو چھپوانے کی تلقین کی تھی۔ اقبال سہیل لکھتے ہیں:

''انشاء اللہ آئندہ نعتیہ نظموں میں سادگی زبان کی بھی کوشش کروں گا مگر چھپوانے میں آج کل دقت یہ ہے کہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے غیر معمولی مصارف پڑ جاتے ہیں، اسی لئے خیال تھا کہ اگر ''موجِ کوثر'' کافی تعداد میں فروخت ہو جاتی تو اسی آمدنی سے بقیہ نعت و منقبت کا مجموعہ بھی فوراً چھپوا دیتا۔ ورنہ اختتام جنگ کا انتظار کرنا پڑے گا۔''(۲)

(۳) تیسرا نوٹ مدیر معارف نے مختصراً ''مبارک باد آزادی'' کے عنوان سے شائع شدہ نظم پر لگایا ہے۔ اقبال سہیل کی حب الوطنی، قوم پرستی جگ ظاہر ہے، انھوں نے انگریزوں سے ملک کو آزاد

(۱) کلیاتِ سہیل ص ۲۲

(۲) ایضاً۔

کرانے میں اہم رول ادا کیا تھا اور اپنی انقلابی نظموں سے ہندوستانیوں کے دلوں میں حرارت پیدا کردی تھی۔ ہندوستانیوں کی بے مثال قربانیوں کے نتیجہ میں جب ہندوستان کو آزادی ملی تو انھوں نے اہلِ وطن کو مبارک باد دی، ہر طرف جشن آزادیِ وطن کا سماں تھا، پورے ہندوستان میں جلسے اور مبارک باد کی مجلسیں منعقد کی جارہی تھیں۔ اہلِ اعظم گڑھ نے بھی آزادی کے لئے نمایاں قربانیاں پیش کی تھیں۔ تاریخ کے ان خوبصورت لمحوں کا حصہ بننے میں وہ کیوں کر پیچھے رہتے۔ یہاں بھی متعدد جلسے منعقد ہوئے۔ ان ہی میں سے ایک جلسہ میں اقبال سہیل نے شرکت کی اور اپنی یہ نظم پیش کر کے ہندوستانیوں کے حوصلہ کو بڑھایا۔ اس نظم میں پانچ پانچ مصرعوں پر مشتمل کل ۲۴ بند ہیں اور معارف کے ڈھائی صفحات پر محیط ہیں۔ نظم میں جہاں ضرورت شعری کے سبب مجاہدین آزادی کے نام ولقب نامکمل آئے ہیں حاشیہ میں قارئین کی سہولت کی خاطر پورا نام لکھ دیا گیا ہے۔ نظم کا پہلا بند ملاحظہ کرنے کے بعد سید صاحب کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

گلزارِ وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج ۔۔۔ سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت و چمن آج

غنچوں کا صبا توڑ گئی قفلِ دہن آج ۔۔۔ ہے ہر گلِ خنداں کی زباں پر یہ سخن آج

صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندانِ محن آج (۱)

مدیر معارف نے اس پر درج ذیل نوٹ تحریر فرمائے۔

”وہ نظم جو جشن آزادی ہند کے موقع پر ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو اعظم گڑھ میں پڑھی گئی۔“ (۲)

اس کے علاوہ بھی اقبال سہیل نے ”یوم آزادی، منظر رخصت (انگریزوں کی رخصتی کے موقع پر ۲۳ رفروری ۱۹۴۷ء کو لکھی گئی) آزادی ہندی وغیرہ کے نام سے لکھی جو کلیات سہیل میں موجود ہے۔

کاش مدیر معارف نے ان نظموں کے ساتھ ساتھ ”نغمۂ تہنیت بہ تقریب سمرنا، شام غم، صبح امید اور مرگ حیات آفریں“ وغیرہ جیسی نظموں پر بھی اپنے قیمتی نوٹس لکھ دیا ہوتا۔

مختصر یہ کہ اقبال سہیل فطری شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا سب سے عظیم اور قابل توجہ پہلوان

(۱) معارف ستمبر ۱۹۴۷ء ص ۲۱۳-۲۱۵

(۲) معارف ستمبر ۱۹۴۷ء ص ۲۱۳۔

کے اشعار کا الہامی اور فطری و وہبی ہوتا ہے۔ بہ قول مولانا سید سلیمان ندویؒ:

''شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑھ لکھ کر قابلیت کے زور سے شاعر بنتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آتے ہیں۔ کچھ بھی نہ پڑھتے تو بھی شاعر ہی ہوتے۔ پہلے لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں اور دوسرے فطری شاعر ہوتے ہیں۔ البتہ تعلیم ان کی شاعری کو جلا دیتی ہے۔ ہمارے دوست اقبال سہیل صاحب دوسری قسم کے شعرا میں ہیں یعنی فطری و طبعی شاعر ہیں۔'' (۱)

ان کی حیات کے اس پہلو سے دلچسپی رکھنے والا تقریباً ہر شخص واقف ہے کہ ان میں لا ابالی پن تھا، اپنی اسی کمی کے سبب زمانہ کی نظروں میں وہ مقام حاصل نہ کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک نمونے ان کے کلام کے ضائع ہو گئے۔ معارف نے ان کے کلام کے ''مشتے از خروارے'' جو نمونے حاصل کئے ان کو شائع کر کے محفوظ کر دیا۔ جو بعد میں ''کلیات سہیل'' کے مرتب کے کام آئے۔ یہاں صفحات کی تنگ دامانی حائل ہے اسی لئے معارف میں ان کے شائع شدہ کلام پر سطور بالا میں مختصراً گفتگو کی گئی ہے اور خواہش کے باوجود ان کے کلام کے فنی خصائص کا تجزیہ نہیں کیا جا سکا۔

☆☆☆

(۱) اقبال سہیل کا فن ص ۱۱۔

اقبال سہیل کا تفاعل شعری

ڈاکٹر خالد علوی ☆

اقبال سہیل کی شاعری پر گفتگو سے قبل ان کے شعری نظریات پر بھی نظر ڈالی جائے۔ تو بہتر ہوگا دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال سہیل کے ہم عصر شعرا میں بہت کم شعرا ایسے گزرے ہیں جو شعریات اور جمالیات کا ستھرا ذوق رکھتے ہوئے اپنے نظریات کا باقاعدہ اظہار کرنے پر قادر بھی ہوں۔ رشید صاحب نے جگر صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ کسی دوسرے کی شاعری پر ہی نہیں بلکہ اپنی شاعری پر بھی چند جملے کہنا مشکل تھا۔ صرف جگر ہی نہیں۔ اصغر اور فانی بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یگانہ کے علاوہ صرف اقبال سہیل ہیں جو شعر کی جزویات و جمالیات اور ندرت و جدت پر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ شاعر اور عام انسان کے مشاہدے کا فرق، لطافت احساس، طریقہ اظہار اور انتخاب الفاظ پر ان کی خاص نظر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری جیسی ذوقی اور وجدانی چیز پر کیفیات نفسی کی تعبیر الفاظ میں بیان کرنا مشکل کام ہے۔ شاعری روح پر رقص پیہم کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ شعر کی نغمگی اور روح پر اس کی سحر انگیزی میں جو ربط معنوی ہے اس کا اظہار ایک مشکل امر ہے۔

اقبال سہیل کا خیال ہے کہ شاعری حسن مجرد کی اس مصوری کو کہتے ہیں جس میں لطیف موسیقی بھی شامل ہو۔ تمام فنون لطیفہ میں شاعری مسلمہ طور پر سب سے بلند تر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری کی سلطنت میں اسرار و معارف کی پر اسرار دنیا بھی شامل ہے جہاں دوسرے فنون کی پہنچ نہیں ہے۔ جہاں وہ ہندی کے ایک قدیم شاعر کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔

جہاں نہ پہنچے روی وہاں پہنچے کوی

☆ 79, South Avenue New Delhi

وہ تمام فنون لطیفہ کا موازنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک موسیقار ایک مصور یا ایک سنگ تراش کی پرواز تخیل اس معلوم و موجود کائنات سے تجاوز نہیں کر سکتی جب کہ شاعر کا ذہن عالم قدس تک پرواز کرتا ہے اور نشہ بے کیف اور معنی بے صورت کو پیکر میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ اقبال سہیل کا خیال ہے کہ شاعری ایسا فن لطیف ہے جس میں موسیقی، بت تراشی، مصوری اور اسرار و معارف کے تمام رموز مدغم ہو جاتے ہیں۔ دیگر تمام فنون ہماری صرف ایک حس کو متاثر کرتے ہیں جب کہ شاعری، سامعہ، باصرہ، متخیلہ، نفس ناطقہ اور روحانیت کو متاثر کرتی ہے۔

آل احمد سرور کا خیال ہے کہ یوں تو سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی، عبد الباری ندوی مہدی افادی، عبد الماجد دریابادی، سجاد انصاری شبلی ہی کے خوشہ چیں ہیں لیکن شبلی کی شخصیت اور شاعری کا سب سے دلآویز اور نکھرا ہوا روپ مولانا سہیل کے کلام میں نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال سہیل کے کلام و شخصیت میں نہیں بلکہ ان کے شعری نظریات میں بھی شبلی کا بہت نمایاں اثر ہے۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' میں شبلی نے انتخاب الفاظ اور شوکت الفاظ پر بہت توجہ کی ہے انیس کی عظمت کی وجوہات میں ان کا سلیقہ الفاظ بھی اہم وجہ قرار دیا ہے۔ اقبال سہیل نے یوں تو بہت زیادہ تنقیدی نظریات کا اظہار نہیں کیا لیکن اصغر کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے تقریباً شبلی کے نظریات کا ہی اطلاق کیا ہے۔ ان کا خیال ہے۔

''جن شعرا نے الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترکیب میں موسیقی اور ذوق صحیح کا لحاظ رکھا ہے وہ زندۂ جاوید ہیں دیوان حافظ کی اس عالمگیر اور ابدی مقبولیت کا راز کیا ہے؟ محض دروبست الفاظ اور شگفتگی ترکیب کا طلسم'' لیکن جہاں شاعری کے لئے یہ عنصر سب سے زیادہ ضروری ہے وہاں مشکل یہ ہے کہ یہ چیز محض ذوقی ہے۔

اقبال سہل کے مطابق شعرا کو الفاظ کی ترکیب باہمی میں اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ ان کی حرکات و آواز باہم متضاد بھی نہ ہوں تاکہ تنافر پیدا نہ ہو اور اس قدر یکساں بھی نہ ہوں کہ لطف تنوع معدوم ہو جائے۔ بلکہ پستی و بلندی، ہلکی و گرانی، زور و نزاکت اس تناسب اور توازن کے ساتھ باہمی طور پر پیوستہ ہوں کہ ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا دشوار ہو جائے اقبال سہیل صرف انتخاب الفاظ پر ہی زور نہیں دیتے بلکہ صوتی خوش آہنگی کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں تاکہ بندش چستی کے ساتھ ایک لطیف

انبساط بھی پیدا ہو جائے اور شعر میں خرام جوئبار کی طرح فطری لیکن معتدل روانی آجائے۔ اول تو ثقیل اور بار گوش آوازوں سے احتراز کیا جائے لیکن آغاز تو کسی ثقیل اور بھدی آواز سے قطعی نہ کیا جائے۔ قافیہ، ردیف یا شعر کے آخری لفظ کا تلفظ اور آواز نامانوس نہ ہو ایسے الفاظ ذوق سامعہ پر اس طرح گراں گزرتے ہیں جس طرح رات کے سناٹے میں کسی اونچی جگہ سے پھوا پانی میں چھلانگ مارے۔

اپنے شعری نظریات کی تشکیل میں بعض مقامات پر اقبال سہیل کے خیالات مولانا حالی کے خیالات کی بازگشت بن جاتے ہیں۔ وہ غالب اور اقبال کے تتبع میں عربی و فارسی کی دقیق تراکیب کو غلط قرار دیتے ہوئے بازاری محاوروں سے زیادہ نفرت انگیز قرار دیتے ہیں وہ کسی بھی ایسی ترکیب کو ممنوع سمجھتے ہیں جس میں کسی طرح بھی ذم کا پہلو نکلتا ہو۔ وہ کسی بھی ایسی رنگین بیانی کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں جو دیانت یا نسائیت سے قریب ہو۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ شعر کا خطاب اعلیٰ ترین اور شریف ترین انسانی جذبات سے ہوتا ہے۔

انہوں نے ایک اور نکتے پر زور دیا ہے کہ زمزمہ نشاط اور مالہ ماتم، انسانی زندگی کا جزو ہیں لیکن انسانی طبائع کو داستان غم سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی ترانہ مسرت سے۔ وہ رنج والم کو زندگی کا لازمی عنصر قرار دیتے ہوئے بھی شعری کائنات سے دربدر کرنا چاہتے ہیں۔ غالب نے شاعری کو معنی آفرینی کہا ہے لیکن سہیل رقص معانی قرار دیتے ہیں۔ ''رقص'' کے تلفظ کے ساتھ مسرت و شادمانی وابستہ ہے۔ وہ ڈوبی ہوئی نبضوں، پتھرائی ہوئی آنکھوں اور نزع کی ہچکیوں کو زندہ در گور شعرا کی بدمذاقی تصور کرتے ہیں۔

اگر چہ اقبال سہیل قدیم شعری سرمائے کو وقیع سمجھتے ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں فانی اور اصغر کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن ندرت اور جدت کی تائید کرتے ہیں وہ ندرت بیان کو شاعری کی روح سے تعبیر کرتے ہیں وہ فرسودہ اور پامال خیالات کو دوبارہ بغیر کسی ندرت بیان کے پیش کرنے کو قابل تعزیر جرم سمجھتے ہیں لیکن تاکید بھی کرتے ہیں کہ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہر جدید تخیل یا ہر نئی طرز ادا بلا کسی تخصیص کے دلفریب ہوتی ہے۔

شاعری اور افادیت پر بھی اقبال سہیل کا واضح نظریہ ہے۔ وہ سفیہانہ، عامیانہ، غلامانہ اور منافقانہ انداز کی شاعری کو مبتذل سمجھتے ہیں اور صرف اسی قدر افادیت کے قائل ہیں اس حد سے آگے بڑھ جانے کو شاعر کے منصب سے خارج سمجھتے ہیں اور واعظانہ کہتے ہیں شاعر کا منصب واعظ سے کہیں

بلند ہے۔ ان کو شاعری ایک حساس دل کی قلبی کیفیات کا آئینہ معلوم ہوتی ہے اس سے بحث نہیں کہ خارج میں اس کے نتائج کیا مرتب ہوں گے۔ کسی خارجی مقصد کو پیش نظر رکھ کر شعر کہنا خود مفہوم شعر کے منافی ہے۔ وہ خالق باری کے مقابلے میں زہر عشق اور دیوان داغ کو بے مثل سمجھتے ہیں۔

شبلی نے جس عمل کو محاکات کہا ہے۔ اقبال سہیل اسے مصوری کہتے ہیں ان کے مطابق مصوری شاعری کا ضروری عنصر ہی نہیں اصلی جان ہے۔ مصوری کی بہترین مثال کے لئے نظام رام پوری اور داغ کے اشعار پیش کرتے ہیں۔

لئے جاتا تھا جنوں جانب صحرا ہم کو
دیکھتے جاتے تھے منہ پھیر کے گھر کی صورت

انگڑائی بھی نہ لینے وہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

نظام رامپوری

اقبال سہیل کی شاعری اگر تمام تر نہیں تو زیادہ تر تو یقیناً ان کے نظریات کے تابع ہے اس میں شک نہیں کہ بعض مقامات پر وہ اپنے نظریات کی نفی کرتے نظر آتے ہیں لیکن ایسا کم بہت کم ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی غزل میں عشق کی خودداری اور برتری ہر جگہ نظر آتی ہے۔

سُن نہ کلیم کی طرح حسن کی لن ترانیاں
حُرمت عشق کی قسم، عشق کو ملتجی نہ دیکھ

مرا صبر حد سے گزرا، مگر اے سہیل اب بھی
وہ زباں نکال پھینکوں جو طلب کرے ترحم

آخر غرور حسن کو کھانی پڑی شکست
میرے نیاز عشق کو خود دار دیکھ کر

وارفتگان شوق کو سمجھا ہے تو نے کیا
ان میکشوں میں ہوتے ہیں یزداں شکار تک

دل خطاوار اشتیاق سہی
لب گنہ گار التجا نہ ہوا

عشق اور حسن سے سوال کرم
یہ تو غیرت کا اقتضا نہ ہوا

اردو غزل نے ایسے غیرت مند عاشق بہت کم دیکھے ہیں۔ قائم چاند پوری کی مثال دی جا سکتی ہے جس کی بے دماغی حسن سے بھی فزوں تر ہے۔

بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا
مرتبہ عشق کا یاں حسن سے کب دور گیا

لیکن سہیل کی غزل کا عشق محبوب سے تو التجا کر ہی نہیں سکتا بلکہ وہ صدقے میں ملی بہشت بھی قبول نہیں کرتا۔

ننگ ہے بے عمل قبول بہشت — یہ تو صدقہ ہوا صلہ نہ ہوا

اول تو وہ التجا اور نالہ وبکا کے قائل ہی نہیں لیکن نالہ بہ امید اثر صریحاً بوالہوسی ہے۔

دل کی دنیا میں کہاں سو دو زیاں کا سودا
بوالہوس نالہ بہ امید اثر کرتے ہیں

وہ بہرحال عشق کی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

فغاں سنجیاں ہیں نہ خونباریاں ہیں — یہ دردِ محبت کی خودداریاں ہیں

ان کا عشق ہی خوددار اور غیور نہیں بلکہ حسن بھی بے حد نازک مزاج ہے۔

انجام وفا بھی دیکھ لیا اب کس لئے سر خم ہوتا ہے
نازک ہے مزاج حسن بہت سجدے سے بھی برہم ہوتا ہے

اور یہ شعر تو غالباً ان کے زمانے سے زیادہ ہمارے عہد پر صادق آتا ہے۔

عقوبت ہائے فردا سے ڈراتا کیا ہے اے واعظ
یہ دنیا رفتہ رفتہ خود جہنم ہوتی جاتی ہے

اقبال سہیل کے بعض اشعار تو یقیناً اس قابل ہیں کہ اردو کے ہر انتخاب میں جگہ ملنی چاہئے۔

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے
بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

آشوب اضطراب میں کھٹکا جو ہے تو یہ
غم تیرا مِل نہ جائے غم روز گار میں

ہم نشیمن کو بھی روئیں تو خطا ہوتی ہے
پھونک ڈالیں وہ چمن بھی تو ہنر کرتے ہیں

صیاد نے اس طرح سجایا ہے قفس کو
آتی نہیں اب مجھ کو نشیمن کی فضا یاد

اقبال سہیل کی بہت سی غزلیں اساتذہ کی زمینوں میں ہیں ۔

نالہ اچھا ہوا رسا نہ ہوا
مجھ پہ احساں تو چرخ کا نہ ہوا

اب ضبط شوق بکا متحمل نہیں رہا
دل جلوہ گاہ حسن کے قابل نہیں رہا

رتبہ داں تھا جبینِ عشق کا میں
حسن کے در پہ جُبہ سا نہ ہوا

وفا فروش نہیں ہم کہ مثل لالہ و گل
پھریں دکھاتے ہوئے زخم خونچکاں اپنا

اتنا تو ہوش ہے اسے دیوانہ کیوں کہیں
جو پھوڑتا ہے سر تری دیوار دیکھ کر

صرف غالب ہی نہیں سہیل کے کلام میں فانی، اصغر اور جگر کی زمینوں میں بھی غزلیں مل جاتی ہیں۔ اثر لکھنوی نے اپنے مضمون میں باقاعدہ موازنہ کر کے فانی، اصغر اور جگر سے ان کی برتری قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اثر لکھنوی کا خیال ہے کہ اصغر کی شاعری کا موجودہ رنگ سہیل کا ہی فیضان ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ لیکن اصغر نے جس طرح اپنی شاعری کی نشو ونما کی سہیل نے نہیں کی اب اصغر اپنے رنگ کے مالک ہیں ہماری شاعری کی تاریخ میں بہت سے شاگردوں کا اساتذہ سے آگے بڑھ جانا عام بات ہے۔ سہیل کی شخصیت اور شاعری پر شبلی، حالی اور اقبال کے بہت واضح اثرات ہیں

لیکن انہوں نے اردو فارسی کے تمام شعرا سے اکتساب فیض کیا ہے۔ وہ ذوق کے قائل نہیں ہیں لیکن شعر میں ذوق کے قصیدے کا یہ تو نظر ہے۔

کمال یہ ہے کہ مثل گوہر نہ ہو تہہ آب دامن تر
رہے ملک بے گنہ فلک پر تو کون سی پاک دامنی ہے

ذوق کے قصیدے کا شعر ہے۔

پاک دنیا سے ہیں، دنیا میں ہیں گو پاک سرشت
فرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر

غالب نے کہا تھا۔

میرے پتے سے خلق کو کیوں ترا گھر ملے

سہیل کہتے ہیں۔

اگر چلنا تو نقش پا بھی لغزش سے ہٹا دینا
نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتا دینا

ایک شعر یگانہ سے بھڑ گیا ہے۔

ادھر ہے چتونوں پر بل ادھر تبسم آنکھ میں
عجیب کشمکش سی ہے عنایت و عتاب کی

عقل و عشق کی کشمکش اقبال کے کلام میں عام ہے۔ اقبال سہیل نے بڑے سلیقے سے کہا ہے۔

عاقل مصلحت شناس کو یہ مرا پیام ہے
عشق جنون ہی سہی، قابل احترام ہے

فانی کے اس مشہور شعر کا مضمون اقبال سہیل کے اس مضمون میں نظر آتا ہے۔

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلہ قید حیات
فرق اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

سہیل کہتے ہیں۔

شکل زنداں بدل گئی ورنہ
مر کے میں قید سے رہا نہ ہوا

سودا نے کہا تھا۔

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سہیل کا شعر ہے۔

تو نفس کی آمد و شد کو سمجھتا ہے حیات
میں یہ کہتا ہوں وداع جاں ہے جان زندگی

اقبال سہیل کے اس شعر۔

زاہد کو اپنے حسن عمل پر غرور ہو
مجھ کو تو تری شان کریمی پہ ناز ہے

سے شعری بھوپالی نے چراغ جلایا ہے۔

ترے کرم کے بھروسے پہ حشر میں یارب
گناہ لایا ہوں اور بے حساب لایا ہوں

سیاسی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی جس میں غزل کا رمزیہ انداز اور غزل کے اشارات۔ کنایات موجود ہوں۔

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے
گریباں کو لڑایا آستیں سے
وہ چشم فتنہ گر ہے ساقی میخانہ برسوں سے
کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے
پہنچی وہاں بھی شیخ و برہمن کی کشمکش
اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

علی جواد زیدی کا خیال ہے کہ فیض کی شاعری کی عمارت ان ہی بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہے جن کی

بنا اقبال سہیل نے رکھی تھی اور آج بھی بہت سے شعرا جس کی خوشہ چینی کر رہے ہیں۔

سہیل نے اپنی مذہبی شاعری میں بھی غیر ضروری مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا ہے انہوں نے نعتیہ احترام ملحوظ رکھتے ہوئے لفظی بازی گری اور صنعت گری کو کہیں بھی جگہ نہیں دی۔ ان کے زیادہ تر قصائد بھی نعتیہ ہیں۔ وہ بیسویں صدی کے آخری قصیدہ گو ہیں ان کے تمام قصائد ان کی قادر الکلامی کے مظہر ہیں۔ اگر ان کے صرف ایک نعتیہ قصیدہ کا بھی مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ اردو کی قدیم اساتذہ کی صف کے بے مثال قصیدہ نگار ہیں۔ نوے اشعار کے اس قصیدے کا اختتام اپنی عجز بیانی کے اعتراف پر کرتے ہیں۔

خرد عاجز، نظر خیرہ، زباں کج مج، بیاں قاصر
زمین نعت میں کیا دیجئے داد سخن دانی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ اشعار سوداؔ کے قصیدے میں شامل کر دیجئے تو اسی معیار کے معلوم ہوں گے۔

کرے تار شعاعی لاکھ اپنی سعی امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی
وہی سمجھیں گے جو واقف ہیں اسرار محبت سے
کہ یکساں جانگسل ہے ذوق وصل و درد ہجرانی
ادھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمت مشرق سے
اُدھر بزم جہاں سے رخصتِ شمع شبستانی
ادھر سبزے کا جاگ اٹھنا خمار خواب نوشیں سے
ادھر بادِ سحر سے زلفِ سنبل کی پریشانی

مرا خیال ہے کہ اقبال سہیل کے قصائد پر ان کے تمام اردو کلام اور فارسی کلام پر قصائد سے زیادہ توجہ کی جانی چاہئے۔ اقبال سہیل کا تمام کلام ان کی لاپرواہی کا شکار رہا اب ہماری بے حسی کا ماتم کر رہا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا قول ہے

"مولانا کے فارسی کلام میں اردو سے زیادہ طرفگی اور نازکی ہے ان کے فارسی

قصائدان کی فارسی دانی کا ادنیٰ ثبوت ہیں اثرلکھنوی کا خیال ہے کہ جب وہ اپنے فارسی قصائد سناتے تھے تو یہ امتیاز مشکل ہو جاتا تھا کہ عرفی یا قاآنی نواسنج ہے یا سہیل۔ وہی رفعت خیال و معنی آفرینی، وہی رعنائی و لطافت وہی شرینی وہی وحدت وندرت پیدا کر دی تھی جو متاخرین شعرائے فارسی عرفی، نظیری، ظہوری وغیرہ کا طرۂ امتیاز ہے۔"

آل احمد سرور نے اقبال سہیل کی فارسی شاعری کو اس عجمی نغمے سے تعبیر کیا ہے جس کی لے مجازی ہے

"غالب کے بعد ہندوستان میں فارسی کے اچھے شاعر کم ہی ہوئے ہیں شبلی، خواجہ عزیز لکھنوی، گرامی، ان شعرا میں سے ہیں جن کے یہاں بادۂ عجم کا کچھ رس ملتا ہے اس دور میں اقبال سہیل، اس رنگ کے تنہا نمائندے ہیں" اقبال سہیل کے فارسی قصائد دیکھئے تو شبلی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے"

اقبال سہیل نے شعری نظریات و خیالات کا جو اظہار کیا ہے اس کا اطلاق ان کی فارسی شاعری میں بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ سروجنی نائیڈو کی علی گڑھ آمد پر جو فارسی نظم انہوں نے کہی تھی وہ واقعی تمام حواس خمسہ کو متاثر کرتی ہے۔

بہ شب چو مہر خاوری بہ روئے خود نقاب زد
زمانہ تاج سروری بہ فرق ماہتاب زد
تبسمش تکلمے، تکلمش ترنمے
سزد اگر تلاطمے بہ جانِ شیخ و شاب زد

☆☆☆

موجِ کوثر کی قراءت

پروفیسر مولا بخش☆

نعتیہ قصیدہ یا نعتیہ شاعری کی جملہ صورتیں اس امر کا اعلان کرتی ہیں کہ کوئی بھی متن خالص نہیں بلکہ ہر متن بین متن کا مظہر ہے۔ یعنی شاعری یا ادب اپنے اسلوب اور طرزِ احساس کی وجہ سے ہی عظیم قرار پاتا ہے۔ غزل میں دیکھئے مضامین متحدہ کا سیلاب ہوتا ہے مضامین مختلفہ تو چند خوش قسمت شعراء کے یہاں ہی بمشکل نظر آئے اور یہ مضامین متخیلہ بھی کیا ہیں وہ جو قاری کے حافظے سے سرک کر تحت الشعور کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔ قصیدہ گو وہ مذہبی عظیم المرتبت شخصیات کا ہو، انبیاء، صحابہ، ائمہ، صلحا کا ہو یا کسی بادشاہ، وزیر یا صاحب حیثیت کا، یہاں یہ تو طے ہے کہ تعریف یا ہجو کی جائے گی یعنی مضمون بھی کے تقریباً طے شدہ ہوتے ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ ان میں کوئی خاقانی تو کوئی سودا تو کوئی محسن کاکوروی اور کوئی اقبال تو کوئی اقبال سہیل صرف اس لئے بن جاتا ہے کہ وہ زبان و بیان کی طرفگی اور مصرعوں کے معنوی تیوروں کا خیال رکھتے ہوئے طے شدہ مضمون میں معنی کے نئے کرن کو محسوس کر لیتا ہے یعنی کسی ایک مظہر یا ممدوح کی ذات کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا فنی ہنر رکھتا ہے، جیسے معراج کا واقعہ نعت میں مشہور ترین مضمون بنتا آیا ہے۔ اسے اقبال نے نئے معنوی تیور میں کچھ یوں دیکھا:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہاں حضورؐ کو عظمت انسانی کی دلیل بنا کر کیوں کر پیش کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال ہی کی طرح اقبال سہیل نے نعتیہ قصیدوں، مثنویوں، قطعات، منقبتوں، نعتیہ خمسوں اور غزلوں میں معنیاتی دروں اور طرفگی خیال کے سہارے عشق رسول سے متعلق جذبات و احساسات کی

☆ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نغمۂ دلنواز چھیڑا ہے جو اپنے سننے اور پڑھنے والوں کو شاہ عربؐ سے محبت اور سرشاری کے متبرک عالم میں لے جانے کا براق بن جاتا ہے۔

نعتیہ ادب کے ایک نقاد عزیز احسن نے اپنی کتاب اردو نعت اور جدید اسالیب میں لکھا ہے:

''اردو کی نعتیہ شاعری میں شاعرانہ رویے کا شروع ہی سے فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں بڑی شاعری اب تک صرف ایک خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر ہونے کے لئے شعراء کو مسلسل دعوت دے رہا ہے۔'' (عزیز احسن، اردو نعت اور جدید اسالیب (۱۹۹۸ء) فضلی سنز پرائیویٹ لمٹیڈ، اردو بازار کراچی، ص:۳۴)

اس خیال سے اتفاق کرنا ذرا مشکل ہے لیکن یہ سچ ہے کہ نعت کہتے وقت ننانوے فیصد شعراء شعریت کو ذہن میں نہ رکھتے ہوئے کھوکھلی تعریفوں اور ثواب پر نظر رکھتے ہیں۔ لیکن اردو میں اس ذیل میں کسی حد تک حالی اور بڑی حد تک اقبال، محسن کاکوروی، امام احمد رضا اور اقبال سہیل کے علاوہ حالیہ زمانہ میں بھی چند شعراء نے نعتیہ شاعری کے ذریعے عام شاعری کے معیاروں سے آگے جانے کی مثالیں فراہم کی ہیں۔ اقبال سہیل کے نعتیہ قصیدے زبان و بیان اور شکوہ بیان کے لحاظ سے اردو میں اعلیٰ شاعری کا نمونہ تو ہیں ہی نعت کہنے کا پیمانہ بھی وضع کرتے نظر آتے ہیں۔ زیر غور قصیدہ ''موج کوثر'' صنف قصیدہ کے صوری و معنوی ابعاد و عناصر کو فنی طریقے سے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ہر چند کہ یہ قصیدہ قصیدے کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے جہاں تشبیب نہیں ہوتی۔ قصیدہ گو راست طریقے سے مدح سرائی سے ہی قصیدے کا آغاز کرتا ہے اور دعا پر قصیدہ اختتام کو پہنچتا ہے لیکن اقبال سہیل کے دیگر نعتیہ قصائد میں بہاریہ، فلسفیانہ اور حکمت سے معمور سودمند علوم سے متعلق تشابیب کے علاوہ گریز کی فنی صورتیں اگر بہت اعلیٰ نہیں تو کم از کم اس پائے کی ضرور ہیں جنہیں قارئین حیرت سے پڑھتے ہوئے ایک خاص نوع کی جمالیاتی کیف کے ساتھ رسالت مآبؐ کے قریب خود کو محسوس کریں۔

اقبال سہیل اپنے قصیدوں میں اپنے ممدوح کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں، اگر بغائر نظر سے دیکھیں تو ان کے نعتیہ قصائد میں ملک کے مسائل، اپنی قوم کی زبوں حالی اور ملک کی غلامی سے نالاں اور انگریزوں کے استبدادی نظام، کالونیل جبر کا دکھ سرور کائناتؐ سے مخاطب نظر آتا ہے۔ ان کے قصیدے مشرقی اقدار کی بازیافت اور نوآبادیاتی آقاؤں کی ذہنیت کا پردہ فاش یوں کرتے ہیں کہ وہ

دنیا کے ایک ایسے انسان کے حضور قاری کو لے جاتے ہیں جس کا نام پوری دنیا میں ایک ہی وقت میں بلند میناروں سے پکارا جاتا ہے اور جس نے دنیا میں اللہ کا غلام بننے کے علاوہ کسی بھی ہستی کی غلامی سے نجات کا راستہ دکھایا ہے۔ دیکھئے اپنے عہد کی انگریزی سیاست اور اس کے خلاف آزادی کی سیاسی جد وجہد کس طرح نعت نبی کے مندرجہ ذیل شعر کی بندشوں میں معنی کی لاشعوری جہتوں کو مترشح کرتے نظر آتے ہیں۔

باغ جہاں کا حارس نامی جس نے مٹائی رسم غلامی
پھر سے سنوارا گلشن آدم صلی اللہ علیہ وسلم

'پھر سے سنوارا گلشن آدم' مصرعے کا آدھا یونٹ دنیا کو سنوارنے کے جتن اور سنت نبویؐ کی ادائیگی کے نئے سیاق کی طرف قاری کو لے جاتا ہے۔ یعنی گلشن آدم کو سنوارنے کی صورت انہیں ہندوستان کو انگریزوں سے پاک کرتے ہوئے تحریک آزادی میں نظر آئی۔ آگے بیٹے حضور کی ذات اقدس نے جہاں ان گنت عجوبے بطور اصلاح کئے ان میں سے ایک دو یہ بھی ہیں:

وہم کی ہر زنجیر کو توڑا رشتہ ایک خدا سے جوڑا
شرک کی محفل کردی برہم صلی اللہ علیہ وسلم
فرد و جماعت، امر واطاعت، کسب وقناعت، عفو وشجاعت
حل کئے جو اسرار تھے مبہم صلی اللہ علیہ وسلم

پہلے شعر میں توحید کا فلسفہ اور ایک خدا سے رشتے جوڑنے کی بابت خبر سرتاپا سیاست مدن کا بھی سیاق رکھتا ہے کہ قوم اسی توحید کی بنیاد پر خلق ہوتی ہے۔ دوسرے شعر میں عطفی مرکبات، فرد و جماعت، امر واطاعت، کسب وقناعت، عفو وشجاعت اپنی جگہ مستقل سماجی، سیاسی اور روحانی فلسفے کی جہت رکھتے ہیں۔ فرد اور جماعت میں سے کون اہم کو غیر اہم، ان کے مابین جدلی رشتہ ہے یا تکملے کا۔ جماعت کے بغیر فرد اور فرد کے بغیر جماعت کے معنی کیا ہوں گے۔ یعنی خودی بغیر بے خودی کیا معنی رکھتی ہے شاید کچھ نہیں اور یہ کہ جماعت کے لئے خودی کے لئے فرد/خودی کی تشکیل کا جذبہ ہی اصل فرد و جماعت کا جوہر ہے۔ حکم کون دے کیوں دے اور کس طرح کا حکم دے۔ اطاعت کب بزدلی ہوجاتی ہے کب کار ثواب، یہ حضورؐ نے ہی ہمیں دکھایا۔ صبر کے اصل مفہوم کیا ہیں اور عمل کسب کی شرعی جہت کیا ہیں۔

معاف کون کرسکتا ہے، کسی کو معاف کرنا کیوں کرشجاعت کا جوہر ہے۔ ایک مصرعے میں اقبال سہیل نے انسانیت کے جوہر کے فلسفے کو کشید کر کے رکھ دیا ہے اور مژدہ سنایا ہے کہ ان غیر واضح فلسفوں اور تصورات کو آقا نے دنیا میں آ کر بالکل دو اور دو چار کی طرح سمجھا دیا۔

یہ موج کوثر یعنی قصیدہ میمیہ سے ماخوذ چندان اشعار سے ماخوذ نمونے تھے جن میں مادح یعنی اقبال سہیل نے رسالت مآب کی انسانیت کے تئیں خدمات اور کارنامے گنوائے ہیں۔ ۸۶/ اشعار پر مبنی یہ اقبال سہیل کا سب سے طویل قصیدہ ہے جس کی ردیف درود شریف ہے۔ اس قدر کے طویل قصیدے میں قافیے کو نبھانا اور خود کو معاظلے کے عیب سے بچائے رکھنا یعنی اگر دوبارہ یا سہ بارہ کسی قافیے کو اگر باندھا ہے تو قافیے یعنی لفظ کے معنی اور مزاج کو بدل دینے میں کامیابی حاصل کرنا، قارئین کو انہیں داد و تحسین دینے پر مجبور کرتا ہے۔

دوسری خوبی اس قصیدے کی یہ ہے کہ فعل فعلن فعلن فع کی مثمن صورت کو یعنی آٹھ رکن کو چار چار میں بانٹ کر ہر چار رکن میں قافیے کا التزام رکھا ہے اور بہت سے ایسے اشعار ہیں جن میں قافیوں کی برسات ہے یعنی Internal Ryhme برائے لفظی تکرار ہی نہیں بلکہ معنی آفرینی کا ذریعہ بنتے نظر آتے ہیں۔ اس ذیل میں موج کوثر سے ماخوذ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بزم ملل تھی نظم سے خالی بکھرے ہوئے تھے حق لآلی
اس نے کئے سب آ کے منظم صلی اللہ علیہ وسلم

حفظ مراتب پاس اخوت سعی و توکل رفق و فتوت
تک حدود اللہ میں منضم صلی اللہ علیہ وسلم

الفت قربیٰ، قطع علائق، حب وطن اور حب خلائق
کر دیے سب توحید میں مدغم صلی اللہ علیہ وسلم

مذکورہ اشعار کے مصرع اول میں خالی، لآلی، اخوت فتوت، علائق خلائق، اتنے طویل قصیدے کے ہر شعر کے مصرع اول میں قافیے کے اس التزام کی وجہ سے شعر کی معنیاتی حسن پر فرق پڑنا لازمی تھا۔ لیکن حیرت ہے اقبال سہیل نے اس التزام کو معنی آفرینی کا ذریعہ بنا لیا ہے جس کی داد فن کے استاذ اور اساتذہ نے انہیں دی ہے۔ جیسے اسلم جیراجپوری، افتخار اعظمی، مرزا احسان بیگ، شاہ معین

الدین احمد ندوی اور عطیہ خلیل عرب کے علاوہ نعت کے ہمعصر نقاد جیسے صبیح رحمانی کے توسط سے انور سدید اور عزیز احسن وغیرہ۔

آیئے اب ذرا قافیوں کی بہار اور اس کے معنیاتی حسن کا مظاہرہ کریں۔

اسوۂ اجمل، دینِ مشل، نطق مدلل، وحی منزل
شرع معدل، سلمِ مسلم صلی اللہ علیہ وسلم
مقصد امکاں، مہبط قرآں، منبع احساں، مرجعِ دوراں
روح کے درماں قلب کے مرہم صلی اللہ علیہ وسلم
باطن وظاہر، طیب وطاہر، خسر وقاہر، کوکب باہر
جان مظاہر، مرکز عالم صلی اللہ علیہ وسلم
کنز دقائق، حسن حقائق، جان حدائق، روح خلائق
سب پر فائق، سب پر اقدم صلی اللہ علیہ وسلم
مہر رسالت، مہر جلالت، عین عدالت، خضر دلالت
اے بہ کمالت ناطقہ ابکم، صلی اللہ علیہ وسلم

آپ نے قافیہ در قافیہ کی مذکورہ بالا صوتی جھنکار اور ان میں موجود معنی آفرینی کے سیاق وسباق کو ملاحظہ فرمایا۔ شعر نمبر (۳) دیکھیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ جن لفظوں کو قافیہ کیا ہے وہ محض صوتی جھنکار نہیں معنوی جھنکار اور معنی آفرینی کا ذریعہ بنے ہیں۔ کہا ہے کہ آقا کو کہ آپ جان مظاہر ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی روح ہیں۔ ہم خاکی عام انسان ظاہر و باطن میں توازن نہیں رکھ پاتے۔ اس بات پر جھگڑنے لگتے ہیں کہ رسول عربی روح ہیں یا جسم یا جسم وروح معراج روحانی ہے یا جسمانی۔ ذرا غور کیجئے ذوقافیتین کا التزام سیرت نبویؐ کے عجائب کے کتنے باا ثر بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں یا انہیں چشم بصیرت سے دیکھنے کا ملکہ اپنے قارئین یا سامعین میں کیوں کر پیدا کرتے ہیں کوکب باہر کہہ کر حضور کی ذات کے وصف کو دو چند کر دیا ہے اور وہ یہ کہ ہر چمکتی شے کو دیکھنے کے بعد نہ جانے کیوں ہمیں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وہ باہر سے چمکیلی تو ہے اندر سے کیسی ہوگی ہم اس شے کے پورے وجود کو روشن خیال کرتے ہیں یعنی حضور کو ہم ظاہر و باطن کی اصطلاحوں میں بانٹ کر نہیں دیکھ سکتے بھلا سورج میں

اندر سے خالی اور باہر سے آگ بھری ہوئی ہے، ایسا خیال ہمارے ذہن میں کیوں نہیں آتا۔ وہ اندر اور باہر سے ہمیں یکساں ہی تو نظر آتا ہے۔

کوکب باہر کو دیکھئے کوکب ستارہ جیسے ہی ذہن میں آتا ہے روشن ہوتا ہے اس میں جوڑا ہے باہر اور جس کے معنی چمک اور روشنی کے ہیں۔ التباس بھی خوب ہے باہر سے باہر کا دھوکہ بھی ہوتا ہے کہ جو اندر سے روشن ہے وہی تو باہر بھی روشن ہے۔ ایسے میں حضور کی ذات کی تقسیم کے کیا معنی رہ جاتے ہیں کیا ظاہر اور کیا باطن دونوں یکساں ہیں۔ پھر نبی دوراں کو مرکز عالم کہا ہے اسے یوں سمجھے۔ دل جسم کا مرکز ہے بھلا دل کا ظاہر اور باطن کیا ہو سکتا ہے۔ پھر جو برزخ کبریٰ ہوا سے ظاہر اور باطن کے جھمیلے سے کیا مطلب۔ آپ نے دیکھا کہ اقبال سہیل قافیہ پیمائی تو کرتے ہیں لیکن قافیوں کی ترتیب سے معنی آفرینی کی ایک دنیا آباد کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی علوم وادبیات اور ادب العالیہ پر گہری نظر رکھنے والے نقاد ظفر احمد صدیقی نے اقبال سہیل کے نعتیہ قصیدہ ۔

کرے تار شعاعی لاکھ اپنی سعی امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاک گریبانی

کو بلیغ مطلع بتایا ہے، سودا کا اس زمین میں جو قصیدہ ہے اس کے بعض معائب کی وضاحت کرتے ہوئے ظفر احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

> "گریز کے بعد مدح شروع ہوتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سہیل کے زیر بحث قصیدے کا سب سے منفرد دلکش حصہ یہی ہے۔ اس انفرادیت کے کئی پہلو ہیں۔ اول یہ کہ سہیل نے نعت کی بنیاد جن مضامین پر رکھی ہے وہ روایتی اور بار بار کے باندھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان میں بیشتر سہیل کے یہاں پہلی بار سلک نظم میں پروئے گئے ہیں"۔ مثال کے طور پر:

محمدؐ وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی محمدؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی

(معارف، مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ، ۱۹۵؍۴ اپریل ۲۰۱۵ء، ظفر احمد صدیقی، اقبال سہیل کا ایک نعتیہ قصیدہ تقابلی مطالعے کی روشنی میں، ص: ۲۸۴)

ظفر احمد صدیقی نے نہ صرف سودا بلکہ سہیل کے اس قصیدے کا موازنہ محسن کاکوروی کی اس

زمین میں لکھے قصیدے سے کرتے ہوئے سہیل کے قصیدے کو صوری ومعنوی اعتبار سے دونوں سے بڑھا ہوا دکھایا ہے اور ساتھ ہی سہیل کے قصیدے کی کمی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس نعت میں دعا کا حصہ نہیں ہے۔ جس قصیدے کا تجزیہ راقم کر رہا ہے اس قصیدے میں بھی دعا کا حصہ نہیں ہے۔ قصیدہ جس شعر پر ختم ہوتا ہے وہ یہ ہے:

نظمِ سہیل ان کا ہی کرم ہے ورنہ یہاں کب تابِ رقم ہے

ان اللّٰہ تعالیٰ أعلم، صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی اخیر میں اپنی شاعری کا بھی مرجع رسالت مآب کی ذات کو بتایا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ظفر احمد صدیقی نے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ سہیل پامال مضمون کے بجائے مضامین تازہ یا نئے مضامین زیادہ باندھتے ہیں۔ نعتیہ قصائد اور دیگر نعتیہ اصناف میں جن مضامین متحدہ پر زور ملتا ہے ان میں مدینہ اور یہاں کے مناظر، مدینہ جانے کی تڑپ کا اظہار، کعبہ خضرا کے نظارے کا اظہار حضورؐ کے شافع محشر ہونا، دوسرے انبیاء سے آپ کا تقابل، احد سے متعلق مضامین، مدینے کا موازنہ جنت سے کرنا (جسے غیر شرعی قرار دیا گیا ہے) حضور کی کملی کا ذکر جسے ہندی شعراء نے بھگتی کا رنگ بھی عطا کر دیا ہے۔ گنبد خضراء کا طواف کرتے ہوئے کبوتروں کا ذکر، حضرت جبریل کا ذکر، عشق رسول میں جبریل کی تحقیر کرنے کا غیر شرعی عمل، واقعہ معراج سے متعلق مضامین (اقبال سہیل نے معراج پر باضابطہ ایک قصیدہ لکھا ہے)۔

نبیؐ کی بعثت، ولادت سعادت سے متعلق مضامین، حضور کے جمال صوری ومعنوی کے مضامین، اسمائے مبارکہ، اسوۂ مقدسہ آپ کی اتباع کی آرزو، آپ کی تعلیمات، تعلق مع اللہ ان کی خدمات، عظمت، معجزات اور ان کے اصحاب کی توصیف سے متعلق مضامین، امت کی شفاعت کا التماس اور حضور کی دیدار کی تمنا سے متعلق مضامین کے علاوہ اور بھی بہت سے مضامین نعتیہ قصیدے کے مضامین متحدہ قرار پاتے ہیں۔ اقبال سہیل کے زیر نظر تجزیہ قصیدے میں حضورؐ کے اسمائے مبارکہ اور صفات سے متعلق نئے مرکبات کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں جیسے برمغ فارس، قدس کے رہباں، آئینہ الطاف الٰہی، لمعۂ قدس، مہبط قرآن، مرجع دوراں، صدر مکرم، حارس گیہاں عروۂ وثقیٰ، حاذق دوراں، جان مظاہر، جفِ حقائق، بحرِ قدم کا موج نخستیں (یعنی پرانے سمندر میں اٹھنے والی پہلی موج) آپ ایسے نادر القاب اور

صفات سے متعلق تراکیب اور بھی تلاش کر سکتے ہیں جن کی حیثیت ایک استعارے کی ہے۔

برمغ فارس، قدس کے رہباں، کشور بابل، وادئ کنعاں
سب کی زباں پر مژدہ مقدم صلی اللہ علیہ وسلم
آئینہ الطاف الٰہی، رحمت جس کی لا متناہی
جس کی ہدایت ارحم ترحم صلی اللہ علیہ وسلم
لمعۂ قدس تنِ بے سایہ، جس کی بدولت خلق نے پایا
دین مکمل خلق متمم صلی اللہ علیہ وسلم
مقصد امکاں، مہبط قرآں، منبع احساں، مرجع دوراں
روح کے درماں قلب کے مرہم صلی اللہ علیہ وسلم
شافع محشر، ماحیٔ عصیاں، حامیٔ مضطر، حارس گیہاں
ساقیٔ کوثر، وارث زمزم صلی اللہ علیہ وسلم
سید بطحا، مخبر صادق، عروۂ وثقیٰ مصحف ناطق
برزخ کبریٰ، آیۂ محکم صلی اللہ علیہ وسلم
ابر دُرافشاں، سرور سامی، بدر درخشاں، صدر گرامی
حاذق دوراں، چارہ گر غم صلی اللہ علیہ وسلم

منجملہ فنون سخن میں قصیدہ محض شاعری نہیں علم اور اگر نعتیہ قصیدہ ہے تو علم عقیدت شاعری کی شکل میں عظیم شاعری (High Poetry) کے بطور معرض وجود میں آنے والی شاعری کا نام ہے۔ وہ بھلا کیا قصیدہ جس میں سامنے کے الفاظ کی بھرمار ہو۔ قصیدہ نگاری کا ایک مقصد وہ الفاظ جو ہمارے حافظے سے معدوم ہو رہے ہوں ان کی یاد تازہ کرنا بھی ہے یعنی قصیدہ تقلیل الفاظ کی شاعری ہے نیز سر تا پا تخیلی شاعری بھی۔

بات جب مظہر کبریا کو تخیل عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے کی سامنے آتی ہے جو نعتیہ قصیدے کی سرشت ہے تو غلو کے اور مدح میں بہک جانے کے امکانات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ سہیل نے اپنے چشم تخیل اور عقیدت کے جذبات سے لبریز ہونے کے بعد صاحب معراج کو نظر خاص

سے دیکھتے ہوئے حضورؐ کو کن صفات سے متصف کیا ہے مندرجہ بالا اشعار میں تراکیب اس امر کے گواہ موجود ہیں۔ ان میں کچھ مرکبات تو وہی ہیں جو چلن میں ہیں لیکن بیشتر ان کے شعری کمالات کا اظہار ہیں۔ اتنے اجنبی الفاظ اس نعت میں استعمال کئے گئے ہیں کہ عام قاری تقریباً سو بار دیکھے اور عالم بھی متعدد بار۔ اس کے کیا معنی ہیں اس کے معنی ہیں کہ وہ اپنے علم اور ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ تو کرے ہی بار بار رسالت مآب کے پوشیدہ خصائص، صفات یا عجائبات پر غور کرے، محسوس کرے اور حضورؐ کی ذات اس پر منکشف ہو جائے۔ اب بھلا بتائیں حسن حقائق کیا ہے؟ حض کے معنی فلسفے کے ہیں یعنی Philosophy of reality یہاں یہ استعارہ ہے جو شے کی اصل حقیقت کو سمجھتا ہو۔ وہ بھلا آقائے نامدار کے علاوہ کون ہے۔ جان حدائق بمعنی باغ کی جان مگر استعارہ کیا ہے اگر یہ دنیا ایک باغ ہے تو اس کی جان محمدؐ ہیں۔ باغ کی جان دنیا کی جان ترتیب، عدل اور بھائی چارگی اور انسانیت پسندی کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے یعنی رسول عربی ان خصائص کا منبع ہیں۔

یہ طویل نعت اسمائے صفات محمدؐ کا ایک دفتر ہے جسے ہم حضورؐ کا ایک صوری اور معنوی خاکہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس میں حضورؐ کے ظاہر و باطن کو ایک جانتے ہوئے ان کے جسم اور روح یعنی صورت اور سیرت کو نشان زد کیا گیا ہے حضورؐ کے جسم اطہر کے جمال کا بیان جن تراکیب یا مرکبات کے سہارے کیا گیا ہے ان میں جسم مزکی، لمعۂ قدس، تن بے سایہ، شرح الم نشرح، وہ سینہ، نوری تن کملی میں چھپائے، ان کے ابرو کیسے معلوم ہوتے ہیں کچھ اس طرح 'طاق عبادت ابروئے پرخم، قامت رعنا نطق مدلل، خلق خلیلی اور نطق کلیمی جیسی تراکیب کے ذریعے حضورؐ کا خاکۂ اقدس پیش کیا ہے۔ یہ تو آقا کی وہ صورت ہے جسے ایک مادح نے اپنے تخیل کی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن مادح کی نظر میں ان کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔

اقبال سہیل نے حضورؐ کی ذات کے علاوہ ان کے شہر مدینہ، گنبد خضراء کے منظر کو اپنے ڈھنگ سے باندھا ہے۔

گنبد سبز کے بسنے والے، ماہ رسالت کے دوبالے
آج بھی دونوں ساتھ ہیں ہمدم صلی اللہ علیہ وسلم

صدر امم سلطان مدینہ، وہ جس کے کف پا کا پسینہ
گل کدۂ فردوس کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

دیکھیے دوسرے شعر میں نازک خیال کی حد کردی ہے کیسا پیکر حضور کا ہمارے سامنے رکھا گیا ہے کہ وہ گل کدۂ فردوس کی شبنم ہیں۔ یعنی جنت کے پھولوں پر ٹپکنے والے شبنم کے مانند ہیں۔ سبحان اللہ

حضورؐ کی کملی سے متعلق یہ اسلامی اور ہندی ثقافتی مدلولات کے ذریعے یعنی نوری تن اور لفظ رم جھم کے ذریعے کیسی انوکھی تصویر بنائی ہے۔

نوری تن کملی میں چھپائے، بادل میں بجلی لہرائے
نور کا مینھ برسائے رم جھم صلی اللہ علیہ وسلم

گویا کہ موج کوثر میں اول حصے میں حضورؐ کے اوصاف حمیدہ اور ان کی سماجی، سیاسی، ثقافتی، روحانی اور خدمت خلق کا بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے اصحاب کے اوصاف اور ان کے اٹوٹ رشتے کی اہمیت، لیکن ان جملہ بیانات کا تفاعل نبی کی ذات اور انبیاء میں ان کے انفراد کی نشاندہی ہے۔ اس نعت کا مادح اپنے شعری طریق کار اور زبان کے استعمال کی نوعیت کے اعتبار سے ایک سچا عاشق رسول نظر آتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو درود شریف پر مبنی ردیف پر قصیدہ امیر مینائی نے بھی کہا ہے مگر وہ انداز کہاں جو اقبال احمد سہیل کے پاس ہے۔ پاکستانی شاعر احسان اکبر نے اسی زمین میں نعت کہی ہے، جس سے اقبال سہیل کی اس نعت کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک شعر سنئے:

کام کمال کرامت والا، ناداروں کی راحت والا
دیں دنیا کے درد کا مرہم صلی اللہ علیہ وسلم

احسان اکبر کا لہجہ حالی والا ہے جس کے بارے میں حسن عسکری نے کہا تھا کہ:

''حالی کی نعت کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا کردار نہایت بلند تھا اور ان سے ہمیں بڑے فائدے پہنچے۔ بلند کردار کے لوگ اور انسانیت کو فائدہ پہنچانے والے تو بہت ہوئے ہیں مگر ان لاکھوں انسانوں کو ایسی والہانہ محبت کیوں نہیں ہوتی جیسی آنحضرتؐ سے ہے۔ اس کا جواب ہمیں حالی کی نعت میں نہیں ملتا''۔

(صبیح رحمانی، اردو نعت کی شعری روایت، کراچی پاکستان (۲۰۱۶ء) ص: ۲۷۹)

مجھے کہنے دیجئے کہ اس کا جواب ہمیں اقبال، محسن کاکوروی اور کچھ ایک شعراء کے علاوہ اقبال سہیل کے یہاں ملتا ہے۔ اس نعت کو سنتے یا پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں کی ریاضت، محنت اور کوشش کے بعد حضورؐ آخیر میں ایک اونچے الوہی ٹیلے پر بیٹھے اپنی امت کی حرکات وسکنات نیز اپنے پیغام کے اثرات دیکھ رہے ہیں اور ہم میں سے ایک شخص اقبال سہیل اپنے نبیؐ کی ایک ایک ادا، ایک ایک وصف، ایک ایک بات شفقتوں، مہربانیوں کا یکے بعد دیگرے ایک مجاہد اور عاشق کی طرح اپنے محبوب کا وصف گنواتا جا رہا ہے۔ اس کی لے، طرز ادا ایسی ہے کہ حضورؐ کی روح سرشار ہو رہی ہے اور نام محمد سرمدی نغمے بن کر فضا میں تحلیل ہو رہا ہے اور ادھر امتی بھی جھوم رہے ہیں۔ یہ شاعری نہیں یقیناً عقیدت کا ایک ایسا پھول ہے جس پر خزاں کے سائے قربان ہو جائیں۔

اقبال سہیل کی مرثیہ نگاری

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ☆

سرزمین اعظم گڑھ نے بھی کیسی کیسی نادر و نایاب شخصیتوں کو جنم دیا جن کے ذکر کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی اسی سرزمینِ ذہانت آفریں کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت اقبال سہیل بھی تھے جنھوں نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اردو شعر و ادب کی آبیاری میں صرف کر دیا لیکن ان کے فن پارے وقت کی گرد میں دب کر رہ گئے۔ ناقدین ادب نے بھی سہیل کے تخلیقی پاروں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس باکمال دانشور تخلیقی فن کار نے شاعری کو محض شوق کے طور پر برتا لیکن پیشہ کبھی قرار نہیں دیا۔ اس نوع کی شاعری سچی، حقیقی اور طبع زاد ہوتی ہے۔

اساتذہ کی صحبت اور خطۂ اعظم گڑھ کے علمی و ادبی ماحول نے سہیل کے ذوقِ شعری کو اور بھی جلا بخشی اس طرح خطۂ اعظم گڑھ کا یہ عظیم تخلیقی فنکار افقِ شاعری پر نیرِ اعظم بن کر چمک اٹھا۔

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیرِ اعظم ہوتا ہے

”سہیل کے جمالِ فن اور معنی روشن کے فیض سے بزمِ سخن کا کوئی گوشہ محروم نہیں ان کی غزلیں ان کی نظمیں، ان کے قطعات، ان کے مرثیے، ان کے قصائد نعت و منقبت، سہرے اور رباعیات سبھی ان کی سحر طرازیوں کے دلکش نمونے ہیں“(۱)

سہیل نے تقریباً ہر ہیئت مثلاً مربع، مخمس، مسدس، مثنوی، مسمط اور ترجیع بند وغیرہ میں تجربے کیے اور اپنے فن اور تخلیقی توانائی کے خوب جوہر دکھائے۔

☆ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سہیل نے سب سے زیادہ صنف غزل میں طبع آزمائی کی کلیات سہیل میں غزلوں کی تعداد ۴۷ ہے جب کہ ۴۰ نظمیں ہیں ان میں ۱۹ نظمیں تحریک آزادی، حب الوطنی اور قومی یکجہتی سے متعلق ہیں۔ دس قصائد ہیں جن میں پانچ منقبت اور پانچ نعت کی ہیئت میں ہیں۔ سہیل کی ۱۱ رباعیاں ہیں ایک فارسی اور دس اردو میں ہیں قطعات کی تعداد ۸ ہے جن میں چھ فارسی اور دو اردو میں ہیں۔

سہیل کے آٹھ فرمائشی سہرے بھی ملتے ہیں ان میں چھ مخمس کی ہیئت میں ہیں ایک سہرا مثلث اور ایک سہرا غزل کی ہیئت میں ملتا ہے۔

سہیل نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شخصی نوعیت کے مرثیے کہے ہیں۔ فارسی مرثیوں میں استاذ علامہ شبلی نوحہ دیگر بتقریب یوم شبلی اور مرثیہ مصطفیٰ کمال پاشا قابل ذکر ہیں۔ اردو مرثیوں میں مرگِ حیات آفریں (محمد علی جوہر) اور گاندھی جی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

علاوہ ازیں اقبال سہیل نے اپنے ایک اور مرثیہ کا ذکر تبصرہ بر "نوائے حیات" میں بھی کیا ہے یہ مرثیہ کلیات سہیل میں شامل نہیں ہے سہیل نے یہ مرثیہ اپنے ماموں جان کی وفات پر کہا تھا۔

افتخار اعظمی تابش سہیل میں لکھتے ہیں کہ:

> "وہ خود بھی اس کا ذکر کیا کرتے تھے اس مرثیہ کے صرف دو چار شعر ہی انھیں یاد رہ گئے تھے۔ شبلی نے اس کی بے حد داد دی تھی"

اقبال سہیل خود اس مرثیہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

> "مولانا شبلی نے اس مرثیہ کی حد سے زیادہ داد دی اور میری موزوں طبعی اور ذوق فارسی پر اظہار مسرت فرمایا اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ تیری شاعری پر مجھ کو خود اپنے کلام کا دھوکہ ہو رہا تھا"۔

سہیل کا بہت سا کلام مختلف اصناف کے حوالے سے ضبط تحریر میں نہیں آسکا اور ضائع ہو گیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اردو میں سہیل کے صرف دو ہی مرثیے دستیاب ہو سکے ہیں جو کلیات سہیل میں شامل ہیں۔ پہلا مرثیہ "مرگ حیات آفریں" جو مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ ہے ۲۳ بندوں پر مشتمل یہ طویل مرثیہ مخمس کی ہیئت میں ہے۔ دوسرا مرثیہ گاندھی جی پر ہے۔ اردو میں شخصی مرثیوں کی روایت بھی خاصی پرانی ہو چکی ہے ان میں علامہ اقبال، حالی، جوش، نسیم امروہوی، وحید ہاشمی، فراق اور

چکبست وغیرہ کے نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی ایک نظم شبلی اور حالیؔ اسی نوع کی ایک مثال ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خاموش ہوگئے چمنستاں کے راز دار ۔۔۔ سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں ۔۔۔ حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

سہیل نے شخصی مرثیہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا اگرچہ یہ مرثیے ان کی ذاتی عقیدت بھی ہوسکتی ہے "مرگ حیات آفریں" میں وہ ابتدائی بند میں دنیا کی کشمکش اور سراسیمگی کو نہایت ہی فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا سیر و تفریح کی جگہ نہیں بلکہ یہ زہر کی تاثیر رکھتی ہے یعنی زندگی اور موت میں جام و سنگ کا تعلق ہے اس دنیائے فانی میں جو بھی آیا وہ وقت کا غلام ہوکر رہا اور وقت نے اسے شکست دی اس کشمکش حیات، اور آلام و مصائب سے انسان موت سے پہلے نجات نہیں پاسکتا، سہیل نے دنیا کے پُر پیچ حالات کو زندگی کی بھول بھلیوں سے تعبیر کیا ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جارہے ہیں:

بھول بھلیاں ہے یہ دام گہ شش جہات ۔۔۔ موت سے پہلے کہاں اس سے میسر نجات
کر نہ سکا کوئی حل، مسئلۂ کائنات ۔۔۔ شاطر ایام سے کھائی نہیں کس نے مات
اس کا گرفتارِ دام چھوٹ کر نکلا نہیں

زندگی فانی ہے جو ایک قوسِ قزح کی طرح ہے دنیا کا نظام عقل و فہم سے ماوراء ہے اس میں بڑی بے ثباتی اور ناپائیداری ہے یہاں کی رونقیں بناوٹی اور مصنوعی ہیں دارا شکوہ، جمشید اور زار جیسی نامور ہستیاں اس دنیائے فانی سے نیست و نابود ہوگئیں۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے ۔۔۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سہیل خود سے سرگوشی کے انداز میں اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ دنیا کی حقیقت ایک سراب کی سی ہے اور اس کی مثال بھی نقش آب کی سی ہے۔ جس طرح نقش آب اور سراب فنا سے تعبیر ہیں انسانی زندگی کا وجود بھی انھیں خصوصیات سے ماخوذ ہے۔ چند اشعار:

جلوۂ ہستی ہے کیا صرف فریب سراب ۔۔۔ زندگی مستعار، کیا ہے بس اک نقشِ آب
اس کی حقیقت عدم، اس کا وجود اضطراب ۔۔۔ خواب ہے یہ زندگی، موت ہے تعبیر خواب

زندگی اک وہم ہے، موت ہے حق الیقیں

ان اشعار میں سہیل نے فلسفۂ حیات وممات کی بہترین منظر کشی (PANO RAMIC DESCRIPTION) کی گئی ہے اور یہاں سے مرثیہ ایک نیا موڑ لیتا ہے۔ یعنی وہی حیاتِ جاوداں کا جام پیتا ہے جس نے اپنی زندگی کو عشق کی پرخطر راہوں میں قربان کردیا ہو، ملک وملت پر جان نچھاور کرنے والا حق وصداقت کا پرستار، عظیم مجاہد آزادی، شہید وفا کی شہادت پر آہ وفغاں کرنا شہادت کی توہین ہے اور اس عظیم شہید کی کسرشان بھی، وہ تو زندۂ جاوید ہے اور پھر سہیل کا روئے سخن محمد علی جوہر کی جانب مبذول ہوتا ہے۔ محمد علی جوہر کی وفات حسرت آیات یعنی وطن چھوڑنے پر اضمحلال کی کیفیت کے بجائے وہ سیر بہشت کی مبارکباد پیش کرتے ہیں مرثیہ کا بند ملاحظہ ہو:

آہ! محمد علی، آہ شہیدِ وطن — زُبدۂ اہل کمال، مرجع ارباب فن
چھوڑ کے تو چل دیا دہر کا دارالمحن — خیر مبارک تجھے سیرِ بہشتِ بریں

مولانا محمد علی جوہر کی وفات فلسطین میں ہوئی اور قبر بیت المقدس میں ہے۔ یعنی مشرق کا سورج مغرب میں غروب ہوگیا جس کی شخصیت ملک وملت کے لئے منارۂ نور اور روشنی کا منبع تھی۔

ان کی شہادت پر کائنات کی ہر شئے مغموم ہے۔ سہیل کی تخلیقی بلند خیالی اور ندرتِ ادا کا اندازہ اس بند سے لگایا جاسکتا ہے ؎

یوں تو ہر اک صبح کو صبحِ گہِ حشر تک — شرق سے ہوگا طلوع شاہ سریرِ فلک
کیوں نہ ہو محوِ فغاں آج سماء تا سمک — آہ نہ دکھلائیگا اب کبھی اپنی جھلک

غرب میں ڈوبا ہے جو شرق کا مہرِ مبیں

مہرِ مبیں کو شاعر نے محمد علی کے لئے استعارے کے طور پر برتا ہے یعنی محمد علی کی ذات بڑی اعلیٰ صفات اور ہمہ جہت تھی وہ ایک شعلہ بیان خطیب بھی تھے، سہیل جوہر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی شخصی خوبیوں کی وجہ سے ان کی شہرت اور مقبولیت شرق سے غرب اور عرب سے عجم تک پھیلی ہوئی تھی یہ ان کی نیکیوں اور لوگوں کی دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا کہ محمد علی کی تدفین بیت المقدس جیسی مقدس سرزمین پر ہوئی۔

اقبال سہیل نے اپنے فن کمال سے مرثیہ میں موسیقی اور غنائیت کی کیفیت پیدا کردی ہے۔

مرثیہ استعاراتی زبان میں فلسفیانہ انداز اختیار کئے ہوئے ہے۔ الفاظ وتراکیب کا برمحل استعمال اور شعریات کا سیل بے پناہ اُمڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو قربانیوں میں یقین رکھتا ہے وہی زورِ طوفاں سے مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اور اسی کو دنیا میں سربلندی اور آفاقیت میسر آتی ہے۔ بقول شاعر:

"جو زورِ طوفاں سے لڑ سکے گا اسی کا دنیا میں نام ہوگا
جو اپنی کشتی پہ بچ سکے گا وہی علیہ السلام ہوگا"

اردو میں سہیل کا دوسرا مرثیہ گاندھی جی پر ہے۔ یہ مرثیہ غزل کی ہیئت میں ۲۴ ر اشعار پر مشتمل ہے۔ سہیل نے مرثیہ میں گاندھی جی کا براہ راست تو ذکر نہیں کیا البتہ وہ ان کے قتل کی مثال اس طرح دیتے ہیں کہ انھوں نے جن اہل وطن یعنی ہندوستانیوں کو آب حیات پلایا انھیں نے گاندھی جی کو موت کا جام دیا۔ یہاں سے ذہن گاندھی جی کی طرف جاتا ہے:

وہ فروغ بخش ہر انجمن کہ زمانہ بھر میں تھا ضو فگن
وہ چراغِ بزم گہ وطن، کسی تیرہ دل نے بجھا دیا
وہ خمیدہ قد، خم ماہِ نو، وہ نظر فریب خنک سی ضو
وہ نگاہِ برق عمل کی رو کہ دلوں کو جس نے ملا دیا
وہ کتابِ صلح کا ہر ورق کہ مٹائی کشمکش فرق
وہ قتیل خنجر صبر وحق کہ وطن پہ خود کو مٹا دیا

مرثیہ کے آخری بند میں سہیل نے گاندھی جی کی خدمت اوراعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی زندگی مشعل راہ تھی سہیل گاندھی جی کو عیسیٰ کا تتبع، بودھ اور کرشن کا جانشین تصور کرتے ہوئے اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ ان کے قاتل انھیں قتل کرکے جشن نہ منائیں وہ تو کروڑوں لوگوں کے دلوں کی آواز تھے اور بلا تفریق مذہب وملت ان کی زندگی خود تو پرسوز اور مغموم تھی لیکن زمانے کے لئے روشنی کا سرچشمہ اور منبع ثابت ہوئی۔ گاندھی جی کے جسدِ خاکی کو پھول سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح شمع کی لوگل ہوجانے کے بعد پھول کی طرح ہوجاتی ہے اسی طرح ان کا جسم آگ میں جلنے کے بعد پھول کی مانند ہوگیا۔

عربی، فارسی تراکیب اور قافیوں کے برمحل استعمال سے مرثیہ میں فصاحت اور نغمگی پیدا ہوگئی ہے مثلاً عروس کشورِ ہند زلالِ چشمۂ آ گہی، صیدِ سلسلۂ کرم اور قتیلِ خنجرِ صبر وحق جیسی تراکیب نے گاندھی جی کی شخصیت کو مزید عظمت عطا کی ہے۔

سہیل کے دونوں ہی مرثیہ فنی اعتبار سے بڑے معیاری اور منفرد ہیں، جو اردو میں شخصی مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

باغِ گیتی میں نہ ہوگا اب کوئی پیدا سہیل
غیر ممکن ہے کرے خاکِ وطن پیدا سہیل

سہیل بڑے منکسرالمزاج اور مخیر واقع ہوئے تھے، ان کی قوت آخذہ بہت مضبوط تھی، سہیل ذہن کی دراکی میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے، اپنی سیمابی فطرت کے بارے میں لکھا تھا:

شراب شوق بن کر شعلۂ شمع یقیں ہوکر
رگ و پے میں کوئی رقصاں ہے موج آتشیں ہوکر

حوالے:

(۱) سہیل ایک عبقری عطیہ خلیل عرب بحوالہ اقبال سہیل کا فن ص:۱۵۳) مرتبہ پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی

(۲) افکار سہیل ص:۲۵۸، (اقبال سہیل کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ، صدف پروین)

☆☆☆

اقبال سہیل کی مثنوی ''حکایت ہستی'' کا فکری و فنی تجزیہ

ڈاکٹر منظر حسین ☆

مثنوی اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس کا رشتہ ہر چند کہ طویل منظوم داستانوں سے جوڑ دیا گیا تھا لیکن اس کے دامن میں ہر رنگ کے پھول نئے نئے موضوعات کے ساتھ نظم ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ مثنوی کا مادہ عربی لفظ مثنیٰ ہے جس کے معنی دو کے ہوتے ہیں۔ چونکہ مثنوی کا ہر شعر ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوتا ہے لہٰذا دو مصرعوں کا خیال کر کے اس صنف کو مثنوی سے موسوم کیا گیا۔ مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں۔ اس کے لئے اشعار کی کوئی تعداد متعین نہیں۔ جدید نظم گو شعرا جس کے پیش رو مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی تھے انھوں نے اس صنف کے توسط سے نئے نئے موضوعات کو نظم کیا اور اس کی گنجائش بھی مثنوی ہی میں تھی۔ بقول عبدالقادر سروری:۔

> ''مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے جدید طرز کے مشاعروں کے لئے جو مثنویاں کہیں ان کے اثرات بہت دور رس ثابت ہوئے۔ مثنوی نے آگے بڑھ کر اور نئے اسلوب کو فروغ دے کر انقلاب کو گلے لگایا تھا وہ آہستہ آہستہ دوسری اصناف سخن میں بھی رونما ہو گیا۔ جدید شاعری کی ابتداء اور ارتقاء میں مثنوی نے نہ صرف نمایاں حصہ لیا بلکہ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اسے فروغ دینے کی خاطر یہ ایثار کیا کہ خود کو نظم جدید کے سانچے میں ڈھال لیا۔ قدیم روایات نے مخصوص موضوعات کو مثنوی سے وابستہ کر دیا تھا۔ جب موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی اور

☆ شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی، رابطہ: 9835192717

اسلوب میں تبدیلی آئی تو جو موضوعات مثنوی کی ہیئت میں نظم کیے گئے۔ انھیں مثنوی کے بجائے خود انھیں کے عنوانات سے شہرت ملنے لگی۔''

میرے پیش نظر 85 اشعار پر مشتمل اقبال سہیل کی مثنوی ''حکایت ہستی'' ہے۔ جس میں ادب عالیہ کی تمام خصوصیات سمٹ آئی ہیں ساتھ ہی شاعر کی خلاقانہ صلاحیت، عمیق مطالعہ اور مذہب سے اٹوٹ وابستگی کا ترجمان بن گئی ہے۔ یہ مثنوی حمد، نعت اور منقبت کا حسین گلدستہ ہے۔ جس میں علوم کی گہرائی بھی ہے اور فنکار کے ملتہب دل کا اشاریہ بھی۔ یوں تو ''کن فیکون'' کے حوالے سے اردو کے کئی شعرا نے اسرار حیات وکائنات کی عقدہ کشائی کو موضوع بنایا ہے لیکن اتنے چھوٹے کینوس پر جن شعری تجربوں کا اظہار اقبال سہیل نے کیا ہے، ان کی فکری وفنی ہنرمندی کو استناد بخشتا ہے۔ مثنوی کی ابتداء تخلیق کائنات کے رازہائے سربستہ کے مختصر بیان سے ہوتی ہے۔ دیکھیے یہ اشعار۔

جب ازل میں یہ جہانِ رنگ و بو پیدا نہ تھا — حسنِ وحدت جلوۂ کثرت سے جب بیگانہ تھا
پردۂ ایوان وحدت میں نہ تھا جب ارتعاش — بزمِ لاہوتی سے آتی تھی صدائے دور باش
حسن کو جب التفاتِ عشوہ فرمائی نہ تھا — کوئی جلوہ جب شریکِ بزم تنہائی نہ تھا
یوسفستاں کو نہ تھی آئینہ خانہ کی تلاش — طور دل سے بے خبر تھی وہ نگاہ برق پاش
غرق تھی بحرِ تجلی میں یہ دنیائے شہود — جلوۂ بے رنگ نے چاہی نہ تھی اپنی نمود
بزمِ ہستی بے نیازِ گردش ایام تھی — صبح کا یہ روئے روشن تھا، نہ زلفِ شام تھی
یہ کرن رقص، موجوں کا ترنم کچھ نہ تھا — اشکِ شبنم ہو کہ پھولوں کا تبسم، کچھ نہ تھا
جوش میں آیا یکایک بحرِ ناپیدا کنار — قلزمِ وحدت سے اٹھی ایک موجِ بیقرار

مثنوی کے دوسرے حصے میں تخلیق کائنات کے مرحلے اور مقصد کو بیان کرنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش، ملائکہ کا سجدۂ تعظیم کرنا، ابلیس کا سجدے سے انکار کے بیان کو مختصر لیکن موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تمام اشعار معنویت کا احساس دلاتے ہوئے آبشار کی مانند نیچے اترتے ہیں اور پڑھنے والے کے احساس اور جذبے میں مستی وسرور پیدا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار۔

حسن نے چاہا کہ بزمِ کن فکاں پیدا کرے — یہ زمیں، یہ ماہ وخور، یہ آسماں پیدا کرے
بادۂ وحدت کو مینا کی ہوئی جب جستجو — پیکر آدم نے پائی اس شرف سے آبرو

بسکہ صہبائے تجلی تھی بہت مینا گداز
خاک کے پتلے کو اس دولت سے بخشا امتیاز

وہ نقیب رحمۃ للعالمیں پیدا ہوا
یعنی آدم، خاکی جنت نشیں پیدا ہوا

تمام واقعات نصِ قرآنی کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں جو فنکار کے اسلامی شعور و آگہی سے سرشاری کا پتہ دیتے ہیں۔ خالقِ کائنات آدم کی محض تخلیق کر کے چھوڑ نہیں دیتا بلکہ اس کی تقدیر بھی مقرر کرتا ہے اور ہدایت بھی دیتا ہے مثلاً شجرِ ممنوعہ سے ممانعت، حضرت آدم کا شجرِ ممنوعہ کی طرف راغب ہونا، اس کے بعد ہبوطِ آدم کا واقعہ اور خلیفۃ الارض کی حیثیت سے آدم علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانا، ہر ایک واقعہ کو قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ کہیں بھی مبالغہ کا شائبہ تک نہیں۔ مصنف نے مثنوی کو بیانیہ کی خشکی اور بے کیفی سے بچانے کا ہر طرح جتن کیا ہے۔ ایک پہاڑی جھرنے کی مانند لفظوں کا خوبصورت نغمہ تیزی سے اترتا چلا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ اشعار۔

آدم جنت نشیں آیا بسیط خاک پر
مرحبا، صل علیٰ کا غل ہوا افلاک پر

رفتہ رفتہ سرِ مخفی اب عیاں ہوجائے گا
یہ سوادِ آب و گل رشکِ جناں ہوجائے گا

ابن آدم کھول دے گا سب طلسم گنج راز
اب حقیقت کے قریب آجائے گا حسن مجاز

فاصلہ قوسین کا گو درمیاں ہوجائے گا
دائرہ بن کر محیط دو جہاں ہوجائے گا

اس طرح چمکا سرِ خاکی پہ کرّمنا کا تاج
لے لیا اجرام نوری سے خلافت کا خراج

پھر مشیت نے یہ چاہا عہد کی تعمیل ہو
مقصد انسانیت کی آخری تکمیل ہو

مثنوی کے تیسرے حصے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ ہر شعر میں خلوص و عقیدت کی مہک عود و عنبر کی خوشبو کی طرح پھیلنے لگتی ہے۔ نپے تلے الفاظ، حسن خطاب اور حسن بیان کے ساتھ واقعات اور باریکیوں کو صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس پر طرہ یہ کہ شاعر کو قدم قدم پر اس کا بھی پاس ہے کہ تخیل کی پرواز کہیں ان مقامات تک نہ پہنچا دے جس سے صادق البیانی پر حرف آئے۔ نعت گوئی کا بنیادی مطالبہ اور تقاضا بھی یہی ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

پیکر انساں میں ہو اس نور وحدت کا ظہور
جسکے صدقے میں ہوا ہے بزم کثرت کا ظہور

استجابت ہو دعائے پاک ابرہیمؑ کی
میم احمد میں جھلک ہو احمد بے میم کی

کھنچ کے آئینے میں یوں آجائیں خال وخط یار ۔۔۔ آنکھ بھی خیرہ نہ ہو، جلوے بھی ہوں سب آشکار
ہر ادائے حسنِ مخفی جلوہ گر ہونے لگے ۔۔۔ جلوۂ بے رنگ کی خوگر نظر ہونے لگے
غیر ممکن تھا کہ ہوں ممکن میں واجب کے صفات ۔۔۔ ذات باری کی طرح بندہ ہو کیونکر بے جہات
گو نہ ممکن ہو جدائی، گو نہ رہ سکتے ہوں دور ۔۔۔ ظرف واحد میں ہو کیوں کر اجتماع ظل ونور
گرچہ سب آسان تھا صناع حقیقی کے لئے ۔۔۔ ہم کہاں پاتے نظر تابِ تجلی کے لئے
اس لئے حکمت کا منشا تھا کہ انوارِ قدم ۔۔۔ چند آئینوں سے چھن کر ہو ضیا بار کرم

یہ تمام اشعار اثر آفرینی کے حسن سے مملو ہیں اور اسی وقت ممکن ہے جب کہ شاعرانہ تجربات کا حقیقت سے تعلق ہو یعنی خود شاعر سرتاپا حب رسول میں ڈوبا ہوا ہو۔ اشعار میں زبان اور فن کی خوبیاں موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ اسلوب میں غنائیت اور موسیقی کے زیر و بم کی کیفیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لفظوں کا انتخاب اقبال سہیل کی ذہنی جودت وجدت کا پتہ دیتا ہے۔ مثنوی کے بقیہ حصے خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ، کی منقبت پر مختص ہیں جن میں اشعار کے توسط سے اسلام کی ان عظیم شخصیتوں کے تئیں بے پناہ عقیدت ومحبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کی صفات وکمالات، رفعت وبزرگی، شان وشوکت، بلندئ عزم اور عمل پیہم کی مدح و ستائش بڑے ہی والہانہ انداز میں جوش وصداقت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کے اعلیٰ کردار و افعال کو بھی اپنی جنبش قلم کے ذریعہ مثنوی نگار نے اجاگر کیا ہے۔ اشعار میں فصیح وبلیغ اور رواں لفظوں کا استعمال اصول قواعد واختصار کا لحاظ ہے۔ مثلاً حضرت ابو بکرؓ خلیفہ اول کی شان میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھر زمیں پر آسمانی جشن کی تمہید ہو ۔۔۔ پھر جہاں میں رسم استخلاف کی تجدید ہو
حق نے آدم کو دلائی جس طرح نذر سجود ۔۔۔ اقتدا صدیقؓ کی فرمائیں سلطان الوجود
اہل ایماں کو ہو کیا اس کی امامت میں کلام ۔۔۔ خود امام دو جہاں جس کو بنا جائیں امام
اس کنایت پر کفایت یوں کریں ختمی مآبؐ ۔۔۔ تا کہ امت کے لئے رہ جائے حق انتخاب
امرھم شوریٰ کی ہو بنیاد جس سے استوار ۔۔۔ اور ہو جمہوریت پر امر ملت کا مدار
جانشین سید الکونین جب صدیق ہو ۔۔۔ نفی توریث شرف کی دوسری توثیق ہو

خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروقؓ کی منقبت اور ان کے سطوت کے رعب و وقار کے اظہار کے علاوہ

ان کی خاکساری، خصائل ومحامد کو ایک مخصوص والہانہ کیفیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اللہ اللہ سطوت فاروقؓ کا رعب و وقار — خوف سے سایہ کے لی ابلیس نے راہ فرار

اہل باطل کو پیام مرگ اس کا نام ہے — سایۂ پرچم سے ایراں لرزہ بر اندام ہے

خاکساری یہ کہ ہاتھوں میں ہو ناقہ کی مہار — رعب وہ جس سے مسخر بیت مقدس کا حصار

حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد چھ بزرگ صحابیوں میں سے حضرت عثمان غنیؓ کا خلافت کے لئے انتخاب اوران کے عہد میں اسلامی سلطنت کی توسیع، ان خصائل وشمائل، پھر مخالفت کا ایک طوفان جس کے نتیجے میں امیر المومنین حضرت عثمانؓ ذوالنورین کو شہادت کا جام پینا پڑا۔ ان تمام واقعات و حادثات کی تفصیل اس مثنوی میں ملتی ہے۔ خونِ عثمانی کو اسلامی سیاست کا زوال قرار دیتے ہوئے اسے خانہ جنگی کے آغاز سے موسوم کیا گیا ہے۔ دیکھئے یہ اشعار۔

عہد میں اس کے بڑھیں ملی ترقی کے قدم — ہند سے تا مصر و چیں لہرائے اسلامی علم

عام ہو اس کی مروت، فیض عالمگیر ہو — حلم اس کا بینهم رحماء کی تفسیر ہو

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کا انتخاب، جنگ صفین و جنگ جمل کے تذکرہ کے بعد مثنوی نگار نے امیر المومنین حضرت علیؓ کا علمی مقام ومرتبہ، ذوق عبادت وغیرہ کے بیان میں کافی عرق ریزی کی ہے۔ اسوۂ حسنہ کو کس قدر دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ دیکھئے یہ اشعار۔

سید الابرار پر جیسے رسالت ہے تمام
حیدر کرارؓ پر یوں ہی خلافت ہے تمام

مثنوی کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے۔

بعد ایماں جس طرح ارکانِ اسلامی ہیں چار
یونہی بعد از مصطفےٰ توحید کے حامی ہیں چار
نطق ربانی کے اذعانی منبر چار ہیں
جسم ایمانی کے روحانی عناصر چار ہیں
تو تیائے چشم عرفاں خاکِ پائے چار یار
سچ تو یہ ہے شرط ایماں ہے ولائے چار یار

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال سہیل کی مختصر مثنوی ''حکایت ہستی'' میں فکر وفن کے تمام رموز ونکات آشکارا ہو گئے ہیں۔ شاعر خود ایک بلند پایہ سیرت نگار ہے لہٰذا اپنی باتوں کو تقویت اور استناد بخشنے کے لئے اسلامی عقائد، قرآنی واقعات وتلمیحات کے نگینے کو جوڑ کر مثنوی کو مزین کیا ہے۔ زبان پر قدرت حاصل ہے۔ فلسفۂ حیات کی تشریح میں سادگی، اصلیت اور جوش بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

اقبال سہیل نے اس مثنوی کے توسط سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں کے دلوں میں محبت اور خلفائے راشدین کے تئیں اظہار عقیدت، شیفتگی ور بودگی کی تڑپ کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اور ایک ایسی شمع فروزاں کر دی، جس کی روشنی سے پڑھنے والا مستفیض ہوتا رہے گا۔

☆☆☆

کتاب حقیقۃ الربا کا تعارف

ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی ☆

میرے پیش نظر مولانا اقبال سہیل کی مشہور کتاب حقیقۃ الربا ہے کتاب کے ٹائٹل پیج کی تحریر اس طرح ہے۔ حقیقۃ الربا مولانا اقبال احمد صاحب سہیل اعظم گڑھی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۶ء بار اول ۱۰۰۰ر جلد کتاب ۱۷۸ صفحات پر مشتمل ہے سائز 7x12 سینٹی میٹر ہے اس میں فہرست مضامین کے تحت ۵۷ عنوانات میں ربا سے متعلق بحث ہے اس کا مقدمہ سید طفیل احمد صاحب ولایت منزل علی گڑھ نے لکھا ہے۔

پہلا عنوان ہے ''سود کے بارے میں عقیدہ اور عمل'' اور دوسرا عنوان ''سود کو حرام سمجھنے کے نقصانات'' ان عنوانات میں کتاب لکھنے کی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔

لکھتے ہیں ''عام طور پر ربا کو سود کے مترادف خیال کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام سودی کاروبار کو خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو اہل اسلام عموماً حرام سمجھتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر ربا اور سود مترادف الفاظ ہیں تو سود کی حرمت میں کسی مسلمان کے لئے چوں و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم نے بالفاظ صریح ربا کو ممنوع قرار دیا ہے۔''

آگے لکھتے ہیں ''عام مسلمان سود کو حرام کہتے ہیں لیکن اسی فیصد لوگ مقروض ہیں اور سودی قرضوں میں اپنی جائدادیں تلف کر چکے ہیں حالانکہ حدیث میں سود لینا اور دینا، شہادت دینا سب حرام ہے موجودہ قانون میں مسلمانوں کو مجبوراً تجارت میں سودی لین دین کرنا پڑتا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ اقتصادی پستی بڑی حد تک اسی عقیدہ

☆ لائبریری اینڈ انفارمیشن آفیسر، رامپور رضا لائبریری، رامپور

حرمت ربا کی رہین منت ہے اور یہی اقتصادی پستی ہے جس کی بنا پر مسلمان سیاسی حیثیت سے بھی اپنے دیگر ابنائے وطن سے اس قدر پیچھے ہیں۔ اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی اس اقتصادی زیردستی کو رفع کیا جائے اور ان اسباب وعلل کا تفحص کیا جائے جنھوں نے ہم کو من حیث القوم اس حد تک پہنچادیا ہے۔"

آگے موجودہ سود کو حرام سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں کو جو نقصانات ہورہے ہیں اس پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مثلاً اس کی وجہ سے لوگوں کو سرمایہ کاری یعنی انویسٹ میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ تجارتی کاروبار مین بہت بڑا کاروبار ادھار لین دین پر چلتا ہے اور چونکہ تجارت میں غیر اقوام سے سابقہ پڑتا ہے اور اگر ایسے معاملات سے پرہیز کیا جائے تو تجارت میں نقصانات ہوتے ہیں سودی لین دین یعنی بینکنگ ایک بہت بڑا شعبہ تجارت ہے، جس کی وجہ سے دوسری قوموں میں ہزار ہا کروڑپتی موجود ہیں مگر مسلمان بالعموم اس کو حرام سمجھ کر پرہیز کرتے ہیں اور جو لوگ دانستہ یہ کاروبار کرتے ہیں وہ گویا فسق وفجور کرتے ہیں اس طرح مذہبی احکام کو بے وقعت کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں ان سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ضرورت پر مسلم بھائی کو اپنے مسلم بھائی سے قرض نہیں ملتا مجبوراً غیروں سے قرض لینا پڑتا ہے اور ہماری دست وبازو کی محنت کا ثمرہ دوسروں کی ترقی کا باعث ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ ہماری جائدادیں نذرِ اغیار ہوجاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی ضرورت پر قرض کیونکر حاصل ہو۔ کون ہے جو بغیر کسی فائدے کے اپنی دولت کسی دوسروں کو دے گا۔ قرضِ حسنہ ایک نیکی ہی سہی لیکن القرض مقراض الحسنہ کے مصداق یہ احسان کون کرنا چاہے گا۔

مذکورہ بالا تمہیدی گفتگو کے بعد اب انھوں نے مسئلہ ربا کی تحقیق کا عنوان قائم کیا ہے اور بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں "حرمت سود کی وجہ سے جو نقصانات ہورہے ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اسی وجہ سے قوم کے دردمند حضرات مسئلہ ربوا کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں" آگے لکھتے ہیں بعض حضرات کسی نہ کسی حیلہ سے سود کو جائز ثابت کرنے کے درپے ہیں، لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ صفحاتِ ذیل میں جو گذارش کی جائے گی ان الزامات سے خالی الذہن ہوکر محض نفس مسئلہ پر ایک طالب علمانہ نظر ہوگی۔ یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ حسب نصوص شرعیہ ربوا کی منطقی تعریف کیا

ہوسکتی ہے اور دور حاضر کے کن معاملات پر لفظ ربوا کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ شریعت نے حرمت ربوا کو کن شرائط کے ساتھ مشروط کیا اور ہندوستان میں وہ شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ مزید لکھتے ہیں آغاز سے پہلے یہ گذارش کردینا ضروری ہے کہ اسلام ایک ابدی قانون ہے جس کے احکام ہمارے تغیر پذیر آراء اور محدود عقول کے پابند نہیں۔ نہ یہ جائز ہے کہ ہم خواہ مخواہ کھینچ تان کر نصوص شریعہ (آیت) کی تاویل اس طرح کریں جو ہمارے فہم ناقص کے مطابق وقتی فوائد کے تابع ہو۔ احکام شریعت کے سامنے بلا کسی چون و چرا کے سر جھکا دینا ہمارا فرض اولین ہے خواہ اس راستے میں ہم کو اپنی عزیز ترین متاع حیات سے بھی دست کش ہونا ہی کیوں نہ پڑے۔

بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مولانا نے سود اور ربوا کی منطقی تعریف کا عنوان قائم کیا ہے لکھتے ہیں ''اگر ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مال عارضی طور پر بغرض استعمال و تمتع دیتا ہے اور واپسی کے وقت راس المال کے علاوہ ایک متعین و معہود اضافہ بہ معاوضہ تمتع و تقابض عارضی حاصل کرتا ہے، تو اس اضافہ کو سود کہیں گے۔''

اب دیکھنا ہے اصطلاح شریعت میں ربوا کس کو کہتے ہیں اتنا بہر صورت مسلم ہے کہ ربوا شرعی اور سود مروجہ باہم مترادف نہیں ہیں کیونکہ سود کی بعض مسلمہ شکلیں علماء نے جائز بتائی ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا ارشاد رامپوری کا فتویٰ ہے کہ ایک تھان کپڑا دے کر دو تھان لینا دست بدست یا ادھار دونوں جائز ہیں۔

لغت کے اعتبار سے ربوا کے معنی زیادتی یا اضافہ کے ہیں لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ مطلق زیادتی یعنی ربوا جو لغت میں ہے یہ وہ ربوا نہیں ہے جو شرعاً حرام ہے۔ قرآن میں ہر جگہ ربوا 'الربوا' یعنی الف لام کے ساتھ آیا ہے یہ بھی مسلم ہے کہ الف لام استغراق کا نہیں ورنہ اضافہ مال کی ہر صورت مثلاً نفع تجارت بھی حرام ہوتا اس لئے یقیناً الف لام عہد ذہنی ہے اور یہ کوئی خاص قسم کا اضافہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ خاص قسم کیا ہے؟ کلام الٰہی میں خود کہیں بھی اس خاص قسم کے اضافہ کی صراحت یا لفظ ربوا کی تعریف بہ الفاظ صریح وارد نہیں ہے اس لئے احادیث کی طرف رجوع کرنا ہوگا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ربوا کی کوئی صراحت نہیں فرمائی۔ فاروق اعظم سے روایت ہے ''ان آخر ما نزل من القرآن آیۃ الربوا وان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قبض قبل ان یفسرھا لنا فدعوا الربوا

والربیعہ۔ ترجمہ: ’’ربوا کی آیت ان آیاتِ قرآنیہ میں سے ہے جس کا نزول آخر عہدِ رسالت میں ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کی تفسیر فرمانے کے قبل رحلت کی اس واسطے ربوا اور جس چیز میں تم کو شک ہو سب کو چھوڑ دو۔‘‘ مذہب کے ادلہ اربعہ میں تیسری چیز جو شریعت میں دلیل بنتی ہے وہ اجماع ہے لیکن تعریف ربوا کی نسبت کوئی اجماع امت بھی نہیں ہے، صحابہ کرام سے لے کر ائمہ تک میں اس کی نسبت شدید اختلاف ہے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ صرف ادھار میں ربوا بتاتے ہیں، حضرت سعید خدریؓ اور حضرت عبادہ بن صامت دست بدست معاملات میں بھی ربوا بتاتے ہیں، امام داؤد ظاہری صرف چھ چیزوں یعنی کھجور، جو، گیہوں، نمک، چاندی اور سونا میں ربوا بتاتے ہیں۔ امام مالکؒ صرف خوردنی اشیاء میں ربوا بتاتے ہیں۔ احناف کے نزدیک ربوا کے لئے جنس بالجنس کے ساتھ کیل و وزن کی شرط ہے، شوافع کے نزدیک غذائیت اور ثمنیت وجہ رہی ہے۔ الغرض تعریف ربوا کے لئے کوئی اجماع نہیں اس لئے ربوا کا مفہوم متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن میں ربا کے متعلق جو آیات آئی ہیں اس میں تدبر کیا جائے اور اس کے شان نزول، سیاق و سباق، مصالح و حکم پر خلوص و عقیدت کے ساتھ غور کیا جائے اور حتی الوسع قرآن کی تفسیر خود قرآن یا اس کے بتائے ہوئے اشارات سے کی جائے۔ جن جزئیات کے متعلق احادیث صحیحہ میں حضور کے ارشادات مل جائیں ان کے اسباب و علل اور حالات گرد و پیش کا سراغ لگایا جائے اس طرح اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے جو کلیات (اصول) ہم بقدر استعداد مستنبط کر سکیں اس سے قیاس کر کے حالات حاضرہ سے متعلق رائے قائم کی جائے۔ اس کا نام قیاس ہے اب دیکھنا ہے کہ ائمہ سلف کا اجتہاد تعریف ربوا کی نسبت کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر اجتہاد کا صحیح اور واجب العمل ہونا ضروری نہیں یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ تمدن نے زمانہ حال میں مالی معاملات کی جو پیچیدہ اور متنوع صورتیں پیدا کر دی ہیں ان کا وجود بھی ائمہ مجتہدین کے عہد مبارک میں نہ تھا۔ لہٰذا مسائل حاضرہ کے متعلق کتب فقہ میں کسی جزئیہ کی تلاش ایک فعل عبث ہے تاہم ربوا کی جو تعریف فقہا نے کی ہے اس پر ایک نظر ڈالنا اور اس کو قرآن و حدیث اور عقل و نقل کے معیار پر پرکھ لینا ضروری ہے اگر وہ تعریف ربوا جو فقہا نے کی ہے اس معیار پر صحیح اتری اور سود کی تعریف سے منطبق ہوئی تو مترادف ہوئی، لیکن اگر وہ تعریف سود کے مفہوم موجودہ سے منطبق نہیں ہے یا بداہتہ مخالف عقل ہے یا قرآن و حدیث کے صحیح مفہوم و منشا کے خلاف

اور غلط استخراج پر مبنی ہے تو اس صورت میں ہم کو خود اصل ماخذ یعنی قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ فاذا تنازعتم فی شی فردوه الی الله والرسول۔

فقہا احناف نے جو تعریف ربوا کی فرمائی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

الربو محرم فی مكيل او موزون اذا بيع بجنسه متفاضلاً فالعلة عندنا الجنس مع الكيل والوزن و عندالشافعي الطعم في المطعومات والثمنية في الاثمان واذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم اليه حل التفاضل والنساء ويجوز بيع البيضة بالبيضتين والتمرة بالتمرتين والجوزة بالجوزتين لانعدام المعيار اى القدر فيه، والشافعي يخالف فيه لوجود الطعم ويجوز بيع الفلس بالفلسين باعيانهما ولا يجوز بيع الحنطة بالدقيق ولا بالسويق لان المجانسة باقية من وجه لانهما اجزاء الحنطة والمعيار فيهما الكيل، لكن الكيل غير مسوٍ بينهما وبين الحنطة لا كتنا زهما فيه وتخلخل حبات الحنطة، ويجوز بيع الدقيق بالدقيق متساويا — ويجوز بيع اللحم بالحيوان ويجوز بيع الخبز بالحنطة والدقيق متفاضلاً لان الخبز صار عددياً او موزوناً فخرج من ان يكون مكيلاً ولا ربوبين الحربي والمسلم.

ربا یا زیادتی حرام ہے ہر اس چیز میں جو گز سے ناپ کر یا تول کر بکتی ہے بشرطیکہ ایک جنس کا تبادلہ اسی جنس سے کیا جائے پس ہمارے احناف کے نزدیک وجہ حرمت ربا جنسیت ہے مشروط کیل و وزن، لیکن امام شافعی کی رائے میں ماکولات میں غذائیت اور نقود میں ثمنیت ہے۔ اور ہمارے نزدیک جب یہ دونوں وصف یعنی جنسیت اور وہ شرائط جو اس کے متعلق ہیں یعنی کیل و وزن نہ پائے جائیں تو زیادتی اور ادھار دونوں جائز ہیں، اور ایک انڈے کو دو انڈوں سے اور ایک کھجور کو دو کھجوروں سے اور ایک اخروٹ کو دو اخروٹوں سے بیع کرنا جائز ہے کیوں کہ معیار پیمانہ وزن وکیل اس میں معدوم ہیں مگر امام شافعی کو اس مسئلہ میں احناف سے اختلاف ہے کیونکہ ان اشیاء میں غذائیت ہے۔ اور ایک پیسہ کا دو پیسوں سے تبادلہ بجنسہا جائز ہے اور گیہوں کی بیع آٹے یا ستو سے مطلق جائز نہیں ہے اس لئے کہ جنسیت ایک طرح پر باقی ہے یعنی ستو اور آٹا بھی گیہوں کے اجزاء ہیں اور ان کا پیمانہ ناپ ہے۔ اور ناپ ان چیزوں میں برابر نہیں ہوسکتی کیونکہ پس جانے کی وجہ سے آٹے اور ستو کی مقدار پیمانہ میں زیادہ

آجائے گی اور گیہوں علاحدہ علاحدہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً کم سماوے گا اور آٹے کا آٹے سے برابر برابر لین دین کرنا جائز ہے اور گوشت کی بیع جانور سے جائز ہے، اور روٹی کی بیع گیہوں کے آٹے سے باوجود زیادتی جائز ہے کیونکہ روٹی یا تو شمار کر کے بکتی ہے یا وزن کی جاتی ہے آٹا گیہوں ناپ کر بکتا ہے جس سے روٹی خارج ہو جاتی ہے اور مسلم اور حربی کے درمیان ربو انہیں ہے۔

ربا کے بارے میں فقہائے احناف کی اس تعریف پر مولانا سوال کرتے ہیں کیا وہ ربا جس کی نسبت قرآن میں ممانعت کی گئی ہے اور جس کے مرتکب کو خدا اور اس کے رسول سے جنگ کا نام دیا گیا ہے کیا یہ وہی ربا ہے جس کی تعریف سطور بالا میں کی گئی ہے۔ ہرگز نہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ تعریف دست بدست معاملہ پر بھی حاوی ہے اور دست بدست معاملہ میں ربا کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اگر کسی شی کا تبادلہ ہوتا ہے تو حیثیت و نوعیت کے فرق کی وجہ سے ہوتا ہے ورنہ ایک ہی حیثیت کی چیز میں تبادلہ کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا تبادلہ آج تک ہوا ہے، غیر مساوی الحیثیت کا تبادلہ بمقدار مساوی خلاف فطرت ہے دست بدست تبادلہ کی صورت میں اختلاف اجناس لازمی ہے مثلاً دو اشخاص باہم سو روپیہ کلو والا باسمتی چاول کیوں تبادلہ کریں گے لیکن سو روپیہ والا ایک کلو چاول کا تبادلہ پچاس روپیہ والے دو کلو چاول سے ممکن ہے اور اسے ربا کہنا خلاف عقل ہے دوسرے یہ کہ یہ تعریف اس حدیث کے بھی خلاف ہے جس میں یہ کہا گیا ہے **لا ربا الا فی النسیئہ، لا ربا الا فی الدین** ربا نہیں ہے مگر ادھار میں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک سیر جو دے کر سوا سیر جو لینا حرام ہے لیکن ایک سیر جو دے کر سوا سیر گیہوں لینا جائز ہے اگر یہ استنباط صحیح ہے تو اس مسئلہ کو کیا کہیں گے کہ ایک شخص پانچ سیر گیہوں دے کر ساڑھے چار سیر آٹا حاصل کرتا ہے اور آٹے سے زائد گیہوں اس لئے دیتا ہے کہ پسائی کی مزدوری ادا ہو جائے اس تعریف کے مطابق وہ غریب مزدور اور خوش معاملہ خریدار دونوں ربا کے مرتکب ہوئے، اسی طرح یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ اگر ایک شخص ایک سیر چینی کے بدلے دو سیر گڑ لیتا ہے تو ایک سیر گڑ داخل ربا ہوگا کیونکہ دونوں کی جنس ایک ہے کیا ایسے احکام قابل عمل ہو سکتے ہیں؟ اور کیا ایسے خلاف عقل اور لایعنی احکام شریعت کے مطابق ہو سکتے ہیں؟

مذکورہ بالا فقہی تعریف میں سب سے زیادہ قابل توجہ ٹکڑا کیل اور وزن کا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو مثلاً آم اور امرود بنارس میں گن کر بکتے ہیں اور اعظم گڑھ میں وزن سے بکتے ہیں اب دیکھئے

آم اور امرود کا معاملہ بالتفاضل بنارس میں جائز ہے اور اعظم گڑھ میں داخل ربا ہے اس طرح گویا شرعی احکام ہمارے عارضی رواج اور معاملات کے تابع ہیں بہر حال ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے صاحب ہدایہ نے جو ربا کی تعریف کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ فقہی استنباط کہاں سے لیا گیا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ یہ فقہی استنباط قرآن سے نہیں لیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن میں اشارۃً بھی جنس، کیل، طعمیت اور ثمنیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ فقہی استدلال کی ساری عمارت روایات حدیث پر ہے۔ استدلال کی پہلی حدیث ابوسعید خدری سے ہے جسے عبداللہ بن مسلمہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں:

فقہاء کا استنباط

"ان رسول اللہ ﷺ بعث اخابنی عدی الانصاری فاستعملہ علی خیبر فقدم بتمر جنیب فقال لہ رسول اللہ ﷺ اکل تمر خیبر ھکذا قال لا واللہ انا لنشتری الصاع من ھذا بالصاعین والصاعین بالثلاث فقال لا تفعل بع الجمیع بالدراھم ثم ابتع بالدراھم جنیبا۔"

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنی عدی انصاری کے ایک شخص کو خیبر میں عامل مقرر فرمایا وہ جب کھجور لے کر حاضر ہوئے تو فرمایا کیا خیبر کی سب کھجوریں ایسی ہوتی ہیں۔ تو عامل نے عرض کیا واللہ نہیں ان کھجوروں کو ایک صاع ہم معمولی کھجوروں کے دو صاع کے معاوضے میں خریدتے ہیں اور یہ دو صاع تین صاع معمولی کھجوروں کے عوض میں ملتی ہے۔ حضور نے فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ (جمع) معمولی کھجوروں کو سکوں کے بدلے فروخت کرو اور پھر سکوں سے یہ کھجوریں خرید لو۔

اس حدیث کے سلسلہ میں مولانا تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اس حدیث سے ربا کا کوئی تعلق نہیں یہ محض ایک معاملہ ہے جس کا حال سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بہتر طریقہ اپنانے کی ہدایت کی ہے۔ اس کی مثال ہندوستان کے دیہاتوں میں دیکھنے کو ملتی ہے مثلاً سبزی فروش روپیہ کی بجائے اناج سے سبزی دیتے ہیں اور عورتوں کو بیوقوف بناتے ہیں اور گھر کے بزرگ عورتوں کو منع کرتے ہیں۔

ایک دوسری حدیث ہے:

سمعت ابا سعید یقول جاء بلال بتمر برنی فقال رسول اللہ ﷺ من این هذا؟ فقال بلال تمر کان عندنا ردی بعت منه صاعین بصاع لطعم النبی صلعم فقال رسول اللہ صلعم عند ذالک اوہ عین الربوا لا تفعل ولکن اذا اردت ان تشتری التمر بیع آخر ثم اشتریه.

ابوسعید خدری سے میں نے سنا وہ کہتے تھے بلال برنی کھجور حضور کے پاس لائے حضور نے پوچھا کہاں سے لائے ہو؟ انھوں نے عرض کیا ہماری کھجوریں ردی تھیں۔ اس لئے دو صاع کی ایک صاع حضور کے کھانے کے لئے بدل کر لایا ہوں پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا اوہ یہ تو عین ربا ہے ایسا نہ کرو لیکن جب کھجور سے کھجور خریدنا ہو تو پہلے اپنی کھجوروں کو کسی دوسری شے سے بدلو پھر اس سے کھجور خریدو۔

اس حدیث کے بارے میں بھی مولانا کہتے ہیں اس کا تعلق ربا سے نہیں ہے اس بات پر بکثرت احادیث صحیحہ موجود ہیں کہ دست بدست معاملات سے ربا کا کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا یہ الفاظ حضور کے نہیں ہو سکتے تھے کہ اس طرح کا معاملہ ربوا ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت تک ربا کو حرام قرار دیا جا چکا تھا۔ اس لئے یقیناً یہ اضافہ رواۃ نے کیا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں جو فتح خیبر کے سلسلے میں ہے لیکن فقہا نے اس سے بھی غلط طریقے سے ربا کی نسبت استدلال کیا ہے۔ حدیث یوں ہے۔

عن فضاله بن عبید قال کنا مع رسول اللہ ﷺ یوم خیبر فضمنا غنائم کثیرہ نبایع الیهود الاوقیة من الذهب بدینار او بدینارین فقال رسول اللہ ﷺ لا تبیعوا الذهب الاوزنا بوزن".

حضرت فضالہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ فتح خیبر کے دن حضور کے ہم رکاب تھے اور بہت سا مال غنیمت ہمارے ہاتھ لگا تھا اور ہم یہودیوں سے ایک اوقیہ سونے کا سامان دو یا تین دیناروں کے عوض میں فروخت کرتے تھے جس پر حضور نے ارشاد فرمایا نہ بیچو سونے کو بہ عوض سونے کے مگر بوزن مساوی۔
اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد بہت سا قیمتی سامان سونے چاندی کا مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ مسلمان چونکہ سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے اس لئے وہ ان قیمتی

سامانوں کو اونے پونے بیچ کر نقد حاصل کرنا چاہتے تھے اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ آپ لوگ اپنی خداداد دولت کو یوں مفت میں نہ لٹائیں جو مال فروخت کریں کم از کم ان کا وزن تو دیکھ لیں۔

اسی طرح تین چار حدیثیں اور ہیں جن سے فقہا ربا کے بارے میں استدلال کرتے ہیں۔ ان تمام احادیث کو نقل کر کے مولانا لکھتے ہیں۔ ''ان حدیثوں کو بار بار پڑھ جایئے آپ کو ربا کا لفظ کہیں نہیں ملے گا۔ ان احادیث سے تعریف ربا کا استدلال کرنا کیا معنی؟ اس وقت تک ربا کی حرمت بھی وارد نہ ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ محدثین مثلاً ابن ماجہ اور امام بخاری وغیرہ نے ان احادیث کو بیع صرف اور بیع مراطلہ کے ضمن میں درج کیا ہے۔

اسی واقعہ سے مشابہ ایک اور واقعہ نقل کیا ہے۔ امیر معاویہ کے عہد میں مال غنیمت میں سونے چاندی کے سامان ملے تھے اور لوگ باہم خرید وفروخت کر رہے تھے اس پر عبادہ بن صامت نے اپنے خطبہ میں لوگوں کو ایسے معاملات سے منع کیا اور بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کو سونے سے معاملہ کرنے سے منع کیا ہے۔ مگر یہ کہ معاملہ برابر کا ہونا چاہئے اس واقعہ کو عبادہ بن صامت سے کئی رواۃ نے مختلف طریقہ سے نقل کیا ہے ان تمام احادیث کو یکجا نقل کر کے مولانا لکھتے ہیں کہ یہاں بیع مراطلہ و بیع صرف کو ربا سے مخلوط کر دیا گیا ہے۔ اور مذکورہ بالا احادیث پر غور کامل کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع مراطلہ کے متعلق بہ لحاظ موقع چند مناسب ہدایتیں فرمائی تھیں جن کا مقصد محض اس قدر تھا کہ اشیاء یا سکوں کا تبادلہ یا تو نہ کیا جائے اور اگر تبادلہ کیا جائے تو کسی فریق کو نقصان نہ ہو۔

ان احادیث کی بنیاد پر فقہاء نے بیع مراطلہ و بیع صرف کو ناجائز قرار دیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ بعض فقہاء نے جو غلطی کی ہے اس کا ماخذ دراصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض رواۃ نے احکام متعلقہ ربا اور احکام متعلقہ مراطلہ و بیع صرف کو غلط فہمی سے بوجہ التباس باہم مخلوط کر کے غلط احکام کی تخریج کی ہے جو بعد کو بعض روایات میں بطور فرمودہ رسول روایت ہو گئے۔ اس لئے ان فقہاء نے جن اجتہادات کو ان احادیث پر مبنی کیا اس میں بھی غلطی لازمی تھی۔

بیع مراطلہ و بیع صرف کی تعریف:

اذا بیع الذهب بالذهب او الفضة بالفضة سميت مراطله و اذا بيع الذهب بالفضة سميت صرفا.

(جب سونے کو سونے کے عوض بیچا جائے تو اسے بیع مراطلہ کہتے ہیں اور سونے کو چاندی کے بدلے بیچا جائے تو اسے صرف کہتے ہیں)۔

عرب میں مختلف ممالک یمن، عراق، مصر وغیرہ کے الگ الگ سکے الگ الگ معیار اور وزن کے ہوتے تھے ان کے تبادلے میں اکثر جھگڑا ہوتا تھا یہ حالات تھے، اس لئے حضور نے اس موقع پر کچھ ہدایتیں فرمائیں۔ مراطلہ کے بارے میں فرمایا اپنی ہم جنس چیزوں کو باہم تبادلہ کے بجائے نقد سے مال خریدو۔ صرف کے متعلق فرمایا سکوں کا تبادلہ بالمساوات باعتبار مالیت کیا جائے یعنی وزن اور معیار دونوں اعتبار سے دونوں فریق کو مساوی مالیت ملے۔

بیع صرف سے متعلق روایات:

عن ابى سعيد الخدرى ان رسول الله قال لا تبيعوا الذهب بالذهب الامثلا بمثل ولا تشفوا بعضها على بعض —— ولا تبيعوا منها غائبا بناجز.

(موجود کو غیر موجود سے نہ بیچو) اسی طرح ایک روایت ہے:

لا تبيعوا الذهب بالذهب ولا الورق بالورق الاوزنا بوزن مثلا بمثل سواء بسواء.

ایک اور روایت ہے:

عن عبادة بن صامت قال قال رسول الله الذهب بالذهب — التمر بالتمر سواء بسواء يداً بيد فاذا اختلف هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يداً بيد.

مذکورہ بالا احادیث کا بھی ربوا سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو فتح خیبر سے متاثر ہو کر حضرت عبادہ نے بذات خود روایت کی ہیں۔ اب ایک روایت جس میں ربا کا لفظ آیا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے اس کے راوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

"قال سالک بن اوس بن الحدثان من یصطرف الدراھم فقال طلحه بن عبدالله وھو عند عمر ارنا ذھبک ثم آتنا اذا جاء خادمنا نعطیک ورقک فقال عمر کلا والله لتعطینه ورقه اولتردن الیه ذھبه فان النبی قال الورق بالذھب ربوا الاھاء وھاء — الخ".

مولانا کہتے ہیں اس میں فان النبی قال کے بعد جو عبارت ہے وہ حضرت عمرؓ کے الفاظ نہیں ہوسکتے کیوں کہ خود حضرت عمر کا قول ہے کہ حضور آیت ربوا کی تفسیر سے پہلے رحلت فرما گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں الورق بالذھب کہا گیا ہے حالانکہ چاندی وسونا ہم وزن ہرگز نہیں ہوسکتے۔

یہاں تک تو وہ روایات ہیں جن سے فقہا 'ربوا الفضل' کی حرمت اخذ کرتے ہیں اب ہم وہ روایات نقل کریں گے جن سے ربوا لنسیه پر استدلال کیا جاتا ہے۔

حدثنی اسامه بن زید ان رسول الله قال 'لا ربوا الا فی النسیئه' ایک روایت ہے: 'لا ربوا فیما کان یداً بید، لا ربوا الا فی الدین' ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دست بدست معاملہ میں تفاضل ربوا نہیں ہے ربوا کے جتنے معاملات ہیں ان کا نسیـــــہ یا ادھار ہونا ضروری ہے مگر یہ ضروری نہیں کے ہر ادھار کے معاملہ میں اضافہ لیتا رہا ہے۔ اس کو یوں سمجھئے ہر گدھا زمین پر چلتا ہے لیکن زمین پر چلنے والا ہر جانور گدھا نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہی غلطی ایک بالمعنی روایت میں ہوگئی ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک روایت ہے: 'کل قرض جر نفعا فھو ربوا'۔

یہاں ایک روایت کا ذکر ضروری ہے جس میں ربوا کا لفظ آیا ہے بعض فقہاء اس روایت سے ربوا النسیه کے بارے میں استدلال کرتے ہیں حدیث یوں ہے:

"التمر بالتمر ربوا الا ھاء وھاء الشعیر بالشعیر ربوا الا ھاء وھاء الحنطه بالحنطه ربوا الا ھاء وھاء الملح بالملح ربوا الا ھاء وھاء الفضة بالفضة ربوا الا ھاء وھاء الذھب بالذھب ربوا الا ھاء وھاء."

یہاں بھی انداز عبارت بتا رہا ہے کہ یہ حضورؐ کے الفاظ نہیں ہیں کیونکہ حضورؐ کا حکم ہوتا تو کسی امر یا نہی میں ہوتا۔

حدیث میں التمر بالتمر والشعیر بالشعیر کہا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جنس بالجنس میں ربا ہے۔ اسی طرح سے ارباب ظاہر کے علاوہ تمام فقہاء جنسیت کے ساتھ ربا کو مشروط کرتے ہیں۔ لیکن یہ استنباط صحیح نہیں ہے۔ مولانا نے کئی مثالوں سے اس کے غلط ہونے کی دلیل دی ہے اسی طرح اس حدیث سے علامہ داؤد ظاہری کی رائے یہ ہے صرف انھیں اشیاء ستہ میں ربا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اول الذکر چار اشیاء میں طعمیت اور بقیہ میں ثمنیت وجہ ربا ہے۔ مولانا نے مذکورہ فقہاء کی رائے کو عقلی ونقلی دلائل سے خارج کردیا ہے۔ اسی حدیث کی بنا پر امام مالک کی رائے ہے کہ صرف ماکولات مذخر میں ربا ہے اور کسی چیز میں ربا نہیں۔ مولانا اس رائے کو کچھ حد تک اقرب بہ صواب مانتے ہیں ماکولات مذخر سے وہ کھانے کی چیزیں مراد ہیں جو رکھنے سے خراب نہیں ہوتیں۔ ماکولات مذخر ایک طرح سے ذخیرہ اندوزی کی ایک قسم ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا ہے۔

بہر حال زیر نظر حدیث التمر بالتمر ربا الا ھاء و ھاء' سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اشیاء میں بصورت معاملہ قرض، اصل دین پر اضافہ بہر حال ربا ہے اس کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ اگر ان کو قول رسول مان لیا جائے تب بھی اس روایت کا مقصد کوئی عام منطقی کلیہ نہیں بلکہ اہل عرب میں ادھار لین دین کی جو صورتیں اس وقت رائج تھیں اس سے متعلق ہیں۔

مروجہ سود کے طریقے

اب دیکھنا یہ ہے کہ عرب میں ادھار معاملات کا مروج طریقہ کیا تھا اور جس طرح کے سودی معاملے آج ہوتے ہیں وہ عرب میں جاری تھے یا نہیں جہاں تک تفحص اور تلاش سے مثالیں ملتی ہیں عرب میں موجودہ سود کا رواج نہیں تھا آج حسب ذیل طریقے سود کے مروج ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے کچھ روپے بطور قرض لئے جس میں یہ شرط تھی کہ فی صد روپیہ اس قدر ماہوار یا سالانہ معاوضہ حق استعمال کا قرض دہندہ کو علاوہ اصل رقم کے ملے گا اب یہ قرض یا تو تجارتی وصنعتی اغراض کے لئے لیا جاتا ہے یا مدیون اس کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے کے لئے لیتا ہے۔

دوسری صورت سودی معاملات کی یہ ہے کہ ایک تاجر سے دوسرا تاجر جو کچھ مال بغرض تجارت

ادھار لیتا ہے اور قیمت ایک مدت معین کے بعد دینے کا وعدہ کرتا ہے اس صورت میں مال بیچنے والا اپنی چیزوں کے دام میں بہ لحاظ مدت ادائیگی کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ اشخاص یا کوئی کمپنی یا گورنمنٹ لوگوں کے پس انداز سرمایہ کو اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں اور یہ سرمایہ لوگوں کو قرض پر دیتے ہیں اس طرح ایک طرف تو سرمایہ کی فراہمی ان کا پیشہ تجارت ہوتا ہے دوسری جانب جن لوگوں کا روپیہ وہ اپنے پاس بطور امانت رکھتے ہیں ان کو بھی اس آمدنی کا ایک معقول حصہ بطور ایک رقم مقرر کے دیتے ہیں اس قسم کے کاروبار کو بینکنگ کہتے ہیں عرب میں ایسا کوئی طریقہ رائج نہیں تھا۔

اب دیکھنا ہے کہ عرب میں کیا طریقہ رائج تھا۔ عرب قدیم میں سود کا جو طریقہ تھا وہ قریب قریب اس طریقہ سے مشابہ تھا جس طرح کہ آج کل ہمارے دیہاتوں میں غلہ کو ڈیوڑھے یا سوائے پر دیتے ہیں لیکن اتنا فرق تھا کہ آج ہمارے یہاں اگر کوئی شخص ایک من غلہ کسی کو قرض دیتا ہے تو اسی وقت یہ وعدہ لے لیتا ہے کہ آئندہ فصل پر ایک من کا ڈیڑھ من لے گا۔ لیکن عرب میں قرض لیتے وقت کسی اضافہ کا معاہدہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک طرح کی پیشگی خرید کا معاملہ ہوتا تھا مثلاً اگر کوئی شخص متعین مدت کے لئے قرض لیتا تھا اور مدت میں واپس کر دیتا تھا تو عرب کے لوگ اسے بیع سلف کہتے ہیں اور اگر وہ مدت پر قرض ادا نہیں کر پاتا تھا اور مہلت کے عوض جو اضافہ اس سے لیا جاتا تھا اسے ربا کہتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سود بھی تو اسی کو کہتے ہیں کہ مقدار قرض اور زمانہ قرض کے حساب سے ایک خاص رقم قرض دار کو ادا کرنی پڑتی ہے تو دونوں میں فرق کیا ہے؟ مولانا کہتے ہیں کہ بہ ظاہر تو کوئی فرق نہیں لیکن حقیقتہً بہت بڑا فرق ہے۔ عرب کی صورت مروجہ میں معاملہ کرتے وقت اضافہ کا کوئی معاہدہ نہیں ہوتا تھا لیکن مقررہ وقت پر اگر قرض دار قرض واپس کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا تو قرض خواہ مہلت کے بدلے اصل رقم پر کچھ اضافہ کر دیتا تھا اور قرض دار کو مجبوراً ماننا پڑتا تھا، لیکن اگر پہلے سے اس طرح کے معاہدے کی بات ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ قرض دار قرض نہ لیتا لیکن جب وہ یہ معاملہ کر چکا، معاملے کے وقت ایسی کوئی شرط نہیں تھی پھر بعد میں یہ شرط لگائی گئی تو یہ یقیناً اس پر زیادتی اور ظلم ہے۔ مزید تحقیق کرنے پر یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ بیع سلف کے معاملے عموماً غیر مستطیع اور نادار و مسکین اشخاص کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی بات کی تائید میں امام بغوی کی تفسیر آیت ربا کا حوالہ دیا

ہے۔ امام بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں:

قال عطا و عکرمہ نزلت فی العباس بن عبدالمطلب و عثمان ابن عفان کان قد اسلفا فی التمر فلما حضر الجذاذ قال لھما صاحب التمر ان انتما اخذتما حقکما لایبقی لی مایکفی عیالی فھل لکما ان تاخذ النصف و توخرا النصف واضعف لکما ففعلا فلما حل الاجل طلبا الزیادہ فبلغ ذالک رسول اللہ فنھا ھما فانزل اللہ تعالیٰ ھذہ آلایۃ.

یعنی انھوں نے لکھا ہے کہ آیت تحریم ربا حضرت عباس ابن مطلب اور عثمان ابن عفان کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ حضرات کھجور کی فصل تیار ہونے کے قبل پیداوار کا معاملہ کرتے تھے یعنی درہم، دینار یا کھجور دے کر کھجور کی فصل پیشگی خریدتے تھے اور جب تیاری فصل کا زمانہ آتا تو کھجور والا کہتا کہ اگر آپ لوگوں نے پورا مطالبہ لے لیا تو ہمارے بال بچوں کے لئے کیا بچے گا۔ اس لئے اس وقت آدھی کھجوریں لے لیجئے۔ بقیہ آدھی کو دوگنی کر کے فصل آئندہ میں لے لیجئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی اسی بنا پر ایک بڑے محقق کی رائے ہے کہ ربا صرف بیع سلف میں ہے۔

اس سلسلہ بیان میں ہم اس نوبت پر آگئے ہیں کہ قرآن پاک اور حدیث میں جس ربا کی حرمت ہے اس کی تعریف قرآن پاک کے سیاق و سباق، شان نزول اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں کر سکیں اور اسی ضمن میں یہ بھی بتا سکیں کہ تحقیق ربا کے لئے مختلف فقہاء نے جو مختلف شرائط عائد کی ہیں ان میں سے کون سی رائے کس حد تک صحیح ہے اور اگر غلطی ہوئی ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں اور حالات حاضرہ میں کون سا طریقہ کتاب اللہ و سنت رسول کے مطابق ہو سکتا ہے۔

پچھلی بحث سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ فقہاء کی تعریف ربا عقل و نقل کے خلاف ہے۔ اس تعریف میں غرض معاملہ، اشخاص معاملہ اور مقام معاملہ کا کوئی لحاظ نہیں ہے بیع مراطلہ و بیع صرف کو ربا سے مخلوط کر دیا گیا ہے۔

بزرگوں نے جو روایات کی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ربا صرف نسیئہ (یعنی ادھار) یا دین واجب الاداء میں ہے اس ضمن میں ایک اور حدیث کا ذکر کرنا مناسب ہے حدیث یوں ہے:

عن ابی ھریرۃؓ استقرض رسول اللہ ﷺ سنا فاعطاہ و اعطی سنا فوقہ قال خیار کم محاسنکم قضاءً.

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دو سالہ اونٹ قرض لیا اور ویسا ہی ایک اونٹ واپس دیا اور اس پر سے ایک اونٹ اور دیا اور فرمایا تم میں سے بہتر وہ ہے جو بہتر طور پر ادائے قرض کرے۔

اب یہاں پر یہ دیکھنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کیوں ربا سے خالی ہے اور حضرت عباسؓ کا معاملہ ربا ہے؟ دونوں میں کچھ باتیں مشترک ہیں :۔ مثلاً

دونوں میں آغاز معاملت کے وقت اضافہ کا کوئی معاہدہ نہیں تھا بر وقت ادائیگی دونوں میں اصل دین پر اضافہ ہوا۔ دونوں معاملے ادھار کے تھے۔ اب حسب ذیل امور دونوں میں مختلف ہیں۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ معاملہ استقراض کا تھا وہ معاملہ پیشگی خرید کا۔

لیکن مولانا کا کہنا ہے کہ یہ فرق کوئی ایسا فرق نہیں ہے جس کی بنا پر اختلاف حکم ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ کھجور والے قصے میں اضافہ کا معاہدہ کرنے والا غیر مستطیع محتاج اور مجبور ہے اور یہ معاہدہ دراصل ایک مضطر کا معاہدہ ہے جو قانوناً قابل نفاذ نہیں ہوگا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع مضطر سے منع فرمایا ہے اس موقع پر معاہدہ زیادہ لازمی طور پر مجبوری مانا جائے گا اور اس کا لینا حرام ہوگا۔ اونٹ والی صورت میں قرض لینے کی غرض یہ نہ تھی کہ اس سے زندگی قائم رکھی جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قرض لینے پر مجبور نہ تھے اگر دائن زیادہ کا معاہدہ چاہتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرط منظور نہ ہوتی تو انکار کر سکتے تھے لیکن خوشی سے منظور کر لیتے تو یہ شرط ناجائز نہ ہوتی کیونکہ جس طرح اضافے کے ساتھ ادائے قرض مستحسن اصول ہے اسی طرح اس مستحسن فعل کا وعدہ کر لینا بھی گناہ نہیں ہوتا اس تفصیل سے حسب ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

اگر کسی صاحب احتیاج شخص کو اس کے بال بچوں کی پرورش کے لئے کوئی قرض دیا جائے تو اس پر کوئی اضافہ لینا یا اضافے کی شرط کرنا ناجائز ہے برعکس اس کے کہ اگر کسی اور غرض سے قرض لیا جاتا ہے اور بخوشی اور بلا جبر و اکراہ اس زیادتی کا معاہدہ ہوتا ہے تو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ آیت قرآنی پر تدبر کرنے سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

قرآن کی آیت: "اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ☆ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ☆ (سورہ روم: ۳۸،۳۷)

اس آیت میں ذی القربیٰ اور مساکین ومحتاجوں کی اعانت کا ذکر ہے۔ جو لوگ زکوٰۃ کے بجائے ربا کے ذریعہ اپنا فائدہ چاہتے ہیں وہ دراصل خسارے میں ہیں پس اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ربا اور زکوٰۃ کا محل ایک ہے یعنی مسافر ومساکین جو زکوٰۃ لے سکتے ہیں ان کو قرض دے کر اضافہ لینا ربا ہے کیونکہ یہاں پر ربا اور زکوٰۃ کا مقابلہ ہے۔

دوسری آیت یہود کے بارے میں ہے ان کو ربا حرام کی گئی مگر وہ نہ مانے نتیجہ یہ ہوا کہ قدرتی آسائشوں سے محروم کردئے گئے۔

یہودیوں کو کس سود سے روکا گیا ہے۔ یہودیوں اور مسلمانوں کا ربا ایک ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَھُمْ وَبِصَدِّھِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَثِیْرًا ☆ وَّاَخْذِھِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُھُوْا عَنْہُ وَاَکْلِھِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (النساء آیت: ۱۶۱)

ربا کی تشریح ہے باطل طریقہ سے مال کھانا اور اس کی ضد ہے تجارت۔

ناجائز طریقہ پر مال کھانے کی تفصیل:

اس کو قرآن حکیم میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ۔ یہاں باطل مال کے مقابلے میں تجارت کا ذکر ہے۔

تجارت کے معنی:

تجارت اس مال منفعت کو کہتے ہیں جس میں ایک شخص اپنے مال کا مبادلہ دوسرے شخص کے مال سے خواہ نقد خواہ ادھار کرتا ہے اس معاملہ سے جانبین کو یکساں منفعت مقصود ہوتی ہے۔ تجارت کے علاوہ مبادلۃ المال بالمال کی صرف ایک صورت ہوسکتی ہے وہ ہے اقراض۔ لیکن خود اقراض کا منشاء بھی تجارت ہوسکتا ہے۔ یعنی رفع احتیاج کے بجائے جلب منفعت مثلاً ایک تاجر قرض لیتا ہے اور راس المال کے علاوہ کچھ رقم دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے وہ اپنی ناگزیر ضروریات زندگی کے

لئے قرض لینے کے لئے مجبور ہے پہلی صورت میں معاملہ جائز ہے۔ کیونکہ وہ تجارت کی ایک قسم ہے دوسری صورت میں تفاضل کا وعدہ جبری ہوگا اور ایسا معاملہ ناجائز ہوگا غیر مستطیع شخص محل تجارت نہیں بلکہ احسان کا مستحق ہے۔

تراضی کا معیار:

یہ لفظ اس جگہ بولا جاتا ہے جہاں فریقین کسی معاملہ سے یکساں طور پر رضا مند ہوں اور فیصلہ لینے میں آزاد ہوں مثلاً فرض کیجئے افریقہ کے صحرا میں دو ہم سفر ہوں ایک کے پاس پانی نہ ہو اور پیاس سے جان بلب ہو دوسرے کے پاس پانی کی چھاگل ہو مگر وہ اس صورت میں دینے کے لئے تیار ہو کہ اس کے پاس جو لاکھوں روپے کا ہار ہے وہ معاوضہ میں حوالے کردے ظاہر ہے جان بچانے کے لئے اسے ہیرا دینا پڑے گا تو کیا ایسی صورت میں معاملہ بالتراض سمجھا جائے؟

توراۃ کے مطالعہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کو جس سود سے روکا گیا تھا وہ محتاج و مساکین سے متعلق ہے اب ان آیات پر گفتگو کریں گے جس میں ربا کو مطلق حرام قرار دیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲۷۴) اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷۵) یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ (۲۷۶) (سورہ بقرہ)

حکم حرمت ربا کے آغاز سے پورے دو رکوع خیرات وصدقات کی ترغیب غرباء اور غیر مستطیع پر احسان کرنے کا ذکر ہے یہ آیتیں جس میں حرمت ربا کا ذکر ہے۔ مکہ فتح کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی ہیں اس کی شان نزول کے بارے میں کئی روایتیں ہیں ایک روایت یہ ہے کہ خطاب اہل مکہ سے ہے جو سودی کاروبار کرتے تھے، ایک روایت ہے کہ یہ حضرت عباسؓ اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ آیت بیع سلف سے متعلق ہے جو خود 'فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ' سے واضح ہو رہا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کے نتائج اور ہندوستان سے اس کی عدم تطبیق:

ربا جو اس آیت کے ذریعہ حرام ہوئی وہ بیع سلف کا معاملہ ہے یہ معاملہ مسلمانوں سے متعلق ہے جس ملک میں ربا حرام ہوئی وہ اسلامی حکومت تھی دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہندوستان کے سودی معاملات ان حالات سے منطبق ہوتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ نہ تو بیع سلف کا وہ طریقہ آج ہے نہ ہی وہ حالات ہیں کہ اگر کوئی محتاج قرض ادا کرنے سے قاصر ہے تو اسے مجبور کیا جاسکتا ہے علاوہ ازیں ہندوستان میں نہ تو ہماری حکومت ہے اور نہ محض مسلمانوں سے لین دین ہے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آج کل کے سودی معاملات پر ربا کا اطلاق نہ تو فقہی احکام کے مطابق ہے اور نہ حدیث سے اس کا ربا ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی قرآن کی آیات کے ذریعہ سے اس کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ جب قرآن وحدیث میں ربوا کی کوئی تعریف موجود نہیں ہے تو ہمیں مجبوراً مفہوم متعین کرنے کے لئے دو صورتوں میں ایک صورت اختیار کرنی پڑے گی ایک تو اس کے لئے اہل عرب کا رواج دیکھنا پڑے گا دوسرا قیاس کرنا پڑے گا رواج کے لئے حضرت عباسؓ کی پیشگی خرید فصل واقعہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا واقعہ کی شکل یہ ہے کہ حضرت عباس کھجوروں کی خرید کا پیشگی معاملہ کرتے تھے جب کھجوریں تیار ہوجاتی تھیں تو کھجور والا کہتا اگر آپ نے اپنا حق لے لیا تو میرے بچے فاقہ سے مرجائیں گے لہٰذا کچھ حصہ لے لیجیے اور کچھ کے لئے آئندہ فصل تک کی مہلت دیجیے اس سے معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ محتاج اور غریب سے ہوتا تھا اس قصہ کی بنیاد پر ہمارے علماء ربا کے حرام کے ہونے کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کرتے ہیں۔

(۱) ربا دراصل مبادلۃ الاموال بالا جال یعنی زمانہ مہلت کے معاوضہ میں یہ مال لیا جاتا ہے اور چونکہ زمانہ صاحب مال کی ملکیت نہیں اس لئے زائد روپیہ بلا معاوضہ ہے دوسری توجیہ یہ کرتے ہیں کہ اگر ربا کو جائز قرار دے دیا جائے تو سرمایہ دار کو ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت نہیں ہوگی مزے سے گھر بیٹھے سود لیا کرے۔ تیسرے یہ ہے کہ سود نفع معین ہے یہ جائز نہیں ہے۔ چوتھے یہ کہ ضرورت مند بھائی کی مدد کرنا اخلاقی فرض ہے اور اس کے لئے کوئی نفع نہیں لینا چاہیے مولانا نے بحث کرکے یہ بتایا کہ اس میں سے کوئی بھی وجہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس واقعہ کی بنیاد پر ربا کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا محتاج شخص جو مستحق صدقہ ہو اپنے یا اپنے عیال کی پرورش کے لئے قرض لے یا ایک ایسا مدیون جو استطاعت دین واجب الاوا پر قادر نہ ہو اور نہ بصورت ادائے دین اس کے پاس اتنا بچ رہے جس سے بچے پل

سکیں اصل دین یا اصل قرض پر اضافہ کا کوئی معاہدہ کرتا ہے تو یہ معاہدہ ربا کا ہوگا جو نا جائز ہے مگر یہ حکم عدم جواز دو شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ (۱) جہاں یہ معاہدہ کیا جائے وہاں اسلام کی حکومت ہو (۲) معاملہ یا تو بین المسلمین ہو یا اگر فریقین میں سے مسلم نہ ہو تو کم از کم مسلم کے برابر حقوق رکھتا ہو یا ذمی ہو۔

مولانا کہتے ہیں کہ ہمارے دعوے کی تائید قرآن کی آیات سے بھی ہوتی ہے آیات تحریم ربا سے قبل پورا رکوع انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب میں ہے اور محتاج کو صدقہ دینے اور مدد کرنے پر ایک عمدہ خطبہ ہے اس میں ربا کا مقابلہ زکوٰۃ سے کیا گیا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ربا اور صدقہ کا محل ایک ہے یعنی صاحب احتیاج کی رفع حاجت اور احتیاج کا معیار یہ ہے کہ محتاج کے پاس کفالت کے لئے کچھ نہ ہو۔

آیت تحریم پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آیت میں سود خوروں کی مثال آسیب زدہ مخبوط الحواس سے دی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بیع اور ربا کو ایک جیسا بتاتے ہیں لیکن ظاہر ہے دونوں میں فرق ہے دونوں میں مشارکت یہ ہے کہ دونوں میں مبادلۃ المال بالمال ہے اسی وجہ سے سود خور ربا کو بیع کہتے ہیں۔ بیع یعنی تجارت میں جانبین یکساں ضرورت مند ہوتے ہیں فریقین معاملہ کی تکمیل میں حقیقی طور پر آزاد ہوتے ہیں لیکن ایک محتاج جو قرض لینے پر مجبور ہے اور ایک مستغنی مہاجن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک طرف خود غرض مہاجن ہے اور دوسری طرف مجبور بے بس قرض دار ہے جو اگر قرض ادا کرتا ہے تو فاقہ کی نوبت آجاتی ہے ایسے میں معاہدہ اضافہ یقیناً ایک طرف ہوگا۔ بیع اور ربا میں یہی فرق ہے جس کی وجہ سے بیع حلال اور ربا کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ آگے آیت میں ذکر ہے "یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ" یہاں ربا اور صدقہ کا محل ایک ہے صدقہ غریبوں اور مسکینوں کا حق ہے اس لئے ربا کا محل بھی غریب اور محتاج کے لئے ہوگا، اگر ربا ہر غریب امیر سے لینا جائز ہوتا تو صدقہ سے اس کا کیا مقابلہ۔ آیت تحریم ربا میں آگے کی آیت یوں ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲۷۸) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۹) وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۸۰) (سورہ بقرہ)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم سچ مچ مومن ہو۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کرتے ہو تو تمہارے لئے تمہارا اصل مال ہے۔ ظلم نہ کرو حالانکہ تم پر بھی ظلم نہیں ہو رہا ہے۔

یہاں ظلم کا اطلاق اسی صورت میں ہوگا جب یہ غیر مستطیع شخص جو ضروریات زندگی کے لئے کسی معاہدہ ربا پر مجبور ہوتا ہے ورنہ ایک مستغنی شخص اگر اپنے دائن کو اصل دین سے کچھ زیادہ دیتا ہے تو اس پر کون سا ظلم ہوتا ہے جبکہ خود حضور نے ایسا عمل کیا ہے اور 'خیار کم محاسکم قضا' فرمایا ہے۔

ربا کے لئے احتیاج لازمی شرط ہے چنانچہ آگے کی آیت ہے: 'فَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ و نظرۃ اِلٰی مَیْسَرَةٍ۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا فَهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ۔ اس آیت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مہلت کا مستحق ذو عسرۃ ہے یعنی جو تنگی میں ہو اور تنگی کے لئے معیار یہ ہے کہ اس پر صدقہ جائز ہو۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا فَهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ اس آیت سے یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے مستطیع اشخاص کے لئے یہ امر جائز نہیں رکھا ہے کہ وہ دوسروں کے مقروض رہیں۔ یہیں سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مستطیع اشخاص جو تعیش و تنعم، تجارت یا دوسرے غیر ضروری کاموں کے لئے قرض لیتے ہیں وہ اصطلاح شریعت میں قرض نہیں بلکہ ایک طرح کا ایسا معاملہ ہے جو خواہ مضاربت کی کوئی قسم ہے یا اکراہ کی۔ قرض کے لئے احتیاج شرعی کا وجود اولین شرط ہے۔

"ربا کی نسبت ہمارا استنباط":

اس عنوان کے تحت گذشتہ مباحث کا جو نچوڑ ہے اسے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے "لہٰذا ہمارا یہ استنباط ہے کہ بلا قید و جنس و کیل و وزن وغیرہ ایک غیر مستطیع مستحق صدقہ شخص کے رفع احتیاج ضروری کے لئے جو قرض دیا جائے اس پر اضافہ مشروط کا نام ربا ہے جو قرآن کی آیت متعلقہ سیاق و سباق اور شان نزول سے قابل یقین حد تک ثابت ہے۔"

مذکورہ بالا پیراگراف میں ربا کی تعریف کرنے کے بعد اب اس مسئلہ یعنی لاربوا بین الحربی والمسلم پر بحث کی ہے اور چوبیس پچیس صفحات میں جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حربی سے ربا لینا جائز ہے اور ہندوستان جیسے ملک میں جو کہ دارالامن ہے ایک مستامن مسلم کو حق ہے کہ وہ ان تمام طریقوں سے دولت حاصل کرے جس کی اجازت حکومت کا قانون دیتا ہو بلالحاظ اس کے کہ شریعت

اسلامی کے مطابق وہ حرام ہو۔ صرف شرط یہ کہ ایسے معاملات غیر مسلم کے ساتھ کئے جائیں مگر اسی کے ساتھ مسلمان کے لئے یہ ناجائز ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کو سود دے کیونکہ سود دینا درحقیقت ظلم کا موقع دینا ہے۔ ہاں البتہ اگر اس کو اپنی ناگزیر فطری ضروریات پر کسی مسلم سے قرض نہ ملتا ہو اور قرض نہ لینے کی صورت میں جان کا خطرہ ہو تو وہ غیر مسلم سے بھی ربائی قرض لے سکتا ہے اور یہ معاملہ اس قسم کا سمجھا جائے گا جیسے فاقوں کی صورت میں مردار بھی حلال ہو جاتا ہے اور اس گناہ کی ذمہ داری ان مسلمانوں پر ہوگی جو استطاعت رکھتے ہوئے بھی اپنے غیر مستطیع بھائی کی رفع احتیاج سے گریز کرتے ہیں یا ان علماء پر ہوگی جنھوں نے قرضہ حسنہ کو واجب بھی قرار نہیں دیا اور سود کی حرمت کا فتویٰ دے کر مستطیع مسلمانوں کے ہاتھ پر مہر لگا دی اور ان کو جناب علی رضی اللہ عنہ کے **یعض المومن علی مافی یدیه** (مومن اسی چیز کو کاٹتا ہے جو اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے) کا مصداق بنا رکھا ہے۔

اقبال سہیل کا تصورِ غم: درباب غزل

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی☆

اختر انصاری کا خیال ہے کہ ہمارے پاس غزل کی تفہیم اور جانچ پرکھ کی کوئی معتبر کسوٹی نہیں ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ غزل کا مطالعہ جس جامع طریقہ کار کا تقاضا کرتا ہے اس کی مثال اردو تنقید میں ناپید ہے۔ یہ یقیناً ایک بڑا سخت اعتراض ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو اسے بالکل بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو غزل کے مطالعے میں اس کے اساسی پہلوؤں روایت غزل، روح عصر اور شاعر کے انفرادی مزاج پر اب تک پوری توجہ نہیں دی گئی ہے اور مختلف ناقدین کے یہاں غزل کے فنی معیار کی تعیین قدر میں تعبیر و تاویل کا اختلاف بین طور پر نمایاں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غزل کے موضوع پر خاصے فکر خیز مطالعے پیش کئے گئے ہیں مگر اس کے جانچ پرکھ کے جو پیمانے وضع کئے گئے ہیں ان سے غزل کے کلی مطالعے کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ غزل کے موضوعات و اسالیب کا مطالعہ حقیقتاً ایک خاصا پیچیدہ عمل ہے اور اس کی تفہیم آسان نہیں۔ اس ضمن میں اکادکا کوششوں کے علاوہ ابھی تک کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی ہے اردو ناقدین میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اختر انصاری اور آل احمد سرور نے غزل کے آرٹ کی تفہیم پر بالخصوص توجہ کی ہے۔ جس کا اعتراف ضروری ہے۔

غزل اصلاً داخلی کیفیت کے اظہار کا فن ہے اور اپنی ہیئت کے اعتبار سے دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ مستحکم اور منظم ہے۔ غزل کے فن کی اس مخصوص نوعیت نے اس کے ہیئتی لوازم کو اس کا ناگزیر جزو بنادیا ہے۔ غزل کی خوش آہنگی، اس کا اشارتی و ایمائی اندازِ بیان اور منضبط طرزِ اظہار جو اس کی اساسی خصوصیات ہیں اس کی مقررہ ہیئت ہی کے اندر بہ روئے کار لائی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ

☆ صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

ہے کہ غزل کے اسالیب میں عہد بہ عہد تبدیلیوں کے باوجود ایک داخلی صنف کی حیثیت سے اس کی فنی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور یہ بنیادی طور پر اپنی اسی امتیازی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے۔

اقبال سہیل کی غزلیہ شاعری کے مطالعے کے سیاق میں غزل کے فن پر چند باتیں جملہ معترضہ کے طور پر اس لئے پیش کی گئیں کہ اقبال سہیل کی شعری تخلیقات بالخصوص ان کی غزل گوئی کی قدروں کے تعین میں ان عناصر کی کارفرمائی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جسے ان کے ذہن نے اخذ وقبول کئے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کے ذہن وفکر کے برگ وبار، عہد ساز، نقاد، دانشور اور شاعر وادیب مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کی علمی وفکری بصیرتوں میں پروان چڑھے اور حسرت موہانی جیسی نابغہ روزگار شخصیت سے انھیں قربت نصیب ہوئی۔ اقبال سہیل جنگِ آزادی کے شباب آزادی کے گواہ رہے ہیں۔ لہٰذا سیاسی سطح پر عظیم مجاہدین آزادی مولانا محمد علی جوہر، نہرو، حسرت موہانی، مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی جیسے قائدین کی سیاسی بصیرتوں سے کسب فیض ایک فطری بات تھی۔ اس وقت ملک وملت کے پیچیدہ مسائل تھے جن سے وہ دن رات الجھتے رہے اور ان ہی پر خامہ فرسائی کرتے رہے۔ ایک طرف ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا معاملہ تھا، دوسری طرف قومی سطح پر مسلمانوں کے تہذیبی وجود کی انفرادیت کے تحفظ کا غم۔ جنگ آزادی کی جدوجہد، ٹوٹتے انسانی رشتے، تمام انسانیت پر تشدد، اقدار کی پامالی اور لہولہان ہوتا معاشرہ اقبال سہیل کے عہد کا مقدر تھا۔

اقبال سہیل بنیادی طور پر ایک صالح اور تعمیری فکر ونظر کے پاسدار واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ سیاسی طور پر جو انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے اثرات قبول کئے اس کی بڑی وجہ محمد علی کی دینی، ملی، سیاسی اور ادبی شخصیت تھی جو بقول عبد الماجد دریابادی ''سیاست اور ایمانیت'' سے عبارت ہے۔ ان سب پر فائق ان کا جذبہ دینی اور ایمان کی حلاوت ہے جو ان کی شخصیت کا ایک اساسی عنصر قرار دیا جاسکتا ہے اور ان کے شاعرانہ جذبات کو متحرک کرتا رہا ہے۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے وہ غالب، حالی اور اقبال جیسے انقلاب آفریں شعرا سے خاصے متاثر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں اردو غزل کی فکری وفنی روایت میں غالب، حالی اور اقبال کے ذریعہ بالیقین نئے ابعاد اور جہتوں کا اضافہ ہوا۔ اقبال کے اثر سے بالخصوص اردو غزل میں عصری حالات ومسائل اور جدید زندگی کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کی ترجمانی کی طرف باضابطہ توجہ دی گئی اور اس میں وسعت اور کشادگی پیدا کرنے کی شعوری طور پر کوشش کی گئی۔ اقبال سہیل

کی فکر، اسالیب اور رنگ و آہنگ پر ان اکابرین کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول کا ہندوستان جن حالات سے دوچار تھا اس میں نجی تجربات اور ذاتی افکار و احساسات کے اظہار کی تہہ میں مختلف اثرات و عوامل کی کارفرمائی سے صرف نظر ممکن بھی نہ تھا۔ اقبال سہیل اپنے عہد کے سیاسی و قومی حوادث سے شدید طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کے شعری نگارشات کا وافر حصہ قومی و ملی بیداری کا وسیلہ اظہار ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان کے قومی احساسات اور ملی جذبات بڑی خوبی کے ساتھ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر داخلیت کا روپ دھار گئے ہیں۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ داخلیت جذبے اور تخیل کی آمیزش سے وجود میں آتی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ پُرگداز کیفیت اور معنوی بلاغت سے اشعار میں جدت اور تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ اردو کی کلاسیکی غزلیہ شاعری کا سرمایہ انھی خوبیوں کی رہینِ منت ہے۔

انسانی زندگی بیک وقت رنج و غم، دکھ درد، مسرت و شادمانی کا مرقع ہے۔ یہ زندگی بہ ظاہر جتنی سپاٹ اور سادہ نظر آتی ہے بہ باطن اتنی ہی پیچیدہ، مرکب اور مبہم ہے۔ دنیاوی و سماوی ہر آفات و مصائب کا ٹھکانہ اور آشیانہ اصلاً ہماری زندگی ہی ہے اور فرحت و انبساط کے لمحے کی مستحق بھی یہی زندگی ہے۔ حیات انسانی سے وابستہ مثبت اور منفی حالات اور احساسات ہی تخلیق کا روپ دھارتے ہیں اور شعر و ادب میں منتقل ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے شعر و ادب محض وسیلہ اظہار نہیں ہوتے بلکہ کائنات کی وہ تمام خوشی اور غم، جو انسانی زندگی میں پوشیدہ اور محفوظ ہیں اس کے محافظ اور امین بھی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کائنات کی ساری روشنیاں اور تاریکیاں پہلے زندگی کے حصے میں آتی ہیں اس کے بعد ہی احساس و تجربات کی بھٹی میں تپ کر ادب و شاعری کی شکل اختیار کرتی ہیں۔

اقبال سہیل کی غزل گوئی ان کی واضح فکری اساس ان کے منفرد طرز احساس اور مخصوص اسلوب اظہار سے مل کر انھیں معاصر غزل گویوں میں نمایاں مقام عطا کرتے ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری اپنی بلیغ اشاریت، اپنے فنی رچاؤ، اپنی خوش آہنگی، اپنے طرز کلام کی شگفتگی اور اپنی مانوس شعری زبان اور طرزِ اظہار سے اپنا ایک مستحکم نقش چھوڑتی ہے۔ انھوں نے اپنے بعض اشعار میں تخلیقی رویوں کی بابت بعض بڑے معنی خیز اشارے کئے ہیں، جن سے ان کی غزل کے انفرادی مزاج اور انداز و آہنگ کی بابت واضح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ ان کا یہ شعر اس ضمن میں توجہ طلب ہے:

میرا ذوقِ فن عامیانہ نہیں ہے — یہاں قصۂ زلف و شانہ نہیں ہے
سہیل حزیں، کون سنتا ہے اس کو — یہ روداد غم ہے، ترانہ نہیں ہے

بہ قول حفیظ میرٹھی:

تخلیق میں آتے نہیں شہ کار کے انداز
جب تک نہ سنواریں اسے فن کار کے آنسو

سہیل اسی پس منظر میں اپنے کلام میں رودادِ غم، سوز دروں اور بے تابیٔ دل کا ذکر کرتے ہیں۔ جسے وسیع تر تلازمات کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

شاعر کے کلام میں یہ کیفیت، اس عہد کے ٹوٹے بکھرتے ہوئے انسانی رشتوں، مذہبی اور روحانی عقائد سے انحراف اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عالم گیر تہذیبی اور معاشرتی بحران کے دردانگیز اور کربناک احساس سے پیدا ہوئی ہے جس کے پس پردہ اس کے آفاقی نظریۂ حیات اور انسانی ہمدردی کے ہمہ گیر جذبے کی کارفرمائی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے، شاعر کا یہ عمل اس کی غزلوں کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی اور پر معنی بناتی ہے۔

اک میں ہی بدنصیب، گرفتارِ غم نہیں — دنیا اسیر حلقۂ زلف دراز ہے
کس نے دیا تجھے یہاں اذنِ فغاں سہیل — تیری نوا تو پردہ در بزمِ راز ہے
زنداں نصیب ہوں مرے قابو میں سر نہیں — میرا سجود ان کے لئے، معتبر نہیں
لذت شناس غم کو ہے اظہارِ غم حرام — روتا ہوں اور دامنِ مژگاں بھی تر نہیں

یہ درست ہے کہ اقبال سہیل ایک خوشحال اور ذی علم خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور اپنے وکالت کے پیشے میں ان کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہوتا تھا۔ لیکن وہ جاگیردارانہ نظام، فرقہ پرستی اور انگریزوں کے ظلم و زیادتی کے علاوہ قوم مسلم کی بے عمل زندگی ان کی حساس طبیعت کو بے چین اور بے قرار کرتی ہے۔ حیات انسانی کے ناقابل برداشت صدمات اور زندگی کے رنج و الم کو ''خاموش خود کلامی'' کے قالب میں اس طرح ڈھالا کہ یہ جزو بن گئے۔ اس لئے سہیل کے نزدیک شاعری فرحت و سرور کی کیفیت کا اظہار یا دوسروں کو سنانے کا ذریعہ نہیں، بلکہ دکھ بھری سوگوار تنہائی میں ایک مکالمہ، خود سے باتیں کرنے کا ذریعہ اور تزکیہ نفس (Katharsis) کا مؤثر وسیلہ ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بے

جاننا ہوگا کہ سہیل کی شاعری اور انسانی دکھ بھری زندگی میں کوئی بعد نہیں بلکہ یہ ان کے فن کا لازمہ اور ان کی حیات کا اثاثہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے غم کو بڑی حد تک مشخص کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک غم کی بڑی عظمت اور معنویت ہے جس کا برملا اظہار انھوں نے خود کیا ہے یہ اشعار دیکھیے:

اب غرقِ بحرِ غم کو ہے طوفان کی تلاش	دستِ طلب میں دامنِ ساحل نہیں رہا
اصرار نہیں لیکن، سنیے تو سنانا ہے	اک دکھ کی کہانی ہے اک غم کا فسانہ ہے
کیا آپ سمجھتے ہیں، اس دیدۂ گریاں کو	ہر اشک کے قطرے میں بجلی کا خزانہ ہے

دکھ درد، رنج والم، حزن وملال جب عرفانِ ذات کا ذریعہ بن جائے تو اس کی حیثیت ایک قدر (Value) کی ہو جاتی ہے اور یہ زندگی کے عناصر ترکیبی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ زندگی کے یہ وہ عناصر ہیں جو ہمیں وقتی طور پر مغموم تو کرتے ہیں لیکن ان غموں سے تجربات مہمیز ہوتے اور ہم قوت، توانائی، حوصلہ اور جینے کا ہنر سیکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سہیل کی شخصیت اور کردار میں شفافیت، ارادے میں پختگی، صبر وتحمل اور قوت برداشت جیسی صفتیں انھی کے وسیلے سے پروان چڑھیں اور یہی ان کے تخلیقی اظہار کا محرک بھی ہیں۔

واضح رہے کہ سہیل کے لئے قوم وملت کی لہولہان زندگی، غم اور دکھ، آنسو بہانے کا ذریعہ تو بنے لیکن یہ زندگی کے ہمراہ سفر بھی ثابت ہوئے، یعنی رونے اور ہنسنے کے دوران وہ تنہا نہ تھے بلکہ غم کا ساتھ تھا۔ اس لئے ان کی شاعری میں حزن وغم ایک اساسی عنصر کے طور پر شامل ہے۔ بلکہ انھوں نے اسے ایک اعتبار بخشا ہے، اسے ایک بلند تر سطح پر اعلیٰ روحانی اور اخلاقی اقدار اور صفات کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اس میں مفہوم ومعنی کی ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے۔ ہماری کلاسیکی شعری روایت میں عاشقانہ شاعری کو درد وغم سے علاحدہ کر کے نہیں دیکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یوسف حسین خاں کی یہ توضیح توجہ طلب ہے:

''انسانی زندگی میں غم کے عناصر ایسے پیوست ہیں کہ انھیں اس سے علاحدہ کرنا ممکن نہیں۔ خوشی اور مسرت کے گریز پا لمحوں کی یادیں جلد فراموش ہو جاتی ہیں لیکن غم کی یاد کبھی دل سے نہیں جاتی۔ اس کے نقوش ایسے گہرے ہوتے ہیں کہ زمانے کے ہاتھ سے بڑی مشکل سے بھرتے ہیں...... غم آرٹ کی تخلیق کا زبردست محرک ہے اور اس طرح وہ ایک خاص لطف کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ اس کو کوئی

چاہے تو نشاطِ غم سے تعبیر کر سکتا ہے...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم کی حالت میں انسان کو اپنے وجود کا شعوری احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے...... آنسوؤں کی بہ دولت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم وجود رکھتے ہیں۔ ہم زندہ ہیں اور یہ احساس بہ جائے خود مسرت آگیں ہیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو غم اور مسرت کے ڈانڈے مل جاتے ہیں...... مسرت کے امکانات زندگی میں محدود ہیں۔ برخلاف اس کے غم زندگی کے تانے بانے میں سمویا ہوا ہے'' (اردو غزل، ص: ۱۱۶ تا ۱۱۹)

سہیل کے یہاں نشاطِ غم کی کیفیت کا اظہار مخصوص انداز میں ہوا ہے۔ ان کی کیفیاتِ تغزل پر میر کے اثرات کی کارفرمائی کے بجائے غالب کی رجائیت اور اقبال کا تفکر ان کے دائرہ فن اور اندازِ فکر میں بھرپور ندرت اور جدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ یعنی ایک طرف انھوں نے قدماء کے اندازِ بیان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے تو دوسری طرف فکری سطح پر جدت، ان کی غزلوں کو ایک مخصوص آرٹ کا حامل بناتی ہے نتیجتاً ان کے غزلیہ اشعار، اپنے تغزل کی نزاکتوں اور لطیف پیرایۂ بیان کے باعث بہ آسانی پہچانے جاسکتے ہیں۔

سہیل کی شاعری بالخصوص غزل گوئی کے مطالعے کے ضمن میں اردو غزل کی قدیم روایت اور قدماء کے وضع کردہ اصولوں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، جس کی حیثیت آج بھی شاعری کے معیار ومنہاج اور تعیینِ قدر میں بنیادی ہے۔ انھوں نے ان روایت کو اپنے پیش نظر رکھا ہے جس کی رو سے غزل کے بنیادی اسلوب اور اس میں تغزل کے عنصر کو برقرار رکھتے ہوئے اسے منفرد جہت عطا کرنا، غزل گو کا وصفِ خاص ہے۔ معیاری شاعری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں داخلی کیفیات کے اظہار کے ساتھ شاعر کی اپنی شخصیت کا پرتو بھی نمایاں ہو اور اس نسبت سے اس کی اپنی ایک مخصوص معنوی فضا بھی ہو۔ غزل میں معنویت اور تہہ داری کے سبب ہی اسے داخلی صنف کے ذیل میں رکھا جاتا ہے۔ سہیل نے اپنی غزلوں میں رموز و علائم کو نئے مفہوم و معنی میں برتا ہے نیز داخلی کیفیت کے اظہار میں رمزیت و ایمائیت پر خصوصی توجہ دی ہے۔

اب ہجر کا شکوہ نہ تغافل کا گلہ یاد ... آئی جو تری یاد تو کچھ بھی نہ رہا یاد
سب غم تھے فراموش، جہاں تجھ کو کیا یاد ... ہر درد کی ہے مجھ کو یہی ایک دوا یاد

اقبال سہیل نے بہ ظاہر نئے الفاظ اور استعاروں کے استعمال پر توجہ نہ دی مگر انھوں نے مروجہ

علائم اور استعاروں کو برتنے میں واضح طور پر فنی بصیرت، فنی پختگی اور مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے اشعار غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی یکجائی سے وجود میں آتے ہیں، بلکہ کلیم الدین احمد کے الفاظ میں کہیں تو ''دونوں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جاسکتے۔ وہ ہونے والے واقعات کی طرف اس کھلے یا چھپے اشارے، طنزیہ اشارے کرتے ہیں جو فوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ ہونے والے واقعات ہوں یا نجی واقعات ہوں، ان کے شعروں میں ایک قسم کا تسلسل پیدا کرتے ہیں'' یہ درست ہے کہ اپنی غزلوں میں انھوں نے روایتی شعری الفاظ مثلاً حسن وعشق، وفاو ہوس، نشیمن، گلچیں، گلستاں، جنوں، زلف اور دوسرے لفظوں کا استعمال کیا ہے جس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ ان کا تعلق عصری اور جدید تقاضوں سے برائے نام ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اس لئے کہ ان قدیم الفاظ کے آج کے حالات ومسائل کے تناظر میں ایک نئی توجیہ اور تعبیر پیش کی جاسکتی ہے اور ان سے آج کے تناظر میں نئے معنی اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

اقبال سہیل کے نزدیک ادب، آرٹ اور جملہ فنون لطیفہ کا بنیادی مقصد تعمیر ہے۔ چونکہ وہ شخصی اعتبار سے نیک طبیعت اور بے حد حساس واقع ہوئے ہیں اس لئے زندگی کا وہ حصہ جو فرد اور انسانیت کے لئے باعث تکلیف ہے ان کی شاعری کا غالب حصہ ہے۔ ایک دردمند دل اپنے ذاتی زخم پر انسانیت کے گھاؤ کو ترجیح دیتا ہے۔ یعنی اس کے زخم میں بھی ایک تنوع اور تہہ داری ہے۔ سہیل کے نزدیک ذاتی غم وسیلہ ہے دوسروں کے صدمات کی تفہیم کا، انھیں گھاؤ نہ لگتے تو شاید دنیا کے گھاؤ نظر نہ آتے اس لئے وہ گھاؤ، ٹیس اور درد کو بے حد عزیز رکھتے ہیں۔ تاہم وہ دنیا کے دکھ اور صدمات سے بے چین اور مضطرب ہیں۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی شخص پر غم کا پہاڑ بھلے نہ ٹوٹا ہو، لیکن بنی نوع انسان کی تکلیف اور درد کی شدت کو ہر لمحہ وہ محسوس کرتا ہو، تجربے کے شعلے میں جب زندگی تپتی ہے تو دوسروں کو ایسے سانحے سے محفوظ کرنے اور دکھوں کو ہرنے کی چاہت جنم لیتی ہے۔

واضح رہے کہ یہ غم انسان کو اذیت پہنچاتے ہیں نیز افسردگی، مایوسی اور بے چینی کا سبب بھی ہے لیکن اسی غم کی کوکھ سے انقلاب کا جنم ہوتا ہے اور اسی میں زندگی انگیز کرنے کا راز بھی پوشیدہ ہے۔ حیات انسانی سے اس کا رشتہ ازل سے ہے اور تا قیامت اس سے نجات ممکن نہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جب تک انسان اور اس کا دل اور دل پر چوٹ لگنے کا سلسلہ باقی رہے گا، چیخ، نالہ اور گریہ کا وجود

باقی ہے تو ایسی آوازیں کبھی پرانی نہیں ہونگی۔ ان آوازوں کو شعری قالب میں ڈھالا جائے یا نثری پیرائے میں پیش کیا جائے اس کی عظمت اور معنویت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ سہیل کے کلام کا مطالعہ اصلاً ان مرکبات کا مطالعہ ہے جن سے ہماری زندگی لہولہان ہورہی ہے۔ ان میں مظلوم اور مغموم دل کی آہیں اور کراہیں بھی ہیں اور سسکتی ہوئی آرزوئیں اور تمنائیں بھی سانس لے رہی ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری ہمیں فرحت وسرور اور کیف وسرمستی کے عالم میں نہیں لے جاتی بلکہ ایک ایسی دنیا کی سیر کراتی ہے جس میں زندگی کا اصلی چہرہ پوری طرح مترشح ہوجاتا ہے۔ ان کی شاعری کے اسباب وعلل تو ذاتی ہیں لیکن اس کا دائرہ پوری انسانیت کو محیط ہے۔ یہ اشعار صحیح معنوں میں ہماری زندگی کی تعبیر وتشریح ہیں جن کی معنویت ہمیشہ قائم رہے گی۔

انھیں ذروں سے کل دنیا نئی تعمیر کرنی ہے
سنبھال اے دامنِ فطرت غبارِ ناتواں اپنا

☆☆☆

اقبال سہیل کی غزلوں کا عروضی مطالعہ

عبید اعظم اعظمی ☆

اقبال سہیل کا شمار اپنے عہد کے چند بہت نمایاں شعرائے کرام میں ہوتا ہے۔ لہجے کی انفرادیت اور اسلوب کی جاذبیت انھیں اس عہد کے دیگر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ لہجے کو انفرادیت اور اسلوب کو جاذبیت کی حد تک پہنچانے میں یقیناً انھیں ان بحور واوزان کی بھی اعانت حاصل رہی ہوگی جسے انہوں نے اپنے شعری اظہار کے لیے منتخب کیا تھا۔ فکر چاہے کتنی ہی بلند ہو اور جذبہ چاہے کتنا ہی صادق ہو اس وقت تک شعر نہیں بنتے جب تک وہ کسی بحر کے قالب میں نہ ڈھل جائیں۔ فکر کی بلندی، جذبے کی صداقت، بحر کا انتخاب اور طرزِ تخلیق یہ تمام عوامل یکجا ہو کر کسی شاعر کا اسلوب طے کرتے ہیں۔ یہ تمام خوبیاں بڑی حد تک ہمیں اقبال سہیل کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ شاید اسی باعث ان کا اسلوب اپنے معاصرین سے قدرے مختلف ہے۔

'اقبال سہیل کی غزلوں کا عروضی مطالعہ' کے عنوان سے میرا یہ عروضی تجزیہ کلیاتِ سہیل میں شائع شدہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ عارف رفیع صاحب کے مرتب کردہ اس کلیات کو بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ، بلاسس روڈ، بمبئی۔۸، نے 1988 میں شائع کیا تھا۔

یہ عروضی تجزیہ کلیات میں شائع شدہ غزلوں کی ترتیب کے اعتبار سے نہیں بلکہ بحور کی ترتیب کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ اس تجزیے میں ہر غزل کا صرف مطلع منتخب کر کے بحر کی نشاندہی کی گئی ہے، نیز جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں بحر کی باریکیوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

بحر ہزج مثمن (سالم) مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

☆ کرلا، ممبئی www.azmi.in

اس بحر کا بنیادی رکن ''مفاعیلن (++-+-++-)'' ہے۔ یہ رکن مصرعے میں چار بار اور شعر میں آٹھ بار ہوتا ہے۔ اسے 'بحرِ ہزج مثمن' اور 'بحرِ ہزج مثمن سالم' دونوں ہی ناموں سے جانا جاتا ہے۔ اس بحر میں کہے گئے اشعار حسب ذیل ہیں ۔

(۱)

زبانوں پر نہیں اب طور کا افسانہ برسوں سے
تجلی گاہِ ایمن ہے دلِ دیوانہ برسوں سے
اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۴

(۲)

ادب گستاخ ہو جائے جنوں خوددار ہو جائے
تو دنیائے محبت کی فضا ہموار ہو جائے
اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۹

(۳)

غبارِ قیس بن کر، لیلیٰ محمل نشیں ہوکر
عیاں ہیں کچھ کہیں ہوکر، نہاں ہیں کچھ کہیں ہوکر
اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۸

(۴)

بس اک مشقِ تگ ودَو ہے نہ آنا ہے نہ جانا ہے
زبانِ موج ہے اور رقصِ فطرت کا فسانہ ہے
اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۶

(۵)

کرم اتنا تو صیدِ غیر پر صیاد کرتا ہے
کبھی اپنے اسیروں کے بھی دل کو شاد کرتا ہے
اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۸

(۶)

اگر چلنا تو نقشِ پا بھی لغزش سے مٹا دینا
نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتا دینا
اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۹

(۷)

نوید نَو بہار آئی گھٹا چھائی ہے گلشن پر
اسیرانِ قفس قابض ہوئے شاخِ نشیمن پر

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۲

(۸)

اسیروں میں بھی ہوجائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا
ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے دَر پیدا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۴

(۹)

خموشی داستاں میری، تحیّر ترجماں میرا
بیاں ہوتا ہے اس محفل میں یوں سوزِ نہاں میرا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۹

(۱۰)

نہ دوں کونین کے بدلے یہ گنجِ بے بہا اپنا
کہ مقصودِ دوعالم ہے دلِ بے مدعا اپنا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۵

(۱۱)

حریمِ حسن سے بے گانگی پیدا نہ ہوجائے
کہیں خودداریٔ غم بڑھ کے استغنا نہ ہوجائے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۹

(۱۲)

الٰہی خیر! یہ کیا ہوگیا ہے برقِ خرمن کو
کہ گرتی ہے تو کتراکر مرے شاخِ نشیمن کو

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۳

(۱۳)

نظر اسرار تک بے نورِ ایمانی نہیں جاتی
حقیقت پہلے مانی جاتی ہے جانی نہیں جاتی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۹

(۱۴)

طبیعت دشت سے بھی مائلِ رم ہوتی جاتی ہے
مری وحشت ترقی پر ہے یا کم ہوتی جاتی ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۲

(۱۵)

عجب نیرنگِ فطرت ہے سرشتِ نوعِ انساں بھی یہی خود اہرمن بھی ہے یہی تصویرِ یزداں بھی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۱۷

(۱۶)

ہماری پستیِ فطرت نہ تھی یوں آشکار اب تک کہ تھی دیوارِ زنداں، رازِ دل کی پردہ دار اب تک

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۲۳

(۱۷)

ملی تھی نام کو اک زیست محرومِ سکوں وہ بھی سوا یما ہے کہ نذرِ عشوۂ قاتل کروں وہ بھی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۲۶

(۱۸)

بتا اے سبزۂ بیگانہ ڈیرے کس نے ڈالے ہیں کہ اب نسرین وگل ہیں باغ میں اور نہ ہی لالے ہیں

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۱۱

نوٹ: میرے خیال سے دوسرے مصرعے میں سہوِ کتابت در آیا ہے۔ 'نہ' یہاں پر دو حرفی ہو کر بروزنِ 'فع' یا 'فا' ہو گیا ہے۔ ہماری شاعری میں 'نہ' عمومی طور پر یک حرفی (نَ) شمار کیا جاتا ہے۔ مصرعے میں اگر الفاظ کی ترتیب بدل دیں تو وہ سقم، جو غالباً سہوِ کتابت کے سبب پیدا ہوا ہے، دور ہو جاتا ہے۔

کہ اب نسرین وگل ہی باغ میں ہیں اور نہ لالے ہیں

اس طرح بحر ہزج مثمن سالم کی ۱۸ غزلوں میں ۲۵۴ اشعار کہے گئے۔

بحر ہزج مسدس محذوف/ مقصور :

مفاعیلن مفاعیلن فَعولُنْ/ فعولان

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دو بار ہوتے ہیں۔

(۱)

ہمیں اب کیا غرض خلدِ بریں سے　　　محبت ہے وطن کی گل زمیں سے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۳

بحر ہزج اخرب (سالم) مربع مضاعف:

مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور شعر میں دو بار ہوتے ہیں۔

نوٹ: بعض ماہرین عروض اسے بحرِ ہزج مثمن اخرب (سالم) بھی کہتے ہیں جو مناسب نہیں ہے کیونکہ زحاف اخرب صدر و ابتدا کے لئے مخصوص ہے۔ حشو میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے اسے اخرب مثمن نہ کہہ کر اخرب سالم مربع مضاعف کہنا چاہئے۔ یہ وزن 'مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلن' سے تخنیق کے ذریعے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسے بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف مکفوف سالم (مخنق) کہا جائے گا۔

(۱)

اک دکھ کی کہانی ہے اک غم کا فسانہ ہے　　　اصرار نہیں لیکن سنیے تو سنانا ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۴

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف/مقصور:

مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن/فعولان

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں چار بار اور شعر میں آٹھ بار لائے جاتے ہیں۔

(۱)

دیکھا بھی نہ اس سمت اسیرانِ وفا نے　　　پیغامِ رہائی دیا ہر چند قضا نے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۱

(۲)

آئی جو تری یاد تو کچھ بھی نہ رہا یاد　　　اب ہجر کا شکوہ نہ تغافل کا گلہ یاد

س غزل میں اشعار کی تعداد۔۸

(۳)

پوچھو نہ اسیرانِ قفس زاد کا عالم — عالم تو ہے بس طائر آزاد کا عالم

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۲

اس طرح بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف رمقصور کی تین غزلوں میں ۲۱راشعار کہے گئے۔

بحر هزج مثمن مقبوض:

مفا عِلن مفا عِلن مفا عِلن مفا عِلن

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دوبار ہوتے ہیں۔
ہزج سالم ہی کی طرح مزاحف آہنگ 'مثمن مقبوض' بھی اردو شاعری میں بہت مقبول ہے۔

(۱)

یہ عطر بیزیاں نہیں نسیمِ نو بہار کی — صبا اڑا کے لائی ہے شمیم زلفِ یار کی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۳

(۲)

گرہ کھلی نقاب کی وہ ضد گئی حجاب کی — بلائیں لے رہا ہے دل نگاہِ کامیاب کی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۳

بحر ہزج مقبوض مثمن کی دو غزلوں میں ۲۶راشعار کہے گئے۔ حفیظ جالندھری مرحوم کی مشہور نظم ابھی تو میں جوان ہوں، اسی بحر میں ہے۔

بحر ہزج کے چار مزاحف اوزان کی سات غزلوں میں ۴۷راشعار کہے گئے۔ اس طرح سالم اور مزاحف اوزان ملا کر بحر ہزج کی ۲۵ غزلوں میں ۳۲۸راشعار کہے گئے۔

بحر رجز

بحر رجز سالم میں کوئی غزل نہیں ہے البتہ رجز کے ایک بہت ہی دل آویز مزاحف آہنگ رجز مطوی مخبون رمخبون مذال میں پانچ غزلیں ضرور ملتی ہیں۔

رجز مطوی مخبون/ مخبون مذال

مربع مضاعف:

مُفْتَعِلُن مفاعلن مُفْتَعِلُن مفاعلن / مفاعلان

یا

مُفْتَعِلُن مفاعلانْ مُفْتَعِلُن مفاعلن / مفاعلان

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دو بار ہوتے ہیں۔ اس بحر میں مفاعلن کی جگہ حشو، عروض وضرب میں مفاعلان کو بھی لایا جاسکتا ہے۔

(۱)

برقِ ادا نہ رک سکی سینۂ موجِ نور میں فطرتِ اضطرابِ دل، آہی گئی ظہور میں

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۸

(۲)

حسن ہولاکھ بے نقاب آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ خود وہ تری نگاہ کا حسن نظر سہی نہ دیکھ

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۷

(۳)

پختگیٔ جنونِ شوق ایک خیالِ خام ہے حسن اگر ہے بے کراں عشق بھی ناتمام ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۷

(۴)

آگ لگا کے چل دیے خرمنِ امتیاز میں کون سی برق تھی نہاں نالۂ نے نواز میں

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۴

(۵)

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل میں کیا دیا دولتِ دو جہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۴

بحرِ رمل:

بحرِ رمل سالم عام طور پر اردو میں رائج نہیں ہے۔ مگر اس بحر کے بہت سے مزاحف آہنگ اردو شاعری میں بے انتہا مقبول ہیں۔

رمل مثمن محذوف/ مقصور:

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن / فاعلانْ

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دو بار ہوتے ہیں۔

(۱)

مشقِ وحشت پھر شہیدِ ناتمامی ہو گئی مصلحت پھر سنگ راہِ تیزگامی ہو گئی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۹

(۲)

رنگ وبو کے اس سرابستاں میں ششدر چھوڑ کر کیا ہوا حسنِ عقیدت مجھکو مضطر چھوڑ کر

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۲

(۳)

شاعری کیا ہے فروغِ حسنِ پنہاں دیکھنا خاکدانِ آب و گل میں عالمِ جاں دیکھنا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۹

(۴)

اور کیا عشق وجنوں میں سازوساماں چاہئے چاک داماں چاہئے تارِ گریباں چاہئے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۱

(۵)

آ گیا وہ فتنۂ محشر خرام آ ہی گیا ساقیِ دوراں مئے خونیں بجام آ ہی گیا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۵

اس بحر کی پانچ غزلوں میں کل ۴۶/ اشعار ملتے ہیں۔

رمل مثمن سالم/ مخبون، مخبون، مخبون محذوف/ مخبون مقصور/ مخبون محذوف مسکن/ مخبون مقصور مسکن:

فاعلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلُن/ فَعِلانْ/ فَعْلُن/ فَعْلانْ

یا

فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلُن/ فَعِلانْ/ فَعْلُن/ فَعْلانْ

اس بحر میں بھی صدر وابتدا میں فاعلاتن (سالم) کی جگہ فعلاتن (مخبون) لانے کی عام اجازت ہے۔عروض وضرب میں فَعِلُن، فَعِلانُ، فَعْلُن ،اور فَعْلان میں سے کسی بھی رکن کولایا جاسکتا ہے۔اس بحر کی درج ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں ۔

(۱) رمل مثمن سالم/مخبون، مخبون، مخبون محذوف

فاعلاتن /فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلُن

(۲) رمل مثمن سالم/مخبون، مخبون، مخبون مقصور

فاعلاتن/ فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلانُ

(۳) رمل مثمن سالم/مخبون، مخبون، مخبون محذوف مسکن

فاعلاتن/ فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعْلُن

(۴) رمل مثمن سالم/مخبون مخبون، ، مخبون مقصور مسکن

فاعلاتن/ فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعْلانُ

(۱)

کس نے پیغام دیا سلسلہ جنباں ہوکر　　روح نکلی ہے تنِ زار سے رقصاں ہوکر

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۰

(۲)

فکرِ انجام سے وہ قطعِ نظر کرتے ہیں　　وہی جانباز مہم عشق کی سر کرتے ہیں

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۶

(۳)

حاصلِ سعی ہے سرگشتۂ حرماں ہونا　　یعنی ہرگام پہ منزل کا گریزاں ہونا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۲۰

☆ یہاں یعنی کی یائے علت کا گر جانا مستحسن نہیں ہے۔

(۴)

مجھ سے پوچھو نہ مزاجِ دلِ ناشاد ابھی　　میرے نغموں میں ہے کچھ تلخیِ فریاد ابھی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۹

(۵)

کیا مزے کے ہیں ترے دَر کی گدائی کے مزے ہیچ ہیں اب تو سبھی دولتِ شاہی کے مزے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۳

رمل مشکول مربع مضاعف:

یا

رمل مثمن مشکول:

فَعِلاتُ فاعلاتن فَعِلاتُ فاعلاتن

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دو بار ہوتے ہیں۔

(۱)

اگر آئنہ سے دل کے اٹھے پردۂ توہُّم تو جدھر اٹھیں گی نظریں نظر آؤ گے تمھیں تم

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۸

بحر متقارب مثمن (سالم):

اس بحر کا بنیادی رکن "فَعُولُن (+-+-)" ہے۔ یہ رکن مصرعے میں چار بار اور شعر میں آٹھ بار ہوتا ہے۔ فَعُولُن فَعُولُن فَعُولُن فَعُولُن

(۱)

مرا ذوقِ فن عامیانہ نہیں ہے نہ سنیے مجھے بھی سنانا نہیں ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۱

(۲)

وہ آئے تو کیا میری مشکل وہی ہے وہ جلوے وہی ہیں مرا دل وہی ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۴

بحرِ متدارک:

متدارک سالم میں کوئی غزل نہیں ہے۔ البتہ اس بحر کے ایک بہت ہی مقبول مزاحف آہنگ

متدارک مخبون میں تین غزلیں ملتی ہیں۔

☆متدارک مخبون مثمن مضاعف (مسکن)

فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن

اس بحر میں فَعِلُن کو ایک مصرع میں آٹھ بار اور پورے شعر میں سولہ بار لایا جاتا ہے۔ اس مقبول ترین آہنگ میں جہاں فَعِلُن ہے وہاں حسبِ ضرورت فَعْلُن کر لینے کی عام اجازت ہے۔ فَعِلُن کو فَعْلُن کر لینے کے عمل کو تسکینِ اوسط کہتے ہیں۔

(۱)

کس حال میں ہیں زندانیِ غم بے درد زمانہ کیا جانے
خود جس نے اٹھائے ہوں نہ ستم وہ میرا فسانہ کیا جانے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۶

(۲)

وہ سامنے جب آجاتے ہیں سکتے کا سا عالم ہوتا ہے
اس دل کی تباہی کیا کہئے امرت بھی جسے سم ہوتا ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۶

(۳)

کی ہے شبِ غم کس طرح بسر پچھلا وہ فسانہ کیا کہئے
کانوں میں ہو جب گل بانگِ سحر رودادِ شبانہ کیا کہئے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۵

بحرِ کامل:

یہ ایک بہت ہی مترنم بحر ہے۔ اس کا سالم آہنگ اردو میں بے انتہا مقبول ہے۔

کامل مثمن سالم

اس بحر کا بنیادی رکن ''مُتَفاعِلُن (+++-++-)'' ہے۔ یہ رکن مصرعے میں چار بار اور شعر میں آٹھ بار ہوگا۔

(۱)

بڑھی اور جرأتِ معصیت نگہِ کرم کے پیام سے تری رحمتِ ہمہ گیر سے تری فیضِ بخشیٔ عام سے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۵

بحرِ جمیل:

اس بحر کا بنیادی رکن "مُفاعلاتُن" (++-++-+-) ہے۔ یہ رکن مصرعے میں چار بار اور شعر میں آٹھ بار ہوگا۔

(۱)

حریمِ دل میں وہ حسنِ مطلق جو برسرِ جلوہ افگنی ہے

تو محرمانِ وصال کے لب پہ هٰذِهِ مـا وَعَـدْتَنِی ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۱

(۲)

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے اسیرِ غم اب تو چھوٹ جائے

چمن کو لوٹا ہے باغباں نے تو آئے گلچیں بھی لوٹ جائے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۳

نکتہ: اس غزل کی تقطیع بحرِ متقارب کے مزاحف آہنگ: **فَعُولُ فَعْلُن فَعُولُ فَعْلُن فَعُولُ فَعْلُن فَعُولُ فَعْلُن** سے بھی کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ جمیل سالم بحر ہے اس لیے تقطیع کے دوران ترجیح اسی بحر کو دی جائے گی۔

بحرِ خفیف:

اردو میں بحرِ خفیف یوں تو صرف ایک ہی آہنگ رائج ہے، مگر بے انتہا مقبول ہے۔

خفیف مسدس سالم/مخبون،مخبون،مخبون محذوف/مخبون مقصور/ مخبون محذوف مسکن /مخبون مقصور مسکن

فاعلاتن مفاعلن فَعِلُن / فَعِلانُ / فَعْلُن / فَعْلانُ

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دو بار ہوتے ہیں۔ بحرِ خفیف

کا یہ آہنگ ہماری شاعری میں کافی مقبول ہے۔ اس بحر میں فاعلاتن (سالم) کی جگہ فعِلاتن (مخبون) لانے کی عام اجازت ہے۔ عروض ضرب میں فَعِلُن، فَعِلانْ فَعْلُن اور فَعْلان میں سے کسی بھی ایک رکن کو لایا جاسکتا ہے۔ اس بحر میں حشو میں ہمیشہ 'مفاعلن' ہوگا۔ اس بحر کی درج ذیل شکلیں ممکن ہیں۔

(۱) خفیف مسدس سالم/مخبون، مخبون، مخبون محذوف

فاعلاتن / فَعِلاتن مفاعلن فَعِلُن

(۲) خفیف مسدس سالم/مخبون، مخبون مخبون مقصور

فاعلاتن / فَعِلاتن مفاعلن فَعِلانْ

(۳) خفیف مسدس سالم/مخبون، مخبون، مخبون محذوف مسکن

فاعلاتن / فَعِلاتن مفاعلن فَعْلُن

(۴) خفیف مسدس سالم/مخبون، مخبون، مخبون مقصور مسکن

فاعلاتن / فَعِلاتن مفاعلن فَعْلانْ

ان تمام آہنگوں کو بیک وقت ایک ہی نظم یا غزل میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(۱)

جو تصور سے ماورا نہ ہوا وہ تو بندہ ہوا خدا نہ ہوا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۲۶

(۲)

حسنِ فطرت کی آبرو مجھ سے آب و گل میں یہ رنگ و بو مجھ سے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۹

(۳)

نہ رہا ذوقِ رنگ و بو مجھ کو اب نہ چھیڑ اے بہار تو مجھ کو

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۸

بحرِ مضارع:

بحرِ مضارع اخرب (سالم) مربع مضاعف:

مفعولُ فاع لاتن مفعولُ فاع لاتن

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دوبار ہوتے ہیں۔ یہ ایک بہت دل پذیر آہنگ ہے۔

نکتہ : بعض ماہرینِ عروض اس بحر کو مضارع مثمن اخرب (سالم) بھی کہتے ہیں جو کہ مناسب نہیں ہے کیونکہ زحافِ اخرب، صدر و ابتدا کے لئے مخصوص ہے۔ حشو میں نہیں آسکتا۔ اس لیے اسے اخرب مثمن نہ کہہ کر اخرب سالم مربع مضاعف کہنا چاہیے۔ اس وزن کو 'مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاع لاتن' سے تحبیق/تخنیق کے ذریعے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، اس صورت میں اسے بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف مکفوف سالم (مخبق) کہا جائے گا۔

(۱)

غم ہے اساسِ فطرت دنیائے رنگ و بو کی　　　شبنم کے اشک سے ہیں تر دستیاں نمو کی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۱۹

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف/مقصور:

مفعولُ فاع لاتُ مفاعیلُ فاع لن/فاعِ لانْ

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دوبار ہوتے ہیں۔

نکتہ: اس بحر میں 'فاعلن' کی جگہ فاعلان لانے کی اجازت ہے۔ شعر کا ایک مصرع ''بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعولُ فاع لاتُ مفاعیلُ فاعلن) میں اور ایک مصرع ''بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور (مفعولُ فاع لاتُ مفاعیلُ فاع لانْ) میں کہا جاسکتا ہے۔ دونوں ہی اوزان کو ایک ہی شعر، غزل یا نظم میں جمع کیا جاسکتا ہے۔

(۱)

کیوں چپ نہ لگ گئی حرمِ یار دیکھ کر　　　حیراں ہوں اپنی جرأتِ گفتار دیکھ کر

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۸

(۲)

اُف کیا مزہ ملا ستمِ روزگار میں　　　کیا تم چھپے تھے پردۂ لیل و نہار میں

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔ ۱۳

(۳)

اب دل کو ہم نے بندۂ جاناں بنا دیا　　اک کافرِ ازل کو مسلماں بنا دیا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۲۰

(۴)

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے　　بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۲

(۵)

صحنِ حرم نہ کُنجِ صنم خانہ چاہیے　　اے بے خودی مجھے ترا کاشانہ چاہیے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۰

(۶)

اب ضبطِ شوق کا متحمل نہیں رہا　　دل جلوہ گاہِ حسن کے قابل نہیں رہا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۶

(۷)

عرشِ بریں بھی اس کے مقابل نہیں رہا　　جس دل کو تو نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۷

(۸)

آیا نہ انقلاب اس اجڑے دیار تک　　بدلا اگرچہ خود چمنِ روزگار تک

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۷

(۹)

دل کعبۂ شہود میں محوِ نماز ہے　　دیر و حرم سے اب یہ جبیں بے نیاز ہے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۳

(۱۰)

زنداں نصیب ہوں مرے قابو میں سر نہیں　　میرے سجود ان کے لیے معتبر نہیں

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۳

(۱۱)

رازِ نیازِ عشق چھپایا نہ جائے گا　　ہم سے ہنر کو عیب بنایا نہ جائے گا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۴

(۱۲)

جب آج چشمِ شوق سے پردہ کرے کوئی　　کیوں اعتبارِ وعدۂ فردا کرے کوئی

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۳

(۱۳)

ان سنگ دل بتوں سے امیدِ اثر عبث　　اے چشمِ شوق گریۂ شام و سحر عبث

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۶

بحرِ مجتث:

بحرِ مجتث مثمن مخبون مخبون محذوف/مخبون مقصور/ مخبون محذوف مسکن /مخبون مقصور مسکن:

مفاعلن فَعِلاتن مفاعلن فَعِلُن/فَعِلانْ/فَعْلُن/فَعْلانْ

یہ ارکان اسی ترتیب سے مصرعے میں ایک بار اور پورے شعر میں دو بار ہوتے ہیں۔ یہ بحر بھی خفیف اور مضارع کی طرح مرکب بحور کی ایک انتہائی مقبول بحر ہے۔

اس بحر میں عروض ضرب میں فَعِلُن، فَعِلانْ فَعْلُن اور فَعْلان میں سے کسی بھی ایک رکن کو لا یا جاسکتا ہے۔ اس بحر کی درج ذیل شکلیں ہیں ۔

مجتث مثمن مخبون، مخبون محذوف

مفاعلن فَعِلاتن مفاعلن فَعِلُن

مجتث مثمن مخبون، مخبون مقصور

مفاعلن فَعِلاتن مفاعلن فَعِلانْ

مجتث مثمن مخبون، مخبون محذوف مسکن

مفاعلن فَعِلاتن مفاعلن فعْلُن

مجتث مثمن مخبون، مخبون مقصور مسکن

مفاعلن فَعِلاتن مفاعلن فعْلانْ

ان تمام آہنگوں کو بیک وقت ایک ہی شعر میں نظم یا غزل میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(۱)

سنائیں کس کو الٰہی غمِ نہاں اپنا   اس انجمن میں نہیں کوئی ہم زباں اپنا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۶

(۲)

سرشکِ شوق ہے تفسیرِ مدعا میری   ٹپک رہی ہے نگاہوں سے التجا میری

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۷

(۳)

حرم سے جاتے ہیں طیبہ کو یوں ترے مخمور   نظر میں جلوۂ ساقی جگر میں شعلۂ طور

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۶

(۴)

تری یہ زلفِ سیہ ہے کہ پیچ و تاب میں سانپ
پڑے ہیں چڑھ کے ترے سر بڑے عذاب میں سانپ

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۸

(۵)

سکوں نصیب شہیدِ وفا کہاں ہوتا   کہ مر کے بھی تو غمِ عمرِ جاوداں ہوتا

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۳

(۶)

گلہ نہیں ہے جو ہستی کا اعتبار نہیں   ستم تو یہ ہے فنا بھی مآلِ کار نہیں

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۰

(۷)

اسیرِ فلسفہ دیں کے نکات کیا جانے مریدِ شک اثرِ معجزات کیا جانے

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۵

(۸)

ہے ان کے پرتوِ عارض سے اب یہ حالِ نظر کہ وہ بھی محو ہوئے دیکھ کر جمالِ نظر

اس غزل میں اشعار کی تعداد۔۱۷

آیئے دیکھیں اقبال سہیلؔ نے کس بحر میں کتنے شعر کہے

بحر ہزج مثمن (سالم) : مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

۱۸ غزلوں میں [۲۵۴] اشعار

بحر ہزج مسدس محذوف/ مقصور :

مفاعیلن مفاعیلن فَعولُنْ/ فعولان

۷ غزلوں میں [۴۷] اشعار

بحر ہزج اخرب (سالم) مربع مضاعف:

مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن

۱ غزل میں [۱۴] اشعار

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف/ مقصور :

مفعولُ مفاعیلُ مَفاعیلُ فعولن/ فعولان

۳ غزلوں میں [۲۱] اشعار

بحر ہزج مثمن مقبوض :

مفا عِلن مفا عِلن مفا عِلن مفا عِلن

۲ غزلوں میں [۲۶] اشعار

رجز مطوی مخبون/ مخبون مذال

مربع مضاعف:

مُفتَعِلُن مفاعلن مُفتَعِلُن مفاعلن/ مفاعلان

۵ غزلوں میں [۳۰] اشعار

رملِ مثمن محذوف/ مقصور:

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فاعلانُ

۵ غزلوں میں [۳۶] اشعار

رمل مثمن سالم مخبون، مخبون، مخبون محذوف/ مخبون مقصور/ مخبون محذوف مسکن/ مخبون مقصور مسکن:

فاعلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلُن/ فَعِلانُ/ فَعْلُن/ فَعْلانُ

۵ غزلوں میں [۵۸] اشعار

رمل مشکول مربع مضاعف:

فَعِلاتُ فاعلاتن فَعِلاتُ فاعلاتن

۱ غزل میں [۸] اشعار

بحر متقارب مثمن (سالم):

فَعُولُن فَعُولُن فَعُولُن فَعُولُن

۲ غزلوں میں [۱۵] اشعار

متدارک مخبون مثمن مضاعف (مسکن)

فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن

۳ غزلوں میں [۳۷] اشعار

کامل مثمن سالم: مُتَفَاعِلُن مُتَفَاعِلُن مُتَفَاعِلُن مُتَفَاعِلُن

۱ غزل میں [۵] اشعار

بحر جمیل: مَفاعِلاتُن مَفاعِلاتُن مَفاعِلاتُن مَفاعِلاتُن

۲ غزلوں میں [۱۲] اشعار

خفیف مسدس سالم/ مخبون، مخبون، مخبون محذوف/ مخبون مقصور/ مخبون محذوف مسکن/ مخبون مقصور مسکن:

فاعلاتن مفاعلن فعِلن/ فَعِلانْ/فَعْلُن/فَعْلانْ

۳ غزلوں میں[۴۳] اشعار

بحر مضارع اخرب (سالم) مربع مضاعف:

مفعولُ فاع لاتن مفعولُ فاع لاتن

۱ غزل میں[۱۹] اشعار

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف/ مقصور:

مفعولُ فاع لاتُ مفاعیلُ فاع لن/فاع لانْ

۱۳ غزلوں میں[۱۵۲] اشعار

بحر مجتث مثمن مخبون مخبون محذوف/مخبون مقصور/ مخبون محذوف مسکن/مخبون مقصور مسکن:

مفاعلن فَعِلاتن مفاعلن فَعِلُن/فَعِلانْ/فَعْلُن/فَعْلانْ

۸ غزلوں میں[۸۲] اشعار

کلیاتِ سہیل کی غزلوں کے عروضی مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال سہیل نے دس (۱۰) بحور کے ۱۷، اوزان میں (۷۴ غزلوں میں) کل ۸۳۷ /اشعار کہے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بالترتیب بحرِ ہزج، بحرِ مضارع، بحرِ رمل اور بحرِ مجتث، ان کی پسندیدہ بحریں رہی ہیں۔انہوں نے اپنے جذبات کی ترسیل کے لیے تقریباً ۹۰ فیصد مثمن بحریں استعمال کیں۔مجموعۂ غزلیات میں جہاں دو غزلیں ۲۶ /اشعار پر مشتمل ہیں وہیں تین غزلیں ۳ /اشعار پر اور ایک غزل صرف دو اشعار پر مشتمل ہے۔اس تجزیے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اقبال سہیل کی بھی پسندیدہ بحریں وہی ہیں جو میر، غالب اور اقبال وغیرہم کے ساتھ ساتھ اردو کے دیگر اہم شعرا کو مرغوب رہی ہیں۔

☆☆☆

علامہ اقبال سہیلؒ اور مدرسۃ الاصلاح

مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی☆

اقبال سہیل ۱۱ر ربیع الآخر ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۴ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بڈھریا میں پیدا ہوئے (۱)۔

سہیل کے والد ماجد عزیز اللہ خاں نے ان کا نام ابوالظفر حامد رکھا لیکن ان کے دادا امانت اللہ خاں انھیں اقبال کہہ کر پکارتے تھے، بعد میں یہی نام مشہور ہوا (۲)۔ عرفیت ''صاحب'' اور تخلص ''سہیل'' ہے (۳)۔

اقبال سہیل کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر بانی مدرسۃ الاصلاح مولانا محمد شفیع کے ذریعہ ہوئی، فارسی کی تعلیم مولانا شفیع کے علاوہ ان کے والدین نے بھی دی۔ والد سے ان کے حصول علم کا طریقہ یہ تھا کہ فارسی میں خط لکھ کر اپنے والد کو بغرض اصلاح دکھاتے اور وہ جو اصلاح دیتے اسے مکمل یاد کر لیتے، بعض اوقات اصلاح کی شکل میں مستقل مضامین دیئے جاتے جنھیں وہ یاد کر لیتے تھے اور والدہ ام کلثوم سے فارسی کی مشہور کتابیں گلستاں، بوستاں پڑھیں۔ (۴)

بارہ سال کی عمر میں اقبال سہیل فارسی لکھنے، بولنے پر قادر ہو گئے تھے اور فارسی میں شعر بھی کہنے لگے تھے۔۵ سہیل کا ادبی ذوق ان کے والدین کا رہین منت ہے جبکہ اسلام سے گہری وابستگی ان کے ابتدائی استاد مولانا محمد شفیع صاحب کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد سہیل علامہ شبلی نعمانی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر کوئی چودہ پندرہ برس کی رہی ہوگی۔ سہیل نے علامہ شبلی سے دیوان الحماسہ، شرح مسلم، بحر العلوم اور عقد الفرید

☆مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ

وغیرہ پڑھیں۔ ان دنوں سہیل درس کے علاوہ کے اوقات میں بھی اکثر علامہ شبلی ہی کی صحبت میں رہتے۔[6] اس عرصہ میں اقبال سہیل نے فارسی شاعری میں وہ کمال پیدا کرلیا کہ خود علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ ''تیری شاعری پر مجھ کو خود اپنے کلام کا دھوکا ہوتا ہے''۔[7]

مولانا حمید الدین فراہی ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے۔ سہیل بھی اس زمانہ میں مشرقی علوم کی تحصیل کے لئے مولانا فراہی کے ساتھ علی گڑھ کے قدیم محلہ بنواسرائیل میں مقیم تھے۔ وہاں انھوں نے مولانا فراہی سے تفسیر وحدیث کے علاوہ سبع معلقہ اور دیوان متنبی پڑھا، اسی زمانہ میں سہیل نے اپنی فارسی استعداد بڑھانے میں مولانا فراہی سے کافی مدد لی۔ سہیل کی مشرقی تعلیم کا یہ سلسلہ ۱۹۰۹ء تک برابر جاری رہا۔[8] اسی سال سہیل کی شادی حفیظ اللہ خاں کی صاحبزادی عمدۃ النساء سے ہوئی۔ خانصاحب شہر بنارس میں مختار تھے اس لئے گھر والوں کے ایما پر سہیل بنارس میں انگریزی اسکول میں داخل ہوگئے اور ۱۹۱۳ء میں انٹرمیڈیٹ کیا۔[9]

بنارس کے ان کے عہد طالب علمی ہی میں جب کہ ابھی انھوں نے انٹرمیڈیٹ بھی پاس نہیں کیا تھا۔ ان کی ذہانت وفطانت، فہم وشعور اور مشرقی علوم میں پختہ استعداد بہم پہنچا لینے کی وجہ سے انھیں مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامی کا رکن منتخب کرلیا گیا تھا۔

۲۳ر جون ۱۹۱۲ء کو مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامیہ کا ایک اجلاس ہوا جس میں حاجی صدر علی صاحب ساکن موضع ہمئی پور، حاجی حسن علی صاحب ساکن موضع رواں، حافظ حامد حسن صاحب ساکن موضع کوہنڈہ، محمد خلیل خانصاحب ساکن موضع سنجر پور، مولانا حافظ حمید الدین صاحب ساکن موضع پھریہا اور منشی عبدالستار صاحب ساکن موضع رنجہ پور سکرور شریک تھے۔ باتفاق آراء یہ طے ہوا کہ ''مولوی محمد اقبال (اقبال سہیل) ارکان انتظامیہ میں داخل کئے جائیں''۔ (۱۰)

اسی اجلاس میں علامہ حمید الدین فراہی مدرسۃ الاصلاح کے ناظم بنائے گئے۔ (۱۱) کارروائی کے الفاظ یہ ہیں۔

''تمام ممبران کمیٹی نے باتفاق رائے جناب مولانا حافظ حمید الدین صاحب مدظلہ کو مدرسہ کا اعزازی ناظم منتخب کیا۔ سردست چونکہ مولانا موصوف مدرسہ پر مستقل قیام نہیں فرما سکتے لہٰذا ان کی نیابت پر ایک شخص کا متعین کیا جانا منظور ہوا''۔ (۱۲)

اس اجلاس میں مدرسہ کے ناظم مولانا شفیع صاحب کو امین مدرسہ مقرر کیا گیا۔(۱۳)

پھر پہلی بار اقبال سہیل صاحب کی بحیثیت رکن مجلس انتظامی مدرسۃ الاصلاح کی انتظامیہ کے اجلاس میں شرکت ۱۰ر جولائی ۱۹۱۲ء بروز چہار شنبہ ہوئی۔ اس اجلاس کی صدارت حاجی عطاء اللہ صاحب ساکن نظام آباد نے کی تھی۔ مولانا فراہی بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ اس اجلاس میں جو اہم امور طے پائے تھے وہ باختصار حسب ذیل ہیں:

(۱) تعمیرات کی تکمیل جلد از جلد کی جائے۔

(۲) دارالاقامہ درس گاہ سے الگ متعین کیا گیا۔

(۳) جیراجپور اور بندول کے مکاتب کی مدرسۃ الاصلاح کی شاخ کی حیثیت سے منظوری کی درخواست پیش اور منظور ہوئی۔

(۴) ارکان انتظامیہ سے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ اگر کوئی بغیر کسی عذر معقول کے مسلسل تین اجلاسوں میں غیر حاضر رہا تو اسے برخاست کر کے اس کی جگہ پر دوسرے رکن کا انتخاب کر لیا جائے۔

(۵) مدرسہ کا سال شوال سے شروع ہوگا۔[۱۴]

پھر ۴ر اگست ۱۹۱۲ء کو مدرسہ کی مجلس انتظامی کا اجلاس حاجی بھیکھو خانصاحب ساکن موضع سیدھا سلطان پور کی صدارت میں ہوا۔ اس وقت مولانا فراہی ناظم اور ماسٹر محمد ذکی علوی ساکن کوہنڈہ نائب ناظم تھے۔ یہ ایک سرکاری ملازم بھی تھے اور غالباً مدرسہ میں کچھ تدریسی فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔(۱۵) ان کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے استعفا دے دیا تھا۔ اسی اجلاس میں ان کا استعفا پیش ہوا لیکن منظور نہیں ہوا بلکہ تجویز یہ پاس ہوئی کہ دوسرا نائب ناظم تجویز کرنا ہے، لیکن جب تک نائب ناظم محمد ذکی صاحب نہ آجائیں یا دوسرا نائب ناظم منتخب نہ ہو جائے اس وقت تک ان کی نیابت نظامت کی ذمہ داری صوفی عبدالمجید صاحب ساکن موضع بڈھریا سنبھالیں گے اور جہاں تک تعلیم سے ان کا تعلق تھا تو اس کے لئے اطمینان سے کسی لائق دیندار مدرس کی تلاش کی جائے۔ اس اجلاس میں بھی ناظم مدرسہ مولانا فراہی اور نومنتخب رکن انتظامی اقبال سہیل صاحب شریک تھے۔

پھر دوسرے دن ۱۵ر اگست ۱۹۱۲ء کو بھی مجلس انتظامی کا اجلاس ہوا جس کی صدارت حافظ حامد حسن صاحب ساکن موضع کوہنڈہ نے کی تھی جس میں کچھ دوسرے امور زیر غور آئے اور فیصل ہوئے۔

اس اجلاس میں بھی اقبال سہیل صاحب شریک تھے۔

اس کے بعد ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو مجلس کارکن کا اجلاس ہوا حسن کی صدارت حاجی صدر علی صاحب ساکن موضع ہمئی پورنے کی تھی اس میں بھی اقبال سہیل صاحب شریک تھے۔(۱۶) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عہد طالب علمی ہی میں مجلس کارکن کے بھی رکن منتخب ہو گئے تھے۔

پھر ۲۶؍ دسمبر ۱۹۱۲ء کو مدرسہ پر مجلس عمومی کا اجلاس ہوا جس میں علاقے کے ۳۹ منتخب افراد شریک ہوئے تھے۔ اقبال سہیل صاحب بھی موجود تھے۔(۱۷)

۱۰؍ جون ۱۹۱۵ء کو مجلس انتظامی کا ایک اہم اجلاس صوفی عبدالمجید خانصاحب کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا مسعود علی ندوی صاحب، مدرسہ کے نائب ناظم اور مولانا شبلی متکلم صاحب پرنسپل (مہتمم) بنائے گئے۔ اس اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ تمام مدرسین کے پاس ایک ایک رجسٹر ہونا چاہئے تاکہ تمام گھنٹیوں کی حاضری ہو سکے۔ اور ایک جنرل رجسٹر ہونا چاہئے تاکہ تمام طلبہ کی ایک ساتھ حاضری ہو سکے۔

اسی میں یہ بھی طے پایا کہ ایک اور ملازم بڑھایا جائے جس کا کام درس گاہ میں جھاڑو دینا، گھنٹہ بجانا، طلبہ کا تمام کرنا اور ان کے کمرہ وغیرہ کی صفائی کرنا ہو، اسی میں یہ بھی طے ہوا کہ تمام طلبہ کے لئے ایک ایک چارپائی اور ہر دو طالب علموں کے لئے ایک اسٹول، مدرسہ کے انتظام سے بنوائے جائیں اور جو طلبہ قیمت دے سکتے ہوں ان سے قیمت وصول کی جائے۔(۱۸)

اس تجویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ شروع ہی سے مدرسہ کے طلبہ کی عزت نفس، وقار اور معیار کا کتنا خیال رہا ہے، اس اہم اجلاس میں بھی اقبال سہیل صاحب شریک تھے لیکن چونکہ اقبال سہیل صاحب ۱۹۱۴ء میں کوئنس کالج بنارس سے بی اے کر کے دوبارہ علی گڑھ چلے گئے جس کی وجہ سے مدرسہ کی مجالس انتظامی وکارکن میں ان کی شرکت مشکل ہو گئی تھی اس لئے جب ۲۶؍ اگست ۱۹۱۵ء کو مجلس انتظامی کا اجلاس ہوا جس کی صدارت محمد خلیل خانصاحب ساکن موضع بڈھریا نے کی تھی تو اقبال سہیل صاحب کی تعلیمی مصروفیات اور بعد مسافت کی وجہ سے ان کی جگہ مسٹر سلطان احمد صاحب ایم-اے، ایل-ایل-بی اعظم گڑھ کو مجلس انتظامی کارکن منتخب کر لیا گیا۔(۱۹)

درمیان میں کسی وجہ سے مولانا مسعود علی ندوی صاحب بھی مدرسہ کی انتظامیہ سے الگ ہو گئے

تھے۔ پھر ۲۶ر نومبر ۱۹۱۸ء کو مجلس عمومی کا جو اجلاس ہوا جس کی صدارت مولوی محمد سعید وکیل صاحب نے کی تھی اور جس میں کل ۱۶۹ منتخب افراد نے شرکت کی تھی۔ اور غالباً مجلس عمومی کا یہ اب تک کا سب سے بڑا اجلاس تھا۔ اس میں جن چار آدمیوں کو مجلس انتظامی کا ممبر منتخب کیا گیا، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا محمد سعید صاحب کے علاوہ مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا اقبال احمد خاں سہیل بھی تھے۔ یوں تقریباً تین سال سے کچھ زائد وقفہ کے بعد اقبال سہیل صاحب پھر مجلس انتظامی کے رکن ہو گئے۔

اس اجلاس میں مسجد تعمیر کرنے اور درسگاہ کی بنیاد رکھنے کی تحریک ہوئی۔ حاجی حسن علی صاحب ساکن موضع رواں نے بنیاد کھودنے کی ابتدا کی پھر ناظم مدرسہ مولانا حمید الدین فراہی، ان کے بعد معتمد مال مولانا محمد شفیع صاحب۔ پھر شیخ محمد انصاری فراہی، ان کے بعد مولانا شبلی متکلم ندوی پھر حافظ محمد جنید فراہی اور ان کے بعد عابد علی خاں ساکن منڈیار نے بنیاد کھودی اس کے بعد ناظم مدرسہ مولانا حمید الدین فراہی نے یہ دعا کی۔ ربنا یسرلنا هذا وتممه وتقبل منا.

تمام شرکاء نے اس دعا میں شرکت کی۔

اس عظیم الشان اجلاس میں رواں، پھریہا، نظام آباد، چیونٹی، دریا پور بسہی، پر سہا، بڈھریا، بکھرا، سنجر پور، سیدھا سلطان پور، منجیرپٹی، حسن پور، طوئی، راجہ پور سکرور، کھریواں، سرائے میر، بندی خورد، جیراجپور، منڈیار، اعظم گڑھ، مرزا پور، کمراواں، جعفر پور، ننداؤں، منگراواں، مخدوم پور، ملکشہ پور، نیاؤج، نگواں، بلریا گنج، چاندپٹی، مہرا، تھوپٹی، رسول پور، چاند پار، نصیر پور، گلواں، نورالدین پور، اشرف پور، املو، فخر الدین پور، ابراہیم پور، لہرا، اساڑھا، شاہ پور، نرولی، بلیا کلیان پور، محی الدین پور مکرہٹہ، بمہور، قطب پور، گجہوا، خیر الدین پور، غالب پور، بھدگدیہ، جھکہا، پھولپور، جگمل پور، علاء الدین پٹی، باسوپار، فتح پور سکروی، کرمینی، محمد آباد، ہمئی پور، منڈور، پورہ بھکھاری، پھیٹی، مسلم پٹی اور بندول کے نمائندوں نے شرکت کی۔ (۲۲)

پھر ۱۶ر نومبر ۱۹۱۹ء کو مجلس انتظامی کا جو اجلاس ہوا اس میں اقبال سہیل صاحب کی تجویز اور محمد خلیل خانصاحب کی تائید سے باتفاق آراء شرکاء مولانا مسعود علی ندوی صاحب کا بحیثیت رکن مجلس کارکن انتخاب عمل میں آیا۔ (۲۳)

اس کے بعد سے فروری ۱۹۲۸ء تک کے اجلاسوں کی کارروائی میں اقبال سہیل صاحب سے

متعلق کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔ البتہ فروری ۱۹۲۸ء میں مجلس انتظامی کا جو اجلاس ہوا جس میں مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا محمد شفیع خاں، حاجی محمد انصاری، حافظ محمد خلیل صاحب، حاجی حسن علی، مولانا عبدالاحد، عبدالعزیز اور شیخ حفیظ اللہ صاحب شریک ہوئے تھے۔ اس میں چار تجاویز زیر غور آئیں، ان میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ:

''ترمیم دستور العمل کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے'' چنانچہ اس کام کے لئے ایک مختصر کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ارکان حسب ذیل تھے۔

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا اقبال احمد سہیل اور مولانا حمید الدین فراہی۔ (۲۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں دستور العمل میں جو ترمیم ہوئی اس میں مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ مولانا اقبال احمد سہیل کا کردار بھی بہت اہم ہے۔

۱۹ر جنوری ۱۹۳۰ء کو مجلس عمومی و انتظامی کے اجلاس ہوئے لیکن کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے مجلس انتظامی کا اجلاس ملتوی ہو گیا۔ پھر وہی اجلاس ملتویہ ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ جس کی صدارت حاجی حسن علی صاحب نے کی تھی۔ اس میں کل سات امور پر غور و فیصلہ ہوا جن میں سے ایک اہم امر مجلس تعلیمی کے ارکان کا انتخاب تھا۔ چنانچہ مجلس تعلیمی کے ارکان کی حیثیت سے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام وکیل اور مولانا اقبال احمد سہیل کا انتخاب ہوا۔ (۲۵)

پھر ۳ر اپریل ۱۹۳۲ء کو مجلس عمومی کا ایک اجلاس ہوا جس میں کل ۴۷ افراد شریک ہوئے۔ بہ تحریک مولانا اقبال احمد خاں سہیل اور بتائید مولانا مسعود علی ندوی، باتفاق حاضرین حاجی حسن علی صاحب صدر مجلس ہوئے، اس میں مدرسہ کا گوشوارہ آمد و خرچ پیش ہوا۔

اس کے بعد اسی روز مجلس انتظامی کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کے صدر بہ تحریک اقبال احمد سہیل اور بتائید حافظ محمد خلیل صاحب، مولانا مسعود علی ندوی ہوئے، اس میں قانون گو عبدالرحمٰن صاحب کی علالت کے باعث حاجی حسن علی صاحب کو قائم مقام معتمد مال مقرر کیا گیا اور اسی اجلاس میں مجلس کارکنان کی دو خالی نشستوں کے لئے شیخ محمد سجاد انصاری اور مولانا اقبال سہیل کو ممبر منتخب کیا گیا۔ یہ دونوں نشستیں حافظ عبدالاحد صاحب، اڈیہہ اور حافظ واجد علی صاحب طوی کی خالی ہوئی تھیں۔ اب اقبال سہیل صاحب مدرسہ کی تینوں مجالس (انتظامی، تعلیمی اور کارکن) کے ممبر ہو گئے۔

پھر اسی تاریخ کو مجلس انتظامی کا بھی اجلاس ہوا۔ مولانا مسعود علی ندوی ہی اس کے بھی صدر بنائے گئے، اس اجلاس میں مدت تعلیم، زمانہ حاضری، مدت تعطیلات اور ممتحنین وغیرہ کے تعین کے سلسلہ میں غور ہوا اور فیصلہ یہ ہوا کہ سب بدستور سابق ہی رہیں گے۔ (۲۶)

کارروائی رجسٹر کا ایک ورق بالکل الگ ملا جس کے زمانہ کا صحیح پتہ نہیں لیکن قیاس ہے کہ اس کا زمانہ ۱۹۳۲ء کے بعد ہی کا ہے کیوں کہ وہ ریکارڈ میں اسی زمانہ کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ تحریر اور اسلوب تحریر بھی اسی زمانہ کا معلوم ہوتا ہے اس میں مجلس انتظامیہ اور مجلس تعلیمی کے ارکان کے نام درج ہیں۔ تیس افراد پر مشتمل انتظامیہ ہے اور آٹھ افراد پر مشتمل مجلس تعلیمی۔ ان دونوں میں مولانا اقبال احمد خاں سہیل کے نام ہیں۔ اس انتظامیہ میں مولانا ابواللیث شیر محمد ندوی اصلاحی کا نام بھی ہے۔ (۲۷)

۱۹۳۲ء ہی میں جانشین شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی مدرسۃ الاصلاح تشریف لائے تو مولانا اقبال سہیل نے منظوم خیر مقدمی کلمات کہے تھے جس کے دو اشعار یہ ہیں:

از مقدمت دل شاد شد، ویرانہ ام آباد شد
اے بر تو چو من صد فدا خوش آمدی خوش آمدی

دلہا بہ اقدام تو وردِ زبانہا نام تو
آمد زہر سو ایں صدا خوش آمدی خوش آمدی

پھر جب دوبارہ ۱۹۳۶ء میں مولانا مدنی مدرسۃ الاصلاح تشریف لائے تو اقبال سہیل صاحب نے پھر ان کا منظوم کلمات سے استقبال کیا تھا۔ اس موقع کے بھی دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بہار بوستانِ فیض مولانا حسین احمد
کہ شیخ الہند محمود الحسن را جانشیں آمد

جمال علم و دین آمد بزیبد گر چنیں آمد
کہ تقویٰ در یسار آمد، طہارت در یمیں آمد

۲۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو مجلس کارکن کا جو اجلاس ہوا۔ اس کے صدر بہ تحریک مولانا اقبال احمد خاں

سہیل اور بتائید حاجی رشید الدین صاحب، مولانا مسعود علی ندوی بنائے گئے، اس اجلاس میں بہ تحریک حکیم محمد اسحاق بتائید حاجی حسن علی یہ تجویز پاس ہوئی کہ مجلس کارکن کے جوارکان مدرسہ سے دلچسپی کم لیتے ہیں ان کی جگہ پر دوسرے ارکان منتخب کئے جائیں۔ پھر بہ تحریک مولانا اقبال احمد خاں سہیل و بتائید مولانا عبدالعزیز سکروری، مولانا قمرالدین صاحب کی جگہ حافظ عبدالحمید صاحب وکیل چھتے پوری رکن مجلس کارکن منتخب ہوئے۔ پھر بہ تحریک مولانا عبدالعزیز و بتائید محمد سجاد انصاری، محمد خلیل صاحب کی جگہ مولانا بدرالدین اصلاحی رکن مجلس منتخب ہوئے۔ (۲۸)

پھر یکم فروری ۱۹۴۱ء کو مجلس تعلیمی کا جو اجلاس ہوا اس کے صدر مولانا سید سلیمان ندوی منتخب ہوئے، اس میں بہ تحریک مولانا مسعود علی ندوی و بتائید حاجی رشید الدین فراہی یہ تجویز پاس ہوئی کہ مدرسہ کے نصاب تعلیم میں ضروری اصلاح کے لئے ایک مختصر کمیٹی بنائی جائے جس کے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبلی متکلم اور اقبال احمد خاں سہیل ہوں۔ یہ لوگ کسی قریب کی تاریخ میں بمقام اعظم گڑھ نصاب موجودہ پر غور کریں اور ضروری اصلاح و ترمیم کریں اور جو نصاب تجویز ہو اس پر آئندہ عمل درآمد کیا جائے۔ ارکان مذکورہ بالا کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ مشورہ کے لئے دوسرے ماہرین کو بھی شریک کر سکتے ہیں۔

ان تین افراد پر مشتمل کمیٹی نے مجلس تعلیمی سے سفارش کی کہ مولانا ابواللیث شیر محمد صاحب اصلاحی کا بحیثیت مدرس تقرر کیا جائے، پھر اسی اجلاس میں ارکان مجلس تعلیمی نے مجلس کارکن کے یہاں یہ سفارش کی کہ موجودہ حالات کے اعتبار سے مدرسہ کی ترقی و اصلاح کے لئے مدرسین کے تقرر و تنزل اور عزل و نصب کے لئے ایک ماتحت کمیٹی تشکیل دی جائے جس کے ارکان حسب ذیل ہوں:

(۱) مولانا مسعود علی ندوی صاحب (۲) مرزا مرتضیٰ بیگ صاحب

(۳) حاجی رشید الدین صاحب (۴) ڈاکٹر حافظ حفیظ اللہ صاحب

(۵) مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل

بقیہ کارروائی کے لئے طے ہوا کہ کل ۱۰ بجے کے پیشتر پھر اس مجلس کا اجلاس ہو۔ (۲۹)

چنانچہ ۲؍فروری ۱۹۴۱ء کو دوبارہ اجلاس ۹ بجے صبح شروع ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب صدر مجلس بنائے گئے، اس اجلاس میں مندرجہ ذیل امور متفقہ طور پر طے ہوئے۔

(۱) موجودہ رجسٹر کارروائی میں یہ غلط مبحث ہے کہ ایک ہی رجسٹر پر مجلس انتظامیہ، مجلس کارکن اور مجلس تعلیمی سب کی کارروائی کا اندراج ہوتا ہے، اس لئے ناظم صاحب سے یہ استدعا کی جائے کہ علاحدہ علاحدہ چار رجسٹر بنوائیں تاکہ مجلس عمومی، مجلس انتظامی، مجلس کارکن، مجلس تعلیمی سب کی کارروائیاں علاحدہ علاحدہ درج ہوں۔

(۲) درس تجوید کے لئے ایک قاری کی سخت ضرورت ہے جس کی سفارش یہ مجلس کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ جلد سے جلد اس پر توجہ کی جائے گی۔

(۳) بہ تحریک حاجی رشید الدین صاحب و بتائید مولوی مسعود علی صاحب، مولوی قمر الزماں صاحب، مولوی داؤد اکبر صاحب اور مولوی اظہار الدین جن کو اب تک وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ایک روپیہ ماہوار فی کس مشاہرہ پر ان کا تقرر عمل میں لایا جائے اور مولوی اختر احسن صاحب و مولوی امین احسن صاحب کی تنخواہوں میں بہ صلۂ حسن خدمات ۵، ۵ روپیہ ماہوار کا اضافہ کیا جائے اور حافظ محمد صدیق صاحب کی تنخواہ میں بھی دو روپیہ ماہوار کا اضافہ کیا جائے اور مولوی شبلی متکلم ندوی مہتمم مدرسہ کے مشاہرہ میں دس روپیہ ماہوار کا اضافہ کیا جائے مگر مالی حالت کی درستی تک سردست ۵ روپیہ ماہوار دیا جائے۔ (۳۰)

پھر ۲ رفروری ۱۹۴۱ء ہی کو مجلس انتظامیہ کا بھی اجلاس ہوا۔ اجلاس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے فرمائی، اس اجلاس میں بہ تحریک جناب سہیل صاحب اور بتائید حافظ عبدالحمید وکیل صاحب، طے پایا کہ:

غلام محمد صابر مرحوم نندا‌ؤں، حاجی عبدالرحمٰن قانون گو مرحوم سنجر پور، منشی عبدالصمد مرحوم راجہ پور سکرور، حافظ محمد خلیل مرحوم سنجر پور اور عنایت اللہ خاں مرحوم حسن پور کی جگہ حاجی حافظ ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب ریٹائرڈ سول سرجن بکھرا، ڈاکٹر شبیر امام صاحب سنجر پور، مولوی محمد عاصم اصلاحی کوٹیلہ، مولوی علی حیدر وکیل ڈھلئی فیروز پور اور مولوی فضل حق وکیل مبوارہ خرد کو مجلس انتظامیہ کا رکن منتخب کیا جاتا ہے۔

پھر اقبال سہیل صاحب ہی کی تحریک پر محمد اسحاق وکیل صاحب کی تائید سے مجلس نے یہ بھی طے کیا کہ چوں کہ مولانا حفیظ اللہ خاں ساکن بندی گھاٹ اور مولوی محمد شفیع خاں صاحب ساکن سیدھا سلطان پور کبرسنی وانحطاط قوئی کے باعث مدرسہ میں دلچسپی لینے اور جلسوں میں شرکت کرنے سے معذور

ہیں اس لئے مولوی حاجی عبدالغنی صاحب انصاری اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس ساکن موضع جگیہاں اور شیخ عبدالرؤف صاحب علوی ساکن موضع کوہنڈہ کوان کی جگہ رکن مجلس انتظامی منتخب کیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی طے پایا کہ چونکہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری و مولانا عبدالغفور جیراجپوری اور مولانا عبدالسلام پھریہاوی بوجہ بعد مسافت اور حکیم محمد یوسف صاحب بندوی و محمد صدیق خانصاحب بوجہ عدیم الفرصتی و مولوی قمرالدین صاحب بوجہ عدم ہمدردی مدرسہ مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے فرائض انجام نہیں دے سکتے لہذا یہ لوگ رکنیت مجلس انتظامیہ سے سبکدوش کئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ شیخ ابوالفتح صاحب رئیس جمال پور، منظور احمد خان صاحب منڈیار، قمرالدین خان صاحب شاہ گنج، ڈاکٹر بدرالدین صاحب شاہ گنج، حافظ فیض الحسن صاحب سورہی اور حاجی محمد علی خان صاحب مختار رکن مجلس انتظامیہ مقرر کئے گئے۔

اسی اجلاس میں ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب معتمد مال منتخب کئے گئے اور اسی اجلاس میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کو مجلس انتظامیہ نے یہ اختیار دیا کہ جو ارکان مجلس تعلیمی بوجہ بعد مسافت یا بسبب معذوری فرائض رکنیت انجام نہیں دے سکتے ان کی جگہ جدید ارکان کا انتخاب کرلیں۔

اس کے بعد ہی مجلس کارکن کا اجلاس بھی ہوا اس اجلاس کی صدارت بھی مولانا سید سلیمان ندوی نے ہی فرمائی اسی اجلاس میں مولانا ابواللیث شیر محمد اصلاحی کا تقرر (۴۵) روپیہ ماہوار پر ہوا۔ (۳۱)

ان اہم اجلاسوں کے بعد مجلس انتظامی، مجلس کارکن اور مجلس تعلیمی کے رجسٹر کارروائی الگ الگ کردیئے گئے رجسٹر کارروائی مجلس انتظامی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سہیل صاحب، تادم واپسیں مجلس انتظامی کے رکن رہے البتہ اس کے بعد رجسٹر کارروائی مجلس کارکن میں ان کی شرکت نظر نہیں آتی اس لئے قیاس ہے کہ اس کے بعد وہ مجلس کارکن کے رکن نہیں رہے۔ جہاں تک مجلس تعلیمی کی رکنیت کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے کیونکہ رجسٹر کارروائی مجلس تعلیمی دستیاب نہیں ہوسکا البتہ مجلس انتظامی نے مختلف موقعوں پر انھیں تعلیمی امور سے متعلق جو ذمہ داریاں دیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجلس تعلیمی کے رکن بھی حین حیات تک رہے جیسا کہ آگے کچھ ذکر آئے گا۔

۱۰ر مارچ ۱۹۴۶ء مطابق ۶ر ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ کو مجلس انتظامی کا ایک اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے فرمائی تھی۔ اس میں کل سات تجاویز پر غور و فیصلہ ہوا تھا جن میں

سے پہلی تجویز کے تحت درج ہے کہ:

دارالمعلومات کے متعلق یہ طے پایا کہ حسب فیصلہ مجلس کارکن بالفعل ایک مناسب وقت تک کے لئے اسے بند رکھا جائے جب حالات سازگار ہوں تو ناظم صاحب مدرسہ (حاجی رشید الدین صاحب) حسب ذیل اشخاص کے ذریعہ اس کے موجودہ آئین وقواعد پر نظر ثانی کر کے مدرسہ کے نقطۂ نظر سے اس کی اصلاح وترمیم کریں۔

کمیٹی مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل ہوگی۔

(۱) حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

(۲) جناب مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل

(۳) جناب حافظ عبدالحمید صاحب

(۴) جناب مولوی بدرالدین صاحب نائب ناظم مدرسہ

(۵) جناب مولوی محمد عاصم صاحب اصلاحی

اسی اجلاس میں مولانا علی حیدر عثمانی ڈھلئی فیروز پور کی جگہ مولانا عبدالسلام ندوی علاء الدین پٹی (شبلی منزل اعظم گڑھ) کا نام بحیثیت رکن مجلس انتظامی منظور کیا گیا۔(۳۲)

مجلس انتظامی کا ایک اجلاس ۲۵ رنومبر ۱۹۵۱ء مطابق ۲۴ رصفر ۱۳۷۱ھ کو ہوا جس کی صدارت مولانا اقبال سہیل صاحب نے کی اس اجلاس میں وقف کی جائیدادوں سے متعلق ضروری کاغذات کی فراہمی اور قانونی مشورے حاصل کرنے جیسے کئی اہم امور ومسائل زیر غور آئے اور ان پر فیصلے ہوئے، ان میں سے ایک اہم بات یہ طے ہوئی کہ:

''ہندوستان میں پہلے سے بھی اور موجودہ فضا میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جن کی بنا پر بقائے دین کے لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ وہ نوجوان تعلیم یافتہ اشخاص جو دینی تعلیم سے بے بہرہ رہ گئے ہوں اور دینی خدمت کا رجحان رکھتے ہوں ان کو دینی تعلیم اور تدبر فی القرآن کا درس دینے کے لئے کچھ وسیع النظر اساتذہ مدرسۃ الاصلاح پر فراہم کئے جائیں جن کا صرف یہی کام ہو، جو طلبہ اس غرض کے لئے مدرسہ پر آئیں ان میں سے غیر مستطیع طلبہ کو ضروریات زندگی کے لئے وظائف بھی دیئے جائیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے کم از کم دو اساتذہ کا حق الخدمت اور دس طلبہ کے وظائف

کے لئے سالانہ پانچ ہزار کا بجٹ منظور کیا جاتا ہے۔" (۳۳)

اس تجویز پر عمل درآمد ہوا اور ڈاکٹر عبدالحق انصاری، پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر سید عبدالباری، شبنم سبحانی جیسے ذہین جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں نے مدرستہ الاصلاح کا رخ کیا، اس کام کے لئے باہر سے مفید مطلب اساتذہ تو نہیں فراہم ہو سکے لیکن مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب سے ان لوگوں نے خوب استفادہ کیا۔

دوسری اہم بات یہ طے ہوئی کہ:

"مدرسہ کی سڑک کے لئے ساٹھ فٹ چوڑی زمین جس کی منظوری ڈسٹرکٹ بورڈ سے لی جا چکی ہے اس میں ایسی ضروری ترمیمات کے بعد کہ صحن مدرسہ سے سڑک عام جاری نہ ہو سکے ناظم مدرسہ کو اس کے حصول اور ادائے معاوضہ کی منظوری دی جاتی ہے اور یہ کام جہاں تک ترمیم نقشہ وغیرہ کا تعلق ہے محمد سجاد صاحب کے ذمہ کیا جاتا ہے۔"

اسی تجویز کا نتیجہ ہے کہ مدرستہ الاصلاح کا کیمپس دو حصوں میں منقسم ہونے سے محفوظ رہ گیا۔

تیسری اہم بات یہ طے ہوئی کہ:

"جلد سے جلد کوشش کی جائے کہ درسگاہ سے شفاخانہ کو علاحدہ کر دیا جائے اور کسی مناسب جگہ پر اسپتال کی عمارت قائم کی جائے۔" (۳۴)

اسی اجلاس میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی جگہ مولانا عبدالسلام فراہی صاحب کا، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی جگہ محمد عیاد انصاری صاحب کا اور شیخ عبدالوحید کی جگہ مولانا فراہی کے پوتے اور سابق ناظم مدرستہ الاصلاح مولانا ابوالحسن علی فراہی صاحب کا انتخاب بحیثیت رکن مجلس انتظامی ہوا۔

مجلس انتظامی کا وہ اجلاس جس میں مولانا اقبال سہیل صاحب کی شرکت آخری تھی ۱۴ر مارچ ۱۹۵۴ء مطابق ۸ر رجب ۱۳۷۳ھ کو ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت اقبال سہیل صاحب ہی نے فرمائی تھی۔

یہ اجلاس اس اعتبار سے بڑا تاریخی تھا کہ مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کے سالانہ جلسوں میں جس طرح مدرستہ الاصلاح کو نشانہ بنایا جاتا اور انتہائی جارحانہ رخ اختیار کیا جاتا تھا اس کا پہلی مرتبہ

انتظامی سطح پر سخت نوٹس لیا گیا۔ کارروائی کے الفاظ یہ ہیں۔

"طے پایا کہ منجانب ارکان مدرسہ (۱) جناب حافظ عبدالحمید صاحب وکیل، (۲) مولوی ابوالحسن علی صاحب، (۳) مولوی عبدالرحمٰن ناصر، (۴) مولوی محمد عاصم صاحب اصلاحی، (۵) مولوی بدرالدین صاحب اصلاحی زیر سرپرستی جناب اقبال احمد خان صاحب سہیل اس بات کے مجاز کئے جاتے ہیں کہ ۴/۵/ مارچ کو بیت العلوم سرائے میر پر حال میں جو جلسہ ہوا ہے اور جس کے بھی اثرات کا قوم میں متعدی ہونے کا اندیشہ ہے ان کو دور کرنے کے لئے خط و کتابت، تحقیقات اور انعقاد مجالس وغیرہ کی جو تدبیریں مناسب سمجھیں عمل میں لائیں۔" (۳۶)

اس اجلاس کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد مولانا اقبال احمد خاں سہیل کا ۷/ نومبر ۱۹۵۵ء کو انتقال ہوگیا۔ (۳۷) اور ۲۵/ دسمبر ۱۹۵۵ء کو مجلس انتظامی کا جو اجلاس حاجی رفیع الدین صاحب قریشی کی صدارت میں ہوا وہ دراصل ایک تعزیتی اجلاس تھا۔ اس اجلاس کی تعزیتی قرارداد یہ تھی۔

"مولانا اقبال احمد خان صاحب سہیل کی وفات حسرت آیات پر یہ مجلس اپنے انتہائی درد و رنج کا اظہار کرتی ہے اور دل سے دعا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے"۔ (۳۸)

اس طرح مولانا اقبال سہیل کا مدرسۃ الاصلاح سے تقریباً ۴۵ سالہ تعلق ان کی زندگی کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہوا۔

باغ گیتی میں نہ ہوگا اب نوا پیدا سہیل
غیر ممکن ہے کرے خاک وطن پیدا سہیل

مراجع وحواشی

(۱) کلیات سہیل، مرتبہ عارف رفیع، طابع بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ بلاسس روڈ بمبئی (۸) سن اشاعت، رمضان ۱۴۰۸ھ، اپریل ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۳۔ لیکن ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی تحقیق کے مطابق سن عیسوی میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۸/ دسمبر ۱۸۸۵ء قرار پاتی ہے۔ ملاحظہ ہو: ذکر فراہی، مرتبہ: ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر صفحہ:

۱۵۵۱۔ اورڈاکٹر شباب الدین صاحب کے بیان کے مطابق ۷؍ جنوری ۱۸۸۶ء ہے۔

(۲) کلیات سہیل، صفحہ:۱۳

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً

(۵) ایضاً، صفحہ:۱۴

(۶) ایضاً

(۷) ایضاً، صفحہ:۱۵

(۸) ایضاً، صفحہ:۱۶

(۹) ایضاً

(۱۰) اس اجلاس کی کارروائی سے متعلق تمام تفصیلات رجسٹر کارروائی جنرل مدرسۃ الاصلاح سے ملی ہیں رجسٹر کارروائی جنرل اس لئے کہا جارہا ہے کہ ابھی اس وقت تک تمام مجالس کی کارروائی الگ الگ رجسٹروں میں نہیں تھیں۔

(۱۱) رجسٹر کارروائی جنرل مدرسۃ الاصلاح

(۱۲) ایضاً

(۱۳) ایضاً

(۱۴) ایضاً

(۱۵) ماسٹر محمد ذکی صاحب کے مدرسہ پر مدرس ہونے کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا سراغ نہیں مل سکا کیوں کہ ریکارڈ میں کوئی صراحت نہیں ہے۔

(۱۶) رجسٹر کارروائی جنرل مدرسۃ الاصلاح

(۱۷) ایضاً

(۱۸) ایضاً

(۱۹) ایضاً

(۲۰) اس کا علم انٹرنیٹ سے ہوا

(۲۱) کلیات اقبال سہیل، صفحہ ۱۷- اور ذکر فراہی صفحہ: ۵۵۲

(۲۲) رجسٹر کارروائی جنرل مدرسۃ الاصلاح

(۲۳) ایضاً

(۲۴) ایضاً

(۲۵) ایضاً

(۲۶) ایضاً

(۲۷) اس ورق کا ربط تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں مل سکی کیونکہ کوئی ایسی علامت موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے ظاہر کی جاسکے۔

(۲۸) رجسٹر کارروائی جنرل مدرسۃ الاصلاح

(۲۹) ایضاً

(۳۰) ایضاً

(۳۱) رجسٹر کارروائی مجلس انتظامی مدرسۃ الاصلاح

(۳۲) ایضاً

(۳۳) ایضاً

(۳۴) اس زمانہ تک درسگاہ کی عمارت ہی کے دو کمروں میں اسپتال قائم تھا۔ بعد میں یہ اسپتال سرائے میر چلا گیا۔

(۳۵) رجسٹر کارروائی مجلس انتظامی مدرسۃ الاصلاح —— اس وقت مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی پاکستان منتقل ہو چکے تھے۔

(۳۶) رجسٹر کارروائی مجلس انتظامی مدرسۃ الاصلاح

(۳۷) کلیات سہیل، صفحہ: ۲۱

(۳۸) رجسٹر کارروائی مجلس انتظامی مدرسۃ الاصلاح

اقبال سہیل کی غزلیہ شاعری

ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی☆

انسان عالم محسوسات میں یا تو ظاہر کے انبساط سے خوش رہتا ہے یا باطن کا کرب اس کی ذات کے لئے ایسا جراحت افزاء ثابت ہوتا ہے کہ اس کی شدت سے حواس پگھلنے لگتے ہیں، سچے شاعر کو ظاہری انبساط سے زیادہ باطنی دکھ زیادہ پسند ہوتا ہے اور اس سے وہ لذت آشنا ہوتا رہتا ہے۔ لذت آزار ذات کا فلسفہ یہیں سے پیدا ہوتا ہے، غالب نے کہا تھا ؂

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

اقبال سہیل ایک ایسے ہی فنکار تھے جنہوں نے تخلیقی محسوسات سے گزرتے وقت اس باطنی کرب کو شاعری کے ذریعہ اپنے جذبات کی ترسیل اور احساسات کے ابلاغ کا ذریعہ بنایا۔ اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، منقبت، نعت، سیاسی نظم گوئی، سماجیات و اخلاقیات سے متعلق گوہر آبدار ان کی کلیات میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے اقبال سہیل کے نزدیک غزل کی حیثیت ثانوی تھی لیکن ان کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ اس مفروضہ سے انکار کرتا ہے۔ اقبال سہیل کے یہاں جو تغزل و سرمستی ہے اور جس طرح واردات قلب کا اظہار ہوا ہے وہ فنکار کے لئے اگر قابل اعزاز نہیں تو قابل تحسین ضرور ہے اسی لئے میں نے آگے اقبال سہیل کی غزلیہ شاعری پر بہت مختصر گفتگو کی ہے۔

☆ 426/610 سی، باری انکلیو، کیشو نگر، سیتاپور روڈ، لکھنؤ

اردو غزل میں زبان کے استعمال کے طریقے ہر زمانے میں تبدیل ہوتے رہے ہیں، ہر بڑے شاعر نے الفاظ کو برتنے کا ایک نیا سلیقہ پیش کیا ہے۔ جو شاعر فن کی تخلیقی اہمیت سے واقف ہے اور شاعری کو انفرادی احساسات، جذبات اور تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے، زبان کے بنے بنائے معیار کی پرواہ نہیں کرتا وہ اپنے اظہار کے لئے اپنی زبان آپ بناتا ہے۔ شاعر اپنی ایجاز کاری اور کفایت الفاظ سے کام لے کر ترسیل جذبات کرتا ہے۔ وزیر آغا نے غزل کے شعر پر یوں اظہار خیال کیا ہے ''غزل کے شعر کے ہمہ گیر تاثر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ شاعر تفصیل اور تجزیئے کی بجائے کفایت اور اختصار کی مدد سے مرکزی نکتے کو اُبھارتا ہے اور ناظر کی نگاہیں اس نکتے پر مرتکز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اشارے کنائے کو جس خوبی اور نفاست سے غزل نے استعمال کیا ہے کسی اور صنفِ سخن میں اس کی مثال موجود نہیں۔ اسی سے وابستہ غزل کے شعر کی یہ خوبی بھی قابل غور ہے کہ یہ بات کو ادھورے انداز سے پیش کرتا ہے۔ اور بات کی تکمیل کو ناظر کے تخلیقی عمل کے لئے چھوڑ دیتا ہے''۔

اقبال سہیل جیسے نابغۂ روزگار کا شمار انہیں شعراء میں ہوتا ہے، اقبال سہیل نے غزل میں پورے رموز و آداب غزل کو پورے ادبی تلازمات، لسانی انسلاکات اور پوری فنی چابکدستی کے ساتھ برتا ہے، اقبال کے یہاں اظہار مدعا کے لئے جو بھی لفظ مستعمل ہوا ہے اس کی جگہ پر متبادل لفظ ممکن نہیں ہے۔ ادب خالص تمثیلی انداز بیان ہوا کرتا ہے، اقبال سہیل کی شاعری میں یہ انداز بیان پوری جلوہ سامانی کے ساتھ نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کیوں چپ نہ لگ گئی حرم یار دیکھ کر	حیراں ہوں اپنی جرأت گفتار دیکھ کر
کیوں ایک کے ہزار مقابل بنایئے	آئینہ دل کا توڑیئے سرکار دیکھ کر
اتنا تو ہوش ہے اسے دیوانہ کیوں کہیں	جو توڑتا ہے سر تری دیوار دیکھ کر
آخر غرورِ حسن کو کھانی پڑی شکست	میرے نیاز عشق کو خوددار دیکھ کر

یہی والہانہ پن اور تخلیق کی یہی سرمستی و تمثیلیت اقبال کی پوری شاعری میں جلوہ گر ہے۔

اقبال کا ذوق جمال بہت ہی شائستہ اور نکھرا ہوا ہے، ہر اچھے اور بڑے فنکار کی طرح انہو ں نے آب و گل کی تجلیوں میں حسن کا مشاہدہ کیا اور ان تجلیوں کو اپنے فن میں سمیٹ لیا۔ اقبال نے حسن کو مہرباں نامہرباں نہ سمجھ کر حسن بھی سمجھا۔ وہ اپنے جذبات کو ترفع دیتے ہیں تو تصوریت پسند بن جاتے

ہیں، مجازی سطح پر انہوں نے حسن کی جو تصویر کشی کی ہے وہ حسی ہے، حسن ان کے نزدیک دیکھا، چھوا جاسکتا ہے اور اس سے لطف اندوز بھی ہوا جاسکتا ہے۔ ان کے کلام میں حسن کی محاکات زیادہ تر بصری ہے، اس میں تحرک اور ارتعاش ہے۔ آنکھوں کو چکا چوند کرنے کی کیفیت ہے۔ اقبال کے کلام میں رنگ ونور کی یہ چلتی پھرتی چمکتی دمکتی تصویر ملاحظہ ہوں۔

زبانوں پر نہیں اب طور کا افسانہ برسوں سے
تجلی گاہ ایمن ہے دل دیوانہ برسوں سے
کچھ ایسا ہے فریبِ نرگسِ مستانہ برسوں سے
کہ سب بھولے ہوئے ہیں کعبہ وبتخانہ برسوں سے
وہ چشم فتنہ گر ہے ساقی میخانہ برسوں سے
کہ باہم لڑرہے شیشہ وپیمانہ برسوں سے
ستم کو اہتمام دلفریبی اب نہیں باقی
وہ زلفیں ہورہی ہیں بے نیاز شانہ برسوں سے
کہاں اب وہ نگاہ شرمگیں کے وار چھپ چھپ کر
کہ اب ناوک زنی ہوتی ہے بے باکانہ برسوں سے

درج بالا اشعار میں اگر افتخار عارف کی زبان مستعار لوں تو کوئی لفظ بے ادب یا کم نسب نہیں ہے اور آپ نے دیکھا کہ غزل قاری کو ایک عالم محویت میں لے کر چلی جاتی ہے۔ غزل کی یہی زبان ہے، یہی لب ولہجہ ہے، یہی توانائی اور یہی رموز وآداب ہیں جن کو برتنے کے بعد اقبال سہیل جب اپنے حریم شعر میں داخل ہوتے ہیں تو خوب صورت اشعار کی تخلیق ہوتی ہے جنہیں پڑھ اور سن کر دل ودماغ کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے، روح کو فرحت ومسرت کا احساس ہوتا ہے

سہیل اب کس کو سجدہ کیجئے حیرت کا عالم ہے
جبیں خود بن گئی سنگِ در جانانہ برسوں سے

اسی لب ولہجہ کی غزل پر حکومت یہی حسن بیان غزل کی شناخت ہے۔

شاعری کا ایک عمل وہ ہے جس میں موجودہ اور مروجہ الفاظ کے رمزی اور علامتی علاقوں

میں ردوبدل کیا جاتا ہے، اس عمل سے زبان میں ترقی اور توسیع ہوتی ہے، اس ترقی وتوسیع کی رفتار معاشرے کی مادی ترقی، ذہنی نشوونما اور جذباتی تہذیب کے تابع ہوتی ہے۔ ہر نئی ایجاد فرہنگ کو نیا لفظ اور انسان کو نیا خیال دیتی ہے، الفاظ یوں بہترین ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنی صوتی کیفیات اور آہنگ سے فردوس گوش بن جاتے ہیں اور الفاظ کا بہترین ہونا اس پر بھی منحصر ہے کہ ان کے معنی میں کتنی وسعت، گہرائی اور تنوع ہے ان کی ایمائیت کس قدر دور رس ہے، الفاظ کی یہ خوبیاں ان کے استعمال ہی سے کھلتی ہیں، فرہنگ اقبال ملاحظہ ہو ۔

اُف کیا مزہ ملا ستم روزگار میں ۔۔۔ کیا تم چھپے تھے پردۂ لیل ونہار میں

سو سجدے ایک لغزش مستانہ وار میں ۔۔۔ اللہ کیا ادا ہے ترے بادہ خوار میں

وہ مستِ نازِ حُسن، میں سرشار آرزو ۔۔۔ وہ اختیار میں ہیں نہ میں اختیار میں

ہو موسم جنوں تو ہے فرزانگی حرام ۔۔۔ دیوانہ کیا جو ہوش نہ کھوئے بہار میں

اقبال کی شاعری اپنے آپ کو جن معنوں میں ممتاز کرتی ہے ان میں ایک اہم شعری رویہ عشقیہ تصور کا ہے۔ عشقیہ تصور کا یہ دھندلکا، یہ پُر اسرار اور ماورائی رویہ اقبال کی شاعری پر محیط ہے۔

اقبال کی شعری کائنات اتنے کثیر الابعاد اور قیامت خیز جلوؤں سے معمور ہے کہ بیک نظر اس کا تماشا مشکل ہے، اس کائنات میں تفلسف بھی ہے، تفکر بھی اور جمالیاتی رنگ بھی۔ ملاحظہ ہو ۔

گرہ کھلی نقاب کی وہ ضدگئی حجاب کی ۔۔۔ بلائیں لے رہا ہے دل نگاہ کامیاب کی

صبا سے کہہ رہی تھی کل یہ پنکھڑی گلاب کی ۔۔۔ لٹی ہوئی بہار ہوں مٹے ہوئے شباب کی

یہ صبح نو بہار کی یہ شام ماہتاب کی ۔۔۔ شبیہ ہے کھنچی ہوئی تبسم شباب کی

ادھر ہے چتونوں پہ بل ادھر تبسم آنکھ میں ۔۔۔ عجیب کشمکش سی ہے عنایت وعتاب کی

جھلک ہے حسنِ یار کی، مرے سرشک شوق میں
کہ شبنمی نقاب میں کرن ہے آفتاب کی

اقبال نے اردو غزل کے تقریباً سبھی رموز وعلائم سے اس طرح کام لیا ہے کہ وہ ان کے اظہار کا جزو لاینفک بن گئے ہیں، اس طرز اظہار اور انداز بیان کا نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اقبال نے الفاظ کے خلاقانہ استعمال سے غزل کے رموز کو اپنی شاعری کی مصطلحات اور علائم سے بدل

کر اظہار کا نیا راستہ نکالا ہے جو ان کا منفرد اسلوب ہے جسے اعتبار و استناد کا درجہ ملا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے فانی کے عہد شاعری کا جو تجزیہ کیا ہے بعینہ اس کا انطباق اقبال سہیل کی شاعری پر بھی ہوتا ہے، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ فانی نے ''امام یاسیات'' کی حیثیت سے اپنا تفرد قائم کیا ہے جو یاسیت قاری کے پہلو طرب میں ایک نشتر رکھ دیتی ہے۔ برخلاف اس کے اقبال سہیل کی انفرادیت میں ایک مردانگی، گھن گرج اور چیلنج ہے۔

باب فردوس اگر وا نہ ہوا نوک خامہ سے کھول لیں گے سہیل

آخر میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے الفاظ کو مستعار لیتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں، اقبال سہیل کا بھی عہد ''علامہ اقبال کا حیات آفریں عہد تھا، نذر الاسلام اور جوش کا انقلابی زمانہ تھا، حسرت، جگر اور اصغر کی نشاطیہ اور رجائیہ شاعری کا دور تھا۔ یہ گاندھی اور جواہر لال کا سیاسی زمانہ تھا، یہ ہماری قومی تحریک آزادی کا دور تھا۔ دار و رسن کا دور تھا، مزدور و کوہکن کا دور تھا''۔ ایک ایسی سیاسی، معاشرتی رستاخیز کے زمانے میں اقبال کی آواز اپنی انفرادیت کے ساتھ جانی اور پہچانی گئی جو اقبال کے فن شاعری کو بام عروج تک لے جاتی ہے اور نقادان فن کو ٹھہر کر سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

☆☆☆

اقبال سہیل سیاسی شاعری کے آئینے میں

ڈاکٹر علاء الدین خاں ☆

اعظم گڑھ کے نیر تاباں اقبال سہیل (۱۹۵۵ء-۱۸۸۴ء) محفل شبلی کی آخری شمع تھے۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی۔ خاک اعظم گڑھ ان کے فیض سے شیراز ہند تھی، یہ حافظ و عرفی کے ہم سخن و ہم زبان تھے، ان کے نوک خامہ سے شعر کے چشمے جاری و ساری تھے، اردو، عربی اور فارسی زبان و ادب پر عبور حاصل تھا، فارسی شعر و نظم پر قدرت کاملہ رکھتے تھے اور فی البدیہہ اشعار کہتے، انھیں اپنے وقت کے دو طبعی و فطری شاعروں کا سایہ تربیت اور فیض صحبت حاصل تھا یعنی مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی۔ وہ دونوں کے باقاعدہ شاگرد تھے، اس لئے وہ بھی فطری و طبعی شاعر تھے۔ شبلی کی طرح اقبال سہیل بھی قصیدہ اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ علی گڑھ کی فضا انھیں بہت راس آئی، وہاں ہم مذاق اصحاب کا اجتماع، یونین کی محفلیں، اہل کمال مہمانوں کی آمد، اس ماحول نے ان کے لئے مناسب فضا کا کام دیا، اس کے بعد پے بہ پے ملک میں سیاسی انقلاب کا دور آیا، اس میں بھی ان کی طبیعت نے مناسب آب و ہوا پائی۔ اور ان کی عظمت علی گڑھ کی فضا میں خوب چمکی۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین:

> ''مولانا (سہیل) اور ان کے ساتھیوں کے طفیل شعر و سخن کی سرگرمیوں کو ایم، اے، او کالج میں وہ قبول عام نصیب ہوا تھا، اور اس کا معیار اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ علی گڑھ والے جو اپنی تعریف میں یوں بھی انکسار کے اتنے زیادہ عادی نہیں اسے اپنے عہد کا 'عکاظ' کہنے لگے تھے اور سچ بھی ہے کہ اس زمانہ میں جس شاعر کے کلام کو یہاں

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ تاریخ شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

پسند کرلیا جاتا اس کی شہرت واستناد کو سارے ملک میں تسلیم کرلیا جاتا۔ اور علی گڑھ میں شعر اور تنقید وادب کے امام سہیل تھے۔" (۱)

وہ بلا کے ذہین تھے اور غیر معمولی حاضر دماغی کے باعث وکالت میں بہت کامیاب تھے، ان کے پیشہ وکالت کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ وکالت کے پیشہ نے ان کے علمی جوہر کو چمکنے نہیں دیا۔ ان کا نثری سرمایہ بہت کم ہے، شبلی پر انھوں نے قسط وار مضمون مجلّہ الاصلاح میں لکھا جو سیرت شبلی کے نام سے کتابی شکل میں فضل الرحمن کی کوششوں سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ممتاز شعراء کے مجموعہ کلام پر تنقیدی مضامین، اور مشاعروں کے صدارتی خطبات ہیں جن سے ان کے فکر ونظر، اسلوب نگارش، قلم کی روانی وغیر معمولی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔

اقبال سہیل اپنی زندگی سے بہت بے پروا تھے، انھوں نے نام کمانے کی کوشش نہیں کی، ان کی بے پروائی کی وجہ سے ان کے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا یا دوسروں نے اپنے نام کر کے ادب میں نمایاں نام پیدا کیا۔ انھوں نے شعروسخن کی تمام اصناف غزل، قصیدہ، نظم، قطعہ، نعت، منقبت اور رباعی میں طبع آزمائی کی اور سب میں کامیاب رہے۔ غزل اور قصیدہ میں تو نمایاں مقام پیدا کیا، ان کی غزلوں میں غزل کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انھوں نے غزل کے ذریعہ سیاسی وملی خیالات وافکار کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات سے لے کر اپنی آخری زندگی تک کے سیاسی واقعات، رجحانات ومیلانات نیز کوائف کو بڑی خوش اسلوبی سے غزل ونظم کے قالب میں پرو دیا ہے۔ ان کی ملی وسیاسی شاعری اپنے عہد کے مخصوص سیاسی ماحول اور قومی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ بقول محمد نعیم صدیقی:

> "سہیل کا دل چونکہ خود قوم ووطن کی محبت سے سرشار تھا، اس لئے ان کی اس نوع کی شاعری میں حوصلہ، بلند ہمتی اور خود اعتمادی کے گہرے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان پر سامراجی استقلال کے خلاف ان کے اشعار کوہ آتش فشاں معلوم ہوتے ہیں۔ شبلی کی طرح وہ بھی لیگی نظریات کے شدید خلاف تھے اور انھوں نے رہتی زندگی تک قومی یکجہتی اور وحدت ملی کا پرچم بلند کئے رکھا۔" (۲)

قومی حمیت، وطن کی آزادی، اور حب الوطنی کے جذبات ان کی شاعری میں جابجا موجود

ہیں۔ وہ ترانہ وطن میں لکھتے ہیں:

ہمارا وطن ہے ہمارا وطن زمانے کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمیں ساری دنیا سے پیارا وطن

خدا مہرباں ہے تو کچھ غم نہیں ترے دست وبازو تجھے کم نہیں
نہ لے دوسروں کا سہارا وطن

ہوئی مدتیں غیر کے دام میں نہ رسوا ہو دنیا کی اقوام میں
نہ کر اب تو ذلت گوارا وطن

تو غیروں کے پھندوں سے آزاد ہو پشیماں باہر کا صیاد ہو
دکھادے یہ دلکش نظارا وطن

غلامی کا مٹ جائے دامن سے داغ جلے گھر میں مسجد سے پہلے چراغ
چمک جائے تیرا ستارا وطن

بدیشی کا جب لوگ دیتے ہیں ساتھ پشیمانی ہی ان کو لگتی ہے ہاتھ
ہے ایسوں سے لازم کنارا وطن

یہ بیگانہ پرور یگانے نہیں حواس ان کے اس دم ٹھکانے نہیں
نہ سن ان کی باتیں خدارا وطن

سنادے سنا جب قومی کا راگ دلوں میں لگادے حمیت کی آگ
ابھی جگمگا اٹھے سارا وطن

بدیسی کی فرماں بری چھوڑدے غلامی کی زنجیر کو توڑدے
دلی جوش کر آشکارا وطن

زمانہ ترے جوش کا ہو مقر نہ تاکے کوئی اجنبی تجھ کو پھر
جو تونے یہ میدان مارا وطن (۳)

مذکورہ اشعار کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ قومی شاعر تھے، وطن سے محبت رکھتے تھے اور ملت کی غیرت کو ابھارنے کا فن جانتے تھے۔ انگریز جو کہ ہندوستان میں بغرض تجارت آئے تھے اور

بتدریج ترقی کر کے ہندوستان کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی، اس کو سہیل نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

خموشی داستاں میری، تحیر ترجماں میرا
بیاں ہوتا ہے اس محفل میں یوں سوز نہاں میرا

غلامی میں وفا بے سود، سجدہ رایگاں میرا
نہ خود اپنی جبیں میری، نہ ان کا آستاں میرا

کرم مہماں کا ہے، یا حسن خلق ناتواں میرا
مرے گھر کو گھر اپنا جانتا ہے میہماں میرا

خیال ان کے سخن میرا، زباں ان کی دہن میرا
بہار ان کی چمن میرا، گل ان کے گلستاں میرا

سمٹ جائے گی خود منزل، وہ دن لائے گا مستقبل
ابھی تو جادۂ پیمائے طلب ہے کارواں میرا

وہ کہتے ہیں یہ جلوے سب ہیں ایجادات مغرب کے
دل مظلوم کہتا ہے شرر میرے، دھواں میرا (۴)

پوچھتے کیا ہو دیار دل کی مہماں پروری
جو بلا باہر سے آئی وہ مقامی ہوگئی

رخنۂ دیوار زنداں آپ بھر دیتا ہوں میں
قید میری، خود مرے ہاتھوں دوامی ہوگئی (۵)

انگریز ہندوستانیوں کو باہم لڑانا چاہتے تھے، اس سے متعلق اقبال سہیل جولائی ۱۹۳۲ء میں کہی گئی اپنی غزل میں رقم طراز ہیں:

کچھ ایسا ہے فریب نرگس مستانہ برسوں سے
کہ سب بھولے ہوئے ہیں کعبہ و بت خانہ برسوں سے

وہ چشم فتنہ گر ہے ساقی میخانہ برسوں سے
کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

چمن کے نونہال اس باغ میں پھولیں پھلیں کیوں کر
یہاں چھایا ہوا ہے سبزۂ بیگانہ برسوں سے (۶)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

صدا فریاد کی آئے کہیں سے وہ ظالم بدگماں ہوگا ہمیں سے
خدا سمجھے بت سحر آفریں سے گریباں کو لڑایا آستیں سے(۷)

نہیں اب کارگر کوئی فریب حسن کا افسوں
مدار اک رہ گیا ہے فتنۂ شیخ و برہمن پر (۸)

دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں کانگریس نے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرے تو اس نے محوری طاقتوں کے حملے کا بہانہ بنایا، کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ سے قبل ۱۹۴۱ء میں یوپی اسمبلی میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا، اقبال سہیل ممبر اسمبلی تھے، انھوں نے ریزولیوشن کی تائید میں برجستہ شعر کہے:

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے، اسیر غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہے باغباں نے، تو آئے گلچیں بھی لوٹ جائے
ستم بھی ہوگا تو دیکھ لیں گے، کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے، یہ مہربانی کا جھوٹ جائے
بلا سے قزاق آکے لوٹیں، یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے، قفس تو کم بخت ٹوٹ جائے (۹)

غزل کے انداز میں سہیل کی سیاسی شاعری کو بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے، انھوں نے اپنی غزل میں آزادیٔ وطن کے جذبے کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے جیسے:

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا
ابھی دیوار زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا
کیے ہیں چاک دل سے بوئے گل نے بال و پر پیدا
ہوس ہے زندگانی کی تو ذوق مرگ کر پیدا
جوانو! یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزم سفر پیدا

وہ شبنم کا سکوں ہو، یا کہ پروانے کی بیتابی
اگر اڑنے کی دھن ہوگی تو ہوں گے بال و پر پیدا
دل آتش نوا تجھ کو قسم ہے داغ ہجراں کی
دیار حسن میں ہوجائے شور الحذر پیدا
سہیل اب پوچھنا ہے انقلاب آسمانی سے
ہماری شام غم کی بھی، کبھی ہوگی سحر پیدا (۱۰)

۱۹۴۷ء میں جب ہندوپاک بٹوارہ ہوا یا وطن آزاد ہونے کے بعد جو واقعات رونما ہوئے، جو انسانیت سوز حرکتیں ہوئیں اور دونوں طرف قتل عام ہوا، اقبال سہیل نے اپنی شاعری میں اس کی تصویر کشی ہے:

مجھ سے پوچھو نہ مزاج دل ناشاد ابھی — میرے نغموں میں ہے کچھ تلخی فریاد ابھی
خود کہیں کی نہ رہی توڑ کے شیرازۂ گل — اور کیا چاہتی ہے نکہت برباد ابھی
بجلیاں آئیں جو باہر سے وہ رخصت بھی ہوئیں — شعلہ افگن ہے مگر برق چمن زاد ابھی
نخوت حسن کے ماتھے پہ شکن دوڑ گئی — عشق نے وا نہ کئے تھے لب فریاد ابھی
فکر تعمیر نشیمن ہو یہاں کس کو سہیل — ہوش گم کردہ ہیں مرغانِ نو آزاد ابھی (۱۱)

وطن کی آزادی پر قتل و غارت کے باوجود ہر سو خوشی کی لہر بھی دوڑی، اس موقع پر اقبال سہیل نے جو اشعار کہے اس میں ان کے افکار و خیالات کی عظمت کے ساتھ ہی زبان اور بیان کا بڑا دلچسپ اسلوب پایا جاتا ہے۔ یہ نظم جشن آزادیٔ ہند کے موقع پر اعظم گڑھ میں پڑھی گئی، نظم بہت طویل ہے، اس میں اس وقت کے شہید اور زندہ دونوں شخصیات کا ذکر ہے، جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، سی آر داس، پنڈت موتی لال نہرو، عبدالرحیم سندھی، ریشمی رومال تحریک کے ہیرو مولانا مملوک علی، محمد قاسم نانوتوی، امداداللہ مہاجر مکی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، اشفاق اللہ خاں، بھگت سنگھ، رام پرساد بسمل، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

گلزار وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج — سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت و چمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفل دہن آج — ہے ہر گل خنداں کی زباں پر یہ سخن آج

صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندان محن آج

غالب ہوئی طاقت کے مقابل میں سچائی　　صیاد سے چھینی ہے اسیروں نے رہائی
جیتی ہے نہتوں نے اہنسا کی لڑائی　　آزاد کو تبریک ، جواہر کو بدھائی

بچ ہوکے رہا دہر میں گاندھی کا بچن آج

اللہ رے یہ فیض دعائے مدنی کا　　آتش کدہ گل زار ہوا حق طلبی کا
لایا رمضاں ہند میں یہ مژدہ خوشی کا　　ماتھے سے مٹا بندگیِ غیر کا ٹیکا

جاتا رہا اس چاند سے چہرے سے گہن آج

وہ زندۂ جاوید ، وطن کے وہ فدائی　　جان اپنی جنھوں نے رہِ ملت میں گنوائی
ہمت نے انھیں کی ہمیں ساعت یہ دکھائی　　انصاری واجمل ہوں تلک ہوں کہ ڈیسائی

یاد آتے ہیں ہم سب کو شہیدانِ وطن آج

دنیا سے اٹھے داس بھی نہرو بھی نہیں ہیں　　نیتا جی خدا جانے کہاں گوشہ نشیں ہیں
پھر بھی یہی کہتے ہیں جو اربابِ یقیں ہیں　　جسم ان کے کہیں ہوں مگر ارواح یہیں ہیں

اور وہ بھی ہیں اس جشنِ مسرت میں مگن آج

دنیا ہی میں تنہا نہیں یہ جشن خدا داد　　فردوس میں بھی پہنچی ہے اس جشن کی روداد
سنتے ہی یہ خبر سن کے ہوئے خرم و دلشاد　　مسرور ہیں مملوک علی، قاسم و امداد

دیتے ہیں خبر خلد سے محمود حسن آج

سرمایۂ ملت ہوئی جانبازیِ افراد　　قربانی وایثار کی آخر تو ملی داد
کہتے ہیں یہ اشفاقؔ و بھگتؔ، بسملؔ و آزادؔ　　اللہ نے سن لی دلِ مظلوم کی فریاد

زینہ ہے حکومت کا وہی دار و رسن آج (ص ۱۲)

مذکورہ شخصیات کے ذکر کے بعد اقبال سہیل نے ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر اور رانی جھانسی کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا ہے:

اے بادِ صبا خواب سے ٹیپو کو جگادے　　مرحوم ظفر شاہ کے شانوں کو ہلادے
پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکادے　　پھر دونوں کو یہ مژدۂ جاں بخش سنادے

آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

ہوں گی اسی دنیا میں کہیں جھانسی کی رانی — وہ خالدۂ ہند وہ نوشابۂ ثانی
ہے فخرِ وطن جن کی شجاعت کی کہانی — ان کو بھی سنا جا کے یہ پیغام زبانی

پوری ہوئی آزادی قومی کی لگن آج (ص ۱۳)

مولانا محمد علی جوہر آزادی کی بات کرنے کے لئے گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے، وہاں انھوں نے زبردست تقریر کی اور یہ کہا کہ ہم آزادی لے کر ہندوستان جائیں گے بصورت دیگر یہیں مر کر دفن ہو جائیں گے، ان کے وہاں وفات پا جانے اور دفن ہو جانے کا ذکر بھی اس طرح کرتے ہیں:

ہے یاد ہمیں حضرت جوہر کا وہ ارشاد — آئیں گے نہ وہ ہند میں جب تک نہ ہو آزاد
کہہ دے کوئی ان سے کہ ہوئی ختم وہ میعاد — اجڑی ہوئی محفل ہے کریں اس کو پھر آباد

آجائیں کہ پورا ہوا وہ عہد کہن آج (ص ۱۴)

اقبال سہیل کی نظر ماضی وحال دونوں پر ہے، برادران وطن کے بیچ انگریزوں نے جو عناد کا بیج بویا تھا وہ ہمارے شاعر کے سامنے ہے۔ انگریزوں کی وجہ سے چمن کی جو تخریب ہوئی، آزادی اور بٹوارے کی وجہ سے جو جانی مالی نقصانات ہوئے ان سب کے ساتھ ہی مستقبل میں ہندو اور مسلمان کے مابین اتحاد واتفاق قائم رہے، اس کے لئے وہ فکر مند نظر آتے ہیں، مذہب وزبان کا جو فرق ہے اور دونوں کے تمدن وتہذیب میں جو امتیاز ہے اس کی طرف اشارہ کر کے یہ پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ مذہب وزبان کا فرق وطنی اتحاد میں کسی طرح سے رکاوٹ نہیں ہے، وہ مشترکہ کلچر کو مدنظر رکھتے ہوئے الفت کے دیئے کو دلوں کے اندر روشن کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

ارباب وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل — ہاں جشن منالو کہ ہے موقع اسی قابل
ہو جانا نہیں جوش طرب میں کہیں غافل — تخریب تو آسان تھی تعمیر ہے مشکل

ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یہاں ایک — اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود وزیاں ایک — ہم سب کا خدا ایک ہے ہم سب کا نشاں ایک

پھر دل میں ہو کیوں خار عداوت کی چبھن آج

وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہب اسلام جو دین بھی ہو دیتا ہے محبت ہی کا پیغام
مذہب کو خدا کے لئے مت کیجئے بدنام کل شیر وشکر ہوں یوں ہی کل ہند کی اقوام
سنگم پہ ہیں جس طرح ملی گنگ وجمن آج (ص ۱۵)

ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کے بعد جو قتل وغارت گری ہوئی اور طوفان بدتمیزی نیز فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے عوام کے دلوں میں جو پست ہمتی اور مایوسی نے جنم لیا اسے بھی اقبال سہیل نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، وہ قومی لیڈروں کے حوصلہ کو بلند کرنے کی بات کرتے ہیں، اور یہ پیغام دیتے ہیں کہ ماضی کو بھول کر تعمیری کاموں میں لگ جائیں۔ لوگ جس چیز کو تاریکی سمجھ رہے ہیں اور پریشان حال ہیں اس کا ذکر بھی ان کی شاعری میں موجود ہے، وہ لوگوں کو غم واندوہ سے نکال کر نئے طریقے سے زندگی گزارنے پر آمادہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تاریکی چھٹے گی اور نئی صبح کا آغاز ہوگا۔

مہِ نو ابر سے نکلا، مسرت کی کلید آئی سرورِ عام کا پیغام لے کر صبح عید آئی
ابھی عید آرہی ہے اس سے پہلے یہ نوید آئی مبارک جشن آزادی کی تقریب سعید آئی
ہوا صیاد رخصت آج یہ گل زار اپنا ہے
گورنر جنرل اپنا ہے سپہ سالار اپنا ہے

یہ مانا آج بھی ہر چیز کی بے حد گرانی ہے وہی خود غرضیاں ہیں دیس کی سیوا زبانی ہے
دلوں میں کھوٹ ہے لب پر صفائی کی کہانی ہے سبق برطانیہ کا ہے، زباں ہندوستانی ہے
نظامِ کہنۂ سرمایہ داری اب بھی قائم ہے
غریبوں کا غم بے روزگاری اب بھی قائم ہے

بلند وپست میں اب تک بھی باہم سرگرانی ہے زبانوں پر ابھی تک داستانِ پاستانی ہے
ابھی تک مسلم و ہندو میں باقی بدگمانی ہے زباں کی کشمکش اب تک حجاب درمیانی ہے
مگر آثار ہیں یہ سب اسی دورِ غلامی کے
نتیجے ہیں یہ سودائے وطن خواہی کی خامی کے

دھوئیں سے جنگ کے مسموم ہے آب وہوا اب تک غبارِ مغربیت سے مکدر ہے فضا اب تک
دلوں میں زخم تقسیم وطن کا ہے ہرا اب تک کئی صدیوں کا کوڑا کچھ نہ کچھ ہے بچ رہا اب تک

مگر یہ سب اندھیرا جلد ہی اب مٹنے والا ہے

اوراس کے بعد صدیوں تک اجالا ہی اجالا ہے (ص ۱۶)

ہندوستان کی آزادی کو دنیا کی آزادی کا پیش خیمہ بتاتے ہوئے اقبال سہیل کہتے ہیں کہ ہندوستان دنیا بھر میں آزادی کا میر کارواں ہوگا۔

ہمارا دور آزادی ہے طفل شیر خوار اب تک کہ دیکھی ہے جہاں میں ایک ہی فصل بہار اب تک

رہے حالات گردوپیش گو ناسازگار اب تک مگر پھر بھی ترقی ہی پہ ہے یہ ہونہار اب تک

خدا رکھے یہ بچہ کچھ دنوں میں اب جواں ہوگا

تو دنیا بھر میں آزادی کا میر کارواں ہوگا (ص ۱۷)

وطن سے محبت اور وطن کی حفاظت کے لئے جان وتن فدا کردینے کا حوصلہ بھی ہمارے شاعر کے دل میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہمیں شکوے کا کیا حق جب ہماری ہی حکومت ہے نہ مسلم کی نہ ہندو کی یہ جمہوری حکومت ہے

یہ اپنا دیس، اپنا راج ہے اپنی حکومت ہے یہ آزاد و جواہرلال نہرو کی حکومت ہے

فدا اس کی حفاظت میں ہم اپنی جان کردیں گے

وطن پر سب متاع زندگی قربان کردیں گے (ص ۱۸)

اقبال سہیل جمہوری حکومت کے داعی اور ملکی آزادی کے متمنی تھے، ان میں جذبۂ حریت پسندی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے، انھوں نے اپنی قوم کے لوگوں کو اپنی شاعری کے ذریعہ خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کے خلاف جنگ کے لئے آمادہ کیا، ان کے یہاں قوم پرستی ہے، اتحاد ویگانگت کا جذبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ باہمی اتحاد واتفاق کو ہندوستان کی آزادی اور اس کی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے، وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہونے کے ساتھ ہی انسانیت کو مذہب پر ترجیح دیتے تھے۔

حوالے:

(۱) اقبال احمد خاں سہیل "کلیات سہیل" دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، مرتبہ عارف رفیع نومبر ۲۰۱۲، ص ۷۔

(۲) محمد نعیم صدیقی ندوی ''وہ یاد آئے بہت - اقبال سہیل - ایک مظلوم ادیب'' الرشاد، نومبر دسمبر ۲۰۱۷ء ص ۳۵-۲۴۔

(۳) کلیات سہیل ص ۱۰۶-۱۰۵

(۴) ایضاً ص ۲۲۴-۲۲۳

(۵) ایضاً ص ۲۳۷

(۶) ایضاً ص ۲۰۳

(۷) ایضاً ص ۲۳۰

(۸) ایضاً ص ۱۴۴

(۹) ایضاً ص ۲۴۰

(۱۰) ایضاً ص ۲۲۲

(۱۱) ایضاً ص ۲۴۶

(۱۲) ایضاً ص ۱۳۴-۱۳۳

(۱۳) ایضاً ص ۱۳۵

(۱۴) ایضاً ص ۱۳۵

(۱۵) ایضاً ص ۱۳۶

(۱۶) ایضاً ص ۱۳۷

(۱۷) ایضاً ص ۱۳۸-۱۳۷

(۱۸) ایضاً ص ۱۳۸

☆☆☆

کلام سہیلؔ کی عصری معنویت

ڈاکٹر محی الدین آزاد اصلاحی ☆

سہیل کی ادبی عبقریت کسی ایک صنفِ سخن تک محدود نہیں، انھوں نے ہر صنفِ سخن کو اظہار وابلاغ کا ذریعہ بنایا ہے، اور اس میں اپنے خیالات کے موتی ٹانکے ہیں، ہر عہد کا شاعر اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس دور کے سیاسی وسماجی حالات اس کے افکار پر چھاتے ہیں، اس تعلق سے جب ہم ان کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی غزلوں اور نظموں میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار ملتے ہیں جس میں انھوں نے سیاسی حقائق اور اس کی کشمکش کو بڑی حد تک اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

سیاسی رنگ تو انھوں نے اپنے استاد شبلی سے لیا ہے لیکن اس میں جو نکھار اور شگفتگی انھوں نے پیدا کی ہے وہ ان کا بہت بڑا کمال ہے۔ جس کا اعتراف اکثر ناقدین نے کیا ہے۔

بقول آل احمد سرور "شبلی نے اپنی سیاسی نظموں میں جس شگفتگی اور حسن کاری سے کام لیا ہے وہ اقبال سہیل کے یہاں اور نکھری ہوئی ہے۔" (۱)

سہیل اپنے استاد شبلی کی طرح انگریزوں کے سخت مخالف تھے، وہ انگریزوں کی عیاریاں، فرقہ پرستوں کی سرگرمیاں، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشاکش دیکھتے تھے تو ان کا دل تڑپ اٹھتا تھا، انگریزوں کی شاطرانہ چال یہ تھی کہ وہ اپنی حکومت کو قائم ودائم رکھنے کے لئے ابنائے وطن کو کبھی مذہب، کبھی زبان اور کبھی علاقے کی بنیاد پر لڑاتے تھے، ان حالات کو دیکھ کر سہیل کہتے ہیں۔

وہ چشم فتنہ گر ہے ساقیِ مے خانہ برسوں سے
کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

☆ صدر شعبۂ عربی، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

چمن کے نونہال اس باغ میں پھولیں پھلیں کیوں کر
یہاں چھایا ہوا ہے سبزۂ بے گانہ برسوں سے (۲)

سہیل کو انگریزوں سے نفرت تھی، وہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے ہم وطنوں میں آزادی کی لگن پیدا کی اور اپنی قومی وملی نظموں میں ملک کے سرفروشوں اور آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کو پرجوش خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ آزادی ہند کے موقع پر انھوں نے جو نظم کہی اس میں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں (۳) اسی طرح انھوں نے ''مہاتما گاندھی'' کی شہادت پر جو نظم کہی اس کا پرجوش اور تاثیر میں ڈوبا ہوا لب ولہجہ ایک ساحرانہ کیفیت پیدا کرتا ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

وہ حدیث روح، پیام جاں جسے ہم نے سن کے بھلا دیا
وہ حریم غیب کا ارمغاں جسے پا کے ہم نے گنوا دیا
وہی ملک وملت جاں بلب، جسے اس نے آب بقا دیا
اسی ناسپاس نے ہائے اب اسے جام مرگ پلا دیا
وہ بودھ اور کرشن کا جانشیں ہمہ تن عمل ہمہ تن یقیں
وہ تبسم سحر آفریں کہ چمن لبوں سے کھلا دیا
ہمہ روشنی تری ذات تھی، ہمہ سوز تیری حیات تھی
تری روح شمع تھی گل ہوئی ترے تن کو پھول بنا دیا
ترا فیض دہر میں عام ہو، یہ غبار اٹھ کے غمام ہو
تری خاک تیرا پیام ہو، یہ سمجھ کے اس کو بہا دیا (۴)

درحقیقت یہ وہ آزادی اور حریت کے خیالات ہیں جو کسی علم بردار آزادی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر شاعر کے دل میں موجزن ہوئے اور زبان قلم سے آنسو کی طرح ٹپک پڑے۔ قرض حریت وآزادی کا جذبہ اور قوم ووطن کی سربلندی کا ولولہ ان کے دل ودماغ اور شاعری پر برابر چھایا رہا۔ اسی طرح جب ملک آزادی سے ہم کنار ہوا اور اس غلامی کے درد سے نجات ملی جو صدیوں سے دل میں کانٹا بن کر چبھ رہا تھا تو اس خوشی کے موقع پر بھی انھوں نے نئی نظمیں کہیں اور تقریباً سب کی سب پراثر

اور لاجواب ہیں، لیکن ان کی اس طرح کی نظموں میں ''منظر رخصت، نغمۂ بے تاب، مبارک باد آزادی'' کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان کی روانی الفاظ، موسیقیت طنز کی بلیغ نشتریت اور مسرت وشادمانی سے معمور لب ولہجہ سامع کے اوپر ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ جی چاہتا ہے اس کے چند بند پڑھ کر سنائے جائیں۔

تیور جو اسیروں کے بگڑے صیاد کی ہمت چھوٹ گئی
اے ذوق جنوں تیرے صدقے زنجیر غلامی ٹوٹ گئی
باندھے ہوئے اپنے سر پہ کفن نکلے جو فداکاران وطن
صیاد کا زہرا آب ہوا، نبضِ اہل وفا کی چھوٹ گئی
جس ننگ سے سر جھک جاتا تھا، غیرت کا قدم رک جاتا تھا
دامن سے وہ دھبا دور ہوا، چہرے سے وہ کالک چھوٹ گئی

گل زار وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت وچمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفل دہن آج ہے ہر گل خنداں کی زباں پر یہ سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا در زندان محن آج (۶)

اے اہل وفا ماتم نہ کرو وہ وعدہ شکن گر جاتا ہے
جاتا ہے مسافر غم نہ کرو مہمان ہی تھا گھر جاتا ہے
وہ دور مسرت آنے دو قومی پرچم لہرانے دو
جاتی ہے غلامی جانے دو صدیوں کا دلدّر جاتا ہے (۷)

سہیل نے اپنی نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کیا ہے اور انگریزوں کی طرز سیاست پر معنی خیز طنز کئے ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ فنی نقطۂ نظر سے غزل کی شعریت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ بقول شاہ معین الدین احمد ندوی:

''غزل سے ان کو مناسبت کم تھی لیکن اس میں بھی انھوں نے سیاسی رنگ پیدا کیا اور اس کو کمال تک پہنچایا، انھوں نے پوری غزلیں اسی رنگ میں کہی ہیں، لیکن

کہیں سے ان کی شعریت میں فرق نہیں آیا۔''(۸)

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں: ''ان کی غزلوں میں جنگ آزادی کی پوری تاریخ رمزوایما کی تمام لطافتوں کے ساتھ سموری ہے۔ ان کے یہاں آزادی سے پہلے اور اس کے بعد کے حالات وواقعات پر تبصرہ وتنقید غزل اور طنز کے تمام آداب کے ساتھ ہے۔''(۹)

سہیل نے پرانی علامتوں کو نئے معنی ومفاہیم میں استعمال کر کے انگریزوں کے اوپر جو سخت تنقیدیں کی ہیں وہ اردو ادب میں ایک قیمتی اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔

سہیل وسیع الخیال اور وسیع الظرف انسان تھے، ان کا مسلک اخوت ومحبت تھا، وہ نفرت کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے، وہ محبت، خلوص اور انسانیت کے فقدان پر ماتم کناں ہیں۔

کوئی دیر وحرم تک یہ مری فریاد پہنچا دے
وہ شیخ و برہمن کیا جو نہ رہ سکتے ہوں انساں بھی (۱۰)

حق گوئی اور بے باکی کے نمونے بھی ان کی شاعری میں ملتے ہیں جیسے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے دفاع میں ڈاکٹر علامہ اقبال کی تنقید کا جواب دینا (۱۱) اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف معاشی مساوات کی حمایت کرنا (۱۲) ان کی دیانت داری اور جرأت مندی کی اعلیٰ مثال ہیں۔

وہ اپنی شاعری میں قومی یکجہتی پر زور دیتے ہیں، ملکی اتحاد کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام فرقے آپس میں متحد ہو کر سیاسی ومعاشی سود وزیاں کو ایک سمجھیں اور اپنے تہذیبی ولسانی دائرہ میں رہتے ہوئے ملک کی تعمیر وترقی میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کردیں۔

مل جل کے برنگ شیر وشکر دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے (۱۳)

مجموعی حیثیت سے اگر ان کی غزلوں اور نظموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد حاضر کی نئی قدروں اور نئے میلانات اور اپنے وطن کے نئے مسائل سے پوری طرح آشنا ہیں۔ ان کا کلام درحقیقت ایک ایسے دل بے دار کی حکایت ہے جو حساس بھی ہے اور باشعور بھی اس طرح ان کی سیاسی شاعری آزادی سے قبل اور بعد کی جملہ سیاسی اور سماجی مسائل کی آئینہ دار بھی ہے اور ساتھ ہی عالمی اخوت اور انسانی قدروں کی ترجمان بھی، موضوع کا یہی تنوع ان کی سیاسی شاعری کو اہم بناتا ہے۔

مصادر و مراجع

(۱) سہیل نمبر (مضمون پروفیسر آل احمد سرور، مرتبہ نیاز احمد صدیقی محمد حسن انٹر کالج جون پور ۱۹۵۳ء ص ۴۳۔

(۲) کلیات سہیل، اقبال احمد خاں سہیل۔ مرتبہ عارف رفیع معارف پریس شبلی اکیڈمی ۲۰۱۱ء ص ۲۰۳

(۳) ایضاً ص ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵

(۴) ایضاً ص ۱۱۸-۱۱۷

(۵) ایضاً ص ۱۳۲

(۶) ایضاً ص ۱۳۳

(۷) ایضاً ص ۱۳۰

(۸) افکار سہیل (مضمون شاہ معین الدین احمد ندوی) مرتبہ شوکت سلطان علی حماد عباسی ۱۹۵۷ء ص ۵

(۹) ارمغان حرم، مرتبہ افتخار احمد اعظمی ص ۹۲

(۱۰) کلیات سہیل ص ۲۴۷

(۱۱) ایضاً ص ۳۰۶

(۱۲) ایضاً ص ۱۰۸

(۱۳) ایضاً ص ۲۴۲

☆☆☆

عہد حاضر میں اقبال سہیل کی بازیافت

ڈاکٹر حدیث انصاری☆

اعلیٰ، صالح اور نامیاتی شعر وادب، تخلیق کار اور فنکار کے صالح فکر و شعور اور پیہم عرق ریزی کے سبب وجود میں آتے ہیں۔ اور اسی طرح کی شخصیات کے چھوڑے ہوئے نقوش آنے والی صدیوں کے لئے رہنما روشنی کا کام کرتے ہیں۔ کیونکہ شعور ادراک، انسان کی عظیم، عدیم المثال قوتیں ہیں جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں۔ اسی قوت ممیّزہ کے ذریعہ مخلوق عالم میں اس کی مخصوص پہچان بنتی ہے۔ ذہن انسانی میں جب شعور وادراک کی موجیں، کنج ہستی میں، زندگی کے کنول کی تعبیر و تفہیم، تفسیر اور رازہائے پنہاں کا سراغ لگانے کے لئے، ذوق و وجدان اور آگہی کے ساحل سے ٹکراتی ہیں تو شعر کی صورت میں ذہنی آفتاب کے پرتو سے سیل نور پھوٹنے لگتا ہے۔ اگر اس عالم مستی اور ضیاء پاشی میں شاعر کی روح پاکیزہ اور صالح ہے، فکر واحساس میں توانائی ہے، حسن مطالعہ ہے، لفظوں کا حسین انتخاب ہے، شوکت اسلوب، رسالت ذہنی، فقاہت فکری، طرز ادا کی شگفتگی ہے۔ جذبۂ دل کے حسن اظہار کی صناعی ہے اور ندرت وسادگی کی فنکاری کے قیود کا پابند ہے تو اس کا شعور آفاقی، نور کے زینے کے سہارے فرش سے عرش کی طرف مائل پرواز ہو کر خالق کائنات سے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ اس سوز فروزاں میں قلب ونظر اور نوک قلم کی ایک ایک جنبش سے قلب ونظر کا اضطراب اور جوش دروں، نطق کلیم اور سوزِ خلیل کی صورت میں جریدۂ عالم پر ثبت اور مرقوم ہونے لگتا ہے۔

آج اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں کچھ اسی طرح کے فکر وخیال اور حریر و پرنیاں کے تانے بانے سے مزین فی زمانہ عصری معنویت کی حامل شعر وادب کی عبقری شخصیت علامہ اقبال سہیل

☆صدر شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور (راجستھان)

کی فکری وشعوری کوششوں کے چھوڑے ہوئے نقوش کی بازیافت ہورہی ہے۔ ہرنئی صدی جورواں ہوتی ہے اور جوفکر وشعور اور علم وہنر کے ایک ایک خشت سے اپنے رنگ محل کی تعمیر میں سرگرداں رہتی ہے۔ ماضی کی صدی کے خوشے سے اپنے لئے زادِ سفر تیار کرتی ہے! آج ہم اور آپ بھی ایک سچائی کو محسوس کررہے ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں وہ یہ ہے کہ کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے کہیں آگے آکر ادب کوایک نامعلوم سمت اور غیر موسوم بلکہ موہوم صورت میں تخلیق ہوتا ہوااور قاری کومطالعے میں منہمک پارہے ہیں۔ اس موقع پر معذرت کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ آج کا ادب پسند اور ادب نواز طبقہ معاشرے میں دوطرح کے گروہ کی موجودگی کا احساس کررہا ہے۔ ایک سچے قاری، سچے تخلیق کاراور سچے نقاد کا دوسرا اس کے بالکل برعکس......! یہ دور بڑا کشمکش بھرا ہوا ہے۔ محسوس سبھی کررہے ہیں لیکن اس موضوع پر جرأت گفتار کے حامی نہیں ہورہے ہیں۔ خوف اس بات کا ہے کہ طنز ونقد کے یلغار سے خود کو محفوظ رکھنا......!

تخلیق کاراور فنکار اس بات کا شکوہ کررہا ہے کہ اس کا قاری نہیں ہے۔ قاری یہ کہہ رہا ہے کہ سچا تخلیق کاراورفن کارنہیں رہا۔ اس کے ذوق کے مطابق ادب میں دلچسپی اور فکری تربیت کے سامان نہیں رہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ آج تخلیق کار سے کہیں زیادہ تعداد نقادوں کی ہوگئی ہے۔ جوادب کے میدان کو اپنی باندی تصور کرنے لگے ہیں۔ آج ایک قسم کی اور شاخ دیکھنے کو مل رہی ہے۔ جو تخلیق کار ہے وہ نقاد بھی ہے اور جو نقاد ہے وہ تخلیق کار بھی ہے۔ اس طرح ان کی ٹولیاں اور گروپ بنے ہوئے ہیں جو "من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو" کے مشن میں لگے ہوئے ہیں۔ آج پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی سستی اور بروقت سہولیات کے سبب، خوب داد وتحسین بٹورنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس بھیڑ میں حقیقی تخلیق کار، فنکار اور غیر حقیقی کا امتیاز کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ ہماری یہ گفتگو چند حضرات کو ناگوار گزرسکتی ہے۔ لیکن سچائی یہ بھی ہے کہ ایسے ہی ناموافق حالات اور فضا میں حقیقی اور نامیاتی ادب سے نئی صدی اپنا اثاثہ اور سرمایہ تیار کرتی ہے۔ یہ ساری توانائی، قوت، اور رہنمائی، نئی صدی، ماضی کے اثاثے اور سرمائے کے مطالعے اور بازیافت سے کرتی ہے۔ آج بھی بڑی خاموشی سے بغیر کسی صلے کی امید اور نام ونمود کے حقیقی تخلیق کاروں، فنکاروں اور نقادوں کا گروہ اس کام میں لگا ہوا ہے۔ آج کے تخلیق ہونے والے حقیقی اور نامیاتی ادب کی تصویر کل مستقبل میں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کی واحد مثال

آج کا یہ اجتماع خاص ہے۔ ایسے موڑ پر خالص کلاسیکیت کے علمبردار علامہ اقبال سہیل کی بازیافت کرنا، ان کے چھوڑے ہوئے ادب و شعر کے قیمتی سرمائے سے اپنے کام کے موتی و گہر تلاش کر کے موجودہ صدی کی ادبی، شعری، فکری اور تہذیبی تعمیر کے لئے خمیر تیار کرنا، اس اجتماع خاص کا مرکزی مقصد ہے جس کے لئے وہ مبارک باد اور تحسین افتخار کے قابل ہیں۔

اقبال سہیل کی زندگی کا آغاز انیسویں صدی کے آخری نویں عشرے میں شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں۔ انیسویں صدی اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے اور بیسویں صدی کی ابتداء، انیسویں صدی کے چھوڑے ہوئے سیاسی، تہذیبی، معاشرتی، اقتصادی افراتفری، بھوک، افلاس، جہالت، بے روزگاری، اوہام پرستی کے گونا گوں پیچیدہ مسائل کے انبار سے ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ بحرانی کیفیت اور افراتفری 1857ء میں انگریزوں کے خلاف، حریت پسند ہندوستانی عوام کے احتجاج کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس احتجاج آزادی کے بعد انگریز ہندوستان کے تخت حکومت پر کلی طور پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اس شکست سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان ہوا۔ اس احتجاج سے انگریزوں کو یہ خوف لاحق ہوا کہ ہند کی سرزمین پر اگر حکومت کرنی ہے تو مسلمانوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے دفن کرنا ہوگا۔ لہٰذا وہ اس مشن پر اپنی پوری طاقت لگا دیتے ہیں۔ ملک کے چپے چپے میں مسلم علماء، دانشوروں، اہل حکومت اور اہل سیاست پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ ان کی املاک کو قرق کرنا اور انھیں سزائے موت دے کر ان کے خاندان کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دینا، اپنی حکومت کی پالیسی میں شامل کر لیتے ہیں۔ موت اور دربدری کے اس عذاب نے مسلمانوں کے ماضی کے شیرازہ کو پلک جھپکتے خاک آلود کر دیا۔

ایسے میں سر سید احمد خاں نے اپنے رفقاء کے ساتھ قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو سمیٹنے کا تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا۔ سر سید احمد خاں نے برصغیر ہند کی اس سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، شکست و ریخت سے جو سبق حاصل کیا۔ اس کے نتیجے میں عملی طور پر برصغیر ہند کی قومی روح میں ان مسائل سے نجات حاصل کرنے کے لئے۔ بیداری علم و ہنر کا جو صور پھونکا تھا اس کے اثرات کا دائرہ بھی ابھی بہت محدود تھا۔ عام لوگوں تک اس کی رسائی نہیں ہو پائی تھی۔ ملک گیر پیمانے پر ہر فرد کو اس سے مستفیض ہونے کے وسائل کی کمی دامن گیر تھی۔

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے اس دور میں اپنے علم و ہنر اور سعی پیہم سے برصغیر کی شکست خوردہ قوم مسلم کی گرتی ہوئی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور اقتصادی شاخ کو سنبھالا اور مرجھائی ہوئی عوام کی رگوں میں جوشِ عمل اور کسب علم و ہنر کے ذریعہ اپنے کھوئے ہوئے وقار و عظمت کو پانے کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ اس کے نتیجے میں ایک بار پھر یہ قوم اپنے کھوئے وقار کو پانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس وقار کو پانے میں نوے سال کا عرصہ گذر گیا۔ انگریزوں کے تسلط سے ملک کو آزاد تو کرالیا لیکن ملک کی تقسیم کی صورت میں......! آزادی تو حاصل ہوگئی لیکن قوم مسلم کو اس موقع پر بھی جانی، مالی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی قربانی کے عوض......! بے روزگاری، بھوک، افلاس اور دربدری نے باقی ماندہ قوت کو بھی ختم کردیا۔ انتشار، دربدری اور انتقال آبادی کی وجہ سے اس قوم کی اتحادی قوت کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ گذشتہ دونوں صدیوں میں اس قوم نے جو نقصانات اٹھائے ہیں آپ انھیں اپنی کھلی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور محسوس کررہے ہیں۔

علامہ اقبال سہیل کی شعوری اور فکری تربیت، علمی، ادبی، شعری، تہذیبی اور سیاسی جدوجہد کا بھی یہی درمیانی زمانہ ہے۔ ان کی عملی کوششوں کا زمانہ بیسویں صدی کے ابتداء سے شروع ہوکر اسی صدی کی چھٹی دہائی کے نصف اول پر محیط ہے۔ متذکرہ بالا تمام مسائل جو انیسویں صدی نے چھوڑے تھے، بیسویں صدی بھی انھیں مسائل کے انبار میں دبی ہوئی تھی۔ جس نے ہندوستانی مفکروں، دانشوروں، شعراء، ادباء اور حساس ذہنوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ اس کاروانِ تعمیر عصر اور قوم و ملک میں اقبال سہیل بھی اپنی تمام علمی و فکری زرخیزی اور عملی کوششوں سے شامل رہے۔ اس بیداری میں ذوقِ عمل کا ثبوت ان کے شعری سرمائے میں جگہ جگہ دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شعور و فکر پر جب وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے تو غزل کے فارم میں اس طرح گویا ہوتے ہیں۔

غم ہے اساسِ فطرت دنیائے رنگ و بو کی — شبنم کے اشک سے ہیں تر دستیاں نمو کی
فطرت کرے گی شاید تجدید رنگ و بو کی — قربان گہہ محبت جویا ہے پھر لہو کی
اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گام زن ہو — ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طرقو کی
ہو عقل تو سبق لے دریا کے جزر و مد سے — کر جوش دل میں پیدا اگر ہے ہوس علو کی
سجدے بھی ناتواں کے ہوتے نہیں پذیرا — فریاد کون سنتا اقبال تلخ گو کی

اقبال سہیل کی شعری کاوشیں غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی وغیرہ مختلف اصناف سخن پر محیط ہیں۔ انھوں نے اوائل عمری میں ہی خداداد ذہانت اور صلاحیت سے علمی حلقوں میں مخصوص اور منفرد پہچان بنالی تھی۔ ان کے منفرد شعری آہنگ اور لب ولہجے کی خوشبو سے ایوان اردو معطر ہونے لگا تھا۔ انھوں نے اس دور میں جس انہماک اور خلوص دل سے ریاضت فن کیا اور اپنے فکر وفن کے جو نقش گلستان ادب میں قائم کیا وہ آج بھی مینارۂ نور کی طرح درخشاں ہے۔ فکر وفن کی ان بلندیوں تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

اقبال سہیل کا حسی اور ذہنی عمل کبھی کسی شعری روایت کا علمبردار نہیں بنا۔ چہ جائے کہ انھوں نے سرسید احمد خاں کے رفقا کے زیر سایہ تربیت پائی۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی وغیرہ کی مخصوص توجہ ان پر رہی۔ حالی کے پیرویٔ مغربی سے بہت قریب رہے۔ ان کے جدید میلانات سے خوب خوب فیض بھی حاصل کیا۔ جدید شاعری کی کونپلیں بھی انھیں کے دور میں نکلیں، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے بدلتے ہوئے میلانات اور رجحانات بھی دیکھے مگر افکار کی تشکیل اور تخلیقی اظہار میں اپنی مخصوص کلاسیکی روایات کو قائم اور ملحوظ خاطر رکھا۔ ان کے تخلیقی سرمائے میں ہر آن متذکرہ شعری رجحانات کی نغمگی اور آواز کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور ان کے کلام اور شعری سرمائے سے مثالیں بھی پیش کیا جاسکتی ہیں۔ یہ ان کی بے پناہ تخلیقی شعری قوت کی صناعی کا مظہر ہے کہ اس کلاسیکی جام میں اپنے وقت کے تمام شعری وادبی رجحانات اور رنگوں کو شامل کرکے مرکب نامیاتی ادب کی صورت میں ڈھال دیا۔ جس کی قرأت سے آج بھی ادب کے قاری کی تشنگی دور ہورہی ہے اور نئے فکر وشعور کا احساس بھی ہوتا ہے۔

فکر انجام سے جو قطع نظر کرتے ہیں — وہی جاں باز مہم عشق کی سر کرتے ہیں
خلش غم میں بھی ہنس ہنس کے گزر کرتے ہیں — ہم ہیں وہ پھول جو کانٹوں میں بسر کرتے ہیں
رخ ترے حیرتی حسن جدھر کرتے ہیں — اس طرف سجدے سب ارباب نظر کرتے ہیں
اڑ گئی توڑ غنچے کا قفس موج شمیم — خوگر قید ابھی ماتم پر کرتے ہیں
ہم نشیمن کو بھی روئیں تو خطا ہوتی ہے — پھونک ڈالیں وہ چمن بھی تو ہنر کرتے ہیں
جن سے تھی کشمکش غم میں رفاقت کی امید — اب وہی دیدہ و دل ہم سے حذر کرتے ہیں

اٹھ گئے جو ہر معنی کے پرکھنے والے　　　　اب سہیل آپ عبث عرض ہنر کرتے ہیں

غزل کے ان مسلسل اشعار میں جن گوناگوں انسانی مسائل کو اظہار کا موضوع بنایا گیا ہے یہ وہی مسائل ہیں جو برصغیر کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل سے اس وقت کے عوام و خواص دست و گریباں تھے جسے ادب کے مختلف فارم میں اس وقت کے تمام خارجی و داخلی، سماجی و اقتصادی، سیاسی اور عمرانی مسائل کو شعراء کی غزلوں، قصائد، نظموں اور شہرآشوبوں میں صاف صاف دیکھ سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کا نصف اول بڑا انقلابی اور پرفتن دور تھا۔ دنیا کے بیشتر ممالک اور وہاں کے عوام ایک گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ انھیں ہر لمحہ اس سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ ان کے دلوں میں کروٹیں لے رہا تھا۔ پہلی عالمی جنگ، دوسری عالمی جنگ پھر برصغیر ہند کی تقسیم، ان تمام انقلابات اور پرآشوب دور کو اقبال سہیل نے دیکھا تھا۔ ان کے سنگین نتائج کے شکار انسانیت کو تڑپتے دیکھا، اس کے گہرے اثرات ذہن و دل پر مرتسم ہوئے، جس کے سبب ان کی فکری تشکیل نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ اقبال سہیل کے اس نئے فکری رجحان کو توانائی عطا کرنے اور سوز و گداز کا مجسم پیکر بنانے میں اس وقت کے انقلابی نشیب و فراز کے اثرات کا بہت بڑا دخل ہے۔ ان مسائل اور حالات نے اقبال سہیل کی شاعری کو درد و الم کی تصویر بنادیا۔ ان کے ہاں جو سوز و گداز اور درد و کرب پایا جاتا ہے وہ صرف ان کے ذاتی غم کا ہی آئینہ نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے عہد اور حالات کی کرب ناکی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس طرح کے موضوعات کی عکاسی اقبال سہیل نے بڑی فنکاری سے کیا ہے۔

نیرنگ ہی فطرت ہے اس عالم ہستی کی　　　　اک مری ہی قسمت کیا گردش میں زمانہ ہے

☆

تاراج نشیمن کھیل سہی، صیاد مگر اتنا سن لے　　　　جب عشق کی دنیا لٹتی ہے، خود حسن کا ماتم ہوتا ہے

☆

مرغ قفس کو رنج اسیری مگر نہیں　　　　یوں نغمہ زن ہے جیسے غم بال و پر نہیں
تقسیم گل پہ بحث و عنادل میں چھڑ گئی　　　　گلزار لٹ رہا ہے کچھ اس کی خبر نہیں

☆

مسز سروجنی نائیڈو جو بذات خود ایک معروف ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ اقبال سہیل کے شعری مرتبے کی دل سے مداح تھیں۔ اکثر ان سے نئے کلام، نئے موضوعات پر فرمائش کیا کرتی تھیں اور اقبال سہیل بلا تامل خواہش کی تکمیل بھی کیا کرتے۔ ایک موقع پر مسز سروجنی نائیڈو نے اقبال سہیل سے کہا: ''سہیل صاحب! آپ نے جنگ آزادی، دور غلامی اور انگریزوں کی شاطرانہ چالوں پر تو بہت کچھ کہا لیکن آزادیٔ ہند کے بعد کی تصویر کشی یا موجودہ حالات پر بھی کچھ کہئے۔'' یہ غالباً 1948ء کی بات ہے اور مسز سروجنی نائیڈو اس وقت اتر پردیش کی گورنر تھیں۔ دوسری ملاقات پر آزادی کے بعد کی صورت حال پر مبنی غزل جب مسز سروجنی نائیڈو کو سنائی تو چشم دید حضرات کا یہ بیان ہے کہ غزل کے ہر اشعار کے ساتھ مسز نائیڈو کی آنکھوں کی نمی اور چہرے کا کرب دیکھنے کے لائق تھا جسے وہ بار بار اپنے آنچل سے چھپائے جا رہی تھیں۔ غزل ملاحظہ فرمائیں۔

مجھ سے پوچھو نہ مزاج دل ناشاد ابھی
میرے نغموں میں ہے کچھ تلخیٔ فریاد ابھی

ہے عنادل کو وہی درسِ کہن یاد ابھی
کہیں بیٹھا تو نہیں گھات میں صیاد ابھی

خود کہیں کی نہ رہی توڑ کے شیرازۂ گل
اور کیا چاہتی ہے نکہتِ برباد ابھی

فرش خاکی پہ گرا کنگرۂ عرش سے دل
اس کی قسمت میں ہے کچھ اور بھی افتاد ابھی

بجلیاں آئیں جو باہر سے وہ رخصت بھی ہوئیں
شعلہ افگن ہے مگر برقِ چمن زاد ابھی

لوٹیے خاک اس آزادیٔ گلشن کی بہار
ہے ہمارے لئے یہ جنت شداد ابھی

ابھی کچھ اور ذرا کشمکش دیر و حرم
کہ بہت عام نہیں دعوت الحاد ابھی

نخوت حسن کے ماتھے پہ شکن دوڑ گئی
عشق نے وا نہ کئے تھے لب فریاد ابھی

فکر تعمیر نشیمن ہو یہاں کس کو سہیل
ہوش گم کردہ ہیں مرغانِ نو آزاد ابھی

اقبال سہیل کی ایک سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ان کا حسی اور ذہنی عمل، شعور و ادراک کے نکتۂ موہوم، دھندلی اور بے نشان کیفیت کو جو شعری تجربے کی گرفت سے بظاہر دور نظر آتا ہے۔ ان کے حواس کے گرفت میں آتے ہی ایک شعری عمل بن جاتا ہے۔ کائنات کی مختلف وادیوں اور خلا میں پرواز کرتا ہوا ان کا ذہنی تخیل کبھی بے مہار نہیں رہتا ہے۔ ذہنی تخیل پر ان کی گرفت کافی مضبوط دکھائی دیتی ہے۔ تخلیقی قوت اظہار کی یہ خوبی ان کے یہاں صاف نظر آتی ہے۔ احساس و تاثر کی رو، اگرچہ اس پر

فوری اپنا ردِ عمل نہ پیش کریں۔ لیکن اظہار کے وقت حسی اور ذہنی عمل کی تمام قوتیں روبہ عمل دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح ان کا فکری زاویہ یہ عنصر، حقائق کی ایک انوکھی تصویر بن جاتی ہے۔ اس فکری اساس کو مزید تقویت الفاظ کے برمحل استعمال اور معنی کی رمز شناسی سے پہنچاتے ہیں۔

کہتا ہے کون سوز دروں میں اثر نہیں ۔۔۔ کیا آج قصرِ حسن بھی نذر شرر نہیں
مرغ قفس کو رنج اسیری مگر نہیں ۔۔۔ یوں نغمہ زن ہے جیسے غم بال و پر نہیں
تقسیم گل پہ بحث و عنادل میں چھڑ گئی ۔۔۔ گلزار لٹ رہا ہے کچھ اس کی خبر نہیں
لذت شناس غم کو ہے اظہار غم حرام ۔۔۔ روتا ہوں اور دامنِ مژگاں بھی تر نہیں
ہمت نے کردیا سروسامان سے بے نیاز ۔۔۔ موجِ شمیم، نازکشِ بال و پر نہیں

اسیروں میں بھی ہوجائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا ۔۔۔ ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا
کئے ہیں چاک دل سے بوئے گل نے بال و پر پیدا ۔۔۔ ہوس ہے زندگانی کی تو ذوقِ مرگ کر پیدا
یہ مشتِ خاک اگر کرلے پروبال نظر پیدا ۔۔۔ تو اوجِ لامکاں تک ہوں ہزاروں رہ گزر پیدا

معاصرین کے درمیان اقبال سہیل کی شخصیت اور ان کے تخلیقی و فکری سرمائے کی مقبولیت کے گراف پر جب نظر کرتے ہیں تو ان کا قد کافی بلند پاتے ہیں۔ جس کا اعتراف برصغیر ہند و پاک کے معروف دانشوروں کی طرف سے تحریری طور پر ہوچکا ہے۔ ان تمام تحریروں میں ایک بات قدرِ مشترک ہے وہ یہ ہے کہ اگر اقبال سہیل وکالت کے پیشے کی طرف نہیں جاتے اور وادی شعر و ادب کو اپنی خالص فکری اور عملی جولان گاہ بناتے تو شعر و ادب کی ایک نئی کائنات کے خالق ہوتے۔ بلاشبہ یہ بات درست ہے لیکن یہ ہمارا گمان ہے تاریخ شاہد ہے بہت سی شخصیتوں نے زندگی کسی اور میدان میں گزاری لیکن اپنے فکری اور علمی کوششوں سے علم کے دوسرے میدان میں بھی تاریخ ساز نقوش چھوڑے ہیں۔ قدرت ہر فرد بشر کو اس کے ذوق کے مطابق عملی میدان میں اتر کر جدوجہد کرنے کا موقع دیتی ہے۔ اس میں اس کی فطری دلچسپی اور قدرت کی منشاء کا بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اقبال سہیل جیسی منفرد شخصیتیں صرف ایک ہی وادی میں پابہ زنجیر ہو کر نہیں رہ جاتی ہیں بلکہ وہ اپنے ذوق عمل سے مختلف وادیٔ علم و ہنر میں بھی تاریخ ساز نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو اس وادی کے مخصوص علمی شخصیات کے چھوڑے ہوئے علمی

نقوش سے کہیں زیادہ باوقار اور عصری معنویت کی بے پناہ وسعت کا حامل ہوتا ہے۔ وکالت کے پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود اقبال سہیل نے اپنی فکر سے شعر و ادب کا جو سرمایہ چھوڑا ہے اس کی فی زمانہ عصری معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

بحیثیت ایک عام قاری کے میں نے اقبال سہیل کی شخصیت اور شعری سرمائے کو ان کے عہد کے پس منظر میں اور عہد حاضر کے تقاضے کے پس منظر میں مطالعہ کے بعد اپنے تاثرات کے جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ کہ اقبال سہیل کا شعری اثاثہ اور سرمایہ ماضی میں جن خصائص اور معنویت کا متحمل تھا اس سے کہیں زیادہ عہد حاضر میں معنوی تقاضے کو پورا کر رہا ہے۔

☆☆☆

افکارِ سہیل: ایک جائزہ

ڈاکٹر شباب الدین☆

علامہ اقبال سہیل کو قدرت کی فیاضیوں نے بے پناہ صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں اور انھوں نے ان صلاحیتوں کا استعمال بھی کیا لیکن عموماً عاجلانہ اور غیر استمراری، کیونکہ وہ بہت بے چین اور سیمابی طبیعت کے مالک تھے وہ چاہتے ہوئے بھی کوئی کام مستقل مزاجی، یکسوئی اور استغراق سے کرنے کی صفت سے عاری تھے۔ یوں بھی ذہین وفطین انسان کی نفسیات کسی ایک خانے میں مقید نہیں رہتی۔ چنچلتا اور چلبلا پن اس کی پہچان ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے بھی کہا ہے:

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف وخوش اندیشہ وشگفتہ دماغ

ان میں طباعی اور ذہانت تو بہت تھی لیکن ان کی غیر ارتکازی اور سکون ناآشنا طبیعت کے علاوہ ان کے پیشۂ وکالت نے بھی ان کی علمی اختراعات اور فکری جولانیوں کو پابند سلاسل کر رکھا تھا اس پر دوسری ستم ظریفی یہ ہوئی کہ انھوں نے جو کچھ کہا اس کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ بقول خود

''اگر کبھی کبھار کچھ دلی جذبات زبان قلم سے تراوش کرتے رہے تو وہ آہ نارسا کی طرح فضا میں گم ہوئے یا اشک حسرت بن کر خاک میں جذب ہو گئے۔ شرمندۂ اشاعت ہونے کی نوبت نہ آئی۔(۱)

انھیں اپنے کمالات فن کا اخفا اس قدر عزیز تھا کہ ان کے عقیدت مندوں نے جب کبھی ان کے مضامین نظم ونثر کی جمع آوری کی کوشش شروع کی اور اشاعت کی سبیل پیدا کرنی چاہی تو ان کو سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ جیسا کہ مدیر امروز کراچی نے ۸ر نومبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھا ہے ''افسوس یہ ہے

☆صدر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ

کہ اس بڑے شاعر کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا۔ انھوں نے طویل سے طویل قصائد کہے، نظمیں، بے شمار غزلیں، قطعات و رباعیات، مخمس و مسدس و ترکیب بند، غرض کیا نہیں کہا لیکن جمع کچھ بھی نہیں ہوا۔ ۴۰۔ ۴۵ برس تک ان کا مجموعۂ کلام کہیں نظر نہیں آتا تھا لیکن اس کے بعد دوستوں کے بہت اصرار پر انھوں نے اپنے کلام کو جمع کرنے کی مخالفت ترک کردی۔ (۲)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بھائی نیاز احمد صدیقی سہیل صاحب کے خاص نیاز مندوں میں تھے اور شبلی کالج اعظم گڑھ میں تدریسی خدمات انجام دے کر محمد حسن کالج جونپور کے پرنسپل ہو چکے تھے۔ سہیل صاحب کے سفر زندگی کے آخری پڑاؤ پر انھوں نے مارچ ۱۹۵۳ء میں سہیل کے فکروفن پر اہل نقد و نظر سے مضامین لکھوائے اور کلام سہیل جتنا بھی مل سکا ان سب کو ''سہیل نمبر، محمد حسن انٹر کالج میگزین'' کے نام سے ترتیب دے کر شائع کردیا۔ اس سے سہیل شناسی کو ایک نئی جہت ملی۔ یہ نمبر سہیل کی قدر و قیمت کو متعین کرنے اور ان کے فکری و فنی اکتسابات کی تفہیم و تعبیر کے لئے ان کی زندگی میں پہلی سنجیدہ علمی کوشش تھی۔ سید علی جواد زیدی نے بھی اپنے دور ارادت میں سہیل پر ایک مضمون لکھ کر ان کی زندگی ہی میں ماہنامہ نیا دور لکھنؤ میں چھاپ دیا تھا۔ وہی مضمون افکار سہیل میں بھی ص ۲۰ تا ۲۷ شامل ہے۔ سہیل اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے بیسویں صدی کے نصف اول کی ممتاز شخصیتوں میں نمایاں ہو چکے تھے لیکن اس وقت کے رسائل و جرائد میں کلام نہ چھپوانے کی وجہ سے ان کے اشعار عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھے اور عام طبقہ ان کی شاعرانہ عظمتوں سے ذرا کم ہی واقف تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے ان لفظوں میں اس پر روشنی ڈالی ہے:

''بہت دنوں سے ان کے قدردانوں کا تقاضا تھا کہ ان کے منتشر کلام کو یکجا کیا جائے مگر یہ تحریک اٹھ اٹھ کر شاعر کے لاابالی پن سے دب گئی اب ہم سب کو نیاز احمد صاحب صدیقی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے کمال انہماک اور تلاش کے بعد ان کے کلام کا یہ مجموعہ ترتیب دیا اور اہل ذوق کی نذر کیا۔'' (۳)

اس سے پہلے ایک بار اور کلام سہیل کی جمع و ترتیب کا کام شروع کیا گیا تھا جس کے بارے میں عبدالحمید اعظمی اطلاع دیتے ہیں کہ ''۱۹۳۶ء میں مولوی محمد یونس صاحب اصلاحی سنجرپوری نے بہت سا کلام قلم بند کیا۔ مرحوم نے نظر ثانی کے لئے طلب کیا اور دے دیا گیا جسے کسی صاحب نے سہیل مرحوم

کے خانہ بے تکلفاں سے غائب کردیا اور ساری محنت رائیگاں گئی۔‘‘

سہیل نے مولانا اسلم جے راج پوری کے نام اپنے خط مورخہ ۱۸؍مارچ ۱۹۴۴ء میں اسی ادبی ضیاع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’آپ کو معلوم ہے کہ میں نے زندگی بھر شعر کہے اور کبھی اشاعت کی پروا نہ کی بلکہ دوسروں کی محنت سے جمع شدہ سرمایہ کو بھی ضائع کردیا۔‘‘(۴)

سہیل نمبر محمد حسن انٹر کالج میگزین جونپور سے ایک دہائی قبل سہیل کی زندگی میں ’’موج کوثر‘‘ شائع ہوئی تھی۔ اس کی شان نزول اور مرحلۂ طباعت سے گزرنے کے بارے میں مولانا اسلم جے راج پوری کے نام اپنے محولہ بالا مکتوب میں سہیل لکھتے ہیں کہ ’’یہ نظم جو محض اپنی بچی کو ’’بر ہرہ‘‘ کی زنانہ مجلس میلاد میں پڑھنے کے لئے لکھ دی تھی اور عبدالرؤف سلمہ مالک سودیشی دکان کے اصرار پر چھپوادی، اس درجہ مقبول ہوئی کہ اب خیال ہوتا ہے کہ کم سے کم نعت و منقبت کا مجموعہ تو چھپوادوں (۵) لیکن اس مجوزہ مجموعہ کے چھپنے کی باری کبھی نہیں آئی۔ البتہ ان کی وفات کے بعد افتخار اعظمی نے ’’تابش سہیل‘‘ (مجموعۂ غزلیات) اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اور ارمغان حرم (مجموعۂ نعت و منقبت) دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ ایک طویل مدت گزرنے کے بعد ڈاکٹر عارف رفیع صاحب نے کلیات سہیل کو مرتب کر کے چھپوایا جو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کی اشاعت ثانی دارالمصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے نومبر ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر محمود الٰہی کی نگرانی میں ڈاکٹر منور انجم نے ’’اقبال سہیل حیات اور شاعری‘‘ پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے گورکھپور یونیورسٹی سے ۳؍دسمبر ۱۹۸۱ء کو پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۹۵ء میں معمولی ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کردیا۔ اس کے باوجود سہیل کے فکر و فن سے دلچسپی لینے والوں میں بجا طور سے ابھی یہ احساس باقی ہے کہ ان کی طرف جو اعتنا ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوسکا ہے۔

اقبال سہیل کا انتقال ۷؍نومبر ۱۹۵۵ء کو ہوا تو شبلی کالج اعظم گڑھ کے ارباب بست و کشاد کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے فضل و کمال کے اعتراف میں ایک نمبر شائع کیا جائے اور اس کے لئے سہیل کی نشست و برخاست اور ان کے معمولات و مشاغل کے واقف کار اہل قلم سے مضامین لکھوائے جائیں اور اس میں سہیل کی نثری تحریریں بھی شامل کی جائیں تا کہ علمی دنیا کو ان کے تفردات و خصوصیات کو سمجھنے اور سمجھانے میں سہولت پیدا ہو۔

سلسلۂ مطبوعات شبلی نیشنل کالج میگزین میں افکار سہیل مطبوعہ اگست ۱۹۵۷ء کا درجہ تیسرے

نمبر پر ہے۔ اس سلسلے کی دو کتابیں پہلے چھپ چکی ہیں جو بالترتیب یہ ہیں۔

(۲) ڈراما اینڈ ڈرامیٹکس۔ سید اعجاز الحسن

(۳) اے ہینڈ بک آف انڈین پالیٹیکس۔ ایم۔ ایم۔ زبیری

اس میگزین کے مرتب شوکت سلطان صاحب مرحوم (سابق پرنسپل) اور علی حماد عباسی صاحب مرحوم شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ ہیں۔ یہ ۲۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو علی حماد عباسی مرحوم نگران شبلی نیشنل کالج میگزین نے صفحات ۱ تا ۱۶۶، احسن پریس اعظم گڑھ اور اداریہ وصفحات ۱۶۷ تا ۲۶۶ معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپوا کر شائع کیا۔ پہلی جھلک کے زیر عنوان اداریہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے لیکن درحقیقت اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں شخصیت کی جھلکیاں کے تحت رحم علی الہاشمی کو چھوڑ کر باقی سارے مضامین سہیل مرحوم کے شام وسحر کے حاضر باشوں، ہم عصروں، دوستوں، شاگردوں اور واقف کاروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہی ہوئی باتوں کا درجۂ استناد و اعتبار بہت بلند ہے۔ صرف رحم علی الہاشمی نیشنل آرکائیوز نئی دلی کا مقالہ ''مولانا اقبال سہیل کا نظریۂ حیات، شنیدہ کے درجے میں آتا ہے کیونکہ انھوں نے خود اس کی وضاحت ان لفظوں میں کردی ہے:

''مولانا اقبال احمد خاں سہیل مرحوم کی خدمت میں مجھے شرف نیاز نہیں حاصل تھا اور کسی کے نظریۂ زندگی پر روشنی ڈالنے کے لئے محض شناسائی سے زیادہ واقفیت کی ضرورت ہے۔ ان کے شاعرانہ کلام کا بھی صرف اتنا ہی حصہ میرے پیش نظر ہے جو محمد حسن کالج میگزین کے سہیل نمبر میں شائع ہوا تھا۔'' (۶)

حصہ اول کے مضمون نگاروں میں مندرجہ ذیل ارباب قلم کے نام شامل ہیں۔

شاہ معین الدین احمد ندوی، ابو علی اعظمی، نیاز احمد صدیقی، علی جواد زیدی، محمد حنیف خاں، حافظ عبدالحمید اعظمی، رحم علی الہاشمی، افتخار اعظمی، علی حماد عباسی۔ دوسرا حصہ سہیل کے مکمل و نامکمل علمی وادبی مقالات، مکتوبات، خطبات، تبصرے اور تقریظ پر مشتمل ہے اور بڑا جاندار ہے۔

سہیل کے سبھی سوانح نگار اور صحبت یافتہ ان کی بے نیازی، شان استغنا اور لاابالی پن کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کے رشحات قلم کی جمع آوری کا مسئلہ سامنے آیا تو احساس پیدا ہوا کہ عاشق کے تار گریباں کی طرح سب وقت کی چیرہ دستیوں کی نذر ہو چکا ہے۔ اداریہ کا یہ اقتباس درس عبرت ہونے کے ساتھ مرتبین کی تلاش وجستجو اور ان کی محنتوں کی روداد کو بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے۔

"انھوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ لکھا ہمیشہ دوسروں کی فرمائش اور اکسانے پر لکھا اور مسودات کو جمع کرنا تو درکنار ان پر نظر ثانی کے لئے بھی کبھی زحمت کش خمیازہ نہ ہوئے چنانچہ ان کے مضامین کا زیادہ تر حصہ تلف ہونے سے بچ نہ سکا اور جو کچھ بچا بھی تو اس طرح کہ "عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں" یعنی اگر ان کے ایک مضمون کے چار صفحات اعظم گڑھ میں کسی ارادت مند کے پاس محفوظ تھے تو بقیہ صفحات علی گڑھ میں کسی دوسرے کے پاس تھے۔ کچھ مضامین کہیں ادھورے پڑے تھے تو کچھ لاپتہ تھے۔" (۷)

یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ ایک انتہائی باکمال انسان اور گہرے تنقیدی شعور رکھنے والے انشاپرداز کا فکری ونثری سرمایہ جو ہماری ادبی تاریخ کی متاع عزیز تھا اس کا بیشتر حصہ ضائع ہوگیا۔

افکار سہیل کا تیسرا حصہ شاعروں کی رثائی وتعزیتی نظموں اور قطعات تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں حامد حسن قادری، کرشن سہائے وحشی، یحییٰ اعظمی، امجد علی غزنوی، صبا جائسی، (ڈاکٹر کبیر احمد جائسی) اور محمد حنیف خان کے منظوم تاثرات شامل ہیں۔ افکار سہیل کے حصۂ اول میں اداریہ کے بعد ایک الگ صفحے پر رشید احمد صدیقی صاحب کی تعزیتی تحریر کا اقتباس ہے۔ اسی میں یہ جملے بھی ہیں:

"اپنے نیازمندوں میں مولانا نے جن دو چار کو تادم آخر تقریباً چالیس سال تک عزیز ومحترم رکھا ان میں ایک راقم السطور بھی تھا۔ مجھے تو جیسے وہ کسی حال میں متردد یا مایوس نہ دیکھ سکتے ہوں اور ہر طریقہ سے جو ان کے بس میں ہوتا خوش کرنے یا تسکین وتقویت پہنچانے کی کوشش کرتے۔" (۸)

افکار سہیل کے حصۂ اول "شخصیت کی جھلکیاں" کے تمام قلم کاروں نے ایسی باریک بینی اور دقت نظر سے سہیل کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے کہ ان کی سیرت، نفسیات، جودت ذہنی، قوت حافظہ، اخذ نتائج، شاعرانہ عظمت، زود گوئی، برجستگی، حاضر دماغی، بذلہ سنجی، خوش وقتی، درد قومی، ملی اضطراب، سیاسی مذاق ومزاج، تقریر وتحریر، تنقید وتبصرہ، قوت استدلال کا بے پناہ ملکہ، وسعت معلومات، علامہ شبلی ومولانا حمید الدین فراہی سے شیفتگی، بحث ونظر میں نظیر ودلیل کے لئے انھیں دونوں کے اقوال وفرمودات کی طرف مراجعت، نوحۂ غم، نغمۂ شادی، رنج وفراق، مژدۂ وصال، قہقہہ زنی، صدائے ماتم، ہر کیفیت اور ہر جذبہ کے وقت ان کی نوا سنجی، سنی وشیعہ کے معتقدات ومسلمات، افکار ونظریات، قصص وروایات، تاریخ ادیان وملل، سیاسی کشمکش، بنو عباسیہ بغداد، بنو امیہ دمشق، بنو امیہ

اندلس، فاطمین مصر، سلجوقیہ نیشاپور، داستان چنگیز وہلاکو، یورش تاتار، تاریخ وقفہ، نوابی اودھ، انداز و وکالت، طریقۂ جرح و بحث، اخلاق وشرافت، وسعت قلب ونظر، انکسار وتواضع، آزادی ضمیر، حریت فکر، غیرت وخودداری یعنی ان کی کتاب زندگی کا ہر عنوان قاری کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے وہ کہیں کتاب خواں نظر آتے ہیں تو کسی مقام پر صاحب کتاب بن جاتے ہیں۔ سہیل فہمی کے لئے افکار سہیل کی افادیت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس کا پہلا مضمون شاہ معین الدین احمد ندوی کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے ''یوم سہیل'' (۱۹۵۶ء) کے موقع پر صبر حد ضلع جونپور میں پڑھا تھا۔ شاہ صاحب، سہیل صاحب مرحوم کے خاص دوستوں اور ان کے کمالات واکتسابات کے مشاہدین میں تھے اور انھوں نے سہیل پر متعدد مضامین بھی سپرد قلم کیے تھے۔ جن میں سہیل کی ترجیحات فکری پر بڑی باریک بینی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ زیر تبصرہ مضمون میں شاہ صاحب نے سہیل کی سیرت اور ان کے علمی وادبی مقام ومرتبہ کی بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ تینوں زبانوں عربی، فارسی، اردو پر ان کی دسترس، بے پناہ قوت حافظہ، طلاقت لسانی، حدیث و فقہ، تاریخ اسلامی، سیاست وتمدن، تقریر وتحریر کی برجستگی، قلم برداشتہ انشاپردازی، ادبی نکتہ سنجی، طنز و ظرافت، حاضر جوابی، متنوع اور ہمہ گیر مذاق ومزاج، ہر موضوع اور ہر فن سے یکساں دلچسپی، تصوف سے دوری، عقیدے میں محمد بن عبدالوہاب نجدی سے بھی زیادہ سخت لیکن مشرب میں قلندرانہ انداز۔ لکھنؤ کی شاعری کو ماتمی کہہ کے اس سے اظہار بیزاری، امیر مینائی اور ذوق کے کمال فن سے انکار، لیکن داغ کے قائل، نعت ومنقبت اور قصیدے میں ان کی شاعرانہ عظمت، غزل میں سیاسی رجحانات کی شمولیت، قومی ووطنی درد، دل پر دماغ کی حکومت، جذباتیت کے مقابلے میں حقیقت کو ترجیح دینے کا رجحان، حسرت موہانی سے ہم مزاجی، ان کی قومی وملی حمیت وغیرت کا اعتراف، آزادی وطن کی تڑپ، سیاسی و انقلابی نظموں کی شعریت وادبیت ان تمام مسائل کی طرف شاہ صاحب نے معنی خیز اشارے کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر ان کی صلاحیتیں صحیح مصرف میں صرف ہوتیں تو ہندوستان کے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا لیکن یہ علم وادب کی بدقسمتی ہے کہ جو شخص علمی کاموں کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس کی ساری صلاحیتیں وکالت کے پیشہ کی نذر ہو گئیں اور اردو زبان ایک بڑے ادیب کے جواہر پاروں سے محروم رہ گئی۔'' (۹)

مولوی عبدالباری نے جو ابوعلی اعظمی اور کبھی ابوعلی اثری کی کنیت سے قرطاس وقلم کے رشتے کو معنویت دیتے تھے اور مضامین میں اپنی شان انشاپردازی کا اظہار بہت سلیقے سے کرتے تھے تقریباً وہی باتیں کہی ہیں جو شاہ صاحب کے خطبۂ صدارت میں بیان ہوئی ہیں۔ لیکن ابوعلی اعظمی کی تحریر میں اردوئے معلیٰ کی جو چاشنی ہے اس نے اس حکایت کو لذیذ تر بنانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اس کے علاوہ ابوعلی نے سہیل کے انداز نقد ونظر پر بھی دلچسپ اور فکرانگیز توجہ کرکے سہیل کے ناقدانہ شعور کو نمایاں کیا ہے۔ اسی بحث میں انھوں نے غالب و ذوق کی سہرا گوئی کے امتیازات وخصوصیات کے حوالے سے سہیل کے نقطۂ نظر کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے اور ذوق پر غالب کو ترجیح دینے میں اپنے وحید عصر اقبال سہیل کی تائید کی ہے۔

محمد حنیف خاں نے اقبال سہیل کی بدیہہ گوئی اور مزاح نگاری کو موضوع بناکر بڑے تحیر افزا اور دلچسپ انکشافات کیے ہیں اور سہیل کی شعر گوئی کے ایک نئے پہلو سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ انھوں نے ماحصل کے طور پر یہ لکھا ہے کہ ''ان کی شاعری کا کمال ان کی طنزیہ شاعری میں بدرجۂ اتم محسوس ہوتا ہے۔ ان کی طنزیہ شاعری ایک راز ہے جو عیاں بھی ہے اور پوشیدہ بھی۔ اس میں بجلی جیسی آمد وروانی بھی ہے اور اس کی جراحت بھی۔ کلام میں زبان کی خوبی بھی ہے برجستگی اور تازگی بھی۔''(۱۰)

حافظ عبدالحمید اعظمی نے سہیل صاحب مرحوم کے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ اس سے سہیل کے شعری پس منظر کی وضاحت بڑی خوبی سے ہوتی ہے۔ عبدالحمید نے ان واقعات وکوائف کے بیان سے سروکار رکھا ہے جن سے شاعر کی شخصیت اور اس کے فن کی تفہیم میں آسانیاں پیدا ہوں۔ انھوں نے مضمون کی تمہید میں وضاحت کی ہے کہ ''شاعر کی شخصیت خاندانی، تعلیمی اور ملی حالات اور موثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سہیل مرحوم کی ادبی شخصیت کے بہت سے گوشے ہیں لیکن یہاں ان کا احاطہ کرنا میرے مضمون کا مقصد نہیں ہے بلکہ مجملاً اس مضمون میں صرف ان کے حالات زندگی بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ممکن ہے اس سے ان ناقدین کو فائدہ ہو جو شاعر کی شخصیت کو حالات سے الگ کرکے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔

حافظ عبدالحمید اعظمی نے سہیل کا سال پیدائش ۱۸۸۴ء غلط درج کیا ہے۔ ڈاکٹر منور انجم نے اقبال سہیل، حیات اور شاعری میں ص ۲۶ پر سہیل صاحب کی صاجزادی مسلمہ خاتون سابق پرنسپل

نسواں انٹر کالج پہاڑ پور اعظم گڑھ کی ڈائری کے حوالے سے لکھا ہے کہ افتخار اعظمی کی روایت اار ربیع الآخر ۱۳۰۳ھ صحیح ہے۔ اس حساب سے تقویم تاریخی، قاموس تاریخی مرتبہ عبدالقدوس ہاشمی، مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کراچی پاکستان مطبوعہ مئی ۱۹۵۶ء، ص ۳۲۶ و تقویم ہجری وعیسوی مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی مطبوعہ ۱۹۴۹ء، ص ۷۶ سے انگریزی تاریخ ۱۷ر جنوری ۱۸۸۶ء قرار پاتی ہے۔

افتخار اعظمی کی سہیل مرحوم سے دور کی رشتہ داری تھی، اس تعلق سے انھیں سہیل کے حالات و کلام سے خاص شغف تھا۔ تابش سہیل اور ارمغان حرم کو مرتب کیا اور اپنے مقدمہ کی شمولیت سے چھپوایا جس سے سہیل جیسے قادر الکلام شاعر کے نتائج افکار نئی نسل کو منتقل کرنے میں آسانی ہوئی۔ ان کا مضمون سہیل اور ان کا ماحول خاصے کی چیز ہے۔ اس سے اقبال سہیل کی شعری اساس کی تلاش میں خاص مدد ملتی ہے۔ اقبال سہیل کی قومی و وطنی، ملی و دینی اور سیاسی وسماجی شاعری کا پس منظر اس سے روشن ہوتا ہے اور اس کی نشان دہی ہوتی ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری کیوں ان عناصر سے خالی ہے جن کو رومانیت، حسن پرستی، تغزل اور جذباتیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے لکھنؤ کی غزل گوئی اچھی خاصی بدنام ہوئی۔ سہیل کے کلام میں ان کے غیور اجداد کی وراثت، خاندانی روایت، اسلاف کی نجابت و شرافت، خانوادے کی غیرت و حمیت، والدین کی فارسی دانی، علمی لیاقت و حذاقت اور بہترین تعلیم و تربیت کی جڑیں بہت گہرائی میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس مضمون سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کی ذہنی تشکیل اور شخصیت سازی میں ان کے والد عزیز اللہ خاں، والدہ محترمہ ام کلثوم، مولانا محمد شفیع بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کی تعلیم و تربیت اور فیضان نظر کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

افتخار اعظمی صاحب نے سہیل کی تحریر کا ایک اقتباس دیا ہے، جس سے سہیل کی غزلیہ شاعری کے رنگ و آہنگ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتذال و سوقیت، عریانیت و رکاکت، بازاری لہجے اور شہوانی جذبات و خیالات سے ان کے انحراف و گریز کی جڑیں کہاں ہیں۔ عبارت یہ ہے۔

”اکثر مشاعروں کا انعقاد ہوتا جس میں شرکت لازمی تھی۔ سامعین اور شعراء سب معمر ہوتے

اس لئے اپنی غزلوں میں ان مضامین سے جن کو ایوان تغزل کا نقش ونگار سمجھا جاتا ہے اجتناب ضروری تھا۔ میں نے جس قدیم مشرقی تہذیب کے دامن میں پرورش پائی وہاں ایسے خیالات کا اظہار جو معاملات حسن وعشق کے متعلق دور کا بھی اشارہ کرتے ہوں اخلاقی معصیت متصور ہوتا تھا۔ اس لئے مشاعروں میں معنی بندی اور حسن عبارت کے سوا اور کوئی دوسری صورت نہ تھی۔“(۱۱)

علی حماد عباسی مرحوم نے اپنے مضمون میں منجملہ اور باتوں کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سہیل مرحوم قدیم تہذیب کے پروردہ اور قدیم طرز سخن کے دلدادہ تھے۔ انھیں ترقی پسندوں کی شاعری میں زبان کی خامی نظر آتی تھی اور خیال وفکر میں سطحیت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن بعد میں وہ جدید ادب اور ترقی پسندوں سے کچھ ذہنی قرب محسوس کرنے لگے تھے۔ علی حماد صاحب نے ان کی تنقیدی صلاحیتوں اور حسن تعبیر وتشریح کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”ان کی گفتگو سن کر ادب العالیہ کے بہت سے تاریک گوشے روز روشن کی طرح منور ہو جاتے۔ اساتذہ کے مشکل اشعار کو اس طرح معنی پنھاتے تھے کہ الفاظ ومعانی کی ساری گتھیاں دیکھتے دیکھتے کھل جاتیں۔“(۱۲)

افکار سہیل کا دوسرا حصہ اس میگزین کی جان ہے کیوں کہ اسی کے دامن میں سہیل کے افکار کی تمام تر جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔ اس میں ان کے تنقیدی شعور کی چاندنی بھی ہے اور زبان وبیان پر ان کے خیالات کی رنگینی و بوقلمونی بھی۔ تخلیق کے نہاں گوشوں اور فن پاروں کی پوشیدہ جہتوں کو اردوئے معلی کے چمکتے اور چہکتے ہوئے لفظوں، جملوں، استعاروں اور ترکیبوں نے جگمگا دیا ہے۔ ان کی وجہ سے سہیل کے تنقیدی آثار ونقوش کی اپنی ایک الگ پہچان اور اہمیت ہوگئی ہے۔ سہیل کی تنقید کو ہم تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کا نام دینے کا حق رکھتے ہیں کیونکہ اس میں انشائیہ کی شان جلوہ گر ہے اور باتوں سے باتیں پیدا کرنے کا ہنر بھی پوشیدہ ہے۔ سہیل کے مضامین میں نظریاتی تنقید اور عملی تنقید دونوں قسم کے نمونے ملتے ہیں۔ وہ اپنی عملی تنقید میں تقابلی مطالعہ کے نتائج بھی سامنے لاتے ہیں۔ اس لئے اس کا ایک طریقہ تقابلی تنقید ہے۔ اس حصے میں آثار ونقوش کے تحت سہیل کے تین مقالے (۱) شبلی کی جامعیت (۲) داستان تاریخ اردو اور مشرقی یوپی کے کچھ اہل قلم (۳) علامہ شبلی کے مکتوبات۔ مطالعے اور جائزے کے تحت نشاط روح (اصغر گونڈوی) جلوۂ صد رنگ (حبیب احمد صدیقی) خرمن عشق

(شفیق جونپوری) گنجینۂ تحقیق (بے خود موہانی) حدیث حسن (فطرت واسطی) نغمۂ دل (دل شاہ جہاں پوری) پر تبصرے، مقدمے اور تقریظیں ہیں۔ مکتوبات کے تحت سلام سا گری، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا وحید الدین خاں اور مدیر ادیب دہلی کے نام خطوط ہیں۔ خطبات کے تحت مشاعرہ آئینہ ادب کانپور منعقدہ ۱۹۴۴ء، مشاعرۂ مدح صحابہ لکھنؤ منعقدہ ۱۹۴۲ء مشاعرۂ مدح صحابہ لکھنؤ منعقدہ ۱۹۴۴ء کے خطبہ صدارت ہیں اور آخر میں متفرقات کے تحت ان کا ایک مقالہ اسلام اور اعلیٰ انسانی اقدار کا تحفظ، اردو ادب کیوں کر ترقی کر سکتا ہے؟ جدید وقدیم ادب اور تعارف نوائے حیات (یحییٰ اعظمی) ہے۔ اس حصہ دوم میں شبلی کی جامعیت سہیل کا پہلا مقالہ ہے۔ دراصل یہ ان کا لکھا ہوا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے یوم شبلی منعقدہ ۱۸؍نومبر ۱۹۴۴ء کی تقریب میں پڑھا تھا اور شبلی نیشنل کالج میگزین ۱۹۵۶ء میں نمایاں طور سے چھاپا گیا تھا۔ یہ مقالہ ان کی ذہانت وطباعی اور تنقیدی شعور کا بہترین نمونہ ہے۔ اس مقالہ سے ان نقوش کا بھی پتہ چلتا ہے جو علامہ شبلی کی جامع صفات شخصیت کے فیض صحبت اور ان کے خرمن علم وادب کی خوشہ چینی سے سہیل کی لوح قلب ودماغ پر مرتسم ہوئے تھے۔

سہیل نے اپنے خاص اسلوب میں شبلی کی جامعیت کو چند تمہیدی جملوں میں سمیٹ کر یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ''استاذ الامام علامہ شبلی نعمانی کی ذات گرامی درحقیقت ایک ایسی منفرد ممتاز اور یگانہ عصر شخصیت تھی جس کی مثال گزشتہ ایک صدی کے اندر تمام عالم اسلامی میں بہ مشکل مل سکے گی اور جس کی صرف دو انگلیوں سے بلکہ ہر بُن مو سے علم وہدایت کی وہ کرن پھوٹی ہے اور فضل وکمال کی وہ موجیں جاری ہوئیں ہیں جو آئندہ ہزاروں برس تک شبستان انسانیت کو چراغاں اور نزہت گاہ علم وادب کو گل بداماں رکھیں گی۔'' (۱۳)

اس کے بعد انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ رفتار وقت کے ساتھ علوم وفنون میں بھی شاخ وبرگ پیدا ہوتے جاتے ہیں اور ان میں جتنا ہی اضافہ ہوتا ہے کسی کو حصول کمال میں اتنی ہی دشواری پیش آتی ہے۔ ایسے اشخاص جو اردو، عربی، فارسی نظم ونثر اور علوم وفنون کے گوناگوں شعبوں پر حاوی ہونے کے ساتھ محاسن اخلاق کی معراج کمال پر بھی فائز ہوں کم ہوتے ہیں لیکن شبلی کو توفیق ازل نے معراج انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچا دیا تھا۔

پھر انھوں نے شبلی کی جامعیت پر ان لفظوں میں گل افشانی کی ہے۔

"حد سے زیادہ خوددار بھی اور غیر معمولی طور پر متوازن اور خاکسار بھی۔ اظہار میں بے باکی بھی اور انداز بیان میں محتاط بھی۔ اپنے عقائد میں متشدد بھی اور دوسرے کے ساتھ وسیع المشرب بھی۔ جمالیات کے نکتہ شناس بھی اور مدعیان تقویٰ سے زیادہ پاکباز بھی۔ خم خانۂ کہن کے ساقی بھی اور بادۂ نو کے جرعہ کش بھی۔ اکابر اسلاف کے رتبہ شناس بھی اور کورانہ تقلید سے بیزار بھی۔ اسرار شریعت کا پردہ کشا بھی اور معاملات دنیاوی کا نباض بھی اور جس کے قلم کا ہر رقص اور جس کی زبان کی ہر جنبش ایک مستقل نغمۂ رنگیں ہو مگر جس کا تقویٰ بزم چنگ و رباب تو کیا مجلس حال وقال تک جانے کی اجازت نہ دے۔" (۱۴)

یہ سب کہنے کے بعد اس مجلس میں شبلی کی فقہی وکلامی نکتہ سنجیوں کے ذکر اور ان فنون کے اساطین سے موازنہ کو بے محل قرار دیتے ہوئے ایرانی شاعروں سے مولانا کی فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ پھر اردو نثر کے سرمائے کی طرف گریز کرتے ہوئے عہد شبلی کی نثر نگاری کا تجزیہ و موازنہ دقتِ نظری سے پیش کیا ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، سرسید، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے اسلوب نگارش کے مقابلے میں نثر شبلی کے تنوع، کثرت مضامین اور جامعیت کی طرف یوں اشارے کیے ہیں۔

"علامہ شبلی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آزاد کی رنگین نوائی، سرسید کی ترتیب بیان، حالی کی متانت، ڈپٹی نذیر احمد کی شوخیِ ادا، کو لے کر اپنی طرف سے فلسفیانہ موشگافی، زور استدلال، شکوہ بیان تصنیفات کا کمال، انشا کا اعجاز بنا دیا۔" (۱۵)

اس سلسلے میں مثنوی مولانا روم، شاہنامہ فردوسی، شعر العجم اور سیرت النبی کے ایک صفحے کے ظہور قدسی اور تہذیب کی ایک سطر کے محاسن، متکلمانہ مباحث، ادبی تاثیر وادبیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ اردو کی متین تحریروں میں لطیف طنزیات کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ یہ چیز پہلے پہل شبلی نے پیدا کی۔

نثر شبلی کے بعد شعر شبلی کی اولیات وترجیحات، واقعاتی جزئیات، سیاسی مسائل ومباحث اور مذہبی ادراک پر گفتگو کرتے ہوئے قومی ووطنی نظموں میں حالی کو شبلی کا شریک وسہیل بتایا ہے، مگر انھوں

نے اپنے تنقیدی شعور کی مدد سے یہ دلچسپ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ:

''مولانا حالی کی نظموں میں قنوطیت اور مایوسی اس درجہ غالب ہے کہ ان کی افادیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ مولانا حالی کی اردو نظمیں زیادہ سے زیادہ بہترین اور فصیح ترین قومی نوحے ہیں۔ رجز نہیں کہ قوم کے نوجوانوں میں روح عمل بیدار کر سکے۔'' (۱۶)

اس کے بعد انھوں نے ایک اہم پہلو کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ:

''ان (شبلی) کا قلم رقص کا خوگر ہے اور ان کے نغمات جوش و سرمستی سے معمور، انتہائی غم میں بھی ان پر مایوسی طاری نہیں ہوتی اور کلو فارم بھی ان کے دل و دماغ کو معطل نہیں کر سکتا۔ ان کی سب سے درد انگیز نظم جنگ بلقان پر ہے مگر اس میں بھی تحریک عمل کا پہلو نظر انداز نہیں ہوتا۔'' (۱۷)

اقبال سہیل نے بعض معاندین شبلی کا یہ جملہ بھی نقل کیا ہے کہ:

''بعض کوتاہ نظر کہتے ہیں کہ مولانا مرحوم محض ایک بلند پایہ مورخ تھے دوسرے علوم میں ان کو درجۂ کمال حاصل نہ تھا۔'' (۱۸)

سہیل نے علامہ مرحوم کی تصانیف مثلاً جرجی زیدان کی ''تاریخ التمدن الاسلامی'' کے جواب میں الانتقاد، سیرۃ النعمان اور اسکات المعتدی کے حوالے سے اس نظریے کی بہت اچھے اسلوب میں تردید کی ہے اور بعض واقعات وحالات کی طرف متوجہ کر کے شبلی کی علمی عبقریت کو نشان زد کیا ہے۔

حامد حسن قادری کی مقبول ومتداول کتاب ''داستان تاریخ اردو'' شائع ہوئی تو اردو دانوں میں اس کو کافی پذیرائی ملی۔ اقبال سہیل نے بھی اس کی بڑی تحسین فرمائی اور کھلے دل سے یہ اعتراف کیا کہ اردو میں اب تک ایسی جامع، مرتب اور ناقدانہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ لیکن اس اقرار کے ساتھ کہ ایسی کتاب میں کچھ کمیاں رہ سکتی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ''تالیف کی جامعیت متقاضی تھی کہ پورب کے چند مشاہیر ادب نظر انداز نہ کیے جاتے۔''

اقبال سہیل نے خدمت اردو کے تعلق سے اپنے مضمون داستان تاریخ اردو اور یوپی کے مشرقی اضلاع کے کچھ اہل قلم میں مولانا سخاوت علی فاروقی جونپوری، مولوی کرامت علی جونپوری، مولانا لطف اللہ غازی پوری، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی، مولانا احسان اللہ عباسی گورکھپوری، مولوی وکیل احمد سکندر پوری، مولوی عبدالغفور فاروقی محمد آبادی، مہدی حسن افادی گورکھپوری، راسخ عظیم آبادی، مولانا

عبدالحمید عظیم آبادی، میر علی محمد شاد، نواب سید محمد آزاد، پروفیسر شہباز، نواب نصیر حسین خاں خیال، مولوی عبدالرزاق کانپوری، مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، سجاد حیدر یلدرم، سید محفوظ علی نقاش بدایونی، مولانا سید عبدالحیٔ لکھنوی، نواب صدیق حسن خان، خلیفہ محمد حسین، مولانا محمد قاسم دیوبندی اور مولوی عبدالحق حقانی کا تذکرہ نہ کرنے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔

یہ مقالہ صفحہ ۸۵ سے ۱۰۲ تک پھیلا ہوا ہے لیکن نامکمل ہے۔ اگر مرتبین کو مکمل صورت میں دستیاب ہو کر افکار سہیل میں چھپ گیا ہوتا تو اس کی تحقیقی حیثیت اور روشن ہوگئی ہوتی۔ پھر بھی یہ بہت بھرپور اور سہیل کے علم وخبر کی وسعت نیز ان کی تحقیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔

سہیل کے تمام واقف کاروں نے اُن کے حافظہ کے قوی ہونے کا اعتراف وتذکرہ کیا ہے۔ سید علی جواد زیدی (جنہوں نے سہیل سے وکالت میں ٹریننگ لی تھی) مولوی عبدالباری (ابوعلی اثری اعظمی) شاہ معین الدین احمد ندوی، نیاز احمد صدیقی، افتخار اعظمی، علی حماد عباسی کے مضامین اس کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

سہیل کی یادداشت کے تعلق سے شاہ معین الدین احمد ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا ہے کہ:

''ان کی قوت حافظہ کا حال یہ تھا کہ ان کے کان میں ایک مرتبہ جو بات پڑ جاتی تھی یا جو چیز ایک مرتبہ نگاہ سے گزر جاتی تھی وہ ہمیشہ کے لئے ان کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی تھی۔'' (۱۹)

یا ان کا یہ فرمانا کہ:

''وکالت کی مشغولیتوں سے مطالعہ کا موقع بھی نہ ملتا تھا اس کے باوجود انھوں نے نصف صدی پہلے جو کچھ پڑھا تھا وہ سب ان کے حافظہ میں محفوظ تھا۔'' (۲۰)

''داستان تاریخ اردو اور یوپی کے مشرقی اضلاع کے کچھ اہل قلم'' والے مضمون سے سہیل کی بے پناہ قوت حافظہ کی شہادت ملتی ہے اور شاہ صاحب کی تحریر کی ثقاہت وصداقت کی بھی تائید ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے بھی آگاہی ہوتی ہے کہ اقبال سہیل اچھی کتابوں کے مطالعے سے یکسر لاتعلق نہیں تھے۔ اچھی کتابیں ان کے بھی دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی تھیں اور پڑھنے کے بعد ان پر وہ اپنی رائے بھی قائم کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے تاثرات کو تحریری شکل دینے سے عموماً گریز کرتے

تھے۔ ان کے مطالعۂ کتب کا ثبوت زیر بحث اسی مضمون کی اس عبارت سے ملتا ہے کہ:

''نواب نصیر حسین خان خیال کی تالیف داستان اردو ابھی پوری نہیں چھپی، صرف ایک حصہ ''مغل اور اردو'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔'' (۲۱)

سہیل ذوق مطالعہ نہ رکھتے تو نصیر حسین خان خیال کی کتاب کے نام اور اس کے مشمولات سے ناواقف محض رہتے اور اس کا حوالہ نہ دیتے۔ اسی طرح انھوں نے مولانا لطف اللہ غازی پوری کی تفسیر سورۂ فاتحہ مظہر العجائب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''میرے پاس جو قدیم مطبوعہ نسخہ تھا وہ غالباً کسی قدر شناس کے ہاتھ پڑ گیا ورنہ میں اس موقع پر اس کے کچھ اقتباسات پیش کرتا۔'' (۲۲)

سہیل کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ لفظوں یا جملوں کی تکرار سے عموماً اجتناب فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ عبارت کی یکسانیت سے بھی اپنی تحریروں کو دور رکھتے تھے۔ ان کے پاس الفاظ کی کمی نہیں تھی۔ اس لئے وہ مختلف پیرایہ بیان میں اپنے خیالات و افکار کا اظہار کرتے تھے۔ اس مضمون میں بھی ان کا یہ جوہر کھل کر اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔ چند مقامات کی جستہ جستہ عبارت سے اس کی تصدیق ہو جائے گی۔

۱۔ ''حضرت مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے رفقائے کار اور مولانا سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور خلفا سخاوت علی فاروقی اور مولانا کرامت علی مرحومین جو جونپور کے اکابر علماء و مشائخ میں سے تھے، بحیثیت خادم اردو علمائے خیر آباد سے کسی طرح فروتر نہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ خدمت ادب ان بزرگوں کا مقصد نہ تھا بلکہ ان کے تمام مساعی کا محور، ہدایت خلق اور اشاعت حق تھا۔

۲۔ سرسید کے ہم عصر بلکہ استاد اور تحقیقات علمی میں ان کے خضر راہ مولانا عنایت رسول چریا کوٹی مرحوم تھے جو اپنے وقت کے بحر العلوم اور بڑے پایہ کے مصنف تھے۔ سرسید کی خطبات احمدیہ کا بیشتر حصہ دراصل مولانا عنایت رسول کی بے مثل تصنیف بشریٰ سے ماخوذ ہے۔

۳۔ یہی نہیں اضلاع مغربی کے بھی چند قابل ذکر ادیب نذر طاق نسیاں ہو گئے ہیں۔

۴۔ مغرب و مشرق کا نقطۂ اتصال اودھ ہے مگر یہاں بھی ایک قابل ذکر ادیب کے تذکرہ سے تغافل کیا گیا ہے۔

ان مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ اقبال سہیل کے یہاں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے تعبیر اور لسانی اجتہادات کی کمی نہیں تھی۔ وہ اپنے مانی الضمیر کو لفظوں کی پوری جمالیت کے ساتھ تخلیقی رنگ میں بیان کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔ وہ ملتے جلتے خیالات اور یکساں واقعات کو بیان کرنے کے لئے نئے نئے پیرایہ بیان اختیار کیا کرتے تھے۔

شاہ معین الدین احمد ندوی، سہیل مرحوم کے کمالات علم وفضل اور جوہر انشاپردازی کے عینی شاہد تھے۔ انھوں نے رقم فرمایا ہے کہ

''(سہیل) انشاپرداز بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ جیسی تحریر وہ قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے ویسی بڑے بڑے کہنہ مشق صاحب قلم غور وفکر کے بعد بھی مشکل سے لکھ سکتے ہیں۔'' (۲۳)

سہیل کی تحریروں میں طنز وتعریض اور ظرافت ومزاح کا بہت اونچا معیار ملتا ہے۔ زیر تبصرہ مقالہ کے بیشتر مقامات ادیبانہ شوخی اور لطیف طنزیات کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ ''ممکن ہے کہ افق مشرق کے ان ستارہ ہائے سحری کی شعاعیں دیار مغرب تک نہ پہنچ سکی ہوں مگر کیا اردو کا کوئی ذوق آشنا گورکھپور کے مایہ ناز ادیب مہدی حسن افادی الاقتصادی سے بھی بے خبر رہ سکتا ہے؟'' (۲۴)

۲۔ ''ان حالات میں داستان تاریخ اردو کا اس بلبل ہزار داستان کے نغموں سے خالی ہونا یا تو اس وجہ سے ہے کہ مرحوم اضلاع مشرقی کے باشندے تھے یا شاید ان کو بیسویں صدی کے ادیبوں میں شمار کر لیا گیا ہے۔'' (۲۵)

۳۔ خود اپنے صوبہ کے اندر پورب والوں سے جب یہ بے اعتنائی برتی گئی ہے تو بہار و بنگال کے مصنفین اور ادبا...... اگر اس داستان اردو میں فراموش کر دیئے گئے ہیں تو شکوہ کا کیا محل ہے؟ (۲۶)

سہیل نے حامد حسن قادری کے مسامحات کی طرف جس انداز میں نشان دہی فرمائی ہے اور جس خوبی سے تصنیفات ومصنفین کا تعارف کرایا ہے اس سے ان کے ذوق نقد ونظر اور معیار تجزیہ ومحاکمہ کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ زیر بحث مضمون میں مؤلف کی فردگزاشتوں اور کمیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد علامہ شبلی کے حادثۂ شکست پا اور عطیہ فیضی کی ایک یہودی مصور کے ساتھ شادی کے تعلق سے قطعات سہیل کے بارے میں حامد حسن قادری سے جو تسامح ہو گیا ہے اس کے ازالے کے لئے

طویل گفتگو چھیڑی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ واقعات اس زمانے کے ہیں جب نہ خطوط شبلی کی اشاعت ہوئی تھی اور نہ مولوی عبدالحق اور ان کے حواریوں کو اس کا موقع تھا کہ ان خطوط کے پردے میں اپنے دل کا کانٹا قلم کی زبان سے نکالتے۔

اسی سلسلۂ کلام میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور خواجہ غلام الثقلین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس بحث میں ان وجوہات کی بھی تلاش کی گئی ہے جن کے زیر اثر ایک رام کہانی گڑھی گئی ہے۔ پھر ساری بحث علامہ شبلی کے فکر وفن اور ان کی شخصیت وسیرت کے مختلف گوشوں اور نظریات وعقائد کے گرد گھومنے لگتی ہے اس میں سہیل کی وکالت کے طرز استدلال اور اخذ نتائج کے انداز واسلوب کی ساری نکتہ سنجیاں یکجا ہوگئی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جذبات کا ایک طوفان ہے جو سارے بند توڑ چکا ہے۔

''علامہ شبلی کے مکاتیب'' ایک اہم مضمون ہے لیکن یہ بھی نامکمل شائع ہوا ہے۔ اس سے شبلی کی مکتوب نگاری کی خصوصیات کا علم ہوتا ہے۔ انھوں نے ابتدا ہی میں لکھا ہے کہ

''استاذ الامام علامہ شبلی نعمانی کے مکاتیب غالب کے خطوط کی طرح محض تفریح طبع یا مکالمہ کی غرض سے نہ تو لکھے گئے اور نہ اس حیثیت سے ان پر نگاہ ڈالی جاسکتی ہے۔ ان کے خطوط زیادہ سے زیادہ محض ان کی بیاگرفی یا سوانح حیات کا سامان ضرور فراہم کرتے ہیں اور جو نظریات، علمی مباحث یا عملی مسائل میں ان کے نصب العین تھے، ان کے خطوط سے کافی طور پر واضح ہوجاتے ہیں اور مختلف ادوار میں ان کی رائیں قومی اور ملی مسائل میں کیا تھیں وہ بھی انھیں خطوط سے کافی طور پر پیش نظر ہوجاتی ہیں۔'' (۲۷)

یہ پورا مضمون اسی تمہیدی اجمال کی تفصیل ہے۔ شبلی ابتدائی ایام میں فارسی میں خطوط لکھتے تھے۔ ان کے چند مکتوب عربی میں بھی ہیں۔ انھوں نے بعد میں اردو میں لکھنا شروع کیا۔ وہ اشعار کے حافظ تھے مگر خطوط میں نہیں لکھتے تھے۔ القاب وآداب میں اختصار پسند خاطر تھا۔ ان کے خطوط میں کوئی نہ کوئی قومی وملی بے چینی، فلاح وبہبود کی منصوبہ بندی، کسی علمی مسئلہ کی گرہ کشائی یا غلط تعبیرات کی تردید ہوتی تھی جو کچھ دل میں ہوتا وہی زبان سے نکلتا۔ کوئی پردہ داری نہیں تھی وہ مکتوب الیہ کے مزاج ومذاق اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق خطوط لکھتے تھے۔

اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی دو ایسے شاعر ہیں جن کی شاعرانہ عظمتوں اور فن کارانہ معجز بیانیوں کو سب سے پہلے اعظم گڑھ نے پہچانا اور پوری اردو دنیا کو ان کی طرف متوجہ کیا۔ سہیل نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں نشاطِ روح پر جو مقدمہ بصورت تبصرہ لکھا ہے وہ ان کی بلند ذوقی اور نگاہِ نقد کی اعلیٰ صلاحیت کا اشاریہ ہے۔

اقبال سہیل کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے عموماً فارسی اشعار کی مدد لیتے ہیں۔ نشاطِ روح پر بھی اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے اپنی باتوں کے استحکام کے لئے فارسی اشعار کو بنیاد بنایا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بچپن میں ان کی تربیت ذہنی جس علمی و ادبی ماحول میں ہوئی اور علامہ شبلی کے فیضِ صحبت سے جو وسعتِ فکر و نظر ملی وہ پوری عمر اس جوہر سے کام لیتے رہے۔

وہ اپنی بات کو مختلف پیرایۂ بیان میں پیش کرنے کے عادی ہیں۔ ان کی معذرت خواہی بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ وہ کوئی خیال پیش کرتے کرتے بیچ میں کوئی نکتہ پیدا کر کے یا حسنِ تعلیل سے کوئی تاویل کر کے اپنی بات کو بڑی خوبی سے پلٹ دینے کے بھی ماہر ہیں۔ جو اس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ ان کے پیشۂ وکالت نے انھیں یہ دولت شعوری ہے کچھ تو ان کی طباعی و ذہانت اور کچھ ان کے تنقیدی و تخلیقی شعور کے اشتراک و اتحاد نے ان کے کمال کو نکھارا ہے۔ جس میں شبلی کے فیضِ بساط نشینی کا بھی وافر حصہ ہے۔ اس تبصرہ کی تمہید میں بھی ان کی لفظی الٹ پلٹ کا یہ انداز و اسلوب موجود ہے ملاحظہ ہو:

''نقد و تبصرہ اور وہ بھی فنونِ لطیفہ کے متعلق بجائے خود صحتِ ذوق کے علاوہ بہت کچھ دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات کا محتاج ہے۔'' (۲۸)

اس کے بعد وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ کسی کلاسکی نمونہ ادب سے متاثر ہونا اور پھر اس تاثراتی کیفیت و وجدان کو بیان کرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ''بہت ممکن ہے کہ ایک نغمۂ دلکش میری روح پر رقصِ پیہم کی کیفیت پیدا کر دے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس نغمہ کی تاثیر اور میری روح کی تاثیر میں جو ربطِ معنوی ہے اس پر میں حکیمانہ اور فلسفیانہ نظر بھی رکھتا ہوں یا اس کے مخفی اسباب و علل کو الفاظ میں ظاہر کرنے پر بھی قادر ہوں۔'' (۲۹)

ان کا یہ اعتذار واشتباہ اس بنیاد پر ہے کہ وہ شاعری اور فنون لطیفہ کی جمالیاتی قدروں اور اس سے انسانی طبیعت میں ابھرنے والی اہتزازی لہروں کو ماورائے سخن سمجھتے ہیں اور اس کی کیفیت وتاثیر کو ماورائے لفظ وبیاں اس لئے خیال کرتے ہیں کہ وہ حسن مجرد کی تصویر کشی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''شاعری حقیقت میں حسن مجرد کی اس مصوری کو کہتے ہیں جس میں لطیف موسیقی بھی شامل ہو اور جب آج تک حسن مصوی کی تمام اداؤں اور نغمۂ مادی کی تمام کیفیات کے لئے زبان میں الفاظ نہیں ملتے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ

بسیار شیوہ ہاست بتاں کہ نام نیست

(حسینوں کی ہزاروں ایسی ادائیں ہیں کہ ان کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکا)

تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حسن معنوی اور نغمۂ روحانی یعنی شاعری جیسی ذوقی اور وجدانی چیز کی نسبت ہماری کیفیات نفسی کی تعبیر الفاظ میں کی جا سکے۔'' (۳۰)

سہیل صاحب اپنی بے بصیرتی وبے بضاعتی کے عذر واعتراف کے باوجود اس تبصرہ کو صرف نذر گزاری اور خلوص تہدیہ کا نام دیتے ہوئے اپنے خیال کے اظہار پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نفس شاعری پر اپنے زاویۂ نگاہ کا اجمالی طور پر ذکر کرتے ہیں۔ جس کا لب لباب یہ ہے۔

۱۔ فنون لطیفہ کی چہارگانہ تقسیم میں شاعری تمام اقسام کی جامع محاسن ہے۔

۲۔ اس کے علاوہ اس میں حقائق ومعارف اور اسرار وحکم کی غیر فانی دنیا بھی شامل ہے۔

۳۔ مصور صرف انھیں نفسی کیفیات کی تصویر کھینچ سکتا ہے جن کا اظہار جسمانی عوارض سے ممکن ہے۔

۴۔ بت تراش کا خیال ابعاد ثلاثہ کی حدود کو نہیں توڑ سکتا۔

۵۔ مغنی یا مطرب اپنے جاں نواز ترنم سے صرف روح میں انبساط پیدا کر سکتا ہے۔

انھوں نے شاعری کے ارکان اربعہ میں (۱) موسیقی (۲) بت تراشی یا ایجاد وتخلیق (۳) مصوری (۴) اسرار ومعارف کو شمار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر شاعری ان کی جامع ہے تو یہ شاعری کی معراج ہے ورنہ کم سے کم ایک دو صفات لازمی ہیں۔ انھوں نے اس مقالے میں آگے چل کر شاعری کے تعلق کو موسیقی، بت تراشی، مصوری، اسرار ومعارف کے عنوان سے واضح کیا ہے اور اپنے خیالات و نظریات کی مزید وضاحت کے لئے ذیلی عنوانات کا بھی سہارا لیا ہے۔ مثلاً موسیقی اصطلاح شاعری

میں کیا ہے؟ اس سوال کو انھوں نے انتخاب الفاظ اور ترکیب الفاظ کی ذیلی سرخی سے سمجھایا ہے۔ شعر کی ماہیت میں بت تراشی کے عمل دخل کو خیال آفرینی، ندرت بیان یا بداعت اسلوب اور ندرت خیال سے واضح کیا ہے۔ مصوری کو شاعری کی اصل جان اور اس کو شاعروں کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔ اپنے خیالات کو لطافت احساس، قوت مشاہدہ، صدق اظہار، حسن مصوری، کمال مصوری، سلیقۂ انتخاب، حسن ترکیب، سلامت مذاق جیسی اصطلاحوں کی وساطت سے پیش کیا ہے۔ اسرار و معارف کے تحت حکمت و فلسفہ، مذہب و تصوف، عرفان و سلوک اور دقیق نکتوں تک پہنچ سکے دوسری جانب احساس اتنا لطیف ہونا چاہئے کہ وہ غیر مادی حقائق سے بھی لذت اندوز ہو سکے۔ اور ان دونوں مراحل کے بعد قوت بیان ایسی ہونی چاہئے کہ عرفان و ذوق کی اس مجموعی کیفیت کی تصویر ایک نئے انداز کے ساتھ شعر کے نغمۂ موزوں میں کھینچ کر دوسروں کو بھی لذت اندوز کر سکے۔

اس کے بعد انھوں نے ایک بہت اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ

''نظم و نثر کا جو فرق ہے وہ یہاں بھی قائم رہتا ہے۔ نازک سے نازک نکتہ اور لطیف سے لطیف سر معرفت کو محض خشک طریقہ پر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ فلسفہ و حکمت یا نفسیات و تصوف کی مصطلحات کا بے ضرورت بار بار اعادہ بھی شعر میں یہ کیفیتیں پیدا نہیں کر سکتا بلکہ کمال شاعری یہ ہے کہ حقائق و معارف کو گل و بلبل کی زبان اور بادہ و ساغر کے رنگ میں پیش کیا جائے۔'' (۳۱)

سہیل نے اپنے اس مضمون میں فلسفہ حسن و عشق پر بڑی باریک نگاہ ڈالی ہے اور یہ کہا ہے کہ:

حسن و عشق کے رشتوں کے بارے میں مختلف نظریئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حسن بنفسہ کوئی چیز نہیں خود ہمارا ذوق نظر کسی کو محبوب بنا دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اصل حقیقت محض حسن ہے اور حسن ظہور و نمائی چاہتا ہے اور یہی محرک عشق ہے۔ تیسرا یہ کہ حسن و عشق مستقل ہیں اور ہر ایک کا معیار حسن فطری طور پر مختلف ہوتا ہے اور فطرت اپنے معیار پسند کی جستجو میں رہتی ہے۔ جب مل جاتی ہے تو دبی چنگاری بھڑک جاتی ہے۔ چوتھا نظریہ یہ ہے کہ دنیا ایک حسن ازل کا پرتو ہے اس لئے حسن و عشق کی حقیقت ایک ہے شانیں مختلف ہیں۔

اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ سہیل کے تنقیدی شعور میں بہت پختگی اور بالیدگی تھی۔ حیرت یہ ہے کہ تنقید ابھی گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ تنقیدی نظریات میں موجودہ دور کا پھیلاؤ بھی نہیں

تھا، حالی، شبلی، امداد امام اثر اور حسرت موہانی نے تنقید کے پودے کو اپنے افکار کے پانی سے ضرور سینچا لیکن ابھی اس کو برگ و بار لانے میں دیر تھی۔ ایسے دور میں سہیل نے ان نظریات پر غور کیا جو آگے چل کر کافی مستحکم ہونے والے تھے۔ ان کی تنقید پر مشرقی اصول نقد کی گہری چھاپ ہے۔ وہ ہر دور میں شبلی سے متاثر تھے اور انھیں کے حوالوں سے اپنے افکار کو روشن رکھتے تھے۔ اس لئے ان کا موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم سے متاثر ہونا فطری تھا۔ عبدالسلام ندوی ان کے ہم عصر، ہم وطن، ہم استاد بھی تھے۔ ادبی نظریے میں دونوں کے رجحانات ملتے جلتے ہیں۔

اس مقدمہ میں انھوں نے سماجی جائزہ سے پہلوتہی کیا ہے اس کمی کا احساس ہو رہا ہے۔ البتہ چند مقامات پر طنزیات و مضحکات کا انداز ضرور اختیار کیا ہے۔ سلیقۂ انتخاب کی بحث میں انھوں نے بتایا ہے کہ اس سے مراد موضوع تصویر کا انتخاب ہے یعنی انھیں اشیا کی مصوری کی جائے جن میں بجائے خود کوئی ادائے دلکش موجود ہے۔ اردو شاعری میں حسن انتخاب کی مثالیں شاذ ہیں اور اکثر تو ایسی مصوری کی گئی ہے جس سے طبیعت کارہ ہوتی ہے مثلاً۔

جو برسات میں تا درِ یار پہنچے ۔۔۔ بہانہ کیا خود گرے ہم پھسل کر

اس شعر پر ان کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''سبحان اللہ! تصویر تو یہ ضرور ہے مگر کس کی؟ ایک بوالہوس، بدنصیب اور بدمذاق انسان کی۔ بوالہوس اس لئے کہ خود بخود نہیں گرا بلکہ بہانہ کرتا ہے۔ بدنصیب اس لئے کہ در یار تک پہنچ کر بھی آستان بوسی نصیب نہیں ہوئی بلکہ کم بخت گرتا بھی ہے تو کہاں؟ کیچڑ یا کیچ میں۔'' (۳۲)

انھوں نے مثالاً ایک دوسرا شعر بھی درج کر کے شاعر کا مضحکہ اڑایا ہے، ملاحظہ ہو:

''میں نے ان کے سامنے اول تو خنجر رکھ دیا ۔۔۔ پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

اس میں تفصیل سے تصویر تو پیدا ہوگئی مگر کس چیز کی؟ ایک قصاب کی دوکان پیش نظر ہوگئی۔

ملاحظہ ہو:

پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا'' (۳۳)

سلامت ذات کی بحث میں ماحول کی عدم مطابقت سے شعر کی مصوری میں جو بدمذاقی پیدا ہو جاتی ہے اس کی دو مثالوں میں سے ایک یہ ہے:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

اس پر ان کا تبصرہ اس طرح ہے:

''جس وقت یہ حادثہ وقوع میں آیا تھا اس وقت خوش قسمتی سے کوئی فوٹو گرافر موجود نہ تھا جو جمال جاناں کی یہ دل فریب ہیئت کھینچ کر دردمندان محبت کو ہمیشہ کے لئے اس جانکاہ مرض سے نجات دلا جاتا۔'' (۴۴)

حبیب احمد صدیقی کے مجموعۂ کلام ''جلوۂ صد رنگ'' پر سہیل کا تبصرہ اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۶ء میں چھپا تھا اس کو افکار سہیل میں بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ یہ اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ اس میں علم النفس کی بھی بحث ملتی ہے جس کی وجہ سے اس کے بعض جملے نفسیاتی تنقید کے نمونے بن گئے ہیں مثلاً:

۱- حسن خواہ وہ کائنات مادی کا حسن ہو یا موجودات ذہنی کا اس کے متعلق آج تک یہ بحث قطعی طور پر نہیں طے ہو سکی کہ فی نفسہ اس کا کوئی مستقل وجود ہے یا محض اعتبارات ذہنی پر اس کا انحصار ہے۔

۲- شاعری کی نسبت استحسان یا استکراہ تو اسی وقت قابل اعتنا ہو سکتا ہے جب کہ ناقد خود اس راہ کے نشیب و فراز سے واقف ہو اور ان مراحل سے گزر چکا ہو۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سہیل نے اس میں غزل کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے۔

۱- جو لوگ غزل کی تعبیر محض لغوی اعتبار سے کرتے ہیں اور جس میں حسن و عشق کی محاکات ہو اور اس فطری جذبہ کی جہاں گیری سے غزل کی مقبولیت کے قائل ہیں وہ اس صنف کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔

۲- جو اس کی ترکیب صوری، ترتیب تخلیق، بے ربطی اشعار اور ردیف و قافیہ کی پابندی کی بنا پر تغزل کی تحقیر کرتے ہیں وہ بھی پورا سچ نہیں بولتے۔

۳- ایک موزوں طبع کو سطحی غزل کہنے میں اتنی بھی ہنرمندی کی ضرورت نہیں جتنی ایک کمہار کو مٹی کے آبخورے بنانے میں صرف کرنی پڑتی ہے۔

۴- مصرع طرح کا سانچہ سامنے ہے، قافیہ سوچا اور ردیف سے مربوط کر کے پامال مضمون کو

باندھا غزل تیار ہوگئی۔

۵- اگر شاعر حالات وزمانہ کا نبض شناس بھی ہے اور مزدوروں، مظلوموں، ستم زدوں کی جھوٹی ہمدردی میں بھی ایک دو شعر شامل غزل کر لیتے تو وہ ترقی پسند شاعر ہے۔

۶- جنسی تعلقات کو عریانی کے ساتھ بیان کرنے میں جھجک نہ ہوتو وہ بھی بڑا غزل گو ہے۔

۷- ایک معیاری غزل کہنا اچھے خاصے ذی استعداد کے بس سے باہر ہے۔

۸- غزل کو صرف جنسی جذبات کو مصوری کا آلۂ کار سمجھنا اس کی توہین بھی ہے اور اس کے ہفت صد سالہ تاریخی پس منظر سے بے گانگی کا اظہار بھی۔

۹- شاعر قادر الکلام ہے تو ہر مضمون غزل میں ادا کر سکتا ہے۔

۱۰- غزل نے سات آٹھ صدیوں میں اکثر الفاظ میں وہ مفہوم پیدا کر دیئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

۱۱- کنایت یا بہ اصطلاح حال اشاریت کے ایسے ایسے اسلوب پیش کر دیئے ہیں جو ہر طرح کے خیال کو رنگ تغزل میں ادا کر دینے کے ضامن ہیں۔

۱۲- قافیہ وردیف کی پابندی پائے قلم میں بیڑیاں ضرور ڈالتی ہے مگر یہی بے راہ روی اور یاوہ گوئی سے بچاتی بھی ہے۔

۱۳- اساتذہ کی غزلیں زیادہ سے زیادہ نو یا گیارہ اشعار کی ہوتی تھیں

۱۴- دوغزلہ اور سہ غزلہ لکھنے کا مرض تو دور انحطاط کی یادگار ہے۔

۱۵- قافیہ وردیف کی پابندی شاعر کی زبان قلم سے وہی خیالات ادا کرواتی ہے جو اس پر چھائے رہتے ہیں۔

سہیل اپنے دور کے اچھے غزل گویوں کے امتیازات وخصوصیات کا عرفان رکھتے تھے۔ انھوں نے فانی بدایوانی اور اصغر گونڈوی کی تحلیل نفسی اپنے انداز میں جس طرح کی ہے وہ ان کی نگاہ نقد کی گہرائی کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے اکثر مضامین میں فارسی کے نمائندہ غزل گویوں کے حوالے جس خوبی سے آئے ہیں وہ بھی اس کی نشان دہی کرتے ہیں کہ سہیل ان کے انداز واسلوب اور ان کی ذہنی وفکری تاثراتی لہروں کی عمدہ واقفیت اور اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ سہیل نے حبیب کی شعریت وادبیت،

اشاریت و رمزیت، ذہنی محرکات و موثرات اور لفظ و معنی کی تہہ میں اتر کر ان کے کلام کا جائزہ لیا تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ۔

''سعدی و حافظ عرفی و نظیری، میر و غالب، اصغر و فانی سے متاثر ہونے والے شعراء میں غالباً حبیب احمد صدیقی کا نام زیب عنوان شمار کیا جا سکے۔ جلوۂ صد رنگ کا غائر مطالعہ ہر اہل نظر کو میرے مذکورہ بالا خیال کی تائید پر مجبور کرے گا۔'' (۳۵)

اقبال سہیل نے اپنی بحث میں تقابلی تنقید کی شان بھی پیدا کی ہے۔ اس باب میں ان کی یہ انفرادیت ہے کہ وہ دوسروں کی بلندی خیال، قدرتِ بیان اور ندرت مضمون کو انشراح قلب سے تسلیم کرتے ہیں اور خود اپنے شعر کے فروتر ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ انھوں نے اسی میں اوپر کی سطروں میں لکھا ہے کہ

''اور کون شاعر ہے جس کو اپنی ادبی تحقیقات یا اولاد معنوی حسین نہ معلوم ہوتی ہوں اور ان کی شہرت کا آرزومند ہو اور اس توسل سے اپنی ذاتی شہرت نہ چاہتا ہو۔ ان فطری مقتضیات سے بلند ہو جانا بڑے ضبط نفس اور وسعت ظرف کا طالب ہے۔'' (۳۶)

یہ بات خود سہیل کی افتادِ مزاج پر صادق آتی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے ایک شعر کا تقابل اپنے شعر سے کیا ہے اور حبیب کو سراہا ہے، ملاحظہ ہو۔

الٰہی کر کے طے کن رفعتوں کو میں یہ آ پہنچا
کہ یکساں پڑ رہی ہیں اب نگاہیں دوست و دشمن پر

میرا ایک شعر ہے:

چھایا ہوا ہے دیدۂ دل پر جمال حق
باطل بھی اب نگاہ میں باطل نہیں رہا

''ان دونوں شعروں میں بنیادی خیال تقریباً ایک ہی ہے مگر مجھ کو اعتراف ہے کہ حبیب احمد کے طرزِ ادا نے ان کے شعر میں جو وسعت مفہوم پیدا کر دی ہے میرا شعر اس سے خالی ہے۔'' (۳۷)

ایک اور مقام پر وہ حبیب کا سہل ممتنع میں کہا ہوا شعر نقل کر کے اپنے شعر کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں۔

خوگر جو رہی بنا دیتے تم سے یہ بھی تو عمر بھر نہ ہوا

''اسی خیال کو میں نے اس طرح ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

چشمِ کرم کی شوخی طرزِ ستم نہ پوچھ
غم بھی بقدر حوصلۂ دل نہیں رہا

مگر حبیب کے مذکورہ بالا شعر میں جو سادگی اور پاکیزگی ہے وہ کہاں؟ (۳۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعۂ طور اور لن ترانی کی تلمیح مسلمان شاعروں کے یہاں عام ہے۔ سہیل نے عرفی شیرازی، غالب اور اپنا کئی شعر نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

مگر ان تمام اشعار میں ندرت خیال اور ندرت بیان کے باوجود ایک پہلو نظر انداز ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حسن حقیقت کی تجلی نگاہ شوق کے لئے خیرہ کن ہونے کے بجائے اور زیادہ بصیرت افروز ہوگی لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کا غش کھا کر گر جانا اس لئے بھی تو ہو سکتا ہے کہ لن ترانی کی لاج بھی رہ جائے اور جلوۂ جمال میں استغراق کا لطف بھی اٹھایا جائے، یہی پہلو حبیب احمد نے نہایت دلکش اور لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ یوں پیش کیا ہے۔

احترام بے حجابی ہائے حسن دوست تھا
لوگ یہ سمجھے کہ موسیٰ طور پر بے ہوش ہے

شعر کیا ہے ندرت خیال اور بداعت اسلوب کا ایک شاہ کار ہے۔ (۳۹)

سہیل کا یہ اعتراف فن یا تحسین سخن شناس کا انداز یہیں پر ختم نہیں ہوا آگے بھی انھوں نے بچی بصیرت اور اپنی فراخدلی کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔

یوں دیکھتا ہوں برق کو، اللہ رے بے دلی
جیسے کہیں چمن میں مرا آشیاں نہیں

گزشتہ عالمگیر جنگ کے دوران میں تقریباً یہی جذبات میں نے یوں ادا کئے تھے۔

گرفتار قفس ہوں کیا کریں گی بجلیاں میرا
نہ شاخ آشیاں میری، نہ صحن بوستاں میرا

مگر مجھے اعتراف ہے کہ میرے شعر کی وضاحت خیال نے وہ عمومیت مفہوم باقی نہ رکھی جو

حبیب احمد کے شعر میں ابہام نے پیدا کر دی ہے۔ (۴۰)

ان مثالوں سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی بحث و نظر میں یہ اصول بھی برتا ہے کہ تفسیر و تنقید شعر یا ان سے حظ اٹھانے کے لئے اشعار کی دوبارہ تخلیق کی جائے اور جب ان سے لطف و حظ اٹھایا جائے تو اپنے اوپر وہی جذبہ طاری کیا جائے جو شعر گوئی کے وقت اس کے دل و دماغ پر طاری تھا۔

سہیل کا اسلوب نقد و نظر اور نظریۂ انتقاد مشرقی اصول نقد سے مستفاد ہے۔ انھوں نے حبیب کی شاعری کو پرکھنے کے لئے جو پیمانے وضع کئے ہیں وہ تشبیہ و استعارہ کی نادرہ کاری و لطافت، سہل ممتنع، سادگی و پرکاری، مختصر ترکیبوں میں دقیق اور وسیع مطالب، ندرت خیال، ندرت بیان، بداعت اسلوب جیسے الفاظ ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ ان الفاظ کے ذریعہ تنقید میں تخلیقِ نو کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اپنی تنقید کو تلاش حسن، لذت و حظ اٹھانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کی عبارت آرائیوں سے زیادہ تر اسی تاثر کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ وہ فن برائے فن کے حمایتی ہیں جب وہ اپنے مطالعہ میں ذوقی اور وجدانی تاثر کو رہنما بنانے کا رجحان رکھتے ہیں تو ان کے خیالات و نظریات، تاثراتی و جمالیاتی ہو جاتے ہیں اور جب وہ شاعر کا مطالعہ خاص طور سے فرد کی حیثیت سے کرتے ہیں یا صرف اس کی داخلی دنیا سے سروکار رکھتے ہیں تو ان کے یہاں نفسیاتی و تجزیاتی تنقید کی لہریں ابھرنے لگتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ اپنے تنقیدی سفر میں شاعر کا مطالعہ عصری اور تاریخی تناظر میں بھی کرتے ہیں لیکن یہ مواقع شاذ و نادر کا درجہ رکھتے ہیں۔ حبیب کے مطالعہ میں ایک جگہ ان کی نگاہ اس نکتے پر ٹھہرتی ہے کہ:

"تغزل کے علاوہ ان میں بعض اشعار ماورائے تغزل، حکمت ایمانی اور قومی و اجتماعی مسائل کے متعلق بے ساختہ زبان قلم سے نکل گئے ہیں اور در حقیقت یہی اشعار ان کی غزلوں کی جان ہیں۔ ۳۰ رجون ۱۹۲۹ء کی غزل کا یہ شعر خاص طور پر قابل التفات ہے۔

اے عندلیب سعی رہائی پھر ایک بار
اڑتے ہوئے سے رنگ گل و گلستاں کے ہیں (۴۱)

شاعر کی نکتہ شناس نگاہ نے ۲۹ء میں اس انجام کو دیکھ لیا تھا جو اگست ۱۹۴۷ء میں وقوع پذیر ہوا"۔

ایک جگہ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"مدتوں سے ایک بحث چلی آئی ہے کہ قوم کی فلاح کا راستہ موجودہ ترقی یافتہ اقوام کے نقش قدم پر چلنے میں ہے یا اسلام کے دور اول یعنی خلافت راشدہ کے اتباع میں۔ اس مسئلہ پر حبیب احمد کی رائے حسب ذیل نغمہ موزوں میں سنئے۔

الوداع اے خرد فردا بیں
مستی دوش نگر ہے درکار" (۴۲)

تغزل وعصریت اور شعریت وتاریخیت کے سلسلے میں بھی سہیل نے اپنا نظریہ ظاہر کیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں۔

"فلسفۂ الہیات یا حکمت ایمانی کے مسائل بھی حبیب احمد کی غزلوں میں اکثر آتے ہیں مگر اس خوبی سے کہ تغزل کا رنگ قائم رہے اور واعظانہ انداز بیان سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ اسی طرح نفسیات، فلسفۂ اخلاق، طبعیات، سیاسیات وغیرہ کے متعلق دقیق نکتے غزلوں میں توازن واعتدال کے ساتھ سموئے ہیں کہ ایک عامی کا ذہن مشکل سے ان کی طرف منتقل ہوسکتا ہے۔" (۴۳)

سہیل نے مضمون کے آخر میں معاشیات کا مسئلہ اٹھایا ہے اور عرفی شیرازی کا ایک فارسی شعر نقل کر کے یہ سوال پوچھا ہے کہ:

"کون کہہ سکتا ہے کہ اس شعر میں معاشیات کا نکتہ بیان کیا گیا ہے، یا یہ شعر جس میں فیاضی کو بھی ایک طرح کی بلیک مارکٹ قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایک صاحب احتیاج کی سب سے بڑی چیز غیرت چند قرضہ ہائے سیم کے عوض خریدنا کون سا انصاف ہے؟" (۴۴)

اس کے بعد عرفی کا شعر درج ہے پھر یہ چند لفظی تبصرہ ہے کہ:

"دیکھئے حبیب احمد نے اسی بنیادی خیال کو اپنی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

فیاضیوں کے جوش میں منعم کو کیا خبر
خنجر بدست غیرت سائل نہ ہو کہیں" (۴۵)

شاعر مشرق علامہ شفیق جون پوری کا دیوان خرمن عشق کے نام سے ۱۳۶۰ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سہیل کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ افکار سہیل کی زینت میں اس سے بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

اقبال سہیل کو زمانہ قدیم کی تاریخ اور دیار مشرق کی علمی بستیوں کی زبردست معلومات تھی۔ یہ

تذکرہ چھڑ جاتا تھا تو ان کی گل افشانی گفتار دیدنی ہوتی تھی۔ وہ لذت لے لے کر بزم دوشیں کی بساط علم وعرفاں اور حلقۂ شعر و ادب کی حکایت لذیذ تریوں بیان کرتے تھے کہ سننے والوں پر ایک عالم محویت طاری ہو جاتا تھا۔

ان کی بعض تقریظوں میں شعری پس منظر کے طور پر ماضی کے نگار خانے کی تصویریں قاری کے سامنے پیش کرنے کا رجحان موجود ہے۔ خرمن عشق میں بھی انھوں نے بڑی عمدہ داستان گوئی کی ہے جس سے قاری کو گراں قدر معلومات کے ساتھ حظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ ان کا ایک اسلوب خاص یہ بھی ہے کہ وہ قصہ قدیم وجدید میں اپنی داستانِ حیات کے بھی کچھ اوراق شامل کر دیا کرتے ہیں۔

انھوں نے اپنی مقدمہ نگاری کے دو پہلو بتائے ہیں اخلاقی اور ادبی، انھوں نے جو دوسری وجہ بتائی ہے اس سے یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی ادبی وشعری سمت وجہت اور معیار و مزاج سے مطمئن نہیں تھے۔ انھیں کے لفظوں میں سنئے۔

''اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ عصری رجحانات کی بے راہ روی سے تعرض کرنا اور قوم کے مذاق ادبی کو گمراہی سے بچانا ارباب بصیرت کا سب سے بڑا فرض ہے ہمارا ادب اس وقت ایک انقلابی اور بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ جدت قدامت سے یک لخت بیزار ہو رہی ہے اور سعادت مند اخلاف اپنے اسلاف کی یادگاریں مٹا کر نئے ادب کی طرح ڈالنا چاہتے ہیں''۔ (۴۶)

اقبال سہیل کو اس کا اعتراف ہے کہ قدیم اسلوب شاعری اپنی مدت حیات ختم کر چکا ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے تو ادب میں بھی تبدیلی آنی چاہئے لیکن یہ تبدیلی تدریجی ہونی چاہئے تخریبی نہیں۔ ان کی نظر میں مذہب واخلاق، اظہار میں ندرت و پاکیزگی اور فنی ضوابط کی پاسداری کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ حیاسوزی، عریانیت، برہنہ گوئی اور کسی ازم سے وابستگی کو پسند نہیں کرتے ترقی پسندوں پر طنز کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔ ''ہر طرح کی ادبی، اخلاقی اور معاشرتی گمراہیوں کا نام ترقی پسند ادب رکھ لیا گیا ہے۔'' (۴۷)

لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ شاعر کا خطاب اپنی ذات سے ہوتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شاعر کے کلام کی افادیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ وہ تو کوئی بیراگی یا سنیاسی ہوا۔ رہبانیت اور تجردیوں بھی ارتقائے زندگی کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ مانی جاتی ہے۔ شاعر کے یہاں پیام نہ ہو، کسی مقصد کی تڑپ نہ ہو، زندگی کو آگے بڑھانے کی للک اور امنگ نہ ہو تو اس کی عظمت اور معنویت کیا ہے۔

فرد کی بقا معاشرہ سے وابستگی کی وجہ سے ہے۔ سماج سے بے نیاز رہ کر کوئی وجود کی لڑائی نہیں لڑ سکتا۔

وہ فرد کو بہت اہمیت دیتے ہیں اسی وجہ سے ان کے یہاں تاثراتی اور جمالیاتی رنگ بہت گہرا ہے۔ اس مقدمہ میں بھی انھوں نے اپنے اصول ونظریات کی بنیاد اسی پر رکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

''شاعر کا خطاب حقیقتاً اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ آگے جا کے پھر وہ کہتے ہیں کہ ''ایک حقیقی شاعر کی دنیا خود اس کے تاثرات تک محدود ہوتی ہے۔'' (۴۸)

اسی بحث کو انھوں نے دور تک پھیلایا ہے۔ ہر زمانے میں شاعری جیسی اعلیٰ صفت کا افادی و مقصدی پہلو رہا ہے۔ حالی نے بھی مقدمہ شعروشاعری میں شاعری کو سوسائٹی کا تابع بتایا ہے اور ان اثرات کو نشان زد کیا ہے جو شاعری سوسائٹی پر اور سوسائٹی شاعری پر ڈالتی ہے۔ (۴۹) دنیا جانتی ہے کہ ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ شاعر بھی سماج کا پروردہ ہوتا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے بھی شاعری کو روح عصر سے ہم رشتہ وہم آہنگ ہونے پر زور دیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں۔

''شاعری کو دراصل شاعر کی نفسیت اور اس کے ماحول کا آئینہ دار ہونا چاہئے''۔ (۵۰) انھوں نے ایک بڑی پتے کی اور خدا لگتی بات کہی ہے کہ لوگ اپنی پسند اور اپنے ذوق کے مطابق فن پارے پر حکم لگاتے ہیں۔ اگر اپنی محدود پسند کے مطابق نہیں تو فن پارہ کو بے توقیر قرار دے دیتے ہیں جب کہ پرکھنے والے کو اپنی مخصوص انفرادیت سے ہٹ کر شاعر کے ادبی محاسن کا اندازہ لگانا چاہئے۔ انھوں نے ماحصل کے طور پر کہا ہے:

''اگر ناقد خود شاعر ہے تو اس کا فرض ہونا چاہئے کہ جب اپنے رنگ شاعری سے علاحدہ کوئی دوسرا رنگ بجائے خود دلکش اور کامل العیار مل جائے تو صدائے تحسین سے باز نہ رہے۔'' (۵۱)

اقبال سہیل نے شفیق کے آئینہ سخن میں ان کی عصری شاعری کی تصویروں کو محسوس کیا ہے۔ انھوں نے شفیق کے ذہن وفکر پر حفیظ جونپوری، داغ دہلوی، حسرت موہانی اور ان کے خاندانی اثرات کے ساتھ جونپور کے عزائی ماحول کے نقوش کی بھی نشان دہی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

شفیق بھی اگر جونپوری نہ ہوتے تو غالباً محبوب کو یہ وصیت نہ فرماتے:

کچھ نہ کرنا مگر اتنا تو کم از کم کرنا

ہم جو مر جائیں ذرا دھوم سے ماتم کرنا (۵۲)

اس کے بعد سہیل مرحوم نے اپنے مقدمہ میں زبان کی صفائی، طرزِ ادا، برجستگی، ترکیبوں کی شگفتگی، خیالات کے عامۃ الورود ہونے، قبولیت عامہ کی فطری استعداد، روزمرہ کے واقعات اور پیش پا افتادہ واردات کے بیان، اندازِ ترنم، جامعیت کلام، جملہ اصناف نظم پر قدرت، قومی شاعری، بزرگان دین کے احترام، کلام کے لسانی و ادبی اغلاط سے پاک ہونے کی داد دی ہے اور یہ کہا ہے:

''ان کی شاعری الحاد و زندقہ اور توہین روایات ملی کے کمی اثرات سے بھی محفوظ ہے۔ زبان کی سادگی سے ایک قومی مقصد بھی حل ہو جاتا ہے اور اردو کی حیثیت کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے بغیر صحیح ہندوستانی کی اشاعت بھی ہو جاتی ہے جو متحدہ قومیت کی تعمیر کے لئے پہلی بنیاد ہے۔'' (۵۳)

گنجینۂ تحقیق، بیخود موہانی پر ان کا طویل تبصرہ جو معارف اعظم گڑھ کے نومبر و دسمبر ۱۹۳۱ء و جنوری ۱۹۳۲ء کے تین شماروں میں شائع ہوا تھا وہ بھی افکار سہیل میں موجود ہے جس سے سہیل کی زبان دانی، الفاظ و لغات سے واقفیت، عروض و بلاغت پر دستگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ صحیح الفاظ کے غلط استعمال، سیاق و سباق کلام کی مناسبت سے لفظوں کے انتخاب، تشبیہ و استعارہ کے محل استعمال، اختراع تراکیب و ابداع مضامین، تخلیق الفاظ جدید، میں ان کے شعور کی بالیدگی کی شہادت ملتی ہے۔ لغوی و معنوی غلطیوں کی گرفت، تانیث و تذکیر، تعدیہ و لزوم کی عام بیماری پر ان کی فکرمندی کا علم ہوتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ وہ زبان و بیان کے بڑے ماہر اور جمالیات کے بہت اداشناس تھے۔

سہیل نے بیخود موہانی کے غیر جانبدارانہ تفحص و تجزیہ کی تحسین کی ہے اور اس بات کی کافی داد دی ہے کہ:

''شروع سے آخر تک آپ کو ایک حرف بھی ایسا نہ ملے گا جس میں مناظرانہ تلخی پائی جاتی ہو یا سنجیدگی و متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا ہو، حد سے زیادہ اشتعال انگیز مواقع پر بھی انتہائی ضبط اور بلند نظری سے کام لیا گیا ہے۔ نہ تائید میں پاسداری کی گئی ہے نہ تردید میں تحقیر اور دل آزاری کا پہلو اختیار کیا گیا ہے۔'' (۵۴)

اقبال سہیل کو بیخود کی متانت تحریر کے اعتراف کے باوجود ان کی ادیبانہ گل کاریاں اور ظریفانہ بذلہ سنجیاں بہت پسند خاطر ہوئیں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت بیخود کے سحر کار قلم نے انتہائی تہذیب و متانت کے باوجود ان مضامین کا دامن

ظریفانہ بذلہ سنجیوں اور ادیبانہ گل کاریوں سے خالی نہیں چھوڑا۔" (۵۵)

لیکن سہیل نے بے خود موہانی کی خوش وقتی کو پسند کرنے کے باوجود اس قسم کی رنگینی طبع کی بہتات پر سوال بھی اٹھایا ہے۔

"اس مجموعۂ مضامین میں بعض مقامات پر مثلاً آیۂ تحقیق کے دیباچہ میں رنگینی حد اعتدال سے تجاوز کر گئی ہے جس سے تکلف اور تصنع کی بو آتی ہے۔" (۵۶)

سہیل کے اس خیال کے اظہار سے اس نظریے کا پتا چلتا ہے کہ وہ ادبی رویے میں اعتدال و توازن کے قائل ہیں۔ سہیل نے مضامین کی دیانت نقد اور ان کے محققانہ ہونے کو سراہتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ اور ایک عمر کی غور و خوض کا ماحصل چند سطروں میں یکجا کر دیا ہے" (۵۷)

سہیل نے اپنی تبصرہ کی دوسری قسط میں جو معارف کے دسمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی ہے یہ شکایت کی ہے کہ شوق سندیلوی کی مرتبہ کتاب "اصلاح سخن" کو بیخود نے اتنی اہمیت کیوں دی کہ اتنا بڑا مقالہ حوالۂ قلم کر دیا۔ بیخود موہانی کے مقالہ سے چند برس پہلے شوق سندیلوی نے اقبال سہیل کے پاس بھی اس کے کچھ اجزا بالغرض تبصرہ بھیجے تھے۔ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ سہیل صاحب نے پوری کتاب پڑھ ڈالی لیکن اس کو شعرائے عصر کی دماغی ساخت کا زندہ عجائب خانہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اس ناقابل اعتنا کتاب پر بیخود کی مقالہ نویسی پر علامہ سہیل نے کچھ سنجیدگی کے انداز میں اور کچھ ظریفانہ جملوں میں خوب گل افشانی کی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ:

"آئے دن بازاروں میں شعبدہ باز دوا فروش اپنے گرد بھیڑ جمع کر لیتے ہیں۔ حاذق اطبا یہ تماشا دیکھتے ہیں اور تبسم کناں گزر جاتے ہیں۔" (۵۸)

علامہ سہیل کی دوسری شکایت یہ ہے کہ مصنف نے بغیر کسی نوٹ کے حدائق البلاغت کا ترجمہ اپنے مضمون میں درج کر دیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں سرقۂ شعری کی نسبت مصنف حدائق البلاغت کی بعض رائیں قابل قبول نہیں ہیں۔ سہیل نے اس موضوع پر سرقہ، توارد، استفادہ، سرقۂ غیر ظاہر کے بارے میں کافی دقت نظر سے بحث کی ہے اور کثرت سے مثالیں بھی فراہم کی ہیں جو ان کی وسعت

مطالعہ اور قوت حافظہ کی بھی مثالیں بنی ہوئی ہیں۔ بعض مقامات کی عبارتیں ملاحظہ ہوں:

۱-سرقہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ خیال، طرز بیان اور زبان تینوں ایک ہوں اور متاخر کو متقدم کے کلام سے واقفیت ہو۔ اگر ان چہارگانہ شرائط میں سے ایک بھی پائی نہیں جاتی تو اخذ ہو، استفادہ ہو، ترجمہ ہو، یا توارد ہو مگر سرقہ ہر گز نہ ہوگا۔

۲-سرقہ کی بدترین صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی متقدم کا خیال لے کر اپنی عبارت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی جائے۔

۳-حالانکہ حزیں کا شعر نہ سرقہ ہے نہ ان دونوں امور میں سے کسی ایک کا امکان ہے۔ حزیں جیسے شاعر کو جامی کے شعر کا سرقہ کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہوسکتی تھی اور توارد اس لئے ممکن نہیں کہ حزیں یقیناً جامی کے اس شعر سے واقف تھے۔

۴-دو مختلف کلاموں میں بظاہر مفہوم کی یکسانی یا بعض الفاظ کا مترادف ہونا ہی اخذ واستفادہ کی دلیل نہیں ہوسکتی بلکہ خیال کی اصلی روح پر نظر ہونی چاہئے۔ بسا اوقات ذرا سے فرق سے زمین و آسمان کا فاصلہ اور شعبدہ اعجاز کا تفاوت پیدا ہو جاتا ہے۔

۵-یہ تھی مثال ان دو مماثل کلاموں کی جو باہم دگر بالکل مشابہ ہونے کے باوجود بھی ایک دوسرے سے قطعاً غیر متعلق ہوتے ہیں اور ان پر سرقہ، توارد یا اخذ واستفادہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اس کے بعد اخذ واستفادہ کی کثیر الوقوع شکلوں کی نسبت اہم اشارات کئے گئے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان سے استفادہ کرنے والے پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ یہ سب جائز صورتیں ہیں۔

اسی سلسلۂ بحث میں سہیل نے ذوق کے سہرا کو سرقۂ مذموم، تکرار معیوب اور ایہام ناروا کی بہترین مثال قرار دیا ہے۔ یہ سلسلۂ بحث اس لئے کافی اہم ہے کہ جب بھی سہرا نگاری کا ذکر آتا ہے تو غالب کے مقابلے میں ذوق کو ترجیح دی جاتی ہے۔

سید امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں فیصلہ صادر کیا ہے کہ غالب کا سہرا ان کے مذاق غزل گوئی کا رنگ رکھتا ہے جیسا کہ سہرے کو ہونا چاہئے۔" (۵۹) آب حیات کے مصنف محمد حسین آزاد تو اپنے استاذ ذوق کے ایسے اسیر سحر ہیں کہ انھیں ذوق کے سامنے کسی اور کا جمال سخن نظر ہی نہیں آتا۔

انھوں نے سرسری طریقے سے اس کا ذکر کر کے بے اعتنائی کی ہے۔ سہیل پہلے تنقید نگار ہیں جنھوں نے غالب کی سہرا نگاری کی کھل کر داد دی ہے اور ذوق کو اس فن میں غالب کا تبع قرار دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ''اس زمانے (سہیل کے دور طالب علمی ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں علی گڑھ کی ادبی فضا پر ذوق چھائے ہوئے تھے لیکن سہیل نے وقتاً فوقتاً ذوق پر ایسی کڑی اور کبھی استہزائی اور تفریحی تنقید کی اور غالب کی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھایا کہ کالج میں ذوق کا کوئی حمایتی نہ رہا۔'' (۶۰)

ایک ہی زمین اور قافیہ و ردیف میں ایک ہی موقع کی مناسبت سے یعنی زینت محل کے بیٹے مرزا جوان بخت کی شادی کے موقع کے لئے دونوں باکمال شاعروں نے سہرے لکھے۔ غالب کا سہرا، ۱۲/ اشعار پر مشتمل ہے اور ذوق نے چودہ شعر کہے۔ ان دونوں سہروں کو اردو کی سہرا نگاری میں بڑی شہرت و اہمیت حاصل ہے۔ لیکن سہیل کی تنقید کے بعد ذوق کے سہرے کی فنی و ادبی حیثیت دب سی گئی ہے۔

دونوں شاعروں کے صرف مطلع کا موازنہ یہاں درج کیا جاتا ہے اسی سے سہیل کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا
(غالب)

اے جواں بخت مبارک ترے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
(ذوق)

''واضح رہے کہ نوشاہ کا خود نام جواں بخت ہے اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ غالب کے سہرے کا جواب ذوق نے دیا ہے، اب ملاحظہ فرمایئے حضرت غالب خود ''بخت'' کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اسے شہزادۂ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھنے کا شرف خدمت نصیب ہوا۔ پھر نوشہ کے نام سے پہلے تعظیماً لفظ ''شہزادہ'' کا اضافہ ہے اور خود نام ایسی خوبی سے آیا ہے کہ صفت معلوم ہوتا ہے۔ برعکس اس کے ذوق نے ایک تو خالی نام باندھا ہے ثانیاً بجائے بخت و اقبال کو مبارک باد دینے کے خود دولہا کو مبارک

باد دے کر تخئیل شعر غالب کو بدرجہا پست کر دیا اور دوسرے مصرع میں ''آج'' کی تخصیص نے تو شعر کو مدح کے بجائے ذم بنا دیا۔ گویا آج سے پہلے نوشاہ کو یمن و سعادت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ محض سہرے کے طفیل میں آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔'' (۶۱)

چونکہ سہیل نے کافی نکتہ سنج طبیعت پائی تھی، ذہانت کے ساتھ حافظہ بھی نورٌ علیٰ نور تھا۔ اردو کے ساتھ وہ عربی، فارسی اور انگریزی ادب کے بھی شناور تھے۔ لغات وتلفظ اور جملہ فنون سخن پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ وہ عام مجلسوں میں بھی گفتگو کرتے تھے تو علم وخبر کی جھڑی لگا دیتے تھے۔ یہ پورا مضمون ان کی شخصیت اور علمیت کا گواہ بن گیا ہے۔

مقدمہ حدیث حسن بھی ان کی تقریظ ہے جس کو ان کی طباعی اور ذہانت وطلاقت لسانی نے مقالہ بنا ڈالا ہے۔ ابتدا میں پوری شان انشا پردازی کے ساتھ شاعر کی خاندانی نجابت وشرافت، علم و فضل اور علمی وشعری روایات کا تذکرہ ہے۔ وہ سلسلۂ کلام میں بعض ایسے بامعنی جملے بول جاتے ہیں جن میں فلسفہ وحکمت اور اسرار حیات کی کئی دنیائیں آباد ملتی ہیں۔ مثلاً:

۱- یورپ کی زندہ قوموں میں جدت پسندی کا جذبہ قوی تر ہے اور ایشیا کی فرسودہ اقوام پر قدامت پرستی کا رنگ غالب ہے۔

۲- ایک شاہد بازاری کی زبان سے نعتیہ غزلیں سن کر کسی صوفی کو وجد ہوتا ہو تو ہو، لیکن جن ارباب ذوق کا دماغی توازن اس طرح کے غیر فطری اثرات سے محفوظ ہے، وہ اس طریق سماع کو نعت اور صاحب نعت کی توہین سمجھتے ہیں۔

حدیث حسن، فطرت واسطی کا ایک ایسا مجموعۂ کلام ہے جس میں نظمیں، مثنویاں، دوبیتی قطعات سلیقے سے جمع کیے گئے ہیں اور ان تمام مشمولات میں عہد شباب کی رنگینیاں اور حسن وعشق کی سرمستیاں موجود ہیں۔ مناظر فطرت کی ایسی تصویریں اتاری گئی ہیں جو طرز تغزل کو نئی جہتیں دیتی ہیں۔ ان نظموں میں ہیئت کے نئے تجربے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ سہیل نے اشعار سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ فطرت واسطی نوجوان شاعر ہیں لیکن سہیل نے انھیں مستقبل کے اچھے شاعر ہونے کی بشارت سنائی ہے۔

ضمیر حسن خان دل شاہ جہاں پوری اردو کے اچھے شاعر گزرے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام نغمۂ

دل شائع ہوا تو سہیل نے اس پر اپنی رائے دی جو سہیل علی گڑھ ۱۹۳۶ء میں شائع کیا گیا۔ سہیل نے ہندوعرب اور ایرانی روایات ومضامین اور جذبات عشق ومحبت کے اظہار میں صنفی اختلاف کا ذکر بھی کیا ہے۔ انھوں نے غزل کو ''صنف قوی کا جنسی رابطہ صنف نازک سے'' کا نام دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ''عرب میں مرد عاشق اور جنس لطیف معشوق ہے، اور ہندوستان میں قضیہ برعکس ہوگیا ہے۔ ایران کی زمین ہمہ تن حسن ورنگینی ہے اور جغرافیائی حیثیت سے بھی بین العرب والہند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں نہ صرف زبان میں تذکیر وتانیث کا فرق مفقود ہے بلکہ آغاز عہد شباب تک چہرہ کی شناخت میں بھی صنفی لطافت وخشونت میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ لہٰذا اس دنیا میں آکر عشق ومحبت نے اور عموم اختیار کرلیا ہے اور زلف گرہ گیر کے ساتھ خط سبز بھی نگاہ محبت کا مرکز بن گیا۔'' (۶۲)

سہیل نے غزل اور اس کے موضوعات پر طویل اور دلچسپ بحث چھیڑی ہے۔ انھوں نے عشقیہ شاعری کو دو متضاد حصوں میں بٹا ہوا بتایا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنون شباب کا اظہار غزل کو بداخلاقی کی آخری حد تک پہنچا دیتا ہے اور اگر شاعر حسن مجرد کا پرستار اور بلند نظر ہے تو وہ خدا پرست صوفی یا فطرت پرست فلسفی بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مختلف ادوار میں موضوعات غزل کی توسیع کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ اور زمین وزمان بلکہ عالم ملکوت تک کے اسرار کو اس کا موضوع قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد غزل کی ہیئت کی بات کرتے ہیں تو تمام اصناف میں اسی کو سب سے آسان صنف کہتے ہیں۔ جب غزل کے نقصانات بیان کرنے لگتے ہیں تو وہ حالی اور کلیم الدین احمد کے انداز میں غزل شکن بن جاتے ہیں۔

اس سلسلۂ کلام میں وہ غزل مسلسل کی وکالت وحمایت کرتے ہیں تاکہ تصویر کے تمام ضروری پہلو سامنے آجائیں۔ وہ اصلاحی دور کے غزل گو شاعروں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ انھیں میں دل شاہ جہاں پوری بھی ہیں۔ انھوں نے ان کی خصوصیات کلام میں اعتدال مذاق، صفائی، سلاست، برجستگی، صحت زبان، لطیف فارسی تراکیب، خیالات نہ عامیانہ نہ دقیق، بیان حسن وعشق میں کہیں کہیں تصوف کا رنگ، شاذ ونادر فلسفہ وحکمت کے اشارات، سوز وگداز، جوش وسرمستی کا ذکر کیا ہے۔

افکار سہیل میں مکتوبات کے حصے میں چار مختصر وطویل خطوط ہیں۔ پہلا اسلام ساگری کے نام ہے اور طویل ہے اس میں انھوں نے اپنے وہی خیالات ظاہر کئے ہیں جو ان کے مضامین میں پیش کئے گئے ہیں۔ غزل گوئی سے بے اعتنائی اپنے نتائج افکار کی حفاظت سے لاپروائی، غزل کو سب سے زیادہ

نا قابل التفات، نفس تغزل اگر معیار اخلاق سے پست نہیں تو لائق توجہ، میت، جنازہ، گور وکفن، نالہ و شیون سے سخت خلجان، غزل کے موضوعات کی بے ترتیبی، لکھنوی طرز کی مخالفت، دبستان اعظم گڑھ کی تعریف وغیرہ پر انھوں نے بصیرت افروز اور فکر انگیز جملے لکھے ہیں۔

مولانا اسلم جیراجپوری کے نام دو مختصر خطوط ہیں۔ پہلا خط نامکمل ہے اور تاریخ ارقام بھی درج نہیں۔ یہ مکتوب جو ۱۸ر مارچ ۱۹۴۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ مکمل صورت میں کلیات سہیل مرتبہ عارف رفیع، اشاعت دوم ۲۰۱۱ء ناشر دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے۔ سہیل نے اس میں ''موج کوثر'' کی خوبی ہر شعر میں درود شریف کی ردیف کو قرار دیا ہے۔ اس کے بعد نعت کے تعلق سے مختصر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کلیات سہیل کے مشمولہ خط میں انھوں نے اس نعت کی شان نزول بھی بتائی ہے۔

دوسرے خط میں ایک علمی سوال کا جواب ہے جو لفظ ''پُر'' کے بارے میں ہے۔ پہلے تو فارسی قواعد آمدنامہ کی سماعی اور قیاسی کی تقسیم کو غلط اور مصنف آمدنامہ کی ایجاد بتایا ہے۔ اس کے بعد بتایا ہے کہ یہ کسی دوسرے لفظ سے مرکب ہوتا ہے تو مجاز اً صفات کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے جیسے پُر فریب یا پر آفت وغیرہ۔ آگے مزید باتیں کہیں گئی ہیں۔

سیماب کی نظم موجد اعظم پر ایک تنقیدی خط جو رسالہ ادیب دہلی کے مدیر کے نام ہے۔ اس میں سہیل نے سیماب اکبر آبادی کی فنی گرفت اور دینی ارتداد کی اصلاح کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ابلیس کا انکار سجدہ توحید پرستی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ اس کا نسبی غرور تھا۔ اس کا دوسرا جرم انکار خلافت تھا۔ فنی اعتبار سے لفظ اعوذ، سرشتہ، اولیٰ جیسے لفظوں پر اعتراض کیا گیا ہے۔

افکار سہیل میں تین خطبۂ صدارت بھی ہیں۔ دو خطبے مشاعرہ مدح صحابہ کے تعلق سے ہیں اور ایک صدارتی خطبہ ہندوستانی'' کی مخالفت میں ہے۔

آئینۂ ادب کانپور کے مشاعرہ منعقدہ فروری ۱۹۴۴ء کا خطبۂ صدارت اردو ہندی کے لسانی مسئلہ پر ہے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کو ملا کر ایک الگ سے ملغوبہ زبان ہندوستانی کے نام سے رائج کرنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ گاندھی جی کا یہ لسانی تصور تھا۔ سہیل کا نظریہ ہے کہ بول چال کی زبان مشترک ہونے کے باوجود ادب و انشا کے اعتبار سے اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں بن چکی ہیں۔ اردو کی زینت فارسی ترکیبیں اور عربی الفاظ ہیں۔ ہندی میں سنسکرت کی دیوبانی شامل ہے۔ دونوں

زبانوں کی تاریخی اور مذہبی تلمیحات، تشبیہیں، استعارے وغیرہ دوسری زبانوں کے سرمائے سے حاصل کئے گئے ہیں۔ انھوں نے سہ ماہی کے لفظ کو تماہی کرنے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ اب یہ لفظ عام پڑھے لکھے لوگوں کی محفلوں میں رواج پا چکا ہے۔ سہیل کی مخالفت کا سبب یہ ہوگا کہ ''تین'' اردو یا بھاشا کا لفظ ہے اور ماہ فارسی لفظ ہے۔ اساتذہ ماہرین قواعد ہندی و فارسی لفظوں کے درمیان عطف و اضافت والی ایسی ترکیب اور پیوندکاری کو ناپسندیدہ و معیوب قرار دیتے آئے ہیں۔ اردو ہندی دونوں سگی بہنیں ہیں لیکن ایک پر عربی و فارسی اور ترکی کے اثرات ہیں اور دوسری پر ہندوستانی رنگ بہت گہرا ہے۔ سہیل کی ایک بہت مضبوط دلیل یہ ہے کہ اگر دونوں زبانوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے تو ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اور بہت سی زبانیں ہیں کیا وہ سب بھی ختم کی جاسکتی ہیں۔ ہندوستان کی بہت سی دوسری علاقائی زبانوں کے جھرمٹ میں اگر اردو اور ہندی بھی اپنی شناخت کے ساتھ باقی رہ جاتی ہیں تو صرف ان دو زبانوں کے اضافے سے کون سی مشکلات بڑھ جاتی ہیں بلکہ اس عمل کو زبانوں کے گلدستہ میں دو اور پھولوں کا اضافہ ہی کہا جائے گا۔ زبانیں زور زبردستی سے رائج نہیں ہوتیں۔ ہندی اور اردو کی پیدائش دو قوموں کے پیار محبت سے ملنے جلنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس یادگار عہد محبت کو جھگڑے فساد کا سبب بنانا درست نہیں اور اس سے بھی زیادہ ناانصافی کسی ایک فریق کا ان میں سے کسی ایک کو اپنی ملکیت قرار دینا ہے۔ زبانیں قوموں کا مشترکہ اثاثہ ہوتی ہیں۔

اس خطبۂ صدارت میں علامہ شبلی نعمانی کے لسانی شعور اور ان کے نظریات و خیالات کی گونج صاف سنائی دے رہی ہے جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں یوپی کے چیف سکریٹری مسٹر برن کی بنائی ہوئی ورنا کیولر کمیٹی میں پیش کئے گئے اپنے اختلافی نوٹ میں ظاہر کئے تھے۔ شبلی کا یہ نوٹ مولانا سید سلیمان ندوی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں ''اردو ہندی'' کے عنوان سے شائع کر دیا تھا اور اسی عنوان سے یہ ''مقالات شبلی'' جلد دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی میں بھی شامل ہے۔

مسٹر برن نے اپنی یادداشت میں اردو اور ہندی کو قواعد کے یکساں ہونے کی وجہ سے ایک زبان قرار دیا تھا، شبلی مرحوم نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ:

''اگر دونوں زبانوں کی گرامر ایک ہو لیکن الفاظ بالکل مختلف ہوں تو ان کو ایک زبان نہیں کہہ سکتے ہو مشرقی ہندوستان کی زبانوں کی گرامر قریباً بالکل متحد ہے باوجود اس

کے نہ وہ ایک زبانیں کہی جاسکتی ہیں نہ ان کا کوئی مشترکہ کورس بن سکتا ہے۔" (۶۳)

آگے چل کر شبلی نے دونوں زبانوں کی علمی اصطلاحات کے سلسلے میں ہندو مسلم کشمکش کے تعلق سے جن لسانی نقصانات کی نشان دہی کی ہے ان کا لب لباب انھیں کے لفظوں میں یہ ہے:

"گرامروں کے معمولی اشتراک سے دونوں زبانوں کو ایک قرار دینا اور اس کی بنا پر آخری درجہ تک دونوں کا ایک نصاب بنانا سخت غلطی ہے جس سے دونوں زبانیں برباد ہو جائیں گی۔" (۶۴)

کیونکہ علامہ شبلی اصطلاح سازی کے حوالے سے پہلے ہی یہ دلیل دے چکے ہیں کہ علمی مضامین یا علمی خیالات ادا کرنے کے لئے علمی اصطلاحات کی ضرورت پڑے گی جو عربی یا سنسکرت جیسی ترقی یافتہ اور علمی زبان سے مستعار ہوں گی۔ جو یقیناً ہندو مسلم کشمکش کا سبب بن جائیں گی۔ اس کے علاوہ اس طرح جو زبان وجود میں آئے گی وہ نہ اردو ہوگی نہ ہندی بلکہ ایک نئی زبان ہوگی۔ ہندی والوں نے بھی شبلی کے اس اختلافی نوٹ کی جامعیت اور معقولیت کی تائید کی تھی جس کی وجہ سے انگریزی گورنمنٹ کی مفسدانہ لسانی پالیسی بے اثر ہو کر رہ گئی تھی۔ موجودہ دور میں بھی اس کی معنویت ہے۔

سہیل نے لسانی بنیاد پرستی کی بھی مذمت کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اگر کسی کو عربی فارسی پر غصہ ہے تو ہندی الاصل لفظوں سے برہمی کیوں ہے۔ سایہ کی جگہ چھاؤں نہ بولنا اور چھایا پر اصرار کرنا، برکھارت کی جگہ تر سارتو، ریت کی جگہ ریتی، کان کی جگہ کرن، برس کی جگہ ورش اور دیہاتی گنوار کی جگہ گرامی بولنا اور لکھنا ظرافت ہے معقولیت نہیں ہے۔ دلوں کو ملانے کے لئے انھوں نے ایک یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ ہندوستان کی قدیم روایات، تہذیب اور اس تہذیب کے اصل سرچشموں کو جاننے کے لئے اہل اردو ہندوؤں کی تاریخ و تمدن اور ان کے علوم کا ہمدردانہ مطالعہ کرنے کے بعد یہ چیزیں اردو زبان میں لائیں۔ رامائن و مہابھارت کے واقعات اور ویدانت کے فلسفۂ توحید کو دل کش نظم ونثر میں ادا کریں۔ اسی طرح ہندی والے اسلامی تاریخ اور، اکابر اسلام کے کارنامے ہندی نظم ونثر میں شائع کریں۔ یوں دونوں زبانوں کو اظہار خیال کی نئی دنیا مل جائے گی اور آپسی اعتماد و خلوص کا بول بالا ہوگا۔

افکار سہیل میں تقریباً ایک صفحے کا نامکمل مضمون قدیم و جدید ادب کی بحث پر ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ پرانے مزاج والوں کے نزدیک جدید ادب نہایت عریاں، ملحدانہ، مخرب اخلاق اور

مذہب بیزار ہے۔ جدت پسندی کے حمایتی طبقہ کی تحقیق ہے کہ اہانت مذہب اور فحاشی میں قدیم و جدید دونوں برابر کے شریک ہیں۔ قدیم ادب خیالی معصیت میں مبتلا تھا اور بڑے بڑے متقی لوگ نعت و منقبت میں بھی زلف و ابرو کی مداحی کرتے تھے۔ سہیل کے نزدیک دونوں فریق کے اعتراضات حق بجانب ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ نوابی اودھ کے دامن ادب میں پرورش پانے کا یہ نتیجہ ہے۔ نوابوں کی تعیش پسند زندگی اور استمتاع واستلذاذ کے شرعی جواز نے تغزل کو اخلاق سوز روش تک پہنچایا ہے۔ کھیل تماشوں کے ہنگاموں میں سنجیدہ موضوعات اور علمی انہماک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ نوابین اودھ کے عہد حکمرانی کو عمر بھر دور نامسعود قرار دیتے رہے ہیں اور جب بھی موقع ملتا تھا اس کی مذمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ سہیل کے یہ خیالات افکار سہیل کے اکثر مشمولات میں ملتے ہیں وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

۱- سعادت خاں نیشاپوری کے دور نامسعود اور صفدر جنگ کے دست ستم نے اس چمنستان فضل وکمال (شیراز ہند جونپور) کی غارت گری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ (۶۵)

۲- ہمارے دوست اور اردو زبان کے نظیری حضرت فانی بدایونی کو اگر چند دنوں قیام لکھنؤ کی سعادت حاصل نہ ہوتی اور چپ تعزیہ کا منظر پیش نہ ہوتا تو شاید یہ شعر نصیب نہ ہوتا۔

برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشر سکوت
تیرے شہید ناز کا ماتم خموش تھا

(۶۶)

۳- شفیق بھی اگر جونپوری نہ ہوتے تو غالباً محبوب کو یہ وصیت نہ فرماتے

کچھ نہ کرنا مگر اتنا تو کم از کم کرنا
ہم جو مر جائیں ذرا دھوم سے ماتم کرنا

(۶۷)

سلام ساگری کی شاعری پر یوں اظہار رائے کیا ہے۔

۴- سلام کی غزلوں میں ڈوبی ہوئی نبضیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں، نزع کی ہچکیاں، نوحہ گروں کی سینہ کوبیاں، تابوت و مرقد، جنازہ و کفن غرض زندہ درگور ماتمیوں کی وہ تمام بدمذاقیاں جن کو بدقسمتی

سے ارباب لکھنؤ نے ایوان ادب کا نقش ونگار بنا رکھا ہے تلاش کرنے پر بھی مل نہیں سکتیں۔ سوقیت، ابتذال، حیاباختگی، عریاں نگاری، تصنع اور نسائیت جو لکھنؤ اسکول کی خصوصیات ہیں، ان سے بھی سلام کا کلام یک قلم پاک ہے۔(۶۸)

سہیل نے ان خرابیوں کے تدارک کا ایک یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ

''عملی طور پر پاکیزہ لٹریچر پیدا کرنا ہوگا اور اردو زبان کی رگ وپے سے ان سمی اثرات کو زائل کرنا ہوگا جو ہمارے دور ابتلا اور عہد تاریک کی یادگاریں ہیں۔''(۶۹)

ایک اور نامکمل مضمون ''اردو ادب کیوں کر ترقی کر سکتا ہے'' افکار سہیل میں شامل ہے۔اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ اردو ادب کی ترقی علمی وتہذیبی، تاریخی وتحقیقی اور صحیح مذہبی وقومی موضوعات سے ہوگی، بازاری عشق کے افسانوں سے اردو کا بھلا ہونے والا نہیں ہے۔قومی یکجہتی کے جذبات اور کثرت میں وحدت کے انداز انفرادی کوشش کی بنا پر نہیں اجتماعی تحریکات سے پیدا ہو سکتے ہیں۔انفرادی کوشش علمی کو انھوں نے تپتے ہوئے صحرا میں پانی کی ایک بوند کہا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ''ہندو یا مسلمان عوام پر قبولیت کے لئے مذہبی یا قومی عنصر کی آمیزش ضروری ہے''۔(۷۰)

سہیل مذہبی منافرت اور مذہب بیزاری دونوں کا سبب اصل مذہبی روح سے ناواقفیت کو قرار دیتے ہیں۔گزشتہ صفحہ میں آئینۂ ادب کان پور کے مشاعرے کے خطبۂ صدارت میں دونوں مذاہب کے ماننے والوں اور ہندی واردو کے بہی خواہوں کے درمیان ہم آہنگی کے جذبات پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے اہم مذہبی لٹریچر کے ترجمے شائع کرنے کی ضرورت واہمیت پر زور دیا تھا۔اس ناتمام مضمون میں بھی انھیں خیالات کا اظہار ہے اور اس باب میں کالی داس کی ''وکرم اروسی'' کے ترجمہ عزیز لکھنوی اور نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے ترجمہ بھگوت گیتا کو اتحاد السنہ کے لئے قابل تعریف کارنامہ قرار دیا ہے۔ان کے ذیل کے اس جملے میں کیسی دانشوری اور کتنی گہری بصیرت چھپی ہوئی ہے۔

''اگر لڑانے والے مذہب کو وطنی جنگ کا رجز بنانا چاہتے ہیں تو بہی خواہان وطن اسی چیز کو اتحاد کا ترانہ کیوں نہ بنائیں''(۷۱)

علامہ سہیل کو صحابہ کرام سے بڑی عقیدت تھی۔عزاداری کے فروغ نے خلفائے راشدین و اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں کو پس منظر میں ڈال دیا تھا۔تولا وتبرا کے جوش میں صحابہ کی

قربانیاں فراموش کی جارہی تھی۔ تاریخ عزیمت کے روشن اوراق کو کھولنے کے لئے صحابہ کی یادوں کو زندہ رکھنے والی بزم آرائیاں ضروری ہیں۔ افکار سہیل میں مشاعرہ مدح صحابہ کے دو خطبہ صدارت منعقدہ لکھنو ۱۱ر مارچ ۱۹۴۲ء و ۱۹۴۴ء ہیں پہلا خطبہ مکمل ہے اور دوسرا خطبہ نامکمل صورت میں ہے۔ ان خطبوں میں مدح صحابہ کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جان نثاران اسلام کی شجاعت، غیرت وحمیت جماعت صحابہ کی قدروقیمت، بے مثال خدمت انسانیت، شوق شہادت، راست بازی وجرأت، استبداد وشخصیت کے مقابلے میں بے پناہ استقامت وعزیمت معرکۂ خیروشر میں ایمانی فدایت، آسائش دنیا سے نفرت، متاع آخرت سے رغبت، بے نیازی حکومت وسیادت، بیزاری دولت و ثروت، رضائے الٰہی کی چاہت، تحریک فوز وفلاح میں سرگرم شرکت، کارنامۂ خلافت، امانت ودیانت پر بہترین مکالمہ ومحاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ سہیل نے سوال قائم کیا ہے کہ:

۱۔ ''کیا شہدائے بدروحنین کے کارنامے، فاتحین ایران ومصر کی جاں بازیاں اور ہماری کتاب مفاخر کے وہ زریں اوراق نہیں ہیں جن کی یادتازہ رکھنا ہماری قومی زندگی کے لئے ناگزیر ہے''۔ (۷۲)

۲۔ ''کیا فاروق اعظم کی تسخیر بیت المقدس کا واقعہ دنیا کی تاریخ کشورستانی میں عدیم النظیر نہیں ہے اور کیا قربانی اسماعیل کے سوا اس صبرواستقلال، اس ضبط نفس اور ایثار کی شان تاریخ مذاہب پیش کرسکتی ہے جس کا روشن ترین نقش امام الشہد اسیدنا عثمان ذی نورین نے اپنے مقدس خون شہادت سے قایم کیا ہے۔'' (۷۳)

شعروادب میں حسن وعشق کی فرضی داستانیں، سفلی جذبات کی تصویریں، استمتاع واستلذاذ کی خرمستیاں لطف لے لے کر لفظوں کے اسراف کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں، جب کہ سادہ دل، سادہ لوح، سادہ لباس صحابہ کے دامن زندگی میں سچے واقعات کے اتنے انمول موتی ہیں کہ انھیں سمیٹنے کے لئے لفظ وخیال کی وسیع کائنات تنگ پڑجائے گی۔ سہیل فرماتے ہیں کہ:

''میں تو یہ عرض کروں گا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ہر ایک کی زندگی اس کی مستحق ہے کہ ہم ان کی حیات طیبہ کے روشن کارناموں کو اپنے لئے چراغ ہدایت بنائیں اوران کے ذکر خیر اور تبلیغ مناقب سے تہی دستان قسمت کو بصیرت ایمانی کی زکوۃ دیں۔'' (۷۴)

مسلمانوں کی اپنی تاریخ سے ناواقفیت اور مشرق ومغرب کی بساط سیاست سے باخبر ہونے پر

وہ مکالمہ قائم کرتے ہیں کہ شاعری کی عالمگیری تو یہ ہے کہ رستم کے نام سے آج ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ واقعۂ کربلا کی جزئیات ہندو صاحبان تک کو بھی معلوم ہیں لیکن کیا بدر وحنین، حمص وقادسیہ کے نام مسلمانوں کی اکثریت نے بھی سنے ہیں؟

اسلام اور اعلیٰ انسانی اقدار کا تحفظ کے زیرِ عنوان سہیل کا ایک ایسا فکر انگیز مضمون ہے، جس سے اسلامی فکر اور قرآنی اشارات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس مضمون میں سہیل نے اسلام کی عالمگیری حیثیت کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ خود مسلمان اسلام کو صحیح طور پر نہیں سمجھ رہے ہیں۔ ان کے لفظوں میں اسلام وہ نورِ الٰہی ہے جس میں اخلاق کی تکمیل اور اصلاح کے لئے ابدی ضابطے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور انسانی زندگی کے جتنے پہلو ہیں ان سب کے لئے ہدایتوں کا ایک مجموعہ مرتب کر دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اسلام نے انسان کو بلند مرتبہ ہونے کا احساس دلایا۔ انسان دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے۔ اس لئے وہ مظاہر قدرت کو مسخر کرے اور کسی چیز سے مرعوب نہ ہو۔ جب تک مسلمان اسلامی قوانین پر رہا، دنیا پر حکومت کی۔ آج مسلمان اپنی حقیقت کو بھول گیا لیکن دنیا کی زندہ قومیں اس پر عمل پیرا ہیں تو سائنسی ترقیات میں آگے ہیں۔

اسلام نے ذات سے کائنات کے گوناگوں رشتوں کو بتایا اور ان کے درمیان عدل قائم کیا۔ جس کے نتیجے میں اقوام عالم کے درمیان مسلمان ہمیشہ اخلاق کے بلند درجے پر رہا۔ اس نے ہر قسم کی تفریق کی دیواریں توڑ کر سب کو یکساں حقوق دیئے۔ تمام اچھائیوں کو اپنانا اور برائیوں سے دور رہنا اس کا مزاج تھا۔ آج جہالت، پسماندگی، تن آسانی، بے فکری نے اس کو بے وقعت بنا دیا ہے۔

یحییٰ اعظمی کی نظموں کے مجموعہ نوائے حیات کا پہلا ایڈیشن علامہ سہیل کی تقریظ کے ساتھ نومبر ۱۹۴۶ء میں حالی پبلیشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا تھا۔ دار المصنفین اعظم گڑھ سے ۱۹۵۰ء میں کافی ترمیم واضافہ کے بعد اس کی دوسری اشاعت ہوئی۔ اس میں سید سلیمان ندوی کا ۱۹۴۵ء کا لکھا ہوا مقدمہ شامل ہے مگر سہیل کا تحریر کردہ تعارف نہیں ہے۔ اسی تعارف کو افکار سہیل میں آخری نثری تحریر کی حیثیت دی گئی ہے۔ یحییٰ اعظمی، علامہ سہیل کے خرمن اصلاح ومشورۂ سخن کے خوشہ چیں تھے۔

سہیل نے اپنے مقدمہ میں یحییٰ کی غزل بیزاری، عریاں نگاری اور فحاشی سے اجتناب کی

وجوہات پر خفیف سے اشارے کیے ہیں۔ یحییٰ اعظمی کے رنگ سخن کے بارے میں سہیل نے کہا ہے کہ:

''رہی نظم اس میں بھی شبلی کا مخصوص رنگ سخن ان کے بعض کفش برداروں نے اب تک باقی رکھا ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ توقع کی جاتی ہے کہ عزیزی یحییٰ سلمہ کی حیات تک تو ضرور زندہ رہے گا۔'' (۷۵)

موجودہ دور میں بھی افکار سہیل کی دستاویزی حیثیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے اور اس کی معنویت کا معیار وہی ہے جو اس کی اشاعت کے وقت تھا۔ چھ دہائی کی مدت گزرنے کے بعد بھی سہیل کے فکر وفن سے بے اعتنائی کا رویہ ختم نہیں ہوا ہے۔ وہ اپنی حیات مستعار میں لاابالی پن کا شکار ضرور تھے لیکن سہیل شناسوں نے بھی کسی نہ کسی حد تک ان کے ساتھ بے التفاتی کی روش روا رکھی۔ جس کا اثر ابھی تک زائل نہیں ہوا ہے ان پر مختلف اوقات میں کچھ مضامین لکھے گئے اور تحقیق بھی کی گئی لیکن یہ آئینے بھی ان کے خدوخال کو پورے طور سے پیش نہیں کر سکے۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا یہ قول بڑا حکیمانہ ہے کہ سہیل کو نظر انداز کرنا اپنے آپ کو ایک بڑی ادبی نعمت سے محروم رکھنا ہے۔'' (۷۶)

افکار سہیل کے مرتبین شوکت سلطان صاحب مرحوم اور علی حماد عباسی صاحب مرحوم نے سہیل مرحوم کے افکار پریشاں کو جس محنت، لگن اور دل جمعی سے یہاں وہاں تلاش کر کے یکجا کیا وہ لائق تحسین اور قابل صد آفریں کارنامہ ہے۔ اگر ان حضرات نے بروقت اس طرف توجہ نہ دی ہوتی تو جس طرح یہ ورق ورق بکھرا ہوا تھا یقیناً یہ بھی دستبرد زمانہ کا شکار ہو گیا ہوتا۔ کاش کہ انھیں دردمندان ادب کی طرح سہیل کے دوسرے تلامذہ و متعلقین نے اس متاع گم گشتہ کی بازیابی کے لئے ہاتھ پاؤں مارا ہوتا تو اب تک بہت کچھ دستیاب ہو چکا ہوتا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

افکار سہیل میں ان کی کئی نامکمل تحریریں شامل ہیں۔ مثلاً داستان تاریخ اردو اور یوپی کے مشرقی اضلاع کے کچھ اہل قلم۔ علامہ شبلی کے مکاتیب۔ خط بنام حضرت سلام ساگری، خط بنام مولانا اسلم جیراجپوری۔ خط بنام مولانا وحید الدین خاں اعظم گڑھ۔ جدید وقدیم ادب۔ اردو ادب کیوں کر ترقی کر سکتا ہے۔ خطبہ صدارت مدح صحابہ مشاعرہ منعقدہ لکھنؤ ۱۹۴۴ء۔ آج بھی ان کی بازیابی کی طرف توجہ دی جائے تو شاید کامیابی کی صورت نکل سکے۔ ان کے خطوط ومضامین اور متعدد کتابوں، مجموعوں پر

ان کے تبصرے، مقدمے اور کلام کو یکجا کر کے شائع کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ یہ اپنی تہذیبی قدروں کی بازیافت بھی ہے اور کھوئے ہوئے اعظم گڑھ سمیت مشرقی اضلاع کی تلاش بھی۔

حواشی

(۱) افکار سہیل۔ مرتبہ شوکت سلطان، علی حماد عباسی، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ اگست ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۷

(۲) امروز کراچی ۸ر نومبر ۱۹۵۵ء بحوالہ اقبال سہیل، حیات اور شاعری، ڈاکٹر منور انجم، ۱۹۹۵ء، ص ۵۷

(۳) محمد حسن کالج میگزین جونپور، ''سہیل نمبر'' مرتبہ نیاز احمد صدیقی مارچ ۱۹۵۳ء

(۴) کلیات سہیل، مرتبہ، عارف رفیع، ناشر دار المصنفین اعظم گڑھ اشاعت دوم نومبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۲

(۵) مکتوب سہیل بنام مولانا اسلم جیراجپوری مشمولہ کلیات سہیل، مرتبہ عارف رفیع، ص ۲۴

(۶) افکار سہیل مرتبہ شوکت سلطان، علی حماد عباسی، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ اگست ۱۹۵۷ء، ص ۴۳

(۷) ایضاً، ص ۵

(۸) ایضاً، ص ۷

(۹) ایضاً، ص ۲

(۱۰) ایضاً، ص ۳۷

(۱۱) ایضاً، ص ۵۴-۵۵

(۱۲) ایضاً، ص ۶۲-۶۳

(۱۳) ایضاً، ص ۱۷

(۱۴) ایضاً، ص ۷۵

(۱۵) ایضاً، ص ۷۹

(۱۶) ایضاً، ص ۸۲

(۱۷) ایضاً

(۱۸) ایضاً ص ۸۳

(۱۹) ایضاً ص ۲

(۲۰) ایضاً

(۲۱) ایضاً ص ۸۵

(۲۲) ایضاً ص ۸۶

(۲۳) ایضاً ص ۳

(۲۴) ایضاً ص ۸۶

(۲۵) ایضاً ص ۸۷

(۲۶) ایضاً

(۲۷) ایضاً ص ۱۰۳

(۲۸) ایضاً ص ۱۱۲

(۲۹) ایضاً

(۳۰) ایضاً

(۳۱) ایضاً ص ۱۲۷

(۳۲) ایضاً ص ۱۲۳

(۳۳) ایضاً ص ۱۲۴

(۳۴) ایضاً ص ۱۲۵

(۳۵) ایضاً ص ۱۳۱

(۳۶) ایضاً ص ۱۳۷

(۳۷) ایضاً ص ۱۴۱

(۳۸) ایضاً ص ۱۴۲

(۳۹) ایضاً ص ۱۴۳

(۴۰) ایضاً

(۴۱) ایضاً،ص۱۴۴

(۴۲) ایضاً

(۴۳) ایضاً،ص۱۴۸

(۴۴) ایضاً،ص۱۴۹

(۴۵) ایضاً

(۴۶) ایضاً،ص۱۵۲

(۴۷) ایضاً،ص۱۵۳

(۴۸) ایضاً

(۴۹) مقدمہ شعر و شاعری - الطاف حسین حالی، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۳ء،ص۱۶تا۱۸

(۵۰) افکار سہیل،ص۱۵۴

(۵۱) افکار سہیل،ص۱۵۴

(۵۲) ایضاً،ص۱۵۴-۱۵۵

(۵۳) ایضاً،ص۱۵۵

(۵۴) ایضاً،ص۱۶۳

(۵۵) ایضاً،ص۱۶۴

(۵۶) ایضاً،ص۱۶۴-۱۶۵

(۵۷) ایضاً،ص۱۶۵

(۵۸) ایضاً،ص۱۶۸

(۵۹) کاشف الحقائق حصہ دوم، سید امداد امام اثر، ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی - پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء، ص۴۶۸

(۶۰) سہیل نمبر محمد حسن انٹر کالج میگزین جونپور، ص۱۴ بحوالہ کلیات سہیل، مرتبہ عارف رفیع، ناشر دار المصنفین اعظم گڑھ اشاعت دوم نومبر ۲۰۱۱ء، ص۱۷ و اقبال سہیل، حیات اور شاعری، منور

انجم مطبوعہ ۱۹۹۵ء، ص ۴۲

(۶۱) افکار سہیل ۱۷۴

(۶۲) ایضاً ص ۲۰۲

(۶۳) مقالات شبلی جلد دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۵۰ء، ص ۷۶-۷۷

(۶۴) ایضاً ص ۷۸

(۶۵) افکار سہیل، ص ۱۵۱

(۶۶) ایضاً ص ۱۵۴

(۶۷) ایضاً ص ۱۵۴-۱۵۵

(۶۸) ایضاً ص ۲۱۶

(۶۹) ایضاً ص ۲۳۴

(۷۰) ایضاً

(۷۱) ایضاً ص ۲۳۶

(۷۲) ایضاً ص ۲۳۹

(۷۳) ایضاً

(۷۴) ایضاً

(۷۵) ایضاً ص ۲۶۱

(۷۶) اردو غزل میں سہیل کا مرتبہ۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی بحوالہ کلیات سہیل مرتبہ عارف رفیع ناشر دار المصنفین اعظم گڑھ اشاعت دوم، نومبر ۲۰۱۱ء، ص ۳۱۲

☆☆☆

مولانا اقبال سہیل کے شاگرد اسلم سہیل

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ☆

شیراز ہند جون پور سدا سے علم وادب، تہذیب وثقافت اور شعروشاعری کا گہوارہ رہا ہے اور آج بھی اپنے شاندار ماضی کی بہت سی روایات کو زندہ وتابندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہاں ہر دور میں صاحب کمال، اہل علم ودانش اور ادبا وشعرا پیدا ہوتے رہے ہیں۔ عہد حاضر میں جن لوگوں نے شیراز ہند جون پور کی علمی، ادبی اور شعری روایت کو استحکام عطا کرنے میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں ان میں ایک اہم ترین نام اسلم سہیل کا بھی ہے۔

اسلم سہیل کا اصل نام محمد عمر شمس الاسلام، عرفیت منے میاں اور تخلص اسلم ہے، مگر اب یہ اپنے قلمی نام اسلم سہیل سے ہی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ شاید کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ موصوف شاعری میں مولانا اقبال سہیل کے شاگرد ہیں۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے اقبال سہیل پر تحقیقی کام کیے ہیں انھوں نے بھی اقبال سہیل کے اس اہم شاگرد کا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے اقبال سہیل کے شاگردوں کی فہرست میں ان کے نام کا ذکر کم ہی کیا گیا ہے جب کہ اسلم سہیل، مولانا اقبال سہیل مرحوم کے نہ صرف شاگرد ہیں بلکہ استاذ اور شاگرد میں بہت سی مشترک قدریں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اقبال سہیل ایک فطری شاعر تھے، طبعاً عزلت پسند اور نام ونمود سے بے نیاز تھے، حافظہ انتہائی مضبوط تھا اور یادداشت قوی۔ انھیں اپنا سارا کلام زبانی یاد رہتا تھا۔ ادبی محفلوں میں اپنے طویل قصیدے زبانی سناتے تھے۔ اسلم سہیل کا بھی حافظہ مضبوط، یادداشت تیز ہے۔ انھیں بھی اپنا بیشتر کلام زبانی یاد ہے اور اپنے استاد اقبال سہیل کا بھی زیادہ تر کلام یاد ہے۔ اس کے علاوہ اردو، فارسی کے

☆ ADILA PUBLICATIONS DOMAN PURA-KASARI MAU(U.P.)275101

کلاسیکی شعرا کا بھی بہت سارا کلام یاد ہے اور وہ خود بھی ایک فطری شاعر ہیں۔

گذشتہ بیسویں صدی کے تقریباً تیسرے ربع تک طالب علموں میں ''بیت بازی'' اور ''تعلیمی تاش'' کھیلنا ایک اہم تعلیمی اور تفریحی مشغلہ تصور کیا جاتا تھا، جس سے زبان دانی، ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ شعری ذوق کی آبیاری بھی ہوتی تھی، اسلم سہیل کو بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں جنون کی حد تک بیت بازی سے دلچسپی تھی، انھیں اساتذہ کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ وہ فطرتاً ذہین اور حاضر جواب بھی واقع ہوئے ہیں اس لئے بیت بازی میں پوری ٹیم پر تنہا بھاری پڑ جاتے تھے اور آج بھی جب کہ ان کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی ہے انھیں اپنا اور اپنے استاد اقبال سہیل کا اور دوسرے اساتذہ اور ہم عصر شعراء کا زیادہ تر کلام زبانی یاد ہے۔ ان کی یادداشت اور قوت حافظہ قابل رشک ہے۔ شعر و شاعری کی بات شروع کر دیجیے پھر وہ اپنی انتہائی نحیف آواز میں بات سے بات نکالتے جائیں گے اور موقع محل سے اساتذہ کے ایسے ایسے شعر سناتے جائیں گے کہ سننے والا حیرت میں پڑ جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ان کی بیت بازی کا دور دور تک شہرہ تھا اور بقول ایس۔ ایم۔ عباس:

> ''اسلم سہیل صاحب کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ بیت بازی کا شوق انھیں جنون کی حد تک تھا۔ ہم مضمون، ہم قافیہ و ردیف اشعار کو پڑھنے کی انھیں دھن سی تھی، احباب کے درمیان بیت بازی کے معرکے میں یوں شامل ہوتے کہ ایک شعر کے جواب میں دو شعر پیش کر دیتے۔'' (جون پور کے چند شعرا: ص ۱۶۰)

اسلم سہیل جون پور کے ایک بزرگ استاد شاعر ہیں، ان کی پیدائش ۱۹۳۶ء میں ان کے ننھیال اردلی بازار بنارس میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور مقامی تعلیمی اداروں میں ہوئی، جون پور کے اہم تعلیمی ادارہ پی۔ این۔ گھوس ہائی اسکول (جو اب راج انٹر کالج کے نام سے جانا جاتا ہے) سے انھوں نے دسویں تک تعلیم حاصل کی اور وہیں سے ۱۹۵۱ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر اور ادیب کامل کیا۔ (پروفیسر انور صدیقی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) ان کے کلاس فیلو تھے۔ ان کے شاعر دوست واحباب میں وسیم سنبھلی، نامی جونپوری، رضا جونپوری اور حرمت الاکرام قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام کلاسیکی اصناف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے لیکن نعت و منقبت، نظم و غزل اور قطعہ و رباعی میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ شاعری میں

زبان و بیان اور عروضی اصول وضابطے کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور فنی معاملات میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ علم عروض کے رموز ونکات پر بھی ان کی گہری نظر ہوتی ہے، شاعری خوب کرتے ہیں مگر ابھی تک کوئی شعری مجموعہ یا کلیات شائع نہیں ہوسکا ہے۔ بہت سا کلام ضائع ہو چکا ہے اور جو باقی ہے وہ یادداشت میں محفوظ ہے۔ اس کی اشاعت کے بارے میں اپنے استاد اقبال سہیل کی طرح موصوف بھی سنجیدہ نہیں ہیں۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کے ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہوئے۔ ملک کی آزادی کے سال یعنی ۱۹۴۷ء میں شاعری شروع کی اور یہی اردو کی سب سے بااثر اور فعال ترقی پسند تحریک کا عہد شباب بھی تھا، ۱۹۶۰ء کے آس پاس ردعمل شروع ہوا اور جدیدیت کی تحریک کو فروغ حاصل ہونے لگا لیکن اسلم سہیل ان تحریکوں اور رجحانات سے بالکل بے نیاز ہو کر خالص فطری انداز میں شاعری کرنے اور کسی جماعت یا نظریے سے بلا کسی ذہنی یا جذباتی وابستگی کے آزادانہ طور پر تخلیقی عمل سے دوچار رہنے میں عافیت سمجھی جب کہ ''ترقی پسند تحریک'' کے بانی اور روح رواں سجاد ظہیر کا آبائی وطن بھی جون پور ہے۔ اسی طرح جدیدیت کے سرخیل شمس الرحمٰن فاروقی بھی اسی دیار پورب (پروانچل) کے ضلع مئو موضع کوئریا پار کے ہی اصل باشندے ہیں۔ اپنی تمام تر غیر وابستگی کے باوجود اسلم سہیل نے اچھی اور قابل توجہ شاعری کی ہے اور شہرت وکامیابی کے لئے انھوں نے کبھی کسی بیساکھی کا سہارا نہیں لیا ہے۔ گذشتہ دنوں محمد عرفان جون پوری کے دولت کدہ پر ان سے تفصیلی ملاقات کا اتفاق ہو گیا، موقع کو غنیمت جانتے ہوئے راقم (ایم نسیم اعظمی) نے ان کی شخصیت وشاعری اور اقبال سہیل کی شاگردی کے حوالے سے ان سے کئی سوالات کئے تھے اور انھوں نے جو جوابات دیئے یہ مضمون انھیں جوابات پر مبنی ہے۔

خاندانی پس منظر کے بارے میں اسلم سہیل صاحب نے بتایا کہ میرا خاندان جون پور کا قدیمی خاندان ہے۔ میرے والد کا نام محبوب علی ہے۔ ہمارا خاندان شروع سے ہی تجارت پیشہ رہا ہے، پہلے پتھر کا کام ہوتا تھا بعد میں تیل کا کارخانہ قائم ہو گیا پھر اس میں پرفیوم پروڈکٹس کا کام بھی شامل ہو گیا۔ والد کے بعد ہم لوگوں نے کارخانے کو سنبھالا اور ترقی دینے کی کوشش بھی کی، اس کے بعد دوسرے چھوٹے بڑے کاروبار ہوتے رہے، ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد اگرچہ رسمی تعلیم سے کنارہ کشی کرنی پڑی اور اپنے پشتینی کام دھندے میں سرگرم عمل ہو گیا مگر شعر وشاعری اور ذاتی مطالعے کا سلسلہ بہ دستور جاری

رہا۔ میرے ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں انور صدیقی میرے کلاس فیلو اور دوست تھے، جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں پروفیسر ہوئے۔ میرے ان سے یہ پوچھنے پر کہ آپ نے اقبال سہیل کی کب شاگردی اختیار کی تھی؟ انھوں نے بتایا کہ میں نے تقریباً جونیئر درجات کی طالب علمی کے زمانے میں شاعری شروع کی تھی، شعروشاعری سے دلچسپی تو بچپن سے ہی تھی۔ گھر کے لوگ کاروباری قسم کے تھے لیکن میرے ماموں محمد عمر اور نانا بھی شاعر تھے۔ نانیہال میں اچھا خاصا شعری و ادبی ماحول تھا۔ ماموں نوجوانی کے زمانے میں ہی فوج میں آفیسر ہوکر انبالہ چلے گئے تھے۔ بیت بازی کا جنون کی حد تک شوق کے باعث مجھے ہمیشہ اساتذہ کے ایسے اشعار کی تلاش رہتی تھی جس کی ردیف ذرا مشکل ہو اور اس مشکل ردیف کی تلاش کے چکر میں دستیاب ہونے والے شعرا کے پورے پورے دیوان پڑھ جاتا تھا۔ اس طرح شاعری کا مطالعہ کرتے کرتے میں نے خود بھی شاعری شروع کردی۔ حکیم امیر علی ادیبؔ جو داغؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حفیظؔ جون پوری اور آسی غازی پوری کے ہم عصروں میں تھے، ان سے میں نے کچھ دنوں فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں جس سال میں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا، اسی سال مولانا اقبال احمد خاں سہیل کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی تھی۔ متعدد غزلوں اور نظموں پر اصلاح بھی لی اور تقریباً ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں ان سے چار پانچ بار اعظم گڑھ جاکر ملا بھی۔ اس زمانے میں آمد ورفت کے ذرائع محدود تھے، اس لئے کچھ دنوں تک خط وکتابت کے ذریعہ اصلاح کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد موصوف بیمار رہنے لگے، خط وکتابت کا سلسلہ بھی بند ہوگیا اور تقریباً دو سال تک بیمار رہنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں انتقال فرماگئے۔ ۱۹۵۳ء میں محمد حسن انٹر کالج میگزین کا اقبال نمبر شائع ہوا جس کے مرتب کالج کے پرنسپل نیاز احمد صدیقی تھے۔ اقبال سہیل کی شخصیت وشاعری پر اس نمبر میں جن لوگوں کے مضامین یا تاثراتی تحریریں شامل ہیں ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شاہ معین الدین احمد ندوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرورؔ اور نیاز احمد صدیقی قابل ذکر ہیں۔

میرا نام محمد عمر شمس الاسلام اور تخلص اسلم ہے۔ پہلے میں اسلم جون پوری کے نام سے لکھتا تھا مگر اقبال سہیل کی شاگردی کا شرف حاصل ہوجانے کے بعد میں نے اپنے دوست اور شاعر وسیم سنبھلی کے کہنے پر اپنا قلمی نام اسلم سہیلی لکھنے لگا اور اب میری جو بھی شناخت ہے وہ اسی نام سے ہے۔ وسیم سنبھلی

میرے ہم عصر شاعروں میں خاص اہمیت کے حامل تھے۔ وہ موضع سنجھی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ جون پور میں ان کی سسرال تھی اور شہر جون پور کی معروف اور معزز ہستی حاجی زکریا صاحب کے چچیرے بھائی کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی تھی، اس لئے وہ زیادہ تر جون پور میں ہی رہتے تھے۔ وسیم سنجھی کے والد کا نام احسن تھا جو اپنے دور کے معروف شاعر و ادیب تھے۔ اچھی تنقیدی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی تنقیدی نظر بڑی تیز اور باریک بیں تھی، اقبال سہیل ان کے بڑے مداح اور قدرداں تھے۔ مولانا احسن سنجھی کے مضامین اور تبصرے اکثر ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ اور دوسرے رسائل وجرائد میں شائع بھی ہوتے تھے۔ مولانا احسن سنجھی کے ایک بھائی شبیر حسن سنجھی تھے، انھوں نے تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کے موضوع پر انگریزی زبان میں کئی کتابیں بھی تصنیف وتالیف کی تھیں جو کافی مقبول ومشہور بھی ہوئی تھیں جن کے دو ایک نسخے شیعہ کالج جون پور کی لائبریری میں اب بھی موجود ہوں گے۔ موصوف منشی دیا نرائن نگم کے مشہور رسالہ ''زمانہ'' کانپور کے ایڈیٹر بھی تھے۔ جگر مرادآبادی، نشور واحدی اور تحیر بہوروی وغیرہ ان کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ رام بابو سکسینہ کی مشہور زمانہ کتاب ''تاریخ ادب اردو'' بقول اسلم سہیل دراصل مولانا احسن کی ہی تحریر کردہ ہے۔ سنجھی اعظم گڑھ شہر کے دکھن میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، اس چھوٹے سے گاؤں نے کئی قدآور علمی وادبی شخصیات پیدا کی ہیں جن میں مولانا احسن سنجھی، شبیر حسن سنجھی، وسیم سنجھی، منشی حفیظ الرحمٰن ایمن شہابی وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ حفیظ الرحمٰن ایمن شہابی اردو، فارسی اور انگریزی زبان کے اچھے عالم، شاعر وادیب اور علم عروض کے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے۔

راقم کے اس استفسار پر کہ مولانا اقبال سہیل کا اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح کا کیا طریقہ تھا؟ اسلم سہیل صاحب نے قدرے توقف کے بعد بتایا کہ میرے علاوہ بھی ان کے اور بہت سے شاگرد تھے۔ ممکن ہے ''ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم وراہ میری'' والا طریقہ رہا ہو۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ دبستان شبلی کے پروردہ اور علامہ شبلی نعمانی کے تربیت یافتہ تھے، اس لئے ان کے اصلاح کا طریقہ بنیادی طور پر وہی تھا جو علامہ شبلی نعمانی اور اس دور کے دوسرے اساتذہ فن کا تھا۔ میں نے تقریباً ڈیڑھ دو سالوں میں چار پانچ مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے کلام پر اصلاح لی۔ مجھے ان کی زندگی کے آخری ایام میں شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے

کہ موصوف کو کسی خاص موضوع پر نظم یا اشعار کہنے تھے۔ میں بھی موجود تھا، انھوں نے موضوع بتایا اور فرمایا کہ اس پر میں بھی طبع آزمائی کرتا ہوں تم بھی کوشش کرو مجھے اس وقت ان کا یہ طریقہ سمجھ میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی پسند آیا تھا، اس لئے میں اندر اندر تھوڑا بددلی بھی محسوس کر رہا تھا لیکن بعد میں سمجھ میں آیا کہ ان کی اصلاح کا یہ عملی اور مشقی تجربہ انتہائی مفید اور کارآمد تھا، جس کی مثال کسی اور استاد شاعر کے یہاں شاید ہی مل سکے۔ اسلم سہیل صاحب نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا کہ نیاز فتح پوری ایڈیٹر ''نگار'' سے استاد محترم کے اچھے مراسم تھے، خط و کتابت بھی ہوتی تھی، وہ سہیل صاحب کی علمی، ادبی، شعری اور فنی صلاحیتوں کے معترف بھی تھے اور انھیں کے بقول ''اقبال احمد خاں سہیلؔ ہمارے صوبے کے ان چند افراد میں سے ہیں جن کو قدرت نے غیر معمولی ذہانت عطا کی ہے۔ ان کی ادبی عظمت، شاعرانہ اہلیت اور علمی گراں مایگی طبقۂ خاص سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اقبال سہیل سیاسی انداز کی موضوعاتی نظمیں اور غزلیں خوب کہتے ہیں، مگر ان کے یہاں تغزل کی کمی پائی جاتی ہے۔'' ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کسی شعر میں استاد محترم نے دشت و دمن کا استعمال کیا تھا، نیاز صاحب نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ دمن دراصل دامن کا مخفف ہے۔ سہیل صاحب نے اساتذہ کی مثالیں پیش کیں مگر نیاز صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ اس سلسلہ میں بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتا، آپ نے جو جاننا چاہا تھا میں نے بتا دیا۔

سراج لکھنوی اپنے دور کے استاد شاعر ہیں، ایک شعری ترکیب کو لے کر سراج لکھنوی اور آثر لکھنوی میں نوک جھونک شروع ہوگئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ سراج لکھنوی نے اپنے ایک شعر میں ''فریب شکریہ'' کی ترکیب باندھی تھی، شعر درج ذیل ہے:

میرے شعروں میں فریب شکریہ شامل نہیں
دور ہی رہئے دھواں دیتی ہوئی فریاد سے

مذکورہ شعر پر آثر لکھنوی کا اعتراض تھا کہ ''فریب شکریہ'' کی ترکیب درست نہیں ہے۔ یہ بحث روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کے مراسلہ کے کالم میں بہت دنوں تک جاری رہی، آخر میں یہ طے ہوا کہ اس معاملے میں اقبال سہیل صاحب سے فیصلہ کرایا جائے اور وہ جو کہیں اسے ہی درست مان لیا جائے لیکن اقبال سہیل صاحب نے یہ کہہ کر اپنا دامن بچا لیا کہ یہ بحث ہی بے کار ہے کسی اچھے شعر اور اہم فنی

معاملے پر بحث ہونی چاہئے یہ کوئی کام کا شعر نہیں ہے، اس لئے اس بحث میں فضول وقت ضائع کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، موصوف کے اس دوٹوک جواب کے بعد لوگوں نے پنڈت آنند نرائن ملا سے رجوع کیا، ملا صاحب نے ''فریب شکریہ'' کی ترکیب کو جائز اور درست قرار دیا، اس طرح اس بحث کا اختتام ہوا۔

اقبال سہیل صاحب کے شاگردوں میں افتخار اعظمی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ افتخار اعظمی کے والد کا نام عبدالعلی تھا۔ یہ جے گہاں کے رہنے والے تھے، عبدالغنی صاحب جو افتخار اعظمی کے چچایا بڑے والد تھے اور انکم ٹیکس کمشنر تھے، میرے والد سے بھی ان کی راہ ورسم تھی، انکم ٹیکس کے ایک معاملے میں عبدالغنی صاحب نے میرے والد کی بڑی مدد بھی کی تھی اور معاملہ کے حتمی حل میں اہم کردار بھی نبھایا تھا، افتخار اعظمی ان کے چہیتے شاگردوں میں تھے، افتخار اعظمی اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ہی ایک بہترین مقرر اور خطیب بھی تھے۔ ان کے لائق وفائق شاگردوں میں یحییٰ اعظمی بھی تھے جو دارالمصنفین سے وابستہ تھے اور اچھی شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں جن میں سے ایک کا نام ''نوائے حیات'' ہے، اقبال سہیل صاحب نے یحییٰ اعظمی سے پہلی بار میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا: ''یہ میرے دوست حافظ محبوب علی صاحب کے لڑکے اسلم ہیں اس لئے میرے بھی محبوب ہیں۔'' اسلم سہیل صاحب نے مزید بتایا کہ دارالمصنفین والے یحییٰ اعظمی کے علاوہ ایک اور یحییٰ اعظمی بھی تھے جو نہ شاعر تھے اور نہ ہی سہیل صاحب کے شاگرد تھے۔ نیتاقسم کے آدمی تھے اور کامریڈ یحییٰ اعظمی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ انھوں نے سہیل صاحب کی زندگی میں ہی ''اقبال سہیل اکیڈمی'' کے نام سے ایک بزم قائم کی تھی اور سہیل صاحب کے کلام کی اشاعت کی غرض سے ان سے کلام بھی حاصل کرلیا تھا مگر نہ کلام کی اشاعت ہی ہوسکی اور نہ ہی انھوں نے کلام ہی واپس کیا جس کا سہیل صاحب کو کافی قلق بھی تھا اور ان سے کافی ناراض بھی تھے۔

پروفیسر حاذق جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد تھے، سہیل صاحب کے اچھے شاگرد تھے۔ سہیل صاحب سے باقاعدہ اصلاح بھی لیتے تھے اور کبھی کبھی کسی ہنگامی موقع پر سہیل صاحب برجستہ کلام کہہ کر انھیں دے بھی دیا کرتے تھے۔ ایک ہادی اعظمی نامی شاعر بھی ان کے شاگرد تھے اور باقاعدہ کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ سہیل صاحب اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح کے ساتھ ہی دو ایک شعر

اپنی طرف سے کہہ کر شامل کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہادی اعظمی کی غزل کا ایک مشہور شعر دراصل اقبال سہیل کا ہی ہے جو انھوں نے میرے سامنے کہہ کر ان کی غزل میں شامل کر دیا تھا۔ شعر ملاحظہ ہو۔

قائم ہیں پستیوں ہی سے ساری بلندیاں
ممکن نہیں زمیں نہ رہے آسماں رہے

مرزا احسان احمد بیگ اور اقبال سہیل میں بڑی قربت تھی۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں دونوں تقریباً چار سال تک ساتھ رہے، اگر چہ اقبال سہیل عمر میں احسان احمد بیگ سے دس بارہ سال بڑے تھے، ان کے انتقال پر مرزا احسان نے ان کی شخصیت اور کمال ادب وشاعری پر ایک بھرپور مضمون بھی لکھا تھا جو تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ امجد غزنوی اقبال سہیل کے ایک ایسے شاگرد تھے جو انھیں کی طرح شاعر، قانون داں اور سیاسی رہنما بھی تھے۔ اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے، وہ ممبر اسمبلی بھی رہ چکے تھے۔ محمد پور میں نیشنل انٹر کالج انھیں کا قائم کردہ ہے اور زندگی بھر وہ اس کالج کے سربراہ رہے۔ جگر مرادآبادی کی شاعری میں کئی استاد تھے۔ انھوں نے کچھ سالوں تک اقبال سہیل سے بھی اپنی غزلوں پر اصلاح لی تھی۔ منیر اعظمی (دیوگاؤں) اقبال سہیل صاحب کے محرر تھے۔ حافظہ انتہائی مضبوط اور یادداشت بڑی قوی تھی۔ اقبال سہیل صاحب کا بیشتر کلام انھیں زبانی یاد تھا اور "حافظ کلام سہیل" کے نام سے مشہور بھی ہو گئے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں انھیں شاعری کا شوق ہوا تھا۔ خود بھی کہتے تھے اور اقبال سہیل بھی انھیں کہہ کر دے دیا کرتے تھے۔ آواز اچھی تھی اور پڑھنے کا انداز بھی خوب تھا۔ اختر مسلمی بھی ان کے ایک اہم شاگرد تھے۔ اقبال سہیل کے مشاعروں میں شرکت کرنے سے متعلق پوچھے جانے پر اسلم سہیل صاحب نے فرمایا کہ بحیثیت شاعر وہ مشاعروں میں میرے وقت میں کم ہی شرکت کرتے تھے۔ عموماً مشاعروں میں مہمان خصوصی ہوتے تھے یا صدارت فرماتے تھے، لیکن چاہے وہ شاعر کی حیثیت سے شریک ہوں یا مہمان خصوصی یا صدر کی حیثیت سے اعزازیہ یا معاوضہ کے نام پر پیسے وغیرہ قطعی نہیں لیتے تھے۔ جون پور میں محمد حسن انٹر کالج یا دوسرے اداروں کے مشاعروں میں تشریف لاتے تھے مگر اکثر ان کا کلام اختر مسلمی ہی پڑھ کر سناتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی مشاعروں میں شرکت کرنے اور کلام سنانے کی اجازت دی تو مگر بقول ان کے "شاعری فروشی" سے سخت منع فرمایا تھا۔

میرے یہ دریافت کرنے پر کہ آپ کا کلام کن اخبارات ورسائل میں شائع ہوا؟ اسلم سہیل نے فرمایا کہ کلام کی اشاعت کے بارے میں میں نے بھی استاد گرامی کی طرح کبھی بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا، اور میرا ابھی تک کوئی مجموعہ یا دیوان بھی شائع نہیں ہوسکا ہے پھر بھی وقتاً فوقتاً جن اخبارات ورسائل میں میری تخلیقات شائع ہوئی ہیں ان میں روزنامہ ''آزاد ہند'' (کولکاتا)، روزنامہ ''آواز ملک'' (بنارس) ہفت روزہ ''دیار پورب'' اور نئی دنیا'' (جون پور) ماہنامہ ''شمع'' (دہلی)، ''شاخسار'' (کٹک)، لوح وقلم (پاکستان)، ''ادب نکھار'' اور ''ادبی گزٹ'' (مئو ناتھ بھنجن) وغیرہ قابل ذکر اخبارات ورسائل ہیں۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ میں نے حمد ونعت منقبت، قصیدہ، غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مثنوی اور سہرا وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے لیکن نعت ومنقبت، نظم وغزل اور رباعی وقطعہ نگاری میں خاص دلچسپی رہی ہے۔ اقبال سہیل صاحب کے انتقال پر بہت سے لوگوں نے تعزیتی نظمیں لکھی تھیں، جن میں یحییٰ اعظمی کی ''غروب سہیل'' اور آہ حضرت سہیل، کرشن سہائے وحشی کی ''آہ اقبال سہیل'' حافظ عبدالمتین رسڑوی کی ''خراج عقدیت'' صبا جائسی کی ''سوز وساز'' امجد غزنوی کی ''یاد سہیل'' ابوبکر آثر انصاری کی ''علامہ اقبال سہیل مرحوم'' محمد حنیف خاں کا ''قطعہ تاریخ وفات مولانا سہیل مرحوم'' اور حامد حسن قادری کی ''تاریخ گلشن یاران میکدہ'' قابل ذکر ہیں۔ میں نے بھی ان کے انتقال پر ملال پر دو نظمیں کہی تھیں جن کے عنوان ہیں: ''آہ اے اقبال احمد خاں سہیل''، اور آہ اقبال سہیل'' جو ''نئی دنیا'' جون پور میں شائع ہوئی تھی۔ میرے علاوہ بھی جون پور کے جن شعراء نے انھیں منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ ان میں پروفیسر غلام سمنانی، منشی محسن رضا جونپوری اور عزیز ربانی عزیز شامل ہیں۔

بات سے بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے دوستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انوار احمد صدیقی جو بڑے گاؤں الٰہ آباد کے رہنے والے تھے، ان کے والد اولند گنج تھانہ میں منشی تھے اور جون پور میں رہتے تھے، میرے قریبی دوستوں میں تھے۔ اسی طرح وحید اشرف جو اس زمانے میں جون پور میں رہتے تھے اور بیت بازی میں اکثر میرے شریک کار رہا کرتے تھے، ان کا شعری ذوق بھی بہت اچھا تھا۔ ان کے بڑے بھائی امین اشرف بھی شاعر تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں استاد تھے۔ کامل شفیقی جو انقلابی اور سیاسی نظموں کے لئے مشہور تھے اور مشاعروں میں

ایک منفرد انداز اور طمطراق سے پڑھنے میں بے مثل مانے جاتے تھے، مجھ سے تقریباً دو تین سال سینئر تھے مگر ہم دونوں میں اچھے دوستانہ مراسم تھے۔ ہم عصر اور مقامی شاعروں میں سید غلام سمنانی، عزیز ربانی عزیز، کامل بی۔اے۔ اثر جونپوری اور محسن رضا جونپوری وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ میں نے بھی استاد محترم کی طرح استادی شاگردی کی روایت کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ نادم جون پوری (دربانی پور) سہیل ازل، اکرم جون پوری، اشرف جون پوری، قاری ضیاء جون پوری، برباد جون پوری اور واحد جون پوری (مرحوم) میرے شاگردوں میں ہیں اور راقم کو بھی کبھی کبھی ان سے مشورۂ سخن کرنے کا شرف حاصل ہے۔

جناب اعظم سہیل صاحب سے میرا آخری سوال یہ تھا کہ وہ کون سی امتیازی خصوصیات ہیں جو فن شاعری میں آپ کو اپنے استاد مولانا اقبال سہیل سے حاصل ہوئی ہیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ وہ امتیازی وصف عروضی نوعیت ہے۔ مثلاً اقبال سہیل کی شاعری یا شعروں کی تقطیع میں ارکان الگ نہیں ہوتے، میرے شعروں میں بھی ارکان الگ نہیں ہوتے، اسی طرح میرے شاگرد اکرم جون پوری کے یہاں بھی ارکان الگ نہیں ہوتے ہیں۔

☆☆☆

کلام سہیل کی چند فکری جہتیں

ڈاکٹر قمر اقبال☆

بیسویں صدی کا نصف اول ہندوستان کی تاریخ کا جہاں سیاسی حوالہ سے بڑی کشمکش کا دور رہا ہے وہیں اس دور کو ادب عالیہ کی تخلیق کے تناظر میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اس وقت بہت اعلیٰ پایہ کا ادب تخلیق پایا۔ اردو کو بھی اس سے استثنا حاصل نہیں ہے۔ اس زبان میں بے شمار ادباء و شعراء پیدا ہوئے جنہوں نے ادب کو مالا مال کیا۔ زندگی کی حرتوں کو اس وقت کے ادباء و شعراء نے بڑے عمدہ پیرائے میں الفاظ کا پیرہن عطا کیا۔ ادب کے افق پر شعراء و ادباء کی پوری کہکشاں آباد ہے کچھ تو ایسے ہیں جنہیں آج کا عام قاری نہیں جانتا لیکن کچھ ایسے ہیں جنہیں آج بھی قبولیت عام و خاص ہے۔ ایسے ہی فنکاروں کی فہرست میں ایک ممتاز نام اقبال احمد خان سہیل کا بھی ہے۔

اقبال احمد خان سہیل کا تعلق مشرقی یوپی کے اعظم گڑھ ضلع سے تھا۔ وہی ضلع جس کی خاک سے شبلی و فراہی جیسے نابغہ روزگار پیدا ہوئے۔ سہیل نے بھی شبلی و فراہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا پھر دروغ برگردن راوی بیگم صاحبہ کے طعنہ کی لاج کی خاطر علی گڈھ کے علمی میکدے میں اپنی پیاس بجھانے پہنچ گئے۔ اس وقت کے علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا کا کیا کہنا، رشید احمد صدیقی جیسا اردو کا جادوگر وہاں موجود تھا۔ ان کی ہم مشربی سہیل کو حاصل ہوئی۔ ذاکر حسین جیسا علم و تحقیق کا شیدائی بھی اس وقت علی گڈھ ہی میں تھا۔ ان سب کی معیت نے اقبال سہیل کی شاعری کے ملکہ کو صیقل کیا۔

اقبال سہیل مولوی تھے پھر علی گڈھ آ کر قانون کی ڈگری حاصل کی۔ معاشرہ کے لئے صرف ایک صفت سے متصف ہونا کافی ہوتا ہے۔ اقبال سہیل کے اندر دو چیزیں جمع ہو گئی مولویت اور وکالت

☆ شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

پھر بھلا ان کا مقابلہ کون کر سکتا تھا۔ ربا کے ضمن میں ان کی کتاب میں دونوں چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں

اب ذرا ان کی شاعری کے حوالہ سے کچھ گفتگو ہو جائے۔ کلیات سہیل پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہو جائیگا کہ ان کی شاعری کا کینوس بڑا وسیع تھا۔ ایک طرف تو وہ آزادی کے متوالے سپاہی نظر آتے ہیں جو اپنے فن سے دامن غلامی چاک کر دینا چاہتا ہے تو دوسری طرف نعت ومنقبت میں جہاں بڑے بڑے ٹھوکر کھا جاتے ہیں انہوں نے کمال احتیاط کے ساتھ اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں وہیں ظریفانہ شاعری ان کی فطری صلاحیتوں کی غماز ہے۔ سہیل نے غزل کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس میں بھی سرفراز رہے ہیں۔ سہیل پٹھان نسل سے تعلق رکھتے تھے، لیکن غزلوں میں جس نفاست کا مظاہرہ انہوں نے کیا ہے اس کی توقع کسی پٹھان سے کم ہی ہوتی ہے۔ بنت عنب سے عشق کی بھی کوئی روایت نہیں ملتی ہے کہ جس نے ان کے شعر کو نازکی عطا کر دی اور غزلوں میں ایسی موسیقیت جیسے کسی آبشار سے گرتے پانی کی دھیمی دھیمی آواز الغرض سہیل ایک مکمل شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے جگر سوزی کو ساز بنا دیا۔

اقبال سہیل کی شاعری کی جملہ جہتوں پر گفتگو ایک مکمل کتاب کی متقاضی ہے۔ اس مختصر مقالہ میں ان کی غزلوں میں ایسے عناصر کی طرف اشارہ کیا جائیگا جو زندگی کے ان اسرار کی پردہ کشائی کرتے ہیں جس سے انسان ازل سے نبرد آزما رہا ہے۔ سہیل کی غزلوں میں جابجا ایسے اشعار موجود ہیں جو بڑے سادہ اور دلکش انداز میں رازہائے زیست کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ زندگی کے جملہ مسائل، حسن وعشق کی سحر کاریاں، شریعت وطریقت وتصوف کی باریکیاں اخلاقیات کے پیمانے، الغرض ان کی غزلوں میں ایسے بہت سے اشعار ہیں جو ان کو فکری طور پر بلند ترین شعراء کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ اس لئے کسی نے بجا لکھا ہے کہ" مولانا کو صرف وطن کا شاعر سمجھنا اور ان کی عاشقانہ فلسفیانہ اور صوفیانہ شاعری سے بحث نہ کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ (تابش سہیل افتخار اعظمی ص ۱۱۰)۔ خود سہیل کو بھی اسکا احساس تھا کہ شاعری سحر سے گذر کر اعجاز اسی وقت بن سکتی ہے جب شاعر رنگ وبو کی تصویر کشی سے گذر کر فلسفہ وحکمت کے نکتہائے سربستہ اسی جدت بیان اور اسی حسن مصوری سے ادا کرے۔ گویا کہ ان کے مطابق شاعری کے کمال کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب حقائق ومعارف کو گل وبلبل کی زبان اور بادہ وساغر کے رنگ میں پیش کی جائے۔ (افکار سہیل تبصرہ بر نشاط

روح ۱۲۷۰/۱۲۸۰)۔ چنانچہ اسی کمال کی تلاش سے ان کی غزلیں مملوٗ ہیں۔ ذرا انکے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

سو سجدے ایک لغزش مستانہ وار میں
اللہ کیا ادا ہے تیرے بادہ خوار میں
خمار نرگس ساقی کا فیض کیا کہنا
تڑپ رہی ہے نگاہوں میں موج بادہ نور

ایسے بے شمار اشعار ان کی غزلوں میں جابجا پائے جاتے ہیں۔ کمال و اعجاز کی تلاش سہیل کو ایسے معانی کی ادائیگی کی طرف لے جاتی ہے جہاں تک عام شعراء کی رسائی کم ہی ہو پاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سہیل زندگی کے اسرار کی تلاش میں تصوف کی پر پیچ وادیوں کی سیر کرنے سے نہیں گھبراتے جہاں ان کی عقیدت کی مہار بصیرت کے ہاتھ میں ہے محبت اور عشق کے راستے حق کی تلاش تو ان کے یہاں موجود ہے لیکن حق کی تلاش کمال ضبط کو اپنے ساتھ رکھتی ہے، وہ کسی طور پر گوہر مقصود کو دنیا کے سامنے آشکارہ ہونے دینا نہیں چاہتی اسی لئے وہ کہتے ہیں

راز وہ کیا جو آگیا لب پر　　ساز وہ کیا جو بے صدا نہ ہوا

راز کی پردہ پوشی شاید ان کے عشق کی انتہا ہے اس لئے تو ان کے مطابق۔

منصور جو ہوتا اہل نظر تو دعوی باطل کیوں کرتا
اس کی تو زباں کھلتی ہی نہیں جو راز کا محرم ہوتا ہے

دعوی عشق ان کی نظر میں قابل اعتماد اسی وقت ہو سکتا ہے جب محبوب کو کسی طور پر بھی بے پردہ نہ کیا جائے محبت شاید محبوب کو چپکے چپکے دل کی گہرائیوں میں بسا لینے کا نام ہے کیونکہ راز ہستی تک رسائی بلا کمال ضبط کے ممکن نہیں ہے۔

سہیل جس تلاش معشوق میں سرگرداں نظر آتے ہیں وہاں تک رسائی میں دانائی و بینائی کی کوتاہ دستی کا ان کو احساس ہے اس لئے عقیدت کی پناہ میں پہنچ جاتے ہیں اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے۔

جو تصور سے ماورا نہ ہوا　　وہ تو بندہ ہوا خدا نہ ہوا

محبوب تک رسائی میں عقل تو چھوڑ دیجئے تصور بھی مدد نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو انسان کو طرح طرح کی تصویر کشی پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی تصور کے راستے محبوب کی اپنی اپنی پسند کے حساب سے صورت گری کی جاتی ہے، جو تصور سے بالاتر نہ ہو وہ کسی طور پر معبود یا معشوق حقیقی بننے کے قابل نہیں ہے۔ اگر معبود کا تصور سے ماورا ہو کر صرف عقیدت پر انحصار ہو تو یقیناً کوئی تصویر نہیں بن پائیگی۔ صنم آشنائی کی کوشش تو انسان کرتا رہیگا انسان لگاتار رازِ ہستی کو پانے کی جستجو میں رہے گا۔ لیکن اگر تصور سے ماورا ہو کر ادراک کی کوشش رہے گی تو صنم تراشی اور پیکر تراشی کا سلسلہ موقوف ہو جائیگا۔

تلاش حق یا عشق کی انتہا سہیل کو ظواہر سے اغماض پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ غالب نے برملا ترک رسوم کا اعلان کر دیا تھا سہیل بھی ترک قیود تک آجاتے ہیں۔

میرا کیش ترک قیود ہے میرا سجدہ نفی وجود ہے
نہ رکوع ہے نہ سجود ہے نہ غرض قعود و قیام سے

یہی ترک قیود ان کو اس حلاج کی پیروی بننے پر آمادہ کرتی ہے جس کو انہوں نے ہدف تنقید مانا تھا کہ اس نے محبوب کی پردہ داری نہیں کی۔

وہ نعرہ حق یاد نہ وہ جوش فنا یاد اب پیرو منصور کو صرف انا یاد

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام دوسرے اہل نظر کی طرح سہیل بھی عقیدت و بصیرت کی کشاکش میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بصیرت کی کوتاہ دستی کا ان کو شدت سے احساس ہے لیکن عقیدت کو بھی بے بصیرت نہیں دیکھنا چاہتے، بلکہ ان کا فلسفہ عشق بصیرت و عقیدت کا آمیزہ ہے۔ اس میں عقیدت کو اولیت حاصل ہے ذرا دیکھے۔

خرد اب بھی ہے جس کے حل سے قاصر وہ نکتے حل کیے ہم نے یقین سے

یا

بصیرت سے پہلے عقیدت ہے لازم وہ جانے گا کیا جس نے مانا نہیں ہے

یقین کے راستے معرفت حق انسان کو بے خطر آتش نمرود میں کودنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر تلاش منزل کا سفر ختم ہو سکتا ہے۔ سہیل کو اس حقیقت کا ادراک تھا لیکن ساتھ میں وہ بصیرت سے اپنا دامن الگ نہیں کر پائے۔ گویا ایک طرح کا توازن ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔

یہی توازن ان کو ایسے لوگوں کی نکیر پر آمادہ کرتا ہے، جو قول و عمل کے تضاد کا شکار ہوتے ہیں، جو عشق کی انتہا تک پہنچنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن جن کا عمل ان کی نفی کرتا نظر آتا ہے، جو ظواہر کو یا قیود و رسوم کو انتہاء عشق سمجھ بیٹھتے ہیں اسی لئے یہ اشعار ان کی زبان سے نکل پڑتے ہیں

جناب شیخ بھی کچھ کم نہیں اقبال رندوں سے
مگر دنیا سمجھتی ہے بڑے اللہ والے ہیں

یا پھر ایک جگہ وہ کہتے ہیں:۔

شیخ کی شان زہد پردہ رند مشربی
ورنہ جوش طبع کیوں ذکر جمال حور میں

ڈاکٹر اقبال کے یہاں بھی ظاہر و باطن کا فرق قابل گرفت تھا۔ سہیل بھی عشق و محبت، خود فراموشی فنا و بقاء کے مسائل میں ڈاکٹر اقبال کے قریب تر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہیکہ دونوں کے یہاں آہ سحر گاہی کی اہمیت مسلم ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا:۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

سہیل کہتے ہیں:۔

لے دے کے محبت کا اتنا ہی فسانہ ہے
اک اشک سحر گاہی ایک آہ شبانہ ہے

سہیل کی شاعری ان تمام فکری جہتوں کا احاطہ کرتی ہے جو انسانی ذہن کو پریشان کرتی ہے۔ لیکن یہ جہتیں سہیل کو ایسے راستے پر لے جاتی ہے جہاں ان کو انبساط حاصل ہوتا ہے۔ یہی انبساط شاید کسی ادیب یا شاعر کا مقصد ہوتا ہے۔ زندگی سہیل کے یہاں بھی کسی کی شوخی تحریر کا حاصل ہے۔

کچھ اک مرے دل مضطر پر انحصار نہیں
حیات کیا ہے اگر مشق اضطرار نہیں

یہ اضطرار ان کو قنوطیت کی طرف لے جاسکتا تھا جہاں وہ کسی مجنون و صوفی کی طرح اپنی ذات

کے خول میں بند رہتے، زندگی کے مسائل کے سامنے سپر ڈال دیتے، لیکن انہوں نے ایک الگ راہ نکالی یہی الگ راہ ان کا امتیاز نظر آتی ہے۔ فانی کی طرح یاسیت ان کو بے عملی کی طرف نہیں لے گئی۔ انسانیت کی خدمت کو وہ اپنا شیوہ بنالیتے ہیں اور اس اضطرار کے کرب کو جو زیست نے ان کو دیا تھا ایک کونے میں رکھ کر باعمل زندگی جینے میں انبساط حاصل کرتے ہیں۔ اسلئے انہوں نے کہا:

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال
راحت اغیار کو دی آپ پریشان ہوکر

یا پھر:

نکہت گل کی ملی ہے مجھے تقدیر سہیل
میرے طالع کی سعادت ہے پریشان ہونا

اپنے آپ کو پریشان کر کے دوسروں کی خوشی کے لئے تگ ودو شاید دنیا کے تمام فلسفوں کی معراج ہے اور شاید پیغام قدرت بھی ہے۔ انسانیت کی خدمت دنیا کے تمام کاموں سے بڑھ کر ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے۔ سہیل نے بھی غم دل کا مداوا اسی میں تلاش کیا، یہی ان کی انفرادیت ہے۔ سہیل اپنے غزل کے سفر میں زندگی کے پریشان کن مسائل سے دوچار ہوتے ہوئے ایسی منزل پر جا پہنچتے ہیں جہاں انسانیت ہی سب کچھ ہے اور یہی چیز ان کی شاعری کو سحر سے گذر کر اعجاز بنادیتی ہے۔

کسی نے بجا لکھا ہے

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسن انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

اسی حسن انسانیت کی تلاش سے سہیل کی غزلیں عبارت ہیں اور اہل دانش کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

☆☆☆

اقبال سہیل بحیثیت سوانح نگار

ڈاکٹر محمد اختر خاں☆

سوانح حیات غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے، جس میں فرد واحد کی زندگی اور اس کے کارناموں کا بیان ہوتا ہے۔ بعض حضرات اسے تاریخ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں، وہیں اس کے اندر پائی جانے والی بعض صفات اسے فکشن سے بھی قریب کرتی ہیں۔ تاریخ اور فکشن سے یکگونہ مناسبت اور جزوی مماثلت کے باوجود یہ صنف اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتی ہے۔ سوانح نگاری میں ادبیت، لطافت اور شگفتگی کے ساتھ شعوری طور پر تاریخ سے بھی مدد لی جاتی ہے، تاکہ اس دور کے سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور معاشی کشمکش کو سمجھا جاسکے، کیوں کہ کسی انسان/فرد واحد کی شخصیت، سیرت اور ذہنی ارتقا کو اس کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔

انسانی زندگی واقعات/سانحات سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ ہر واقعہ اپنی جگہ پر اہم اور دلچسپ بھی ہوسکتا ہے۔ زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات اور مسائل سے انسان کی زندگی اور اس کی شخصیت طے ہوتی ہے۔ اس لیے سوانح نگار کو اس انبوہ کثیر سے ان واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو فرد کی ذات کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرسکیں، یعنی ہر واقعہ کا بیان نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی اس سے سوانح نگاری کا فن مجروح ہوتا ہے......... اظہار بیان میں خوش سلیقگی اور واقعات کی ترتیب وتدوین میں حسن ترتیب اہم اور بنیادی شئے ہے، یعنی سوانح حیات صرف واقعات کی کھتونی نہیں، بلکہ یہ فرد کے ظاہر و باطن، عادات واطوار، اخلاق وکردار اور نفسیاتی کیفیات کے نشیب وفراز کی مکمل داستان ہے جس میں فرد کی زندگی کے خدوخال ابھرتے، ڈوبتے اور کردار کے اساسی پہلو سامنے آتے ہیں، سوانح حیات کی تعریف بیان کرتے ہوئے اردو کے معروف دانشور قاضی افضال حسین لکھتے ہیں:

☆ صدر شعبۂ اردو، وسنت کالج برائے خواتین، بنارس

''کسی ایک شخص کی حیات اور سیرت کے متعلق، کسی دوسرے شخص کا مرتب کیا ہوا بیانیہ سوانح کہا جاتا ہے، یعنی سوانح فرد کی حیات و سیرت کی وہ تفصیل ہے جو خود موضوع کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مرتب کرتا ہے۔ اس لئے خودنوشت کے واحد متکلم کے مقابلے میں سوانح کا بیانیہ صیغہ واحد غائب میں مرتب کیا جاتا ہے۔'' (قاضی افضال حسین۔ صفیات۔۔ ص۲۱۵، ۲۱۶)

چیمبرس انسائیکلوپیڈیا کے مطابق جس ادب کو سوانح عمری کہا جاتا ہے، اس کو ابتدا ہی سے تاریخ کی ایک شاخ سمجھا جاتا رہا ہے۔ تاریخ کا نام دینے والوں میں ڈرائیڈن کو اولیت حاصل ہے۔ لیکن اس نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اس میں تاریخ کے علاوہ بھی کچھ اور عناصر شامل ہوتے ہیں، یعنی کچھ اور اسے تاریخ سے ممتاز کرتی ہے۔ ڈکشنری اور انسائیکلوپیڈیا میں سوانح عمری کی تعریف اس طرح درج ہے:

''سوانح عمری بطور ایک ادبی صنف کے فرد کی زندگی کی تاریخ ہے۔''

(آکسفورڈ ڈکشنری)

''سوانح شعوری اور فنی پہلوؤں سے کسی شخصیت کے کارناموں اور حرکات وسکنات کا ایسا بیان ہے جس سے اس کی شخصیت کی بازیافت ہوتی ہے۔''

(انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا)

''سوانح حیات کسی مخصوص فرد کی زندگی اور کردار کے مسلسل بیان کا فنکارانہ اظہار ہے۔'' (چیمبرس انسائیکلوپیڈیا)

''سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہوتی ہے، اس کا مقصد جہاں تک ہوسکے، دیانت داری کے ساتھ کسی فرد کی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ مورخ اور مصور دونوں حیثیتوں سے کام کرے۔ مصور کا فرض کیا ہے؟ تصویر سازی کے لئے بیٹھنے والے شخص کی ایسی شبیہ تیار کرنا جو نہ صرف اس سے ملتی جلتی ہو، بلکہ فن کا نمونہ بھی ہو۔'' (انسائیکلوپیڈیا آف امریکا)

ان تعریفات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ سوانح حیات تاریخ اور فکشن سے میل کھاتے ہوئے بھی مختلف اور متنوع ہے، ایک سوانح نگار کسی شخص کو مصور اور مورخ دونوں نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور پھر

حقائق کو تاریخی تناظر میں پیش کرتے وقت اس میں ادبی چاشنی اور لطافت کا رنگ بھی بھر جاتا ہے، جس سے اس میں خشکی کے بجائے شگفتگی اور تازگی در آتی ہے۔ بسا اوقات یہ رنگ اتنا چوکھا ہوتا ہے کہ قاری کو اس پر فکشن کا گمان گزرتا ہے اور اس میں افسانوی ادب سے سوا حظ محسوس کرتا ہے............ کیف ونشاط کا یہ عنصر نہ صرف سوانح کو تاریخ سے ممتاز کرتا ہے، بلکہ فکشن کے دھند کو بھی ہلکا کرتا ہے............ سوانح نگار صرف ان ہی تاریخی واقعات کا انتخاب کرتا ہے جو موضوع کی سیرت کی تعمیر وتشکیل میں معاون ہو سکتے ہیں یعنی صرف واقعات کا تسلسل سے بیان کر دینا کافی نہیں بلکہ اہم اور غیر اہم میں امتیاز ازحد ضروری ہے۔ اگر فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو واقعات کے انتخاب، اظہار بیان پر قدرت، حسن ترتیب کے ساتھ سوانح نگار کے اندر تخلیقی شان بھی ہونی چاہیے۔

سوانح نگار کے سامنے، بہت سارے چیلنجز ہوتے ہیں، جن سے معاملہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک باکمال سوانح نویس اس آزمائش کی گھڑی میں بھی ان وسائل کو دریافت کر لیتا ہے، جو اس کے معاون ہو سکتے ہیں............ سوانح نگار کو تخلیقی وسائل سے لے کر جذبات واحساسات تک کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے، لیکن بہت ہی احتیاط کے ساتھ یعنی آزادی سے زیادہ اسے بندشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایک شاعر/فکشن نگار کی طرح اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی کے لئے آزاد نہیں۔ اس کے علاوہ اسے محبت ونفرت، عقیدت ویگانگت کے جذبے پر بھی قابو پانا ہوتا ہے جو بڑا مشکل عمل ہے۔ ہر سوانح نگار کو اپنے موضوع سے ترجیحی طور پر ہمدردی ہوتی ہے۔ اس لئے جذبات کے رو میں بہہ جانا ایک فطری عمل ہوتا ہے، جب کہ اس فن کے ماہرین معروضیت کو لازمی قرار دیتے ہیں، تاکہ سوانح نگار تحسینی کلمات کے استعمال اور مداحی میں محتاط رہ سکے اور دلائل وشواہد کی بنیاد پر ہی اپنے ہیرو کی تحسین، تنقیص کرے۔

جانسن کا خیال ہے کہ سوانح نگار کو صداقت، وضاحت اور نفسیاتی کیفیت پر خصوصی توجہ صرف کرنی چاہیے، باسول جو جانسن کے مقربین میں سے تھا اس کے اندر ایک اچھے سوانح نگار کی خوبیاں بڑی حد تک موجود تھیں، اس نے فن سوانح نگاری کو کافی تقویت بخشی اور اس کے اجزا کو ایک لڑی میں پرونے کا کام انجام دیا۔ وہیں جدید سوانح عمری میں لائٹن اسٹریچی (Lytton strachey) کو بلند مقام حاصل ہے۔ یہ سوانح عمری میں تفصیلات کے حق میں نہ تھے۔ ان کی سوانح عمری

Eminent victorians کے دیباچے کو جدید سوانح عمری کا منشور کہا جاتا ہے۔ اسٹریچی نے ایجاز واختصار، حسنِ انتخاب، آزادیٔ خیال، معروضی انداز، بے تعصبی اور واقعات کی مناسب ترتیب وتدوین اور غیر جذباتی اندازِ بیان کو سوانح عمری کے لئے لازمی ٹھہرایا ہے، لیکن اردو کے بیشتر سوانح نگاروں کے یہاں ان اصولوں کی پاسداری نظر نہیں آتی ہے۔

اردو کے اولین سوانح نگار حالیؔ اور شبلیؔ ہیں، ان دونوں حضرات نے سوانح عمری کے فنی خصائص کو سامنے رکھتے ہوئے، اخلاقی زاویے پر بھی زور دیا ہے۔ حیاتِ سعدی، حیاتِ غالب اور حیاتِ جاوید میں باسول کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ حیاتِ جانسن جو کہ باسول کی تصنیف ہے، اس کے مقابل اگر اردو کی کوئی سوانح عمری رکھی جاسکتی ہے تو وہ حیاتِ جاوید ہے، جسے علامہ شبلی نے ''مدلل مداحی'' سے تعبیر کیا ہے۔ حالیؔ کو اپنی کوتاہیوں کا شدید احساس تھا، ان سب کے باوجود وہ ہمارے پہلے اور معتبر سوانح نویس ہیں۔ اس کے بعد شبلی نے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا اور ناموران اسلام کا سلسلہ شروع کیا۔ تاریخی پہلو کے علاوہ اور کوئی خاص جدت ان کے یہاں نظر نہیں آتی، جس کی بنیاد پر شبلی کو حالی پر فوقیت دی جاسکے۔ اس کے بعد شبلی کے کئی شاگرد اس میدان میں آئے اور سوانح عمریاں لکھیں جن میں ''سیرتِ شبلی'' ناتمام اور ''حیاتِ شبلی''، مفصل مگر نامکمل کہی جاسکتی ہے۔

حلقۂ شبلی میں سے جن حضرات نے آسمان کی بلندیوں کو چھوا اُن میں ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی اور اقبال سہیل بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ یہ شبلی کے خاص شاگردوں میں سے ایک تھے، مبدأ فیاض نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا، ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ ایک بار پڑھا یا سنا وہ ازبر ہوگیا۔ اقبال سہیل کی ذہانت اور حافظے کا ذکر کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''مرشد (ذاکر صاحب) اور مولانا سہیل عہدِ حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں میں منفرد ہیں، میں نے ان سے زیادہ کسی کو طباع، ذہین اور بے پناہ نہیں پایا، مولانا کی ذہانت اور حافظے کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ جس چیز کو انھوں نے عمر میں کبھی کبھار دیکھا پڑھا تھا، اس پر ان کو اس درجہ عبور ہوتا تھا اور ادنیٰ جزئیات پر بھی ان کو اتنی قدرت ہوتی تھی کہ اس پر نہایت اعتماد کے ساتھ درس دے سکتے تھے۔'' (ضیاء الرحمن

صدیقی، اقبال سہیل کا فن۔ ص ۱۴)

اقبال سہیل ایک عمدہ اور پر گو شاعر کے ساتھ اچھے نثر نگار بھی تھے، تنقید، تبصرہ اور تقریظ کے علاوہ انھوں نے ''سیرت شبلی'' کے عنوان سے ''الاصلاح'' سرائے میر میں حیات شبلی اور ان کے علمی وادبی کارناموں پر قسط وار لکھنا شروع کیا تھا، لیکن صرف پندرہ قسطیں لکھ کر خاموش ہو رہے۔ کوئی صاحب ذوق، معاصر ان کو دوبارہ اس طرف مائل نہ کر سکا، ورنہ وہ شبلی کے اولین سوانح نگار ہوتے۔ ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ''حیات شبلی'' کے مصنف سید سلیمان ندوی جیسے متبحر عالم نے بھی ان مضامین سے استفادہ کیا ہے اور بعض مقامات پر طویل اقتباس بھی نقل فرمایا ہے۔

''سیرت شبلی'' کا شان نزول کیا ہے، اس حوالے سے بعض بیانات ملتے ہیں، شبلی کی وفات کے بعد کئی برس تک ان کی سوانح عمری کا معاملہ معلق رہا۔ اولاً یہ کام مولانا عبدالسلام ندوی کے سپرد ہوا، انھوں نے بہت کچھ مواد یکجا بھی کر لیا تھا، لیکن اطمینان بخش نہ تھا، لہٰذا اس کام کو ان کے لائق شاگرد اقبال سہیل کے سپرد کیا گیا، پھر کیا ہوا؟ پورا واقعہ سید سلیمان ندوی کی زبانی سنئے:

> ''خاکسار نے سیرت کی مصروفیت اور خاندانی اور ابتدائی حالات کے عدم واقفیت کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق اور شریک کار عبدالسلام ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہم وطنی کا تعلق رکھتے (تھے) ہیں۔ اس لئے وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ خاندانی حالات کے ساتھ مکاتیب شبلی کے متفرق معلومات کو بہ ترتیب یکجا کر دیا، ان اوراق کو مولانا شروانی اور مولانا مرحوم کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی۔ پھر یہ کام مولانا کے شاگرد مولوی اقبال .... کے سپرد کیا گیا کہ وہ مولانا کے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زور قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی۔''

(سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۵، دارالمصنفین اعظم گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

'سیرت شبلی' کے لئے ایک لائق آدمی کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ ان کی معلومات بھی اس موضوع پر مناسب تھی۔ اقبال سہیل نے اس کام کو ایک اہم فریضہ سمجھ کر قبول کیا، علی گڑھ ہو کر آئے تھے، اس لئے وہاں کے بہت سے واقعات ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ انھوں نے 'الاصلاح' میں سیرت شبلی کے عنوان سے لکھنا بھی شروع کیا اور خوب لکھ رہے تھے۔ پندرہ قسطیں شائع ہوئیں پھر تاریکی نے اپنا رنگ دکھایا اور اقبال سہیل نے اپنی تساہلی، وہ اقبال سہیل جو ایک اچھے شاعر، ناقد، وکیل اور سیاست داں تھے۔ سوانح نگاری کے میدان کو بھی اپنے زورِ قلم سے سر کر سکتے تھے، لیکن عملی سیاست اور عدم توجہی کی وجہ سے یہ کام نہ ہو سکا، جس کی وجہ سے علم و ادب کے شائقین کو مایوسی ہوئی۔ اقبال سہیل کے دھیان کو اس طرف کھینچنے کے لئے اس کا دیباچہ بھی شائع کیا گیا، تاکہ ان کو سرگرمِ عمل رکھا جا سکے۔ دیباچہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کسی سازگار ساعت میں موصوف نے کچھ صفحات لکھے تھے اور خبر ہے کہ آج کل طبیعت اس کی طرف متوجہ ہے۔ اس تقریب سے دیباچہ کے صفحات 'الاصلاح' میں شائع کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہو توجہ کو سرگرم رکھنے میں یہ تحریک کچھ معاون ہو سکے اور قلم دو چار منزل چل نکلے۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں اس کی بعض اور اقساط شائع ہو سکیں گی۔ یہ تحریر پڑھ کر تمنا ہوتی ہے کہ کاش یہ پرزور قلم علم و ادب کی کسی مستقل خدمت میں مشغول ہوتا۔'' (بحوالہ سیرت شبلی/فضل الرحمن اصلاحی/ص ۲، دارالمصنفین اعظم گڑھ نومبر ۲۰۱۲ء)

یہ دیباچہ بھی اقبال سہیل کو اس طرف متوجہ نہ کر سکا، جس کی اشاعت کا مقصد ہی تھا کہ ان کے دھیان کو اس طرف کھینچا جائے تاکہ وہ مزید کچھ خامہ فرسائی کر سکیں، لیکن عملی سیاست سے زیادہ ان کی غفلت کیشی اور تساہلی نے اپنا رنگ دکھایا اور 'سیرت شبلی' کا مسودہ مناسب وقت کا انتظار کرتا رہ گیا۔ 'سیرت شبلی' کے حوالے سے اقبال سہیل خود کتنے سنجیدہ تھے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ بقول اخلاق احمد:

> ''سیرت شبلی'' کے عنوان سے ان کے کچھ مضامین رسالہ 'الاصلاح' سرائے میر میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک کے نمبروں میں گاہے گاہے چھپتے رہے، لیکن ان کی

> سیمابی طبیعت کو قرار ہی کب تھا کہ 'سیرت شبلی' کو 'حیات شبلی' بنا دیتا۔ 'سیرت شبلی' لکھنے کا یہ انداز تھا کہ ایک تخت کے اوپر جس پر کبھی کبھی کھانا بھی کھایا جاتا تھا۔ سفید کاغذات کے ساتھ ایک پنسل بندھی ہوتی، جب طبیعت کا میلان ہوا تو کچھ لکھ لیا گیا۔ اس طرح قوت حافظہ پر مکمل اعتماد کی وجہ سے کچھ جھلکیاں پیش ہوتی رہیں۔''
>
> (ضیاء الرحمن صدیقی/ اقبال سہیل کا فن/ص ۱۶۹)

یعنی سوانح نگاری کے لئے جس سنجیدگی اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اول دن سے اقبال کے یہاں دکھائی نہیں پڑتی ہے۔ ذہانت اور قوت حافظہ قابل ستائش، لیکن واقعات کو استناد بخشنے کے لئے حوالوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خود ایک اچھے وکیل تھے۔ اس مسئلہ کو ان سے بہتر کوئی دوسرا سمجھ بھی نہیں سکتا، لیکن یکسوئی کی کمی اور عدم توجہی کی وجہ سے وہ سوانح نویسی کے اس امتیازی وصف کو مسلسل نظرانداز کرتے رہے، نتیجتاً وہ اچھے اور کامیاب سوانح نگاروں کی فہرست میں اپنا نام درج نہ کرا سکے۔ اقبال سہیل کے ایک سے زائد مضامین جو 'سیرت شبلی' میں ضمیمے کے طور پر شامل ہیں، بے حد مبالغہ آمیز ہیں۔ بقول ظفر احمد صدیقی:

> ''مولانا شبلی سے متعلق اقبال سہیل کے ایک سے زائد مضامین ''افکار سہیل'' میں شامل ہیں۔ ان کا ایک مضمون 'شبلی کی جامعیت' نہایت مبالغہ آمیز ہے اور دوسرا 'شبلی کے مکاتیب' ناتمام۔'' (ظفر احمد صدیقی/شبلی معاصرین کی نظر میں/ص ۳/ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۲۰۰۵ء)

'سیرت شبلی' کے مضامین اس طرح کی مبالغہ آرائی سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ اقبال سہیل نے یہاں جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف مستند بلکہ اول درجے کی چیز ہے، لیکن اقبال سہیل کی کاوش صرف چند مضامین تک سمٹ کر رہ گئی، اگر ان کی لاابالی طبیعت نے ان کو جم کر کام کرنے کا موقع دیا ہوتا تو یہ ایک دلچسپ اور اہم اضافہ ہوتا، کیوں کہ وہ صاحب سوانح سے بحسن وخوبی واقف اور ان کے کارناموں سے باخبر تھے۔ اخذ نتائج سے قبل ان اقساط کے ذیلی عناوین پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

☆ مولانا کی ولادت اور وطن

☆ دیار پورب میں راجپوتوں کی آمد

☆ مکتب

☆ علی گڑھ میں مولانا کی خدمات

☆ قسطنطنیہ کا سفر

☆ شمس العلماء کا خطاب

☆ علی گڑھ سے ترک تعلق

☆ سرسید کی وفات اور مولانا کا استعفاء

☆ مولانا کا دوسرا عقد اور حیدر آباد کا سفر

اقبال سہیل ایک تبحر عالم، باکمال شاعر اور نکتہ سنج تھے۔ ان کی شاعری اور شخصیت پر شبلی کا گہرا اثر تھا۔ وہ اردو، فارسی پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ وہ کئی اعتبار سے شبلی کے سچے جانشین تھے۔ غالب کے بعد ہندوستان میں فارسی شاعری کو جن حضرات نے شیرینی اور شگفتگی بخشی، ان میں شبلی اور ان کے شاگرد رشید اقبال سہیل کا نام بھی جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ ان کے یہاں بادۂ عجم کا حسن اور عرب کا سوز دروں پایا جاتا ہے۔ اقبال سہیل کی غزلوں کے ساتھ فارسی قصائد دیکھیے تو شبلی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ سچے معنوں میں شبلی کے جانشین اور ادبی وارث تھے۔

اقبال سہیل نے 'مولانا کی ولادت اور وطن' کے عنوان سے ایک سرخی قائم کی ہے، جس میں ۱۸۵۷ء کی شورش کی ناکامی اور پھر ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط اور ان کی مضبوط ہوتی گرفت کا ذکر کیا ہے۔ تاکہ اس پس منظر کو نمایاں کیا جا سکے جس میں علامہ شبلی مرحوم کی پیدائش ہوئی۔ پھر دیار شرق میں راجپوتوں کی آمد اور مختلف شہروں (فیض آباد، اعظم گڑھ اور بلیا) میں ان کا قیام، نیز ان کے آباواجداد کے مشرف باسلام ہونے کی داستان کو جامع اور بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ مولانا شبلی کے والد محترم شیخ حبیب اللہ مرحوم کی وسعت قلبی اور فراخ دلی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال سہیل لکھتے ہیں:

> ''فیض فطرت نے فراخ دستی کے ساتھ فراخ دلی بھی عطا کی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ صاحب مرحوم گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نگاہ میں یکساں مقبول اور ممدوح تھے، قابلیت علمی شرافت، اخلاق، دنیاوی وجاہت واقتدار، دولت وثروت اور سعادت مند اولادیں، غرض خدا نے وہ سب کچھ دے رکھا تھا، جس کی تمنا انسان کو

ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خوش نصیبی کے لئے شیخ مرحوم کا نام اب تک ہمارے دیار میں بطور ایک منفرد مثال کے پیش کیا جاتا ہے۔"

(فضل الرحمٰن اصلاحی/ سیرت شبلی/ ص ۱۹)

اقبال سہیل نے شبلی نعمانی کے خاندانی جاہ وجلال اور ان کے والد محترم کی شرافت، قابلیت اور دنیاوی عزوجاہ کا ذکر مناسب الفاظ میں کیا ہے۔ اس کے بعد شبلی کی تعلیم وتربیت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ان کی تعلیم چار برس چار ماہ کی عمر میں شروع ہوئی، ان کے والد نے دھوم دھام سے شبلی کے مکتب کا اہتمام کیا۔ قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر ہی پڑھیں اور پھر مولوی حکیم عبداللہ کا انتخاب عمل میں آیا جو مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ اس کے بعد اپنے والد کے قائم کردہ مدرسے میں تقریباً فراغت تک کی تعلیم حاصل کی۔ فراغت کے بعد دور دراز کے علاقوں کا سفر کر کے متعدد مشہور علماء سے اخذ واستفادہ کرتے رہے۔ اس سلسلے میں شبلی نے غازی پور سے لاہور تک کا سفر کیا۔ شبلی نعمانی کے اساتذہ کے علمی کمالات کا ذکر کرتے ہوئے اقبال سہیل رقمطراز ہیں:

"کمالات علمی کے علاوہ فارسی، عربی اور شاعری کا ذوق مولانا فاروق کا خاندانی جوہر تھا اور علامہ مرحوم بھی فطری شاعر تھے، اس اتحاد مذاق نے معلم ومعلم کے ربط معنوی کو اور قوی کر دیا اور بالآخر شاگرد کی کشش خود استاد کو اعظم گڑھ کھینچ لائی۔

اے ذوق تشنگی میں ترے جذب کے نثار
آتے ہیں خود وہ ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

مولانا شبلی جیسا طباع تلمیذ اور مولانا فاروق کا تبحر استاذ، فیض ترتیب نے سونے پر سہاگے کا کام دیا، چند ہی دنوں میں یہ جوہر قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اور یہ ہونہار شاگرد استاذ کے لئے مایۂ ناز بن گیا، چنانچہ مولانا فاروق اسی زمانہ میں اکثر فخریہ فرمایا کرتے "انا اسد وانت شبلی" (فضل الرحمٰن اصلاحی/ سیرت شبلی/ ص ۲۴)

مولانا فاروق چریا کوٹی کی چھاپ شبلی کی شخصیت پر گہری تھی۔ دونوں کی ذہنی ہم آہنگی اور اتحاد مذاق نے اس رشتے کو اور قوی کر دیا تھا۔ دیگر علوم کے ساتھ سیاست پر شبلی کی گرفت مولانا فاروق ہی کا

فیضان تھا، لیکن شبلی تھے کہ ان کی علمی تشنگی بجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس پوری صورت حال کا احاطہ کرتے ہوئے اقبال سہیل نے لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ مولانا کے والد مرحوم اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے ـــــ مگر مولانا کی والدہ جو بہت روشن خیال بزرگ تھیں۔ مولانا کی بے تابی شوق کو ناکام دیکھنا کب پسند کرتیں۔ انھیں کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولانا نے طلب علم کے شوق میں دیار وطن کی دلچسپیوں کو خیر باد کہا۔'' (فضل الرحمٰن اصلاحی/ سیرت شبلی/ ص ۲۴، ۲۵)

غازی پور سے لے کر لاہور تک طلب علم کا یہ سفر جاری رہا، سفر کی دشواری، والد کی ناراضگی کے باوجود شبلی نے مولانا فیض الحسن لاہوری سے استفادہ کیا۔ لاہور کا قیام شبلی کے لئے کئی اعتبار سے سودمند ثابت ہوا، عربی زبان وادب کا صحیح مذاق مولانا فیض الحسن ہی کا فیضان ہے، بقول اقبال سہیل:

''مولانا کے لئے لاہور کا یہ چند روزہ قیام بہت کچھ مثمر سعادت ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ اسی درس نے مولانا میں عربی علم وادب کا صحیح مذاق حد کمال کو پہنچایا۔ مولانا فاروق مرحوم معنی آفرینی کے دلدادہ تھے اور وہ متاخرین شعرائے ادب کو جن کے سرخیل متنبی ہیں۔ شعرائے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کا ابتدائی مذاق غالباً یہی رہا ہوگا، مگر لاہور میں آئے تو دنیا بدل گئی۔ شعرائے جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور رشتہ اور رفتہ زبان دل میں اتر گئی، یہاں تک کہ مولانا نے حماسہ تک حفظ کر ڈالا اور آخر تک بلاناغہ صبح کی تلاوت کے بعد حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے۔'' (فضل الرحمٰن اصلاحی/ سیرت شبلی/ ص ۳۰، ۳۱)

مولانا کے والد محترم ایک اچھے اور مشہور وکیل تھے، لہٰذا والد کی خوشنودی کے لئے شبلی نے وکالت کا امتحان بھی طوعاً وکرہاً پاس کیا، نیز اعظم گڑھ وبستی میں کچھ دنوں وکالت بھی کی، لیکن یہ پیشہ ان کے مزاج اور علمی شان کے موافق نہ تھا، لہٰذا اس کوچے کو خیر آباد کہا، اس کے بعد کچہری

میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت کی، لیکن یہ بھی ان کے تقویٰ وطہارت سے میل نہیں کھاتا تھا، لہٰذا اس کو بھی ترک کر دیا اور والد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے نیل سازی کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ ان تمام مشکل مراحل سے گزرتے ہوئے شبلی علی گڑھ پہنچے اور ان کا تقرر عربی ادب کے پروفیسر کے لئے ہوا، اس پوری داستان کو اقبال سہیل نے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے، تاکہ شبلی کے شب وروز قارئین پر منکشف ہو جائیں اور ان کی سیرت/شخصیت کے نمایاں پہلو بھی سامنے آسکیں۔

سرسید نے شبلی کا تقرر عربی ادب کے لئے فرمایا تھا، تنخواہ چالیس روپے ماہانہ طے پائی۔ مولانا کے علمی مرتبے کے حساب سے یہ کچھ بھی نہ تھا، لیکن علمی شغل اور علمی صحبت کی وجہ سے یہ تلخیاں خوش گوار تھیں۔ یہاں پر نہ صرف شبلی کا اصل جوہر کھلا بلکہ سرسید کے کتب خانے سے استفادے، ان کی شب وروز کی مصاحبت اور علمی چرچے کے ساتھ پروفیسر آرنلڈ کی رفاقت نے ان کی دنیا بدل دی۔ اب وہ مولویت کی خول سے باہر نکل کر وسیع فضا میں علم وادب کے حوالے سے سوچنے لگے تھے۔ تاریخ سے دلچسپی بڑھی، ان میں روشن خیالی اور بلند نظری پیدا ہوئی اور وہ ٹھیٹ حنفیت سے نکل کر نامورانِ اسلام کی سوانح عمریاں لکھنے کا منصوبہ بنانے لگے۔ سرسید نے اس شعلہ کو مزید ہوا دی، مولوی شبلی سے علامہ شبلی تک کا سفر انھوں نے کیسے طے کیا اس پورے مسئلہ پر بھی اقبال سہیل نے خاطر خواہ گفتگو فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے ساتھ روزانہ کے علمی اور سیاسی مذاکروں نے اس شعلہ کو اور بھی تیز کر دیا اور مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب وعلل پر علمی اور تاریخی حیثیت سے صرف توجہ کی ضرورت پیش آئی، علی گڑھ کی آزاد فضا میں علمی تگ ودو کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا اور تحقیق وتفحص کی نئی راہیں کھلیں۔''
>
> (فضل الرحمٰن اصلاحی/ص ۴۳)

شبلی خداداد صلاحیت کے مالک تھے، قوت حافظہ اور آخذہ دونوں غضب کا تھا۔ فرصت کے لمحات بھی میسر تھے۔ اس پر مستزاد سرسید کا کتب خانہ جو نوادرات کا ذخیرہ تھا، شوق مطالعہ کے لئے ایک

سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ ساتھ ہی عبدالمجید نامی شخص کی معاونت بھی کارگر ثابت ہوئی، جو مولانا کے لئے نایاب اور نادر کتابیں لے کر آتے تھے۔ سرسید بھی شبلی کی غیر معمولی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ دونوں کا نصب العین بھی ایک ہی تھا۔ بقول اقبال سہیل:

> ''نصب العین دونوں کا ایک تھا، یعنی ملت اسلامیہ کا احیاء، علاج دونوں کی رائے میں ایک تھا، یعنی علوم جدیدہ کی تحصیل، اس منزل تک دونوں ہم آہنگ تھے، مگر آگے چل کر راستے جدا ہو جاتے تھے۔ سرسید مسلمانوں کے مستقبل کو یورپ کے حال میں رنگ دینا چاہتے تھے اور علامہ شبلی یورپ کو خود اس کے اسلحہ سے شکست دے کر اپنا ماضی واپس لانے کے آرزومند تھے۔ ایک کی مصلحت شناسی زمانہ کی رو کے ساتھ بہہ چلنے کی خواہاں تھی تو دوسرے کی ہمت مردانہ خود اس رو کا رخ پھیر دینے کی متقاضی۔'' (فضل الرحمٰن اصلاحی/ سیرت شبلی/ ص ۴۴)

خیر یہ داستان طویل ہے۔ اقبال سہیل نے بھی اس پورے منظر اور پس منظر کو گریز کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ علی گڑھ کے قیام کے دوران شبلی کے ذہنی ارتقاء میں تیزی آئی اور وہاں (علی گڑھ) کا ماحول بڑی حد تک مددگار ثابت ہوا، لیکن مولانا شبلی خود بھی لکیر کے فقیر نہ تھے اور نہ ہی بے حس کہ آس پاس کے ماحول سے متاثر نہ ہوتے، اس دوران مولانا کافی ہوش مند رہے، علی گڑھ آنے سے پہلے وہ تصنیف وتالیف کے میدان میں آچکے تھے (لیکن دائرہ بہت محدود تھا) ان کا ایک فارسی دیوان بھی شائع ہو چکا تھا اور کچھ رسائل جو متنازع اور مختلف فیہ مسائل پر تھے، لیکن یہاں کی علمی وادبی فضا نے نہ صرف ان کی تالیفات کا رخ موڑ دیا، بلکہ عربی وفارسی کے بالمقابل اردو زبان وادب کو ترقی دینے کا شوق پیدا ہوا اور غالب کے مشہور قطعہ میں جس خیال کا اظہار ہوا ہے، اس غلطی کو محسوس کیا۔ یہ علی گڑھ کا دوسرا بڑا احسان تھا۔ بقول سہیل:

> ''دوسرا اور غالباً سب سے بڑا احسان علی گڑھ کا یہ تھا کہ مولانا کا موضوع تصنیف بدل گیا ہے۔ اگر اسی قدیم ماحول میں رہتے تو درسیات کے شروح وحواشی یا فروعیات فقہی کے تنگ دائرہ سے نکلنا شاید نصیب نہ ہوتا۔'' (فضل الرحمٰن اصلاحی/ سیرت شبلی/ ص ۴۶،۴۷)

علی گڑھ کی علمی فضا نے جہاں ان کے تاریخی شعور کو جلا بخشا، وہیں دوسری طرف چند نادر مقالے لکھوائے۔ الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم وغیرہ جیسے جیسے مطالعہ وسیع ہوتا گیا، ارادے بلند اور رفعت پرواز بڑھتی گئی، بحث ومناظرے کی دنیا پہلے ہی ترک کر چکے تھے، 'سیرت النعمان' جیسی اہم تصنیف کے مصنف بن چکے تھے، اب ان کے دماغ میں ہیروز آف اسلام کا تخیل تھا، جو 'المامون' سے شروع ہو کر 'سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم' پر اختتام پذیر ہوا، شبلی نے وفور شوق میں خود فرمایا تھا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

تیسرا فیضان علی گڑھ کا یہ ہے کہ مولانا شبلی کو پروفیسر آرنلڈ کی صحبت نصیب ہوئی جس نے ان کی تاریخی وتحقیقی ذوق کو مہمیز کیا اور ایک دوسرے کی تہذیب وثقافت کو سیکھنے کا سنہرا موقع فراہم کیا، لیکن شبلی بہت جلد کسی سے مرعوب ہونے والوں میں سے نہ تھے۔ وہ جدید وقدیم کو بہت سوچ سمجھ کر قبول کرتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ کی ہر بات پر ایمان لانا بھی ان کے بس کا نہ تھا۔ وہ اپنی فہم وفراست سے وہی راستہ اختیار کرتے تھے جو انھیں درست اور لائق عمل معلوم ہوتا تھا، اقبال سہیل نے علی گڑھ کے فیضان اور شبلی مرحوم کی خداداد صلاحیتوں کا تجزیہ بہت عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ناسپاسی ہوگی اگر فضائے علی گڑھ کے اس فیض کو جس نے مولوی شبلی کو علامہ شبلی بنا دیا، فراموش کر دیا جائے، لیکن ناشناسی ہوگی اگر مولانا کے تمام کمالات کا سرچشمہ علی گڑھ کو قرار دے دیا جائے، ـــــ نقد واجتہاد کا ملکہ اور مطالب کی بے مثل قابلیت، شفیق اساتذہ کی تربیت اور اپنی محنت ودماغ سوزی کے ثمرات تھے، لیکن ان تمام فطری اور اکتسابی کمالات کو صحیح اور نتیجہ خیز منزل کی جانب رہبری کرنے والا علی گڑھ، ورنہ کیا وجہ ہے کہ آج تک پھر علی گڑھ سے کوئی دوسرا شبلی نہ اٹھ سکا۔''

(فضل الرحمن/ سیرت شبلی/ ص ۴۷، ۴۸)

شبلی مرحوم نے یقیناً علی گڑھ کی علمی وادبی فضا سے بہت کچھ سیکھا تھا، لیکن ان کی ذات گرامی سے کالج کو کیا کیا فائدے پہنچے اس کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے، ڈپٹی نذیر احمد اور حالی کے ساتھ شبلی نے بھی سرسید کے قائم کردہ ادارے کی ترویج وترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نذیر احمد بے مثل خطیب اور نثر نگار تھے، تو حالی اور شبلی اپنی نظموں، رباعیوں کے ذریعے محفل میں جان ڈال دیا کرتے تھے، شبلی نے فن خطابت میں بھی کمال دکھایا، لیکن یہ سب کچھ صرف گرمیٔ محفل کے لئے نہ تھا، بلکہ سرسید کی تحریک کو مضبوط بنانا تھا، شبلی نے اپنی شاعری اور تدریس کے ذریعے اس کالج میں جو خدمت انجام دی ہے، اس پر اقبال سہیل نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ درس وتدریس کے علاوہ طلبا میں ذوق انشاء اور خطابت کی روح پھونکی وہیں دوسری طرف اسلامی غیرت وحمیت کا بھولا ہوا سبق یاد کرایا، بہر حال مولانا شبلی نے قومی مفاد کی خاطر زہر کا گھونٹ بھی پیا، پھر کالج میں آنے والے امراء، رؤساء کی مدح میں متعدد نظمیں لکھیں اور اپنی شاعری کے ذریعہ کالج اور قوم کی گراں قدر خدمت انجام دی، جس کا اعتراف بہتوں نے کیا ہے۔ بقول نذیر احمد:

تم اپنی نثر کو لو، نظم کو چھوڑو نذیر
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

علی گڑھ کی علمی وادبی فضا میں شبلی کی حیثیت کئی اعتبار سے ممتاز تھی، وہ ایک اچھے استاذ کے ساتھ دین کے سچے خادم بھی تھے، طلبہ کے اندر اسلامی روح کو بیدار کرنے اور اسلاف کے کارناموں سے نئی نسل کو متعارف کرانے میں ان کا کردار سب سے نمایاں رہا ہے۔ بقول اقبال سہیل:

"سب سے بڑا احسان مولانا کا یہ تھا کہ اس یورپ زدگی کے ہنگامے میں جہاں تک ان کی زبان وقلم نے یاوری کی، مسلمان نوجوانوں کو ان کی قومی روایات، قومی تمدن، اور اسلاف کے شاندار کارناموں کی عزت کرنا سکھایا اور سیاسی حیثیت سے ایک غلام قوم کو کم سے کم دماغی اور ذہنی غلامی سے بچانے کی کوشش کی۔"

(فضل الرحمن / سیرت شبلی / ص ۶۹)

شبلی نے نہ صرف زبان وقلم سے کالج کی خدمت کی بلکہ بعض موقع پر مالی اعانت بھی کی اور ساتھ ہی اپنی بعض تصنیفات کا حق اشاعت بھی کالج کو مرحمت فرمایا۔ ایک دوست نے مولانا شبلی سے

ان کی چند کتابیں ہدیۃً طلب فرمائیں، اس کے جواب میں مولانا نے جو کچھ لکھا پیش خدمت ہے:

"میں اپنی تصنیفات نذر نہیں کر سکتا، میری تصنیفات جو اس وقت تک معرض بیع میں ہیں، المامون اور الجزیہ ہیں۔ یہ دونوں کتابیں سید صاحب نے کالج کے لئے چھاپی ہیں۔ مجھ کو حق تصنیف میں صرف ایک نسخہ عنایت ہوا تھا، وہ دے نہیں سکتا۔" (فضل الرحمٰن/ سیرت شبلی/ ص ۷۰)

اقبال سہیل نے علی گڑھ کے فیضان اور علی گڑھ پر شبلی کے احسانات کے بعد قسطنطنیہ کے سفر کا جائزہ لیا ہے۔ مولانا شبلی کا یہ سفر خالص علمی و تحقیقی غرض سے تھا۔ قسطنطنیہ کے قیام کے دوران شبلی ایک کتب خانے سے دوسرے کتب خانے کی خاک چھانتے پھرے، تا کہ وہ اپنی تصانیف کا معیار بلند رکھ سکیں۔ اس دوران بہت سی نایاب اور نادر کتابیں ان کے ہاتھ آئیں جن سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس سفر میں انھوں نے ترکوں کے اخلاق و عادات، طرز معاشرت، مذہبی اور قومی رسوم کے ساتھ طریقۂ تدریس کا خصوصی جائزہ لیا۔ یہاں کی ایک خاص شے جو مولانا کو بہت پسند آئی، وہ مدارس میں امرا و غربا کی یکساں معاشرتی حالت تھی، ساتھ ہی انھوں نے بطور خاص ایک فرق کو اور بھی محسوس کیا جسے اقبال سہیل نے یوں بیان فرمایا ہے:

"قسطنطنیہ کے قیام میں جو چیز انھوں نے سب سے زیادہ محسوس کی، وہ محکوم و خود مختار ممالک کا تفاوت اور غلام و آزاد قوم کی ذہنیت کا فرق تھا۔ وہ خود ایک غلام ملک کے مناظر دیکھ چکے تھے۔ ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور اپنی زبوں حالی کا احساس اور قوی ہو گیا، تاہم جس اسلامی جاہ و جلال اور عظمت جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں، اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روح مضطرب کو جو سرمایہ نشاط حاصل ہوا اور دل بیتاب سے جوش سرور کی جو موجیں اٹھیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے۔"

(فضل الرحمٰن/ سیرت شبلی/ ص ۷۵)

سر سید کی وفات اور مولانا شبلی کا کالج سے استعفا، والد کا انتقال، قرض خواہوں کی یلغار، مولانا کا عقد ثانی اور پھر حیدر آباد کا سفر اور علمی مشاغل وغیرہ کا جائزہ اقبال سہیل نے بہت ہی عمدہ طریقے سے

لیا ہے۔ اس کے بعد پھران کی طبیعت ادھر مائل نہ ہو گی۔ اس طرح ایک اہم کارنامہ ان کے ذریعہ انجام نہ پاسکا۔ سید سلیمان ندوی نے 'سیرت النبی' کی تکمیل کے بعد حق شاگردی ادا کرتے ہوئے 'حیات شبلی' لکھی۔ کاش اقبال سہیل مستقل ادبی تصنیف کی طرف توجہ دیتے اور سنجیدگی سے علم وادب کی دنیا میں رہتے تو دوسرے اقبال ہوتے اور ایک معتبر سوانح نگار بھی۔

☆☆☆

اقبال سہیلؔ کی نعت و منقبت کے امتیازات

ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد☆

اقبال سہیلؔ کا شمار دبستانِ شبلی کے اہم نعت گو شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے پیش رو شعرا کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور فکر و فن کے اعتبار سے نعتیہ شاعری کو وسعت بخشی۔ انھیں کم عمری سے ہی نعتیہ شاعری سے فطری مناسبت تھی علامہ شبلی اور حمیدالدین فراہی جیسے اساتذہ کی صحبت کی وجہ سے ان کے فن کو مزید تقویت ملی جس سے انھیں صرف اسلامی علوم سے ہی واقفیت حاصل نہیں ہوئی بلکہ محمدؐ کی ذات سے سچی محبت و عقیدت بھی پیدا ہوئی۔ جس کی وجہ سے حقیقت و واقعیت کا اثر ان کے نعتیہ کلام میں بھی واضح طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جس نے انھیں آخری عمر تک اس راستے پر گامزن رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نعتیہ قصائد میں محمدؐ کی وہی صفات نظر آتی ہیں جو قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام میں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ نعت گوئی کے لئے صرف محمدؐ کی ذات مبارک سے عقیدت و محبت ہی کافی نہیں ہے بلکہ تاریخ اسلام پر حکیمانہ نظر اور اسلامی تعلیمات و واقعات کا صحیح علم ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جو نعت کے پیرائے میں ڈھل کر ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں تو اعلا پایہ کی نعتیہ شاعری وجود میں آتی ہے۔ سہیل کی نعتیہ شاعری میں مذکورہ بالا خصوصیات کے ساتھ ساتھ فکر و فن کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

سہیل نے اپنے قصائد کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی سیرت کے مختلف پہلوؤں اور صحابہ کرامؓ کے فضائل و محاسن اور تاریخ اسلام پر ان کے اثرات کی تصویر کشی کا خوبصورت مرقع پیش کیا ہے۔ انھوں نے قصیدے کی مناسبت سے تشبیب کے موضوع کا انتخاب کیا

☆اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، کالینہ، سانتا کروز، ممبئی ۴۰۰۰۹۸

ہے جس کی وجہ سے ان کی تشبیبوں میں وقار و متانت، شائستگی اور پاکیزگی کا عنصر غالب نظر آتا ہے، مذاق صاف ستھرا اور بلند ہے۔ ان کے ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب ملاحظہ کیجیے:

سرشت حسن تغافل، مزاجِ عشق غیور — وہ التفات سے ہم التجا سے ہیں معذور
کسی کے فیضِ تصور سے ہوگیا ہے خود — مرا خرابۂ دل، گنجِ حسن سے معمور

اقبال سہیل نے اپنے نعتیہ قصائد میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ محمدؐ کی سیرت مبارکہ کو اس طرح پیش کیا جائے کہ تاریخ اسلام کے عمرانی حقائق جلوہ گر ہوجائیں کیوں کہ آپ کی ذات میں اسلام مکمل طور پر تحلیل ہوگیا تھا جس کا اندازہ قصیدے کے اس بند سے لگایا جاسکتا ہے:

وہ رابط، عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے
وہ فارق، زہد سے جس نے مٹایا داغ رہبانی
وہ عادل، جس کی میزان عدالت میں برابر ہے
غبار مسکنت ہو یا وقار تاج سلطانی

سہیل نے اپنی نعتیہ شاعری میں علامت نگاری سے شعوری طور پر گریز کیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کی صفات حسنہ کہیں علامتوں کی وجہ سے تاریکی کے پردے میں نہ چھپ جائے کیوں کہ محمدؐ کی ذات میں تمام انبیائے کرام کی صفات شامل تھیں، جسے انھوں نے فنی مہارت کے ساتھ اپنی نعتیہ شاعری میں اجاگر کیا ہے جس سے محمدؐ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ سہیل نے تمام انبیائے کرام کی صفات کو مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے:

تعالی اللہ ذاتِ مصطفےٰ کا حسن لاثانی — کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصافِ امکانی
دعائے یونسؑ، خلق خلیلیؑ، صبر ایوبیؑ — جلال موسویؑ، زہد مسیحیؑ، حسن کنعانی

اردو ادب کے بیشتر نعت گو شعرا نے محمدؐ کے متعلق وہی انداز بیان اختیار کیا ہے جو کہ عام طور پر غزلوں میں محبوب کے لئے مخصوص ہے۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی نعت گو شعرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ دوسرے انبیائے کرام کا استخفاف پایا جاتا ہے۔ لیکن سہیل کی نعتیہ شاعری میں اعتدال و توازن پایا جاتا ہے اور ان کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔ انھوں نے

عام روش سے ہٹ کر انبیائے کرام کا ذکر عزت و احترام کے ساتھ، ان کی عظمت، شان و شوکت اور بلند مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے محمدؐ کی شان کے مطابق الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود انھوں نے اپنی نعتیہ شاعری میں کہیں بھی حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا ہے۔ جس کے ذریعہ انھوں نے حقیقت نگاری کی واضح اور روشن مثال قائم کی ہے اور اپنی نعتیہ شاعری میں تخیل اور فن کے پردے میں واقعات کو گم ہونے نہیں دیا ہے۔ جس کی وجہ سے معنی کی ترسیل تک بہ آسانی رسائی ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں کہیں بھی ابہام و پیچیدگی نظر نہیں آتی بلکہ ان کے کلام میں وضاحت کے ساتھ ساتھ انداز بیان میں شان و تمکنت کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں موضوع و مواد کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ ژولیدہ بیانی اور پریشاں خاطر ان کے کلام میں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ان کی نعتیہ شاعری میں عالمانہ اظہار، فصاحت اور لب و لہجہ کے خوبصورت استعمال سے ان کی فن کارانہ مہارت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سہیل کی نعتیہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے افتخار اعظمی لکھتے ہیں:

> ''ان کی نعتیہ شاعری میں تازگی و توانائی، متانت و جزالت، شادابی خیال، بندش کی دلآویزی، الفاظ کی مرصع کاری سبھی کچھ پورے طور پر موجود ہے۔ ان کی زبان کسی حد تک مشکل ضرور ہے لیکن ان کے یہاں ترتیب الفاظ اس خوش اسلوبی سے ہے کہ کیف و ترنم میں کہیں بھی کمی نہیں آتی، اور اس نغمگی کی وجہ سے ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، ان کے طویل قصیدۂ نعت ''موج کوثر'' میں اگرچہ عربی و فارسی تراکیب کی بہتات ہے، لیکن الفاظ کے تناسب ترتیب اور قافیہ و ردیف کی ہم آہنگی کی وجہ سے اس میں ایک نغمہ زا کیفیت ہے۔'' (افتخار اعظمی، ارمغان حرم، صفحہ ۲۴)

گو نعت گوئی ان کی شاعری کا مخصوص موضوع نہیں ہے بلکہ انھوں نے دوسرے اصناف کی طرح اس فن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ کلیاتِ سہیل میں کل دس نعتیہ قصائد شامل ہیں جس میں صرف دو کو نعت کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے بقیہ چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ان دو نعتوں میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ جس کے مطالعہ کے بعد صنف نعت پر ان کی دسترس اور ان کی فنکارانہ بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے نعتیہ شاعری کے تمام

لوازمات کوفنی مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ بقول شاہ معین الدین احمد ندوی:

''ان کا کمال یہ ہے کہ نعت کا پورا عطر اور جوہر ان دو نعتوں میں کھینچ دیا ہے جس کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہو جاتا ہے۔ وہ کون سا نغمۂ لاہوتی ہے جو اس ساز میں نہیں اور جسے سن کر ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی نہ پیدا ہوتی ہے۔''

(شاہ معین الدین احمد ندوی۔ ارمغانِ حرم، صفحہ ۷۳)

نعتیہ شاعری کے موضوعات محدود و متعین ہوتے ہیں اور مضمون مشترک۔ مگر اس محدود موضوع میں اپنے تخیل کی بنا پر وسعت و رنگا رنگی پیدا کرنا شاعر کے فن کا کمال ہے۔ اقبال سہیل نے اس محدود اور مشترک موضوعات میں ایسی جدت و ندرت پیدا کی ہے جس کی مثال اردو شاعری میں شاذ و نادر ہی ملے گی۔ انھوں نے پرانے خیالات کو نئے معنی و مفہوم عطا کیے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں نئے پن کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ سہیل نبوت کے عظمت شناس تھے، اسلامی تاریخ و واقعات پر ان کی گہری نظر تھی اس لئے ان کی شاعری میں کہیں بھی لغزش نظر نہیں آتی۔ ان کا نعتیہ کلام نعت نبوت کی اعلیٰ مثال ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں:

''اردو میں ان کی نعتیں، نعت نبوی کا صحیح نمونہ ہیں۔ ان میں الوہیت کی تجرید و تنزیہ، نبوت کی عظمت و جلالت، خصائص و کمالاتِ محمدی ہر چیز اپنے اپنے درجے پر رہتی ہے اور وہ اسلامی روح سے اس قدر معمور ہوتی ہیں کہ ان سے مذہب کا درس لیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی حیثیت محض واقعہ نگاری کی نہیں ہوتی بلکہ وہ فکری و تخیل کی جدت و ابداع، الفاظ کے حسن و نفاست، ترکیبوں کی مرصع کاری و خوشنمائی اور زبان و بیان کی دلکشی و رعنائی کے اعتبار سے شعر و ادب کا نگارخانہ ہیں۔'' (شاہ معین الدین احمد ندوی۔ ارمغانِ حرم، ص: ۷۳)

اردو کی نعتیہ شاعری میں سہیل کے قصائد سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے فارسی شاعر عرفی کی طرح اپنے نعتیہ کلام میں آداب و شرائط کا خاص خیال رکھا ہے۔ نعتیہ شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نبوت اور الوہیت کے فرق کو قائم رکھتے ہوئے محمدؐ کی سیرت کی تصویر اس طرح پیش کی جائے کہ صحیح اسلامی عقائد اور توحید و رسالت کے تمام در وا ہو جائیں جس سے قاری کو ایمان کی

تازگی وحلاوت کا احساس پیدا ہو سکے۔ سہیل کی نعتیہ شاعری میں یہ اساسی تصور واضح طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو کے دوسرے شعراء کی طرح سہیل کی نعتیہ شاعری میں افراط وتفریط کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ ان کا کلام اس عیب سے پوری طرح پاک ہے۔ نعتیہ شاعری کی ایک اہم اور بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ محمدؐ کی تعریف وتوصیف اس طرح نہ کی جائے جس سے دوسرے انبیائے کرام کا استخفاف ہو۔ بلکہ صحیح اسلامی شعور یہ ہے کہ تمام انبیا کی شان ومرتبے اور عظمت وجلالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا پورا احترام کیا جائے جب کہ اس کے برخلاف اردو کے بیشتر نعت گو شعرا اس چیز کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور انبیائے کرام کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ استخفاف کا پہلو حاوی نظر آتا ہے۔ مگر اقبال سہیل نے اس دور کی بے راہ روی اور افراط وتفریط سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا اور انھوں نے اپنے آپ کو عقیدہ و توحید کے دائرے میں رکھتے ہوئے محمدؐ کی پیغمبرانہ شان وشوکت اور صفات ومحاسن کو فکر وفن کی تمام رعنائیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قرآن، حدیث وسیرت کا انھوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اس لئے وہ اپنی نعتیہ شاعری میں کوئی بھی بات اسلامی تعلیمات سے ہٹ کر نہیں کہتے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وعقیدت کے باوجود انھوں نے احد اور احمد کے فرق کو ملحوظ رکھا۔ ان کے کلام میں شاعرانہ حسن و لطافت کے ساتھ ساتھ حدیث کا صحیح اور خوبصورت ترجمہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

اقبال سہیل نے اپنے نعتیہ کلام میں سیرت نگاری کے تمام اصول ونظریات کی پابندی کی ہے اس لئے ان کی شاعری میں جوشِ عقیدت اور اعلا درجے کی سنجیدگی نظر آتی ہے لیکن اس موقع پر انھوں نے کہیں بھی حقیقت وواقعیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا ہے۔ سہیل کی اس خوبی نے ان کی نعتیہ شاعری کو صدرِ اسلام کی نعتیہ شاعری کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے۔ سہیل کو عربی شاعری پر گہری دسترس تھی اور خاص کر حسان بن ثابتؓ کی شاعری سے بے حد متاثر تھے جس کا اثر سہیل کی نعتیہ شاعری پر واضح طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھی اعتدال، فکر وفن اور صداقت کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔ نمونے کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ فاتح، جس کا پرچم اطلس زنگاری گردوں
وہ امیؐ، جس کے آگے عقل کل طفلِ دبستانی

وہ عادل، جس کی میزان عدالت میں برابر ہے
غبار مسکنت ہو، یا وقار تاج سلطانی

وہ باذل، سن کے جس کے ابر رحمت کی گہرباری
فضائے آسماں ہے شکوہ سنج تنگ دامانی

متذکرہ بالا اشعار کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تمام اوصاف ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان اشعار میں سہیل کے عقائد وتصورات کی روح پوری طرح جلوہ گر ہے اور ان کا کمال فن عروج پر نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنی نعتیہ شاعری میں تاریخ اسلام کے ایک اہم واقعے شب معراج کی عکاسی قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل انداز میں کی ہے۔ کہیں بھی مبالغہ یا غلو سے کام نہیں لیا ہے بلکہ تحقیقی انداز میں سچائی کے ساتھ معراج کے تمام واقعات کی اپنی نعتیہ شاعری میں مرقع کشی کی ہے۔ ان کا معراج نامہ فکروفن کے امتزاج کا خوبصورت نمونہ ہے۔ ان کا انداز بیان اتنا دلکش اور جاذب نظر ہے جو قاری کو محو حیرت کر دیتا ہے۔ اپنی نعت میں انھوں نے معراج کے واقعے کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس کی مثال اردو کی نعتیہ شاعری کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ معراج کا واقعہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے جو کہ عام انسانی تخیل سے ماورا ہے اس لئے اس واقعہ کے متعلق خود مسلمانوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور جسمانی یا روحانی ہونے کا مسئلہ آج تک موضوع بحث ہے۔ اس لئے جن شعرا نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا انھیں معراج کے واقعہ کا مکمل طور پر علم نہیں تھا اس لئے انھوں نے تخیل اور شاعرانہ بلند پروازیوں کے سہارے اس واقعہ کو پیش کیا ہے مگر سہیل کی نظر معراج سے متعلق بیان کردہ متعدد حدیثوں پر تھی اس لئے ان کی نعتیہ شاعری میں حقیقت کا عنصر غالب نظر آتا ہے اور پڑھنے والے پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے شب معراج میں رونما ہونے والے تمام واقعات کو شاعرانہ پیکر میں اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ ان کی شاعری میں پوری طرح جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ سہیل کی نعتیہ شاعری ادبی محاسن سے معمور ہے اور معراج نامے کے تمام اشعار فکروفن کا بہترین نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام میں مختلف قسم کے خیالات وجذبات اور احوال وکیفیات کی خوبصورت مرقع کشی کی گئی ہے۔ اس میں جس طرح کے خیالات ومناظر پیش کئے گئے ہیں وہ ادبی حسن ولطافت سے آراستہ ہیں جس کی وجہ سے ان کی یہ نعت اردو ادب میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے اور پوری نعت بلاغت ادا، الفاظ کی مرصع کاری، ترکیبوں کی چستی، تشبیہات کی خوبی ولطافت میں اعلا پایہ کا نمونہ ہے۔ انھوں نے اپنی اس نعت میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت بلالؓ کی شان وشوکت، جاہ وجلال، مقام ومرتبے کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ قابل دید ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

سنی سرکارؐ نے جنت میں آوازِ خرام ان کی بلالؓ پاک کے طالع کی اللہ رے درخشانی
جوارِ عرش میں دیکھا یہاں صدیق اکبرؓ کو تماشائے جمال لم یزل میں محو حیرانی
یہ ایواں دیکھتے ہی آپؐ نے حیرت سے فرمایا ہے کس کے واسطے یہ اہتمامِ جلوہ سامانی
فرشتوں نے کہا فاروقؓ کی دولت سرا ہے یہ یہ قصر اس کا ہے طالب جس کے ہیں مطلوب یزدانی

سہیل کی نعتیہ شاعری میں منقبت بھی شامل ہے۔ انھوں نے منقبت نگاری میں حفظ مراتب کا خاص خیال رکھا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک صحابہ کرام کو جو مرتبہ حاصل تھا اسی کی مناسبت سے انھوں نے اپنی شاعری میں ان کی تعریف و توصیف بیان کی ہے۔ یہ ایک ایسا موڑ ہے جس میں اردو کے اکثر منقبت نگار اعتدال و توازن کو برقرار نہ رکھ سکے مگر سہیل کی منقبت نگاری میں اعتدال و توازن پایا جاتا ہے۔ وہ کہیں بھی جانب داری کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے صحابہ کرامؓ کی سیرت و شخصیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ ہر صحابہؓ کے خدوخال پوری طرح اجاگر ہو گئے ہیں۔ ان کی منقبت میں غلو و اغراق دور دور تک نظر نہیں آتا۔ رجائیت، قوت اور ارتقائے انسانی اقبال سہیل کی شاعری کے وہ عناصر ہیں جس سے ان کی شاعری کا کوئی بھی شعبہ بیگانہ نہیں رہتا۔ ان کا تصورِ عشق کائناتی و آفاقی ہے۔ ان کا دامن عقیدہ توحید سے وابستہ ہے۔ وسعت و آفاقیت ان کی شاعری کے وصف خاص میں شامل ہے۔ ان کی منقبت میں صرف شاعرانہ خوبیاں ہی نہیں بلکہ معنوی گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ سہیل نے جنوں، خرد، وجدان اور عقل کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے فنکارانہ بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ حضرت حسینؓ کی حق گوئی و صداقت، بے باکی، ہمت و عزیمت اپنے نصب العین سے ان کی شدید وابستگی اور راہِ حق میں ان کی سرفروشانہ جدوجہد تاریخ اسلام کا وہ عظیم واقعہ ہے جسے سہیل نے موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ سہیل کی منقبت موسیقیت سے لبریز ہے۔ سہیل نے اپنی منقبتوں میں تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات کے کارناموں کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کمال صحت کے ساتھ صدر اسلام کے بعض بلند تاریخی واقعات کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

سہیل کی نعتیہ شاعری میں صحابہ کرامؓ کی منقبت بھی شامل ہے۔ ''موج کوثر'' میں انھوں نے خلفائے راشدینؓ، امہات المومنینؓ اور حضرت حسن اور حسینؓ کے ساتھ ساتھ دوسرے صحابہ کبار کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے شہادت اسلامی کے تصور کو نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔

سہیل نے دراصل منقبت التزاماً شامل نعت رکھی ہے۔ علاوہ ازیں خلفائے راشدینؓ کی شان میں علاحدہ قطعات وقصیدے بھی کہے ہیں۔ صدر اسلام کی شاعری بھی منقبت سے خالی نہیں۔ سہیل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں اور ابوبکرؓ کی شان وشوکت اور بلند مرتبے کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں اپنی نعتوں اور منقبتوں میں اعلیٰ مقام عطا کیا ہے اور ان کے فضل وشرف کو نہایت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔

سہیل نے حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ کو اپنی منقبتوں میں وہی مقام ومرتبہ عطا کیا ہے جس کے وہ حق دار تھے اور جو مستند روایات کا حصہ ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ حکومت حسن انتظام، عظمت واقبال، امن وامان اور بے نظیر عدل وانصاف کی بنا پر تاریخ اسلام کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

تاریخ روزگار کا وہ تابناک دور   دستِ عمرؓ میں جب کہ خلافت کی تھی زمام
جب دینِ حق کا نیر اقبال تھا بلند   جب اوج پر تھا ملت بیضا کا احتشام

حضرت عمرؓ کے جاہ جلال اور دبدبہ کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی بھی ضرب المثل ہے۔ حضرت عمرؓ کی عظمت وجلالت کا ذکر اقبال سہیل نے اس انداز سے کیا ہے کہ عمر کا دور حکومت پوری آب وتاب کے ساتھ ان کی شاعری میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اپنی نعتیہ شاعری اور منقبت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال سہیل خود لکھتے ہیں:

> ''ایک نعت کے سوا، جس کو لکھے بائیس سال گزر گئے، بقیہ تمام نعتیں صحیح طور پر درود شریف کا ترجمہ ہیں یعنی کم سے کم خلفائے راشدینؓ کی منقبت بھی ضرور شامل نعت رکھی گئی ہے۔ نعتوں کے علاوہ منقبت میں علاحدہ نظمیں کہی گئی ہیں جو مذہبی اور فنی ہر حیثیت سے معیاری ہیں۔'' (بحوالہ۔ ارمغانِ حرم، ص: ۲۷-۲۶)

سہیل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور خود ابوبکرؓ کی بزرگی وبرتری کو پیش نظر رکھتے ہوئے مدحتِ صدیقؓ کو نہایت خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ سہیل نے حضرت صدیق کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ، حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کا ذکر ان کے مقام ومرتبے کی مناسبت سے کیا ہے۔ ہر ایک کے وہی اوصاف بیان کیے ہیں جو مستند روایات سے ثابت ہیں۔ ''حکایت ہستی'' اور ''رسالت خاصان رسالت'' میں خلفائے اربعہ کی صحیح اور مکمل تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ابوبکرؓ، وہ انتخاب رسالت | وہ فاروقؓ، تعبیر خواب رسالت
وہ عثمان غنیؓ، فیضیاب رسالت | علیؓ، جرعہ خوارِ شرابِ رسالت
یہ چاروں ہیں احسان وایماں کے پیکر | ابوبکرؓ و فاروقؓ عثمانؓ و حیدرؓ

سہیل کے نعتیہ قصائد، قطعات اور منقبت میں مورخانہ حقیقت نگاری اور شاعرانہ رنگینی و رعنائی کا بہترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی منقبتوں میں کہیں کہیں تخیل، حقیقت اور فن اس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے ہیں جو دل ودماغ پر ایک جادو سا قائم کردیتے ہیں۔ سہیل نے صحیح اسلامی عقائد ونظریات کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنی منقبتوں میں پیش کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی نظم ''رحیق مختوم'' میں اسلامی عقائد کو اس فن کارانہ انداز سے سمویا ہے کہ توحید وخلافت کے تمام درواہو گئے ہیں۔ نمونہ دیکھیں:

خدا کے بندے خدا نہیں تھے، کسی کے مشکل کشا نہیں تھے
مگر! یہ اسرارِ علم دیں کے، ضرور مشکل کشا رہے ہیں

اقبال سہیل اپنی منقبتوں میں کئی حدیثوں کے ترجمے بھی پیش کئے ہیں۔ اس ضمن میں ''رویائے بوتراب'' اور ''منقبت عمر'' بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ بقول عطیہ خلیل عرب:

''منقبت علیؓ اور منقبت حسینؓ میں سہیل کے قصائد الفاظ کی شان وشوکت اور تراکیب، بلند آہنگی، بندش کی چستی، مضامین کے تنوع تشبیب ومدح کے تناسب، تشبیہات واستعارات کی ندرت اور حقیقت آرائی وواقعہ نگاری کی وجہ سے شاعرانہ حسن کاری کے بہترین نمونے ہیں۔ تاریخی حقائق کا دامن ان کے ہاتھ سے کہیں نہیں چھوٹا لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں وہی زور کلام، وہی علوئے تخیل اور وہی جوش وخروش ہے جو خاقانی، عرفی اور قاآنی کے یہاں پایا جاتا ہے۔'' (عطیہ خلیل عرب۔ ارمغان حرم، صفحہ: ۱۰۹)

سہیل نے اپنی منقبتوں میں مبالغہ آرائی اور غیر ضروری مضمون آفرینی سے گریز کیا ہے اور صنعتوں کے بے جا استعمال سے نعت ومنقبت کو گنجلک نہیں ہونے دیا ہے۔ اقبال سہیل نے حدیث اور سیرت کی روشنی میں حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ سہیل نے حضرت علیؓ کے عزم واستقلال،

ان کی انسان دوستی، ان کی خاکساری، مروت، عبادت وریاضت اور شجاعت غرض یہ کہ حضرت علیؓ کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو اپنے قصائد میں شاعرانہ حسن وتاثیر کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ ایک عظیم شاعر صرف مناظر فطرت کی نقل ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے تخیل کے زور سے ان کو جاندار اور متحرک بنا دیتا ہے اور زندگی کو ایک نیا زاویہ نگاہ عطا کرتا ہے۔ سہیل نے اپنی منقبتی شاعری کے ذریعے صحابہ کرامؓ کی سیرت وشخصیت کے تمام گوشوں کو نہ صرف منور کیا ہے بلکہ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے سیرت اور منظر نگاری کے تمام پہلوؤں کو یکجا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سہیل کا شمار اردو ادب کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ فن سخن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر سہیل نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ان کی غزلیں، نظمیں، مرثیے، قصائد، قطعات اور نعت ومنقبت سبھی ان کی شاعری کے دلکش نمونے ہیں لیکن جہاں تک ان کے قصائد نعت ومنقبت کا سوال ہے اس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں توحید ورسالت کا بالکل حقیقی شعور اور صحابہ کرامؓ کے فرق مراتب کا پورا احساس پایا جاتا ہے جو کہ سہیل کی سب سے اہم خوبی ہے جس کی بنا پر سہیل، حالی اور اقبال کے ہم پلہ نظر آتے ہیں اور نعت ومنقبت کے میدان میں ان کا مقام ومرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دور جدید کے نعت گو اور منقبت نگار شعرا کی صف میں سہیل کے مدمقابل کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا۔

علامہ اقبال سہیل کے سیاسی تصورات

(غزلوں کے حوالے سے)

ڈاکٹر سرفراز جاوید☆

ادب انسانی احساس وشعور کے ارتقا کا مظہر ہے، جس میں شاعر وادیب اپنے جذبات اور افکار وخیالات کی شعوری تنظیم کرتا ہے، جس کے ذریعہ سامعین اور قارئین اپنے فکر وشعور کو جلا بخش کر تحریک وتوانائی حاصل کرتے ہیں کیوں کہ ادب میں بنی نوع انسان کی تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور معاشرتی تاریخ کا غیر مربوط بیان ہوتا ہے۔ جو کسی عہد کے معاشرے کے غیر مرئی حقائق کا بالواسطہ ترجمان ہونے کے ساتھ ایک دائمی حقیقت کا استعارہ بن کر جذبات آدم سے رشتہ بھی استوار رکھتا ہے اور نئی نسل ادبی حقائق سے عہد ماضی کے حالات کی بازیافت کر لیتی ہے جس میں معاشرے کے فرد وجماعت کی حیات وزیست کا پرتو ہوتا ہے اور قاری اپنی ذہانت اور استعداد کے مطابق پرلطف انداز میں حظ وشعور بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ ادب کسی قوم ومعاشرے کے حالات وکوائف کو اخذ کر کے اپنے عہد اور مستقبل کا اشاریہ بن جاتا ہے۔

اردو شاعری کی سب سے طاقتور صنف غزل ہے اس نے ہر عہد میں انسانی معاشرے اور اس کی ضرورتوں کو بحسن خوبی برتا ہے۔ یہ صنف اپنے غیر مربوط مضامین کے تنوعاتی حسن کے ساتھ حیات وزیست کا حقیقی رمز ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو کے معروف اور غیر معروف شعرا اور ناقدین نے دانستہ اور غیر دانستہ طور پر غزل کی تنگ دامانی اور یک موضوعی ہونے کا شکوہ کیا ہے۔ مگر ہمارے بڑے شعراء نے اپنے داخلی جذبات کا اظہار غزل ہی میں کیا ہے۔ کیوں کہ غزل لمحاتی اور سانحاتی تاثر کو

☆ریسرچ ایسوسی ایٹ، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

جذب کرلیتی ہے اور استعارات کے پیکر میں کسی حقیقت کا اظہار کرتی ہے مگر عوام آئینہ الفاظ میں فرد وقوم کے سیاسی وسماجی حالات کی تصویر دیکھ لیتے ہیں۔غزل کی اس طاقت کا احساس علامہ اقبال سہیل کو بخوبی ہوگیا تھا جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اگر شاعر قادر الکلام ہے تو دنیا کا کون مضمون ہے کہ جو غزل میں نہیں ادا کیا جاسکتا، سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ غزل گوئی نے ان سات آٹھ صدیوں کے اندر اکثر الفاظ کے اندر وہ مفہوم پیدا کردیے ہیں اور کنایت یا باصطلاح حال اشاریت کے ایسے ایسے اسلوب پیش کردیے ہیں جو ہر طرح کے خیال کو رنگ تغزل میں ادا کرنے کے ضامن ہیں۔تغزل کا یہی ابہام اور یہی اشاریت تو ہے جس پر اس کی ہزاروں تفصیلیں نثار کی جاسکتی ہیں۔ (جلوہ صد رنگ، تابش سہیل)

علامہ اقبال سہیل کے اس اقتباس کی صداقت پر ہمارے قدیم شعرا کا کلام بھی دال ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے معاشرے کے حالات وکوائف کو قلم بند کیا ہے۔حاتم، میر، سودا، مومن، غالب اور اقبال وغیرہ نے اپنے عہد کے واقعات پر بڑے واضح اشارے کیے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

راضی ہیں چمن میں کرے آکے سیر وطیر بلبل سے کیا ہے پوچھ تو گل باغباں کو بیر
حاتم

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
میر

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
غالب

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان ومکاں اور بھی ہیں
اقبال

علامہ اقبال سہیل نے ہندوستان کی آزادی کے لئے سیاست میں عملی طور پر حصہ لیا اور اپنی شاعرانہ حساس طبیعت کے باعث معاصر حالات کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کیا۔ان کی نگاہ ملک

ومعاشرے کے ہر پل بدلتے ہوئے حالات پر تھی۔ اس عہد میں فرنگیوں کی عیاریاں، فرقہ پرستوں کی تخریب کاریاں، کانگریس اور مسلم لیگ جماعتوں کی کشاکش، آزادی کے متوالوں کی جدوجہد اپنے عروج پر تھیں۔ یہ تمام حالات ان کی نگاہ میں تھے، چنانچہ انھوں نے جمہوری عدل وانصاف کی آرزوؤں اور وطن عزیز کی تعمیر وترقی کا جذبہ نیز سیاسی سمت ورفتار کے مختلف پہلوؤں کو اپنے غزلیہ اشعار میں پیش کر دیا۔ انھوں نے سیاسی نقطہ سے انسانی حقوق کا نظریہ قائم کر دیا۔ یوں تو ہندوستانی سیاست میں بہت سی سیاسی جماعتیں اپنے افکار وخیالات کی تشہیر اور آزادی کا مطالبہ کرتی رہیں، مگر انگریز حکام نے اپنے شاطرانہ مکر وکید کے حربے سے عوام میں مذہبی، علاقائی اور لسانی جذبہ کے امتیاز کو تعصب کی شکل دے کر ان کے مابین تفریق قائم کر دی اور یہ تفریق ہندوستان کے بٹوارے میں بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ مزید یہ تفریق دو ملکوں کے وجود میں آنے کے بعد بھی اسی طرح قائم ودائم ہے جس کے تلخ ثمرات سے آج بھی دونوں ممالک دوچار ہیں۔

اقبال سہیل کے مزاج میں اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی سے بڑی زبردست ہم آہنگی تھی۔ شبلی کا مزاج بڑا انقلابی تھا۔ اس لئے شبلی اپنے ہم وطنوں کے ساتھ جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی پُر زور حمایت کرتے تھے۔ اقبال سہیل پر شبلی کے افکار واعمال کے گہرے اثرات مرتب ہوئے، جو ان کے سیاسی افکار وخیالات میں شدت پیدا کرتے رہے۔ وہ بڑے دیدہ ور انسان تھے، انھوں نے غزل کی روایتی شاعری یعنی حسن وعشق کی پیروی کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، اور حسن وعشق کے موضوعات کے برخلاف اپنے ملک ومعاشرے میں درپیش سیاسی اور سماجی مسائل کو شعوری طور پر پیش کیا۔ جس کے باعث انھوں نے غزل میں سیاسی، سماجی مسائل کی پیچیدگیوں کو کچھ اس انداز سے برتا کہ جیسے ان موضوعات سے غزل کے مزاج کو خاص نسبت رہی ہے۔ اسی لئے وہ جدید غزل گو شعرا میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ جیسے جیسے انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور جنگ عظیم کے اثرات کے تحت دنیا کے حالات بدلے تو ہندوستان بھی اچھوتا نہیں رہا اور ہمارے ملک میں بھی انسانیت سوز جلیان والا سانحہ وقوع پذیر ہوا، جس کے فطری ردعمل سے ہندوستانیوں کے سینوں میں انگریز دشمنی کی لو بھڑک اٹھی اور عوام فرنگیوں کے خلاف صف آرا ہونے لگے۔ اسی کے باعث 1920ء میں ترک موالات کی تحریک نے جنم لیا تھا۔ اسی حوالہ سے اقبال سہیل کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہیں ہے خوفِ اسیری سے ہمت پرواز ہمیں تو کنجِ قفس ہے یہ آشیاں اپنا
وفا فروش نہیں ہم، کہ مثلِ لالۂ گل پھریں دکھاتے ہوئے زخم خونچکاں اپنا
یہ امنِ سلطنتِ حسن ہے کہ اہلِ وفا ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں نقدِ جاں اپنا

بالا اشعار اس عہد کے عوام وخواص کی نفسیات کے بہترین عکاس ہیں۔ کیوں کہ ان کی غزلوں میں تصوف اور عاشقانہ اظہار نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ درحقیقت ان کا مزاج اس سے مطابقت نہیں رکھتا اور ان کے یہاں معاشرتی اور سیاسی مسائل نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ مزید ان کے یہاں معاصر موضوعات بھی حکیمانہ طرز فکر پر محیط ہیں۔ ہندوستان میں حب الوطنی کی تحریک عوام کے مابین جیسے جیسے زور پکڑتی ہے تو اقبال سہیل بھی تحریک میں عملی طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے مجاہدین آزادی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انگریزوں کے ذریعہ دی جانے والی قید و بند کی صعوبتوں پر مجاہدین آزادی کی ہمت کس طرح بڑھاتے ہیں:

دو تیلیاں قفس کی ہیں ان کی بساط کیا مرغِ اسیر! ہمت مردانہ چاہیے
وہ سامنے ہے منزلِ مقصود اے جنوں! بس چندگام لغزشِ مستانہ چاہیے
فیضِ تپش سے خود نکل آئیں گے بال و پر ہاں دل میں بیقراریٔ پروانہ چاہیے
ہر گوشہ اس چمن کا درِ مے فروش ہے ہاں آب و گل میں شورشِ مستانہ چاہیے

جب انڈین کانگریس اور انگریزوں کے مابین قلمدان کے اختیارات کی تقسیم کو لے کر 1942ء میں مسئلہ طے نہیں ہو پایا، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کانگریس مکمل طور پر آزادانہ اختیار کی خواہاں تھی جسے انگریز حکام نے تسلیم نہیں کیا۔ اسی کشمکش کے اتار چڑھاؤ کو علامہ اقبال سہیل نے اشعار میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

مشقِ وحشت پھر شہیدِ نا تمامی ہوگئی مصلحت، پھر سنگ راہِ تیز گامی ہوگئی
آگئی صبح قیامت اور یہ کٹتی ہی نہیں کیا شب ہجراں بھی زنجیر غلامی ہوگئی

انسانی حیات و زیست میں امید سب سے طاقتور فطری امر ہے جو بنی آدم کو مصائب و آلام سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے کیونکہ مذہبی روایات اور انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ نوعِ بشر کی جد و جہد کے اشتیاق نے بہت سے مصائب و آلام کو راحت و آرام میں تبدیل کر دیا۔ اسی

لئے شاعر مذہبی تلمیح کا سہارا لے کر اپنے عہد کے پر آشوب اور ناگفتہ بہ حالات کو ساز گار کرنے کے لئے پر امید نظر آتا ہے۔

پہلے پیدا تو کر آتش کدۂ شوق خلیل — آج بھی سہل ہے شعلوں کا گلستاں ہونا

اقبال سہیل طالب علمی کے زمانہ ہی سے بڑی فعال اور متحرک شخصیت رہے اور انھوں نے روزی روٹی کے لئے وکالت کو اپنا پیشہ بنایا۔ مگر عملی سیاست سے وابستگی 1936ء میں ہوئی اور وہ یوپی اسمبلی میں بحیثیت رکن منتخب بھی ہوئے۔ انھوں نے سیاسی رکن کی حیثیت سے اسمبلی اجلاس میں اپنے منظوم کلام کے ذریعہ خطاب کیا۔ مزید اپنی ایک غزل اور دیگر ایسے اشعار بھی پڑھے جو اس عہد کے معاشرتی حالات اور سیاسی سیاق سے گہرا تعلق رکھتے ہیں:

سزا فریاد کی ہے یا کرم ہے میرے شیون پر — قفس اب بھی وہی ہے گرچہ ہے شاخ نشیمن پر
نہیں اب کارگر کوئی فریب حسن کا افسوں — مدار اک رہ گیا ہے فتنۂ شیخ و برہمن پر
بڑھائے جاتے ہیں ہر روز حلقے دامِ گیسو کے — مگر صیاد کا احساں ہے پھر بھی اپنی گردن پر

بالا اشعار میں اقبال سہیل نے ہندوستانیوں کو آگاہ کیا ہے کہ انگریز ہمیں جو سزا دے رہے ہیں وہ ہماری فریادیا کاموں کی وجہ سے سرزمین ہند ہی پر انجام دے رہے ہیں اور انگریزوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہم ہندوستانی اپنی چیزوں سے اتنا لگاؤ رکھتے ہیں کہ ہم اپنے نشیمن کے لئے دونوں جہان قربان کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اور ہندوستانیوں کو یہ مژدہ سناتے ہیں کہ اب ہم انگریزوں کے جال میں نہیں آنے والے ہیں مگر انھوں نے اب بھی اپنی عیاری کے حربہ سے ہمارے مابین شیخ و برہمن کی تفریق قائم کر رکھی ہے جس کے باعث ہر روز نئی چیزیں ہمیں جل دینے کے لئے بنا رہے ہیں مزید طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ احسان بھی ہمارے اوپر ہی رکھ رہے ہیں۔

انگریز حکومت ہندوستانیوں سے خوف زدہ ہوگئی تھی اور بدگمانی کی انتہا کا یہ عالم تھا کہ اگر دور کہیں کوئی فریادی صدا بھی لگاتا ہے تو وہ ہندوستانی لیڈروں سے ہی بدگماں ہوتی ہے:

صدا فریاد کی آئے کہیں سے — وہ ظالم بدگماں ہوگا ہمیں سے

انسان غلامی سے آزاد ہونے کے لئے جدوجہد کرتا ہے تو بہت سی امیدیں بھی اسی نصب العین کی کامرانی سے وابستہ کر لیتا ہے جو خاص طور سے رہبران ملت سے وابستہ ہوتی ہیں مگر جب یہ امیدیں

نصب العین کے حصول کے بعد بھی بروئے کار نہیں آتی ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ایسی ہی کچھ یاس وقنوطیت کا اظہار ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے:

آیا نہ انقلاب اس اجڑے دیار تک　　　بدلا اگرچہ خود چمن روزگار تک

اس فصل میں بھی جا نہ سکے شاخسار تک　　　زنداں نصیب کاش نہ جیتے بہار تک

اقبال سہیل بھی فرنگیوں کی غلامی سے نجات کے لئے مجاہدین آزادی کی مانند اپنا نظریہ رکھتے تھے اور اسی لئے وہ غلامی کو ننگ انسانیت سے تعبیر کرتے ہیں:

قیدِ غلامی وحیاتِ ننگ ہے، ننگ کائنات　　　لعنتِ بندگی کے ساتھ صورت بندگی نہ دیکھ

پھاڑ کے جیب وآستیں کر علم جنوں بلند　　　عشق کے میر کارواں! پرچم خسروی نہ دیکھ

شاعر مجاہدین آزادی کے قافلہ کے منزل مقصود تک پہنچنے کا منتظر ہے اور یہ عزم وتوقع رکھتا ہے کہ آزادی میسر آنے کے بعد ہم بچھڑے ہوئے ہندوستانیوں کے لئے سماجی اور اقتصادی طور پر ترقی کے ساتھ ہر اعتبار سے مرفہ الحال بنانے کے لئے کام کریں گے۔ کیونکہ انگریزوں نے قوم کی عزت اور ملک کی معیشت کو برباد کردیا ہے۔ مگر اسے اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ یہ ترقی ہمارے لئے بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک وعوام کی حالت اتنی خستہ کردی گئی ہے کہ اب تو اس کی خستہ حالی کو سنوارنے کے لئے ایک ایک تنکے کو جوڑ کر ہی سجانا پڑے گا!

اب دیکھئے کب پہنچے یہ قافلہ منزل تک　　　بچھڑوں کو ملانا ہے، گرتوں کو اٹھانا ہے

کچھ کھیل نہیں، سمجھیں تعمیر نشیمن کی　　　بکھرے ہوئے تنکوں کو چن چن کے سجانا ہے

شاعر قیدیوں سے بھی یہ توقع رکھتا ہے کہ اگر وہ اپنے اندر جنون اور پراگندگی پیدا کرلیں تو قید خانہ کی دیوار میں شگاف پیدا ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے فکر وعمل اور جنون کی قوت سے بہت سی راہیں ہموار ہو جاتی ہیں:

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا

ابھی دیوار زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

انگریزوں کے خلاف معاشرے میں نفرت کا جنون اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اور شاعر نے اس عوامی غیظ وغضب کو محسوس کرلیا تھا اور یہ قیاس بھی کیا، کہ اگر یہ جنون مسلسل باقی رہا تو ہم ضرور جلد آزادی

حاصل کرلیں گے اور اب انگریز اپنے جیب ودامن کی خیر منائیں؛

شب غم اب منائے خیر اپنے جیب و دامن کی
رہے دستِ جنوں باقی، تو کرلیں گے سحر پیدا

یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان کی طبیعت اور مزاج میں سربلندی حاصل کرنے کا صحیح جذبہ اور ذوق موجود ہے تو وہ ضرور دیر وحرم کی پابندی سے ماورا ہو کر اپنے عجز وانکسار، صبر وتحمل اور عمل پیہم سے سنگ در پیدا کرنے کا حامل ہو جاتا ہے؛

مذاقِ سر بلندی ہو تو پھر دیر و حرم کیسے
جبیں سائی کی فطرت نے کیے ہیں سنگِ در پیدا

شاعر اور سیاست داں زمانہ، معاشرے اور افراد کے مزاج شناس ہوتے ہیں مزید عوام کی نبض شناسی کے باعث زمانہ کا دھارا بھی مزاج کے مطابق موڑنا بحسن وخوبی جانتے ہیں اسی لئے وہ جوانوں سے مخاطب ہیں؛

جوانو! یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہوجائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا

دراصل قدرت نے انسان کی جدوجہد پر دنیاوی کارہائے نمایاں کا مدار رکھا ہے اگر کسی شخص کے باطن میں جذبہ جوش وجنوں ہوتا ہے تو وہ اپنی ضرورت کے مطابق اپنی دنیا خلق کرلیتا ہے؛

وہ شبنم کا سکوں ہو یا کہ پروانے کی بیتابی
اگر اڑنے کی دھن ہوگی تو ہوں گے بال و پر پیدا

شاعر اپنے رب سے نوجوانوں کے دلوں میں وطن کی محبت کا درد وسوز پیدا کرنے کے لئے دعا کرتا ہے۔ کہ تو ان کے دلوں میں ہنگامہ اور بغاوت کے شرارے پھوٹ پڑنے کے لئے مہمیز کردے؛

دل سوزاں کی اک ہلکی سی یارب! چوٹ پڑ جائے
انھیں ذروں میں ہو ہنگامہ رقصِ شرر پیدا

شاعر ہندوستان کی آزادی کے لئے ہر اعتبار سے کوشاں ہے۔ مگر انسان ہے جو کبھی کبھی یاس کی کیفیت سے دوچار ہو کر اپنے رب سے سوال کرنے لگتا ہے۔ کہتا ہے؛

سہیلؔ اب پوچھنا ہے انقلاب آسمانی سے
ہماری شام غم کی بھی، کبھی ہوگی سحر پیدا

اقبال سہیل کی سیاسی نظر اپنے ملک اور عالمی منظر نامہ پر تھی کیونکہ بنی نوع انسان عالمی پیمانہ پر باہم دوسری جنگ عظیم سے معرکہ آرا تھا جس کے باعث عوام الناس جنگ کی ہولناکیوں، پریشانیوں اور مصائب و آلام میں مبتلا تھی مگر اقبال سہیل نے اس پر آشوب ماحول میں بھی حوصلہ اور ہمت نہیں ہاری، بلکہ عوام کی حوصلہ افزائی کی۔

گرفتارِ قفس ہوں، کیا کریں گی بجلیاں میرا
نہ شاخ آشیاں میری، نہ صحن بوستاں میرا

یہ حقیقت ہے کہ حاکم قوم کا غلاموں کی وفاداریوں سے کوئی واسطہ یا سروکار نہیں ہوتا۔ انھیں تو صرف اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ اس لئے غلام کی وفاداریاں اور سجدے بے سود ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ غلاموں کی اپنی جبیں بھی اپنی نہیں ہوتی تو حاکم کا آستاں اپنا کیسے ہوسکتا ہے؟ اور مزید یہ بھی کہ غلام قوم کی نفسیات اپنے آقا کے لئے کیسے کام کرتی ہے؟ اشعار میں ملاحظہ کریں:

غلامی میں وفا بے سود، سجدہ رائیگاں میرا
نہ خود اپنی جبیں میری، نہ ان کا آستاں میرا

خیال ان کے سخن میرا، زباں ان کی، دہن میرا
بہاران کی، چمن میرا، گل ان کے، گلستاں میرا

جب کوئی حکمراں قوم دیگر قوم پر ظلم وستم روا رکھتی ہے تو قانون قدرت کے مطابق کبھی نہ کبھی وہ مصائب و آلام میں مبتلا ہوتی ہے۔ بھلے ہی انگریزوں نے دنیا میں خاص کر ہندوستان میں اقتصادی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی طور پر اپنی ریشہ دوانیاں ضرور روا رکھیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے برطانوی حکمراں اور عوام کو اپنے شعلوں سے بری طرح جھلس کر رکھ دیا تھا۔ جب شاعر اپنی مظلومیت کی آہ کی پکار بطور سزا انگریزوں پر پڑتے ہوئے دیکھتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے:

کہاں تک اڑ کے جا پہنچے شرر میرے نشیمن کے
لبِ صیاد پر ہے اب تو شورِ الاماں میرا

تاریخ کے صفحات میں یہ اظہر من الشمس ہے کہ جب کوئی قوم دیگر قوم پر اپنا تسلط قائم کر لیتی ہے تو وہ مغلوب قوم کے جملہ امور میں سیاہ وسفید کے غیر اخلاقی تصرف کا استحقاق حاصل کر لیتی ہے

اور مغلوب قوم کے افراد اپنے وقار کی تمکنت سے عاری ہو کر مجبور اور بے چارگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مزید اپنے اوپر بے حسی کی سی کیفیت بھی طاری کر لیتے ہیں۔ شاعر اس کیفیت کو شعر میں کچھ اس طرح ڈھالتا ہے؛

نہ اب صیاد کا کھٹکا، نہ اب گل چیں کا اندیشہ
کرم نے باغباں کے پھونک ڈالا میرے گلشن کو

شاعر اپنی ذات سے مخاطب ہو کر ایک ایسی عمومی بات کہتا ہے جو تمام ہندوستانیوں پر صادق آتی ہے کہ در حقیقت ہماری آنکھیں غلامی کے دور میں کھلی ہیں اور غلاموں کی کوئی میراث نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ آشیانہ کہاں ہے جو مجھے معلوم نہیں اپنا ہو؛

یہ بدبخت آنکھیں کھلی ہیں قفس میں
مجھے یاد تک آشیانہ نہیں ہے

شاعر کے نزدیک ہندوستانی بظاہر غلام ہیں مگر ذہنی طور پر وہ غلام نہیں ہیں اور نہ ہی غلام بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ مزید وہ ایسے آشیانہ میں بھی نہیں رہنا چاہتے جو غلامی کے باعث قفس معلوم ہوتا ہو، اسی لئے وہ اس پر بجلی گرنے کی تمنا کرتا ہے اور اسے احسان سے تعبیر بھی کرتا ہے؛

گرے اس پہ بجلی تو احسان مانوں
قفس ہے مرا آشیانا نہیں ہے

ہر عہد میں ایسے حضرات رہے ہیں جو حکومت کے مہرے بن کر سماج کی نمائندگی کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کا صلہ پاتے رہتے ہیں اور ہندوستان میں بہت سے ہندو اور مسلمان رہبران نے ایسے کام انجام دیئے ہیں تو شاعر ایسے حضرات پر شیخ و برہمن کے استعارے میں بڑا لطیف طنز کرتا ہے ملاحظہ کیجیے؛

شیخ و پنڈت کو مبارک دردِ ملی کا صلہ
حسن کی سرکار میں ان کی سلامی ہو گئی

اقبال سہیل کو ملک سے والہانہ لگاؤ تھا اور وہ ہندوستان کے بٹوارے کے موضوع پر ہندوستانی رہنماؤں کے مابین ہونے والے بحث و مباحثہ سے خوش نہیں تھے کیونکہ وہ ہندوستان کو جغرافیائی حدود

کے ساتھ ہماری مشترکہ تہذیب کو بھی بانٹ رہے تھے۔ تو شاعر محسوس کر رہا تھا کہ ہمارا باغ لٹ رہا ہے۔ مگر اس کے مضر اثرات سے ہمارے ملک وقوم کے ارباب حل وعقد بے خبر تھے۔ شاعر ان کی بے خبری پر طنز کرتا ہے؛

تقسیم گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی
گلزار لٹ رہا ہے کچھ اس کی خبر نہیں

اقبال سہیل اس نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو غلام قوم کی فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ حاکم قوم غلام قوم کو اس قدر مجبور محض بنا دیتی ہے یا وہ خود بخود بن جاتی ہے جس سے اس قوم کے افراد کا آزادانہ پرواز کرنے کے لئے ہمت کا مادہ ہی سلب ہو جاتا ہے اور وہ سازگار ماحول کی راہیں ہموار ہونے کے باوجود اپنے پاس حوصلہ کے پر نہیں رکھتے؛

یوں باغباں نے ہمت پرواز چھین لی
ایسی بھری بہار ہے اور ایک پر نہیں

اقبال سہیل نے قوم اور برادران وطن کو اپنی طویل بحر کی غزل میں یہ درس دیا ہے کہ اگر انسان کے ضمیر وباطن میں فطری جوش وجنون ارادہ کی پختگی کے ساتھ بروئے کار آتا ہے تو قدرت بھی اس کے انجام کی تکمیل کے لئے غیب سے وسائل فراہم کر دیتی ہے؛

جب ولولہ صادق ہوتا ہے جب عزمِ مصمم ہوتا ہے
تکمیل کا ساماں غیب سے خود اُس وقت فراہم ہوتا ہے

اقبال سہیل برادران وطن کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہم نے انگریزوں کی غلامی میں اپنی وفاداریوں کا انجام دیکھ لیا یعنی اس کے صلہ میں در حقیقت ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ تو اب ہمیں سر جھکانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے مزاج کی لطافت کا تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ اب تو سجدہ کرنے سے بھی گرانی طبع ہوتی ہے؛

انجام وفا بھی دیکھ لیا اب کس لئے سر خم ہوتا ہے
نازک ہے مزاج حسن بہت، سجدے سے بھی برہم ہوتا ہے

ہندوستان کی تہذیب وثقافت پر غور وفکر کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان

کی مختلف النوع تہذیب کی باہمی رنگارنگی شیر وشکر کی مانند مشترکہ تہذیب کو دوبالا کرتی ہے۔ اسی کے باعث شاعر یہ عرض کرتا ہے کہ دریاؤں کے سنگم سے کہیں زیادہ پرکشش تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے؛

مل جل کے بہ رنگ شیر وشکر، دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے

دنیاوی تاریخ شاہد ہے اگر کسی قوم کی جملہ دولت لٹتی ہے تو وہ قوم سراپا احتجاج بن کر حاکم و غاصب قوم کو ماتم کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ اسی سیاق میں شاعر نے انگریزوں کو آگاہ کیا ہے؛

تاراج نشیمن کھیل سہی، صیاد مگر اتنا سن لے
جب عشق کی دنیا لٹتی ہے خود حسن کا ماتم ہوتا ہے

انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد ملک میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک کر شعلہ افگن ہوگئی جس کے باعث شاعر بڑے طنز کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم کس طرح گلشن بہار کے مزاے اڑا سکتے ہیں؛

لو میے خاک اس آزادیٔ گلشن کی بہار
ہے ہمارے لئے یہ جنت شداد ابھی

شاعر اور تمام ہندوستانیوں نے آزادی کی خوشی کے لئے جملہ مصائب وآلام کو برداشت کرلیا، مگر حقیقتاً یہ ہوا کہ آزادی سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ بروئے کار نہ آسکی تو شاعر کہہ اٹھتا ہے؛

شب غم کاٹ دی تھی جس کے جاں پرور تصور میں
چھپی ہے کہر کی تہہ میں، وہ صبح زرنگار اب تک

انگریزوں نے ہندوستانی معاشرے میں اپنی عیارانہ حکمت عملی سے عوام کے مابین مذہبی اور علاقائی تعصب کا زہر گھول دیا، جس سے ہمارے ملک کی فضا مسموم ہوکر خون آرزو سے لالہ زار ہوگئی۔ فرنگیوں کے جانے اور آزادی ملنے کے باوجود انتشار و اضطراب ہنوز ہمارے معاشرے میں رواں دواں ہے:

صبا نے جاتے جاتے، جانے کیا سرگوشیاں کی ہیں
نہ بھولا ایک برگِ گل بھی درسِ انتشار اب تک
فضائے جاں ابھی مسموم ہے یادِ شبِ غم سے
دیارِ دل ہے خونِ آرزو سے لالہ زار اب تک

انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان کی فضا مکدر ہوگئی مگر شاعر نے ماحول سازگار ہونے

کی امید کا دامن نہیں چھوڑا اور ایسے پرآشوب ماحول میں بھی عوام کو زندگی گزارنے کا حوصلہ دے کر انھیں مزید غم زدہ ہونے سے بچاتا رہا؛

سہیل اس چلتی پھرتی چھاؤں سے دل گیر کیا ہونا
یہ دنیا کروٹیں لیتی رہی ہے بار بار اب تک

انگریزوں نے آزادی سے قبل ہی ہندوستانی معاشرے میں مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دے کر عوام اور بہت سے نام نہاد قائدین کو متشدد بنا دیا۔ اور وہ اپنے متعصب آمیز جنون کی شدت کے باعث انسانی پہلو کو بھی نظر انداز کر گئے۔ اقبال سہیل نے اسی پس منظر اور پیش منظر کو مدنظر رکھ کر شیخ و برہمن تک اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے؛

کوئی دیر و حرم تک یہ مری فریاد پہنچا دے
وہ شیخ و برہمن کیا جو نہ رہ سکتے ہوں انساں بھی

انگریزوں نے اپنی عیاری سے ہندوستان میں انسانیت کے بجائے وطن پرستی کے غیر فطری جذبہ کو اس انتہا تک پہنچا دیا تھا کہ برادران وطن مسلمانوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے اور ان کی یہ منفی فکر آج بھی متعصب ذہنوں کو غذا فراہم کر رہی ہے۔ اقبال سہیل نے مسلم اور سیاست داں کی حیثیت سے اپنے فرض منصبی سے عہدہ برآں ہونے کے لئے متعصب برادران وطن کو سمجھانے کی کوشش کی ہے مگر دین کو مقدم رکھ کر؛

وطن پیارا ہے ہم کو، دیں مگر اس سے بھی پیارا ہے
فدا ہوں گے وطن پر، رہ سکے گر ہم مسلماں بھی

شاعر بحیثیت ہندوستانی ہونے کے ناطے بے سروسامانی کی حالت میں بھی اپنے افتخار و تمکنت پر نازاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ وطن سے عقیدت اس کو یہ حوصلہ بخشتی ہے اسی لئے شاعر کو بے نوا ہونے کے باوجود وطن کی خاک کے بدلے میں سلیمان کا ملک بھی درکار نہیں ہے۔

سہیل اس بے نوائی پر بھی ہمت کا یہ عالم ہے
عوضِ خاکِ وطن کے میں نہ لوں ملکِ سلیماں بھی

اقبال سہیل کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات ذہن میں آجاتی ہے کہ ان کا کلام تو قارئین سے

غائر مطالعہ کا متقاضی ہے کیونکہ اس میں معاصر سیاست کے ایسے رموز وعلائم پنہاں ہیں جس پر ہر کس و ناکس کی توجہ مبذول نہیں ہو پاتی۔ اسی لئے وہ اپنے کلام کے متعلق فرماتے ہیں؛

مرا ذوقِ فن عامیانہ نہیں ہے
یہاں قصۂ زلف و شانہ نہیں ہے

علامہ اقبال سہیل کی سیاست سے عملی وابستگی اور عوام الناس سے فطری ہمدردی نے ان کی خلاقانہ طبیعت سے غزل کے مزاج میں بڑے معنی خیز اشعار قلم بند کروائے۔ جن میں جذبات کی شدت وٹھہراؤ متوازن ہے۔ کیونکہ ان کے کلام کی فکری بصیرت میں بنی آدم کے مابین عالمی اخوت کی زیریں لہریں موجود ہیں۔ اب ہم ان کے کلام کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں سیاسی اور جماعتی مصلحت بے جا طور پر حاوی نظر نہیں آتی ہے اور ان کے سیاسی تصورات میں بلند کردار کی جملہ خوبیاں واضح طور پر نمایاں ہیں۔

اقبال سہیل کے نعتیہ قصائد کی خصوصیات

ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی☆

دیارِ شبلی کا وہ سپوت جسے خطۂ اعظم گڑھ کے لوگ اقبال سہیل کے نام سے جانتے ہیں، اس کے اقبال کا پرچم ہمیشہ بلند رہا اور سہیل کی رخشندگی ہمیشہ قائم رہی۔ ایسے ذکی، زود گو، فی البدیہہ شعر کہنے والے شاعر کم کم ہی ہوتے ہیں۔ ان کی ذہانت و فطانت کے قائل اکابرین علم و دانش بھی ہیں۔ یہاں شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ نعت پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت، تعریف، توصیف اور خصائص کے منظوم بیان کو کہا جاتا ہے۔ اقبال سہیل کی نعتیں اور نعتیہ قصائد کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعتیہ کلام میں وہ مذکورہ تمام امور اور حفظِ مراتب کا خیال رکھتے ہیں۔

نعت گوئی کا آغاز کب ہوا؟ اس کے بارے میں حتمی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے پھر بھی روایات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب نے پہلے پہل نعت کہی اور اصحاب میں حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے نعت گو شاعر اور نعت خواں تھے۔ اسی بنا پر انھیں شاعرِ دربارِ رسالت بھی کہا جاتا ہے۔ نعتیہ شاعری کی روایت عربی اور فارسی شاعری میں ابتدائی دور ہی سے رہی ہے۔ اسی طرح اردو شاعری میں بھی دکنی عہد سے لے کر عہد حاضر تک اکثر و بیشتر شعرا نے حمد، نعت و منقبت میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بعض شعرا نے اسے اپنا خاص موضوع بنایا اور اردو کی نعتیہ شاعری کو شاعرانہ عظمت سے ہمکنار کیا۔ اس سلسلے میں محسن کاکوروی، احمد رضا خاں بریلوی اور اقبال سہیل وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اقبال سہیل کے نعتیہ قصائد کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی طبع رسا کو اس

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، سری نگر۔ ۱۹۰۰۱۵۔

سے فطری ہم آہنگی تھی۔ انھوں نے اپنے پیش رونعت گو شعرا کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اردو کی نعتیہ شاعری کے افق کو مزید وسعت بخشی اور فکر وفن کے اعتبار سے اسے نیا انداز و آہنگ عطا کیا۔ علامہ شبلی اور حمید الدین فراہی کی صحبتوں نے ان کی عقیدت میں مزید اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر شخصیت کا عرفان و شعور بھی بخشا۔ اسی شعور نے ان کے نعتیہ کلام میں حقیقت وواقعیت کا رنگ بھرا۔ نعت کے لئے صرف عقیدت ہی نہیں بلکہ تاریخ اسلام پر گہری نظر اور واقعات و روایات کے بارے میں بھی صحیح علم نہایت ضروری ہے۔ سہیل کی شاعری میں ان بنیادی خصوصیات کے ساتھ ساتھ آداب فن کا بھی پورا التزام ہے۔ ہمارے زیادہ تر نعت گو شعرا نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اسی طرح کا لب ولہجہ اور انداز بیان اختیار کیا ہے جو غزلیہ شاعری میں مجازی محبوب کے لئے رائج ہے۔ اس کے علاوہ مبالغہ طرازی کی وجہ سے ان کے یہاں اعتدال کی کمی بھی اکثر نظر آتی ہے۔ سہیل نے اس روش سے ہٹ کر تمام انبیا ورسل کی عظمت کا پاس رکھتے ہوئے آپ کے پیغمبرانہ جلال و جمال کے شایان شان الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کا ایک نعتیہ قصیدہ معراج کے واقعے پر مبنی ہے، جس میں انھوں نے معراج کے واقعے کو نہایت خوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے لئے چند اشعار:

وہ جسم پاک خود سر تا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی

حریم ام ہانیؓ میں حضورؐ آرام فرما تھے
در دولت پہ قدسی و ملک تھے محو دربانی

ادب سے آکے جبرئیل امیں نے یہ گزارش کی
کریں سرکار بزم نور تک تشریف ارزانی

براقِ برق پیکر لے چلا یوں ذاتِ انور کو
فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی

حضورؐ اسطرح گزرے گنبدِ مینائے گردوں سے
نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی

ملائک اور رسل صف بستہ استقبال کو آئے
اٹھا افلاک میں ہر سمت شورِ تہنیت خوانی

سوادِ لامکاں تک رک گیا رف رف کہ اس کو بھی
کہاں اس خلوت وحدت میں اذنِ گرم جولانی

کسی نے لے لیا بڑھ کے خود آغوشِ محبت میں
ہوا ملک قدم خلوتِ سرائے حسن امکانی

ظلال و ذات میں پھر کیا ہوا اللہ ہی جانے
کہ ہے یہ مرحلہ مافوقِ ادراکاتِ انسانی

بجز ذات مطہر یہ شرف کس کو ہوا حاصل
بجز صدیق اکبر یہ حقیقت کس نے پہچانی

خرد عاجز، نظر خیرہ، زباں کج مج، بیاں قاصر　　زمینِ نعت میں کیا دیجئے دادِ سخن دانی

یہ ایک طویل ونہایت عمدہ قصیدہ ہے جس کا لطف شروع سے آخر تک پڑھنے ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ درج بالا سطور میں منتخب اشعار نقل کئے گئے ہیں تا کہ حاضرین کو قصیدے کے رنگ و آہنگ اور کیفیت کا اندازہ ہوسکے۔ اس نعت میں سہیل نے افراط وتفریط سے دور رہتے ہوئے جس جذبے اور احترام کے ساتھ اپنے اخلاص وعقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں کمیاب ہے۔ ان کے یہاں رسول پاک کی وہی صفات حسنہ اور فضائل انسانی ملتے ہیں جو قرآن وحدیث اور تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ سہیل نے تمام انبیا ورسل کی عظمت کا پاس رکھتے ہوئے آپ کے جلال و جمال کے شایانِ شان الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس قصیدے کے مطالعے سے قاری کو اندازہ ہوگا کہ وہ ذاتِ اقدس کن کمالات کی جامع تھی، جس کی روحانی جلالت وعظمت کے سامنے کفر وباطل کی تمام ریاستیں سرنگوں ہوگئی تھیں۔ معراج کے واقعے کو بیان کرتے وقت ہمارے روزمرہ کی عام انسانی زندگی سے تشبیہ لے کر اس میں مزید خوبی پیدا کردی، ساتھ ہی اپنی تخیل آفرینی کا ثبوت بھی فراہم کردیا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جانہ ہوگا کہ جس دور میں یہ قصیدہ کہا گیا، اس وقت ہندوستان میں اس بات کی کافی بحث تھی کہ حضورِ پاک بہ نفس نفیس معراج کو گئے تھے یا انھیں خواب میں دیدار کرایا گیا تھا۔ اس بحث کو انھوں نے درج ذیل شعر سے ختم کرنے کی کوشش کی:

وہ جسمِ پاک خود سر تا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی

اسی طرح معراج کے لئے عرشِ معلی تک جانے میں آپ کو کتنا وقت لگا؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ رہا کہ:

"فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی" "وہ آسمان سے کس طرح گزرے؟" "نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی؟" یہ تشبیہیں جو مذکورہ اشعار میں استعمال کی گئی ہیں، وہ بڑی نازک ولطیف ہیں اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے لی گئی ہیں۔ غیر مجسم چیزوں کو مجسم چیزوں سے تشبیہ دینا، شاعری میں شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اقبال سہیل نے اپنے تخیل، مشاہدے، تجربے اور عقیدت سے وہ بھی کر دکھایا۔ اس کا لطف نکتہ شناس اور سخن فہم حضرات ہی جانتے ہیں کہ جب اس طرح

کی چیزیں ہمارے مطالعے میں آتی ہیں تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔ مذکورہ نعتیہ قصیدے میں انھوں نے معراج کے واقعے سے متعلق تمام واقعے کو مکمل طور پر پیش کرنے کے علاوہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اوصاف کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور نعتیہ قصیدہ اسی زمین میں ہے، اس سے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہاں کا دشتِ ایمن، طور کیا، برقِ تجلی کیا — یہ سب کچھ تھی جمالِ مصطفےٰ کی پرتو افشانی
محمدؐ وہ کتابِ کون کا طغرائے پیشانی — محمدؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی
محمدؐ یعنی وہ حرف نخستیں کلک فطرت کا — محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعات ربانی
وہ فاتح جس کا پرچم اطلس زنگاری گردوں — وہ امی جس کے آگے عقل کل طفل دبستانی
وہ ناطق جس کے آگے مہر برلب بلبل سدرہ — وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطق ربانی
وہ عادل جس کی میزان عدالت میں برابر ہے — غبار مسکنت ہو، یا وقارِ تاجِ سلطانی
تراشہ جس کے ناخن کا ہلال آسماں منزل — غسالہ جس کے تلوؤں کا زلال آبِ حیوانی
تعالی اللہ ذاتِ مصطفیٰ کا حسنِ لاثانی — کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصاف امکانی
دعائے یونسی، خلقِ خلیلی، صبر ایوبی — جلالِ موسوی، زہدِ مسیحی، حسن کنعانی
خدا جانے خود اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا — غلام بارگہ جس کے کہیں ما اعظمِ شانی

یہ قصیدہ ۵۳/اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے جملہ اوصاف کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ درج بالا منتخبہ اشعار پورے نعتیہ قصائد سے اخذ کیے گئے ہیں، جن سے شاعر کے تخیل، مطالعے، لفظی ذخیرے اور فن شاعری کا اندازہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ سہیل نے اپنے نعتیہ کلام میں حقیقت نگاری کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں تخیل کی رنگ آمیزی اور فن کی صناعی اس درجہ نہیں ہے کہ حقیقت اس میں گم ہوکر رہ جائے۔ انھیں معانی کی ترسیل کا خاص سلیقہ آتا ہے۔ ان کے خیالات میں ابہام نہیں بلکہ وضاحت ہے۔ ان کا انداز بیان عامیانہ نہیں بلکہ ان کے بیان میں ایک شانِ تمکنت ہے۔ ان کے نعتیہ کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے افتخار اعظمی لکھتے ہیں:

"وہ فن کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں، اسی بنا پر ان کے یہاں مواد و صورت

کا معتدل امتزاج ہے، ژولیدہ بیانی اور پریشاں خاطری سے ان کا کلام پاک ہے ان کے یہاں عالمانہ اظہار فصاحت اور لب ولہجہ کا وقار ہے، ان کے نعتیہ قصائد میں تازگی وتوانائی، متانت وجزالت، شادابیِ خیال، بندش کی دلآویزی، الفاظ کی مرصع کاری اور صوتی تناسب بھی کچھ پورے طور پر موجود ہے۔''(۱)

سہیل کے قصائد میں عربی وفارسی کے الفاظ اکثر استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کے یہاں الفاظ کی بندش ایسی ہوتی ہے کہ خیالات کے بہاؤ میں کمی نہیں آنے پاتی۔ اسی وجہ سے الفاظ کی اجنبیت کا احساس جاتا رہتا ہے۔ ان کا ایک طویل نعتیہ قصیدہ بہ عنوان ''موجِ کوثر'' ہے۔ اس میں عربی وفارسی تراکیب کی بہتات کے باوجود الفاظ کی مناسب ترتیب اور قافیہ وردیف کی ہم آہنگی کی وجہ سے جذبے کا بہاؤ اور نغمگی قابلِ دید ہے۔ اس قصیدے کے بھی چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

احمد مرسل، فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم	مظہر اول مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
عالم ناسوتی کا مجاہد، شاہد لاہوتی کا مشاہد	شان میں ارفع، صبر میں اقوم صلی اللہ علیہ وسلم
شرح الم نشرح وہ سینہ، برقِ تجلی کا گنجینہ	جگمگ جگمگ، چم چم چم صلی اللہ علیہ وسلم
فردو جماعت، امر واطاعت، کسب وقناعت، عفو وشجاعت	حل کئے جو اسرار تھے مبہم صلی اللہ علیہ وسلم
ربط وتصادم، طوع وتحکم، فقر وتنعم، عدل وترحم	سب کے حدود بتائے باہم، صلی اللہ علیہ وسلم
حفظ مراتب، پاسِ اخوت سعی وتوکل، رفق وفتوت	تلک حدود اللہ میں منضم، صلی اللہ علیہ وسلم
جتنے فضائل، جتنے محاسن، ممکن میں ہو سکتے تھے ممکن	حق نے کئے سب اس میں فراہم صلی اللہ علیہ وسلم

یہ قصیدہ ۸۶/اشعار پر مشتمل ہے اور ردیف کا تو کہنا ہی کیا ہے؟ مذکورہ نعتیہ قصیدے کے مطالعے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر کے دل میں اس جامع کمالات شخصیت کی محبت کا ایک دریا موجزن ہے اور وہ اس بات کی کوشش میں ہے کہ کس طرح حضور پاک کی تمام صفات کا احاطہ کر دیا جائے۔ اس قصیدے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، عظمت وصفات کے ذکر کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین اور اسلامی تاریخی واقعات واحادیث کا ذکر بھی مراتب کے اعتبار سے کیا ہے۔ وہ شریعت کی حدوں سے کبھی بھی تجاوز نہیں کرتے۔ اس نعتیہ قصیدے میں خلفائے راشدین کے ساتھ ساتھ بہت سے خاص صحابیوں کے نام بھی بہ لحاظ

مراتب آئے ہیں۔ جیسے:

خلفا چرخِ ہدیٰ کے انجم رضی اللہ تعالیٰ عنہم	آپ جہاں کے ہادیٔ اعظم، صلی اللہ علیہ وسلم
سایۂ قد صدیق مکرم، صید نظر فاروق معظم	رازِ نبوت کے دو محرم، صلی اللہ علیہ وسلم
دونوں مظہر شان رسالت دونوں پیکر صدق وعدالت	دونوں بام شرف کے سلّم، صلی اللہ علیہ وسلم
ختم رسالت شاہ زمن پر، ختم خلافت ذاتِ حسن پر	دونوں مصحفِ حق کے خاتم، صلی اللہ علیہ وسلم
سعدؓ وسعیدؓ و زبیرؓ و طلحہؓ، ابن عوفؓ اور ابوعبیدہؓ	گل کدۂ دیں جن سے ہے خرم صلی اللہ علیہ وسلم

اس نعت کا قصہ یہ ہے کہ اقبال سہیل نے یہ نعت اپنی بچی کو'بر ہرہ' کی زنانہ محفل میلاد میں پڑھنے کے لئے لکھی تھی۔ اب اس شاعر کے تخیل، تصور اور فکر کی بالیدگی کا اندازہ کیجئے کہ جو شاعر اپنی بیٹی کے لئے اس نوع کی نعت کہتا ہو تو اس کا معیار شاعری کیا ہوگا؟

آیئے اب ذرا سا اس نعت کی تکنیک اور خوبیوں پر بھی غور کرتے چلیں۔ سب سے پہلی بات جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کی ردیف ہے یعنی صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب کوئی شاعر اپنے قصیدے یا کسی شعری تخلیق کے لئے کوئی خاص قافیہ یا ردیف اختیار کرتا ہے تو ایک طرح سے وہ اپنے اوپر ایک پابندی لگا تا ہے، جس کا نباہ اسے بہ حسن وخوبی کرنا پڑتا ہے ورنہ پھر قافیہ تنگ ہونے والی بات ہو جائے گی۔ اقبال سہیل نے صلی اللہ علیہ وسلم کی ردیف اختیار کر کے اپنے آپ کو کچھ خاص چیزوں کا پابند کیا اور اسے اس طرح نباہا کہ آج کا قاری پڑھتے ہوئے مسحور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ردیف کے شایانِ شان مصرع لگانا اور اس کے مرتبے کو نبھانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن سہیل نے اپنے مطالعے، اسلامی تاریخ وحدیث سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اپنی طبع رسا کا جوہر دکھا دیا اور اس منزل سے کامیاب گزر گئے۔ سہیل کے نعتیہ کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے مرزا احسان بیگ نے لکھا ہے کہ:

> نعت دراصل نہایت نازک مرحلہ ہے، جہاں ہوش وبصیرت سے کام نہ لیا جائے تو ہر قدم پر لغزش کا امکان ہے، اس لئے ہر راہ رو اس مقدس راہ سے کامیاب نہیں گذر سکتا، یہ کوئی دنیا کا عرصۂ رزم نہیں ہے کہ قدم پس وپیش کو نظر انداز کر کے بلا کسی غور احتیاط کے گرد وغبار اڑاتا بڑھتا چلا جائے۔ (۲) (ارمغان حرم، ص:۵۶)

اقبال سہیل کے نعتیہ قصائد کی لفظیات، خیالات کی بلندی، واقعات کا تسلسل، حضور پاک کی شخصیت کے اوصاف اور اظہار بیان اردو شاعری میں اپنی ایک منفرد شناخت اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں جب کہ قصیدے کی محفل ختم ہوگئی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ قصیدے کی صنف پروان چڑھ سکے۔ سہیل نے نعتیہ قصائد و منقبتیہ قصائد کہہ کر یہ ثابت کردیا کہ شاعر اگر موزوں طبع ہو تو اس کا ذہن کسی بھی موضوع اور صنف میں اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔ سہیل نے بیسویں صدی میں نعتیہ قصائد کہہ کر قصائد کے لئے نئی راہ پیدا کی اور خود اس سے کامیاب گزرے۔ غزل اور نظم کے میدان میں سہیل کے حریف ہو سکتے ہیں لیکن نعتیہ شاعری میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ انھوں نے امرا کی مدح سرائی میں عمر نہیں گنوائی بلکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کے عظیم افراد کی شان میں قصائد کہے تاکہ دلوں میں اعلیٰ انسانی قدروں کا احترام پیدا ہو سکے۔ سہیل شاعری میں اخلاق سے فروتر بات کے قائل نہیں تھے، اس لئے انھوں نے قصیدہ نگاری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے اصلاح قوم اور درس اخلاق کا ذریعہ بنایا۔ آپ کی سیرت پاک صحابہؓ کرام کے فضائل ومحاسن اور تاریخ اسلام کے اہم واقعات کو اپنے قصائد کے ذریعہ اجاگر کیا۔ ادب کا مورخ آئندہ جب اردو کے نعتیہ قصائد کی تاریخ لکھے گا تو اس کا قلم اقبال سہیل کے نامِ نامی کو بیسویں صدی کے نعتیہ قصائد کا اہم شاعر لکھنے پر مجبور ہوگا اور بس۔

کتابیات:

(۱) ارمغانِ حرم، اقبال سہیل (افتخار اعظمی)، مرکز ادب، جہانگیر آباد پیلس، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء
(۲) کلیات سہیل، اقبال سہیل (عارف رفیع)، بھاوے پرائیویٹ لیمٹیڈ، بمبئی، ۱۹۸۸ء

☆☆☆

اقبال سہیل اور قومی یکجہتی

ڈاکٹر شکیل احمد☆

اقبال احمد خاں سہیل دیار شبلی کے نامور اہل کمال میں سرفہرست ہیں۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی بعدہ بنارس میں زیر تعلیم رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے۔ آپ کا شمار یونیورسٹی کے ہونہار اور ذہین طلبہ میں ہوتا تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ نامور وکیل ہونے کے ساتھ قوم پرست مجاہد آزادی بھی تھے۔ سرگرم سیاست میں حصہ لے کر آزادی سے قبل کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور رکنیت کے دوران آزادی اور قومی یکجہتی کے لئے مسلسل سرگرم رہے۔ ان اوصاف کے ساتھ آپ کو فن شعر گوئی سے فطری مناسبت تھی جس کا استعمال آپ نے تحریک آزادی اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے اس انداز میں کیا کہ آج بھی اس کی معنویت باقی ہے۔ آپ کی شخصیت اور فکر وفن کی تعمیر میں دیار شبلی کے علماء اور فضلاء کے ساتھ یہاں کی مٹی کی زرخیزی نے بھی حصہ لیا۔ آپ کے مشہور زمانہ شعر:

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

کا اطلاق آپ کی شخصیت پر بھی ہوتا ہے۔ دیار شبلی کی ایک شناخت اولوالعزمی، سخت کوشی، خودداری جرأت مندی اور حریت فکر و وطن بھی ہے۔ آپ نے جس ماحول میں عملی زندگی میں قدم رکھا وہ انگریزوں کے تسلط اور جبر وظلم کا زمانہ تھا پورے ملک کی طرح اعظم گڑھ میں بھی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی آزادی کے متوالے جوش حریت سے سرشار ہو کر انگریزوں کے خلاف سینہ سپر تھے۔

☆ قاسمی منزل مئوناتھ بھنجن 9236722570

۱۸۵۷ء کی طرح ۱۹۴۲ء میں بھی اس ضلع کے سپوت انگریزی اقتدار سے لوہا لے رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے ہم اقبال سہیل کے حوالہ سے دیارِ شبلی کے تہذیبی اور سماجی ماحول کو بھی ذہن میں رکھیں صدیوں پر پھیلی اس خطہ کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کے مکینوں اور فرزندوں نے زندگی کے ہر میدان میں اپنی کارگردگی کے روشن نقوش قائم کئے ہیں یہاں کے صاحبان علم وفن اور ارباب صنعت وتجارت ہر دور میں اپنی صلاحیتوں کی بدولت سرفہرست رہے ہیں۔ اس فیضان تجلی کے پیچھے یہاں کے مکینوں کی سخت کوشی، باہمی اخلاص وتعاون اور نیک نیتی کا بڑا دخل رہا ہے یہ خطہ اقتدار پرستوں کی رستاخیزیوں اور جنگ وجدال سے بڑی حد تک محفوظ رہا ہے۔ چھوٹی ندیوں اور ہموار زمینوں کا یہ جغرافیائی خطہ تجارت اور کاشتکاری کے لئے موزوں ضرور ٹھہرا مگر اس دیار کے گاؤں کے راستے اور پگڈنڈیاں قریبی قصبات تک جاکر رک نہیں گئے بلکہ حیدرآباد، علی گڑھ، دہلی، دیوبند، لکھنؤ، ممبئی، سورت، کلکتہ اور دیگر علمی اور صنعتی مراکز تک جا پہنچے۔ جس کا فیضان آج بھی جاری ہے۔

ساکنانِ دیارِ شبلی ''پدرم سلطان بود'' کے فریب کا کبھی شکار نہ ہوئے بلکہ اپنی جہد پیہم، محنت و ریاضت اور خود شناسی اور خداشناسی کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھا۔ ایک مخصوص مرعوبیت اور پست ہمتی و کم حوصلگی جو ایک خاص نظام حکمرانی کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے یہ علاقہ اس سے ہمیشہ محفوظ و مامون رہا شاید مکینوں کی اولوالعزمی اور جہد پیہم کی یہ ادا خالق کائنات کو بھا گئی اور اس نے اپنے فیضان خاص کے دروازے ان پر کشادہ کردیئے۔ اس فیضانِ الٰہی سے اقبال سہیل کو بھی وافر حصہ نصیب ہوا تھا۔ آپ نے زندگی کے ہر مرحلہ پر جرأت وبیداری کا ثبوت دیا۔ اپنی شاعری کو وطن کی آزادی اور قومی یکجہتی کے لئے بانگ درا کے مانند استعمال کیا۔ اس کی لے کو مدھم نہ ہونے دیا۔ بادِ مخالف سے کبھی گھبرائے نہیں یہاں تک کہ جب دو قومی نظریے کے حامیوں سے نبرد آزما ہوئے تو انھیں زیر کرنے کے لئے اپنی شاعری کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

آپ کے کلام کا ایک حصہ قومی افکار ونظریات کی تشریح وتبلیغ پر مشتمل ہے جس میں غالب حصہ تحریک آزادی میں جوش بھرنے والی اور قومی یکجہتی کو تعاون دینے والی نظموں پر مشتمل ہے اس فکر کی توسیع کے طور پر بعض قومی رہنماؤں کی تعریف وتوصیف میں یادگار نظمیں لکھیں جنھوں نے قومی یکجہتی کے فروغ اور قومی اتحاد کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

تحریک آزادی کے کئی محاذ تھے۔ سرفہرست انگریزوں کی غلامی اور تسلط سے ہندوستان کو آزاد کرانا تو تھا ہی، ہندو مسلم اتحاد کو تقویت پہچانا بھی بیحد اہم تھا۔ کیونکہ مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کی تنگ نظری سے اسے شدید خطرہ لاحق تھا۔ غربت اور دوسری جنگ عظیم کے پیدا کردہ مسائل بھی پریشان کن تھے۔ انگریزوں کے اقتدار کے معاون دیسی رجواڑے بھی آزادی کی تحریک کو زک پہنچا رہے تھے ان تمام مسائل پر آپ نے ایک شاعر کے ساتھ ایک قومی قائد و مفکر کی حیثیت سے بھی اظہار خیال کیا۔ یہ نظمیں اپنی بعض خوبیوں اور موجودہ حالات کے پس منظر میں اب بھی اپنی معنویت پر اصرار کر رہی ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں کہی گئی نظم ''نوائے وطن'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی کا راز یہ ہے، اے عزیزانِ وطن — جان جائے پر نہ جائے، حرمت شانِ وطن

ننگ ہیں وہ عالم انسانیت کے واسطے — مل کے غیروں سے بنیں جو وجہ حرمانِ وطن

فرض ہے انسانیت کا مقتضا فطرت کا ہے — خارجی حملوں سے کرنا سعی حفظانِ وطن

غیر میرا ناخدا ہو، اے خدا ایسا نہ ہو — گو میری کشتی سے کھیلے موج طوفانِ وطن

رحم کے قابل ہیں وہ دیوانگانِ انتقام — اپنے ہاتھوں پھاڑتے ہیں جو گریبانِ وطن

اس نظم کے اشعار میں اندرون ملک فرقہ وارانہ جذبہ انتقام کی طرف واضح اشارہ ہے جس کی وجہ سے قومی یکجہتی کمزور ہو رہی تھی اس لئے شاعر کی پوری کوشش رہی کہ افراد قوم اپنے اصل دشمن یعنی بیرونی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے متحد اور کمربستہ ہو جائیں۔

نظم ''مبارک باد آزادی'' میں کہتے ہیں:

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یہاں ایک
اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود و زیاں ایک
ہم سب کا خدا ایک ہے ہم سب کا نشاں ایک
پھر دل میں ہو کیوں خارِ عداوت کی چبھن آج
وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہب اسلام

جو دین بھی ہو، دیتا ہے محبت ہی کا پیغام
مذہب کو خدا کے لئے مت کیجئے بدنام
کل شیر و شکر ہوں یونہی کل ہند کی اقوام
سنگم پہ ہیں جس طرح ملی گنگ و جمن آج

ملک سے سچی محبت اور وفا شعاری پر مشتمل ۱۹۳۷ء میں نظم کیے گئے یہ اشعار آج بھی اپنے معنویت کا احساس دلاتے ہیں آج بھی اس کے پیغام کو عوام الناس تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ وطن سے گہری عقیدت ذیل کے اشعار میں دل کو چھو لیتی ہے:

جیوں تو کلاہِ وطن زیب سر ہو — مروں تو کفن میں ردائے وطن ہو
وہی سر ہے جو قوم پر ہو تصدق — وہی جان ہے جو فدائے وطن ہو
نہ لوں مشتِ خاکِ وطن کے عوض میں — اگر ملکِ جم بھی بجائے وطن ہو
اٹھے اس کے دل سے بھی موجِ مسرت — خفا گو بظاہر گدائے وطن ہو

ملک آزاد تو ہو گیا مگر اس میں تقسیم کی تلخی بھی شامل ہو گئی جس کے نتیجے میں زبردست خون خرابہ ہوا۔ باہمی نفرت و عداوت نے اندرونِ ملک میں خونریز صورت حال پیدا کر دی۔ ایک دوسرے کے خلاف جذبہ انتقام کہیں قومی وحدت اور یکجہتی اور آزادی کی نعمتوں کو پامال نہ کر دے اس تشویش کے ساتھ اقبال سہیل نے متحارب فرقوں کو متحد کرنے کی بھرپور کوشش کی جس کے گواہ درج ذیل اشعار ہیں:

اسی سنگم کے دو دھارے ہیں ہندو بھی مسلماں بھی
گلے مل مل کے روئے بھی ہوئے دست و گریباں بھی
رہیں گے متحد با وصفِ تقسیم گلستاں بھی
چمن کے لالہ و گل بھی چمن کے سرو ریحاں بھی
جنوں میں چاک کر ڈالا مگر اب ہیں پشیماں بھی
کہ خود اپنے ہی پیراہن کا ٹکڑا تھا گریباں بھی
فروغِ آتشِ گل نے جلائے آشیاں لاکھوں
نہ آیا راس اس گلزار کو جوشِ بہاراں بھی

کوئی دیر و حرم تک یہ مری فریاد پہنچا دے
وہ شیخ و برہمن کیا جو نہ رہ سکتے ہوں انساں بھی
سہیل اس بے نوائی پر بھی ہمت کا یہ عالم ہے
عوض خاکِ وطن کے میں نہ لوں ملکِ سلیماں بھی

آپ نے جنگِ آزادی کے متوالوں میں جوشِ حریت بھرنے اور قومی یکجہتی کے جذبے کو پروان چڑھانے کے لئے متعدد نظمیں کہیں جن میں آزادی اور غلامی کے فرق کو واضح کرنے کے لئے قفس، صیاد اور بلبل کے الفاظ استعمال کئے۔ جس طرح قفس میں قید پرندہ آزاد فضا سے کم پر راضی نہیں ہوتا اسی طرح ہندوستان بھی انگریزوں کی غلامی سے نجات اور حصول آزادی سے کم پر راضی نہیں ہوگا۔ کہتے ہیں:

مانا کہ قفس میں ہے بہت چین میسر
نے برق چمن سوز نہ صیادِ ستم گر
ہے زیست غلامی کی مگر موت سے بدتر
قابو میں رہے اپنے پر و بال تو کیا ڈر
سو پشت سے جو باغ کہن دیس ہے میرا
ہر سو سے اسے غم کی گھٹاؤں نے ہے گھیرا
میں اور کسی شاخ پہ کر لوں گا بسیرا
ہو دور کسی طرح تو، گلشن کا اندھیرا
ہے طائرِ آزاد ہی اس راز کا محرم
گرنی ہے غلامی تو ہے جنت بھی جہنم
دو تنکے کسی طرح سے کرلیں گے فراہم
یہ اپنے پر و بال سلامت ہیں تو کیا غم

اقبال سہیل نے وکالت اور شاعری کے ساتھ عملی سیاست میں کانگریس اور متحدہ قومیت کی ہم نوائی کی تھی قوم پرستوں اور خاص طور پر مسلمانوں میں آزادی اور قومی یکجہتی کے جذبے کے فروغ کے لئے صدقِ دل سے کام کیا تھا۔ گاندھی جی کی شخصیت قومی یکجہتی کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ ان کا قتل قومی وحدت کو زک پہنچانے کے لئے کیا گیا تھا۔ اقبال سہیل کو اس جانکاہ ہلاکت سے کس قدر صدمہ پہنچا اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

ہمیں جس نے فتح دلائی تھی اسے خاک و خوں میں ملا دیا
ہمیں جس نے راہ دکھائی تھی اسے راستے سے ہٹا دیا
اثر اس کا ہے اب وسیع تر کہ ہر ایک دل میں ہے اس کا گھر
یہ سمجھ کے خوش نہ ہوں فتنہ گر کہ اسے پیام فنا دیا

وطن عزیز کو شان دی، اسے قید غم سے چھڑا دیا
رہ اتحاد میں جان دی، جو کہا وہ کر کے دکھا دیا
یہی دھرم ہے یہی اصل دیں کہ ہو قول سچ تو عمل حسیں
حق و اہل حق پہ رہے یقیں یہ پیام سب کو سنا دیا

ان کا پختہ یقین تھا کہ ہندو و مسلم کے باہمی اتحاد کے بغیر خوشحال و کفیل ہندوستان کی تعمیر کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکتا اور اس کے لئے قومی یکجہتی لازمی ہے۔ انھوں نے اپنے پختہ سیاسی افکار کے اظہار میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ ان کی جرأت گفتار میں دیارِ شبلی کی مٹی کی تاثیر کے ساتھ ان کے اجداد کے شاندار ماضی کی کھنک بھی شامل ہے، جس کی بازگشت سے آج بھی دیارِ شبلی میں زندگی کی ہماہمی برقرار ہے۔ ۱۹۳۷ء میں اسمبلی ہاؤس میں ان کی منظوم تقاریر ہوں یا ''منظرِ رخصت'' کے عنوان سے ان کی مشہور نظم، وبیباکی اور حق نوائی ہر جگہ نمایاں ہے آج کی بدلی ہوئی سیاسی فضا میں بھی ان کے اشعار کی صداقت میں کمی نہیں آئی ہے۔

وطن پیارا ہے ہم کو دیں مگر اس سے بھی پیارا ہے
فدا ہوں گے وطن پر رہ سکے گر ہم مسلماں بھی
جمہور کے آگے چل نہ سکی راجاؤں کی نوابوں کی
تھی جس پہ بدیسی بیل چڑھی وہ شاخ وفا بھی ٹوٹ گئی
مل جل کے کرو تعمیر وطن ایسا نہ ہو طعنے دیں دشمن
ساجھے کی پکائی تھی ہنڈیا چورا ہے پہ آخر ٹوٹ گئی
غلامی غیر کی مصیبت، ہوئی جو صدیوں کے بعد رخصت
تولے کے تیغ نفاق و نفرت، جنوں پہ انتقام آیا
جو مدتوں سے تھے بھائی بھائی انھیں میں باہم ٹھنی لڑائی
نہ آدمیت کو شرم آئی، نہ لب پہ غیرت کا نام آیا
سوتنترتا جس نے تھی دلائی، اسی پہ پستول خود چلائی
یہ ناسپاسی، یہ بے حیائی اسی کو مارا جو کام آیا

مل جل کے بڑھاؤ شان وطن، تعمیر کرو ایوان وطن

ماں جائے ہیں فرزندان وطن جو غیر تھا باہر جاتا ہے

ہم تم کو بسر کرنا ہے یہیں جینا ہے یہیں مرنا ہے یہیں

اٹھو یہ چمن شاداب کرو اب غاصب خود سر جاتا ہے

اتحاد باہمی کی جو فکر درج بالا اشعار میں موجود ہے اگر اب بھی اہل وطن ان اشعار کے مقصد و مفہوم کو اپنا لیں تو نفرت اور کشیدگی کے جو بدبختانہ حالات کبھی کبھی ملک میں پیدا ہو جاتے ہیں اور قومی یکجہتی کو زک پہنچاتے ہیں ان سے نجات پائی جا سکتی ہے اور ملک میں انسانی ہمدردی اور قومی ہم آہنگی کی فضا کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ اقبال سہیل کی قومی شاعری آج بھی اہل ہند کو دعوت فکر و عمل دے رہی ہے کاش کہ خود غرضی اور مفاد پرستی کی مسموم فضا میں ان کی قومی شاعری کی خوش نوائی، پراگندہ ذہنوں کو متاثر کر سکے، اور ان لوگوں کی سماعتوں تک رسائی حاصل کر سکے جنھوں نے نغمۂ اتحاد و یکجہتی کو نہ سننے کا جیسے تہیہ کر رکھا ہو۔

اقبال احمد خاں سہیل کی اردو شاعری

ایک جائزہ

ڈاکٹر حبیب اللہ☆

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

اس شعر میں اقبال سہیل نے شاعرانہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ انھوں نے اظہار حقیقت کیا ہے، اعظم گڑھ کی علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، تمدنی، مذہبی اور روحانی خدمات پر جب نظر جاتی ہے تو سہیل کی شعری صداقت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

اقبال احمد خاں سہیل عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ خدا نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی پورا عبور رکھتے تھے۔ والدین اور مولوی محمد شفیع و مولوی محمد یعقوب کی توجہ سے سہیل کا فارسی ذوق اتنا نکھر گیا تھا کہ وہ بارہ برس کی عمر میں بلا تکلف فارسی بولنے اور لکھنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی سے استفادۂ علم کے بعد سہیل مولانا حمید الدین فراہی کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کے لئے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ علیگڑھ میں مولانا حالی اور وحید الدین خاں سلیم پانی پتی کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہونے کا انھیں موقع ملا۔ اقبال سہیل جب علی گڑھ پہنچے تو وہاں کی علمی اور ادبی فضا پر چھا گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی ان کی ذہانت کے گرویدہ اور ان کے رفیق خاص تھے۔ اقبال سہیل کے سوانح نگار افتخار اعظمی

☆صدر شعبۂ اردو، ڈی اے وی، پی جی کالج وارانسی (بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس)

نے ان کی دس برس کی عمر کا ایک واقعہ کئی جگہ نقل کیا ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں شعر گوئی میں جو ملکہ حاصل تھا اس کی بنیاد بچپن ہی میں پڑ چکی تھی۔ سہیل کے والد زنانے مکان مین کچھ افسردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی رات تھی، فضا خاموش اور ہوا ساکن ایسے عالم میں یہ مصرع برجستہ ان کی زبان سے نکلا ع:

ترحم علی حالیا یا الٰہی

سہیل پاس ہی میں بیٹھے ہوئے تھے فوراً دوسرا مصرع لگایا ع:

طفیل جناب رسالت پناہی

سلام سا گری کے نام ایک خط میں جو سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ بابت ماہ جون ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے اپنی افتادِ طبع کے متعلق ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ ۶-۷ برس کی عمر میں شعر موزوں کرتا رہا ہوں۔ بایں ہمہ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ ملکہ شاعری کو میں نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی اور اہل نظر کے کلمات تحسین و آفرین نے بھی کبھی میرا دماغ مختل نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اپنے نتائج فکر اور زادہ ہائے طبع کو نہ محفوظ رکھا نہ اپنے صدہا قدر شناسوں کو جو جمع و ترتیب کے لئے آرزو مند تھے اس کا موقع دیا۔ میری نگاہوں کے سامنے کتنے خوشہ چین صاحب دیوان ہو گئے اور عام طور پر مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار ہو رہے ہیں مگر ایک لمحہ کے لئے میں اس سے متاثر نہیں ہوا۔

سہیل کے خاندان میں حب الوطنی اور آزادیٔ وطن سے دلچسپی کی روایت ان کے پردادا مولوی ضیاء الدین خاں کے وقت ہی میں قائم ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے ہیرو کنور سنگھ ایک مدت تک اس خاندان کے مہمان رہے۔ سہیل کی شاعری ان کی شخصیت کی ترجمان ہے۔ ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت انسانیت و شرافت تھی۔ مہمان نوازی اور خاطر تواضع ان کی فطرت میں رچ بس گئی تھی۔ دوسروں کی بھلائی کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ درج ذیل شعر ان کی سیرت کے خاص پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال
راحت اغیار کو دی آپ پریشاں ہو کر

اسی طرح ان اشعار میں بھی ان کی اپنی شخصیت کی تصویر دیکھی جا سکتی ہیں۔

دل خطاوار اشتیاق سہی لب گنہ گار التجا نہ ہوا

کرمِ مہماں کا ہے یا حسنِ خلق ناتواں میرا مرے گھر کو گھر اپنا جانتا ہے میہماں میرا

ننگ ہے بے عمل قبول بہشت یہ تو صدقہ ہوا صلہ نہ ہوا

سہیل رجائی شاعر تھے، حزنیہ شاعری کو وہ حد درجہ ناپسند کرتے تھے۔ لکھنو کا مخصوص رنگ شاعری بھی انھیں قطعاً پسند نہیں تھا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی کے بقول وہ ''لکھنؤ کی شاعری کو ماتمی شاعری کہتے تھے، امیر مینائی اور ذوق کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔ بلکہ متشاعر کہتے تھے۔ اور ان کی شاعری کی ایسی مضحک تصویر کھینچتے تھے کہ اس کو نقل نہیں کیا جا سکتا، البتہ داغ کے قائل تھے''۔

(افکارِ سہیل، ص:۸)

اقبال سہیل غزل، قصیدہ، نعت، مثنوی، قطعہ، رباعی، مزاحیہ و فکاہیہ کلام غرض یہ کہ ہر صنف پر قادر تھے اور جو کچھ لکھنا چاہتے تھے ان کے قلم کی روانی کسی میدان میں رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ان کے دماغ میں عربی و فارسی کے فصیح و بلیغ الفاظ اور نازک و لطیف ترکیبوں کا ہجوم ہر وقت رہا کرتا تھا۔ مگر ان کے شاعرانہ کمال کو مدح و قصیدہ اور نعت گوئی سے خاص مناسبت تھی۔ سہیل نے اہم علمی و ادبی اور سیاسی و دینی شخصیتوں پر جو نظمیں کہی ہیں وہ اس کی بہترین مثال ہیں۔ مرزا احسان احمد بیگ نے لکھا ہے:

''واقعہ یہ ہے کہ شاعرانہ کمالات کی اصل تماشا گاہ کچھ قصیدہ ہی کا میدان تھا جہاں کسی اور کو ان کے سامنے حریف مقابل بن کر کھڑے ہونے کی مشکل سے جرأت ہو سکتی تھی''۔ (مقالات احسان، مطبع معارف ۱۹۶۸ء، ص:۱۰۳)

ان کے قصائد میں ان کے تخیل کی بلندی، فکر کی تازہ کاری، لفظوں کی شوکت اور انداز بیان کی شگفتگی اپنی انتہائی منزل پر ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی کے نزدیک ''اقبال سہیل کو آخری بڑا قصیدہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ سہیل نے اس صنف کی تہذیب و ترتیب پر بڑی توجہ کی، ان کے قصیدے کے مطالعہ سے یہ تصور غلط معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس صنف سے صرف قدرت کلام کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔''

سہیل کے نعتیہ قصائد ان کے ذوق سلیم کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے جس حزم و احتیاط اور احترام و عقیدت سے نعتیں کہی ہیں وہ انھیں کا حصہ ہیں۔ ان کی نعتوں میں لفظ اس طرح آئے ہیں جیسے کسی نے نگینے جڑ دئے ہوں۔ سہیل کا نعتیہ قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

محمدؐ وہ کتاب کون کا تغرائے پیشانی	محمدؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی
وہ فاتح جس کا پرچم اطلس زنگاری گردوں	وہ امی جس کے آگے عقل کل طفل دبستانی
وہ رابط عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے	وہ فارق زہد سے جس نے مٹایا داغ رہبانی

یہ پورا نعتیہ قصیدہ اسی شوکت الفاظ، حسن بیان، رنگینی خیال، طلاقت زبان اور قوت اظہار کا نمونہ ہے۔ اسی رنگ میں ان کی ایک اور نعت ہے جس کے ہر شعر میں درود و سلام ہے

احمد مرسل فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
مظہر اول مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
طینت جس کی سب سے مطہر، بعثت جس کی سب سے موخر
خلقت جس کی سب پہ مقدم صلی اللہ علیہ وسلم
فرد و جماعت امر و اطاعت کسب و قناعت، عفو و شجاعت
حل کیے جو اسرار تھے مبہم صلی اللہ علیہ وسلم

سہیل کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مشکل زمین میں بھی تازہ کار اشعار نکالے ہیں۔ جہاں قافیہ، ردیف کی پابندی نے تخلیق شعر کو مشکل بنا دیا تھا سہیل اس سے منزل آسان کی طرح گزرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ انھوں نے مدح صحابہ میں جو قصائد کہے ہیں وہ حفظ مراتب اور فرق درجات میں اپنی مثال آپ ہیں اور کہیں کوئی بے راہ روی نہیں پیدا ہو سکی ہے۔

گلزار دین پاک کا پہلا وہ آبیار	جان بہار، جان چمن، جان کائنات
وہ صادق و مصدق و صدیق مصطفیٰ	بوبکر وہ گزیدۂ اعیان کائنات
ارکان شرع جس کی خلافت سے استوار	مرصوص جس کے فیض سے بنیان کائنات

اقبال سہیل اردو شاعری میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے اردو کے سرمایہ شعری میں نہایت وقیع اور گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی وطنی و قومی اور سیاسی نظمیں تحریک آزادی کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہیں۔ انھوں نے یقین و عمل کی دولت کو بانٹنے میں سچی لگن سے کام لیا ہے۔ آل احمد سرور نے اقبال کے مردانہ آہنگ، رزمیہ خیالات اور پرجوش اظہار بیان کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح ان کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کیا ہے۔

''اقبال سہیل کی شاعری نے زندگی کے بہت سے نشیب وفراز کی ترجمانی کی ہے۔مگران کے کلام کی رمزیت اور خاص طور سے غزل کی ایمائیت سیاسی وسماجی تصور کو بے نقاب نہیں ہونے دیتی۔ سہیل کا سیاسی اور سماجی شعور کتنا بے دار تھا۔اور انھوں نے کن کن مسائل کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے ان سب کا بہترین نقشہ ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں نظم نگاری اور خیالات کا تسلسل بھی اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ان کی شاعری میں انگریزوں کی عیاریاں،فرقہ پرستوں اور وطن دشمنوں کی سازشیں،مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاسی کشاکش،وطن عزیز پر جان نثار کرنے والوں کی سرفروشی،ملکی تعمیر وترقی کی آرزوئیں،عدل وانصاف اور جمہوریت کی حمایت،ہندو مسلم یکجہتی کی خواہش جگہ جگہ ملتی ہے۔یہ اشعار دیکھئے۔

خیال ان کے سخن میرا، زبان ان کی دہن میرا
بہار ان کی چمن میرا گل ان کے گلستاں میرا

کیا فاصلہ قفس سے ہے اب شاخسار تک
جیتے رہے تو اڑ ہی چلیں گے بہار تک

کچھ کھیل نہیں گلچیں تعمیر نشیمن کی
بکھرے ہوئے تنکوں کو چن چن کے سجانا ہے

انجام وفا بھی دیکھ لیا اب کس لئے سرخم ہوتا ہے
نازک ہے مزاج حسن بہت،سجدے سے بھی برہم ہوتا ہے

تقسیم گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی
گلزار لٹ رہا ہے کچھ اس کی خبر نہیں

وطن پیارا ہے ہم کو،دیں مگر اس سے بھی پیارا ہے
فدا ہوں گے وطن پر رہ سکے گر ہم مسلماں بھی

نہ یہ تمکنت تھی تم میں، نہ یہ مسکنت تھی ہم میں
وہ بدل گیا زمانہ نہ وہ ہم رہے نہ وہ تم

اردو شاعری کی یہ منفرد آواز ۸؍نومبر ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

اقبال سہیل اور عربی زبان و علوم

ڈاکٹر عرفات ظفر☆

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے فیض تربیت نے اعظم گڑھ کے جن ذروں کو آفتاب و ماہتاب بنادیا ان میں ایک نمایاں نام اقبال احمد خاں سہیل (۱۸۸۴-۱۹۵۵ء) کا ہے۔ اقبال سہیل ایک ہشت پہل شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر، عظیم ناقد، خوش بیان مقرر، بہترین نثر نگار، ماہر سیاست داں اور بے مثال وکیل و قانون داں ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ عالم دین، عربی زبان و ادب کے رمز آشنا اور اسلامی علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ سہیل کی شخصیت کے اس تابناک پہلو سے علمی دنیا بہت ہی کم واقف ہے، زیر نظر مقالہ میں مولانا سہیل کی شخصیت کے اسی رخ کو اجاگر کرنے کی ایک ادنی سی کوشش کی گئی ہے۔

اقبال احمد خاں سہیل ۱۸۸۴ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک معروف گاؤں بڑھریا میں پیدا ہوئے۔ رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دیار کے ایک بزرگ عالم اور عربی کے فاضل مولانا محمد شفیع مرحوم آپ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ جو معروف دینی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے بانی ہیں۔ سہیل نے بہت جلد اساتذہ کی محنت اور اپنی غیر معمولی ذہانت کے باعث فارسی اور عربی میں لکھنے اور بولنے کی خاصی استعداد پیدا کرلی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سہیل کا خاندان ایک باحیثیت اور تعلیم یافتہ گھرانہ تھا جہاں پر علم و فضل کا چرچہ تھا اور شعر و ادب ان کا مشغلہ تھا۔ سہیل کے والد ماجد اور والدہ محترمہ فارسی شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کی ان کا فرزند بھی فارسی لکھنے اور بولنے میں مہارت پیدا کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سہیل کو کمسنی ہی میں نہ صرف فارسی بولنے اور لکھنے کا

☆ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

سلیقہ آ گیا بلکہ سخن فہمی اور شعر گوئی کی صلاحیت بھی پیدا ہوگئی۔

بچپن کا ایک واقعہ ہے کہ سہیل کے والد محترم ایک بار اپنے مکان میں کچھ ملول وافسردہ بیٹھے ہوئے تھے، سکوتِ شب نے دل شکستگی پر تازیانے کا کام کیا، ایسے میں بے اختیار یہ عربی مصرعہ ان کی زبان سے ادا ہوا ع: ترحم علیٰ حالیا یا الٰھی

سہیل جو پاس ہی بیٹھے تھے انھوں نے برجستہ دوسرا مصرعہ موزوں کر کے شعر مکمل کر دیا۔

ع: طفیلِ جنابِ رسالت پناہیؐ (کلیات سہیل، ص:۱۴)

اس وقت سہیل کی عمر نو یا دس سال کی تھی۔ یہ برجستہ شعر گوئی جہاں سہیل کی شاعرانہ صلاحیت کی غماز ہے وہیں یہ ان کی عربی فہمی کا بین ثبوت بھی ہے۔

عربی وفارسی زبان وادب کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے سہیل عربی وفارسی کے جید عالم سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ''فارسی کے بلبل شیراز اور عربی کے سوق عکاظ'' مولانا حمید الدین فراہی کے دولت کدہ پر موضع پھریہا پالکی پر سوار ہو کر حاضر ہوتے تھے۔ مولانا بڑی شفقت ومحبت سے سہیل کو درس دیتے تھے اور اس طرح مولانا موصوف نے سہیل کے اندر عربی وفارسی کے مطالعہ کا صحیح مذاق پیدا کر دیا، بلکہ ان کے علمی وادبی شعور کو بھی بیدار کر دیا (۲)''۔

(اقبال سہیل شخصیت اور شاعری، ص:۲۸-۲۹)

۱۸۹۸ء میں سہیل اپنے نانا کے پاس اعظم گڑھ میں مقیم ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر کوئی چودہ یا پندرہ برس رہی ہوگی۔ اسی زمانہ میں سہیل کو تاریخ کے معلم اول علامہ شبلی نعمانی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت سہیل نے علامہ شبلی سے دیوان الحماسہ، شرح مسلم، بحر العلوم اور العقد الفرید وغیرہ پڑھی۔ اس کے علاوہ وہ فرصت کے اوقات میں بھی علامہ شبلی کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان کی علمی وادبی گفتگو سے اکتساب فیض کرتے۔ بزم شبلی میں نقد سخن اور ادبیات فارسی وعربی پر مذاکرے ہوا کرتے تھے، سہیل انھیں یکسوئی کے ساتھ سماعت فرماتے اور اپنے حافظہ میں نقش کر لیتے تھے۔

اقبال سہیل نے عربی زبان وادب اور اسلامی علوم وفنون کی تکمیل مولانا فراہی سے علی گڑھ میں کی۔ پھر اس کے بعد علوم مشرقیہ میں انھیں کسی اور کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی ضرورت نہیں

پڑی۔ ۱۹۰۷ء میں مولانا حمید الدین فراہی علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۰۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ادبیات عربی کی تکمیل اور علوم اسلامی میں وقت نظر پیدا کرنے کی غرض سے سہیل بھی علی گڑھ منتقل ہوگئے جہاں ان کا قیام مولانا فراہی کے ساتھ رہا۔ مولانا فراہی قرآنیات کے ماہر اور عربی زبان وادب کے تبحر عالم تھے اور علی گڑھ کے قدیم محلہ بنواسرائیل میں مقیم تھے۔ سہیل نے مولانا فراہی سے تفسیر وحدیث کے علاوہ سبعہ معلقہ اور دیوان متنبی اسی زمانہ میں پڑھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا فراہی فارسی ادبیات کا بھی نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اساتذۂ ایران کے کلام پر ان کی نظر بہت گہری تھی، اس لیے سہیل کو یہاں اپنی فارسی استعداد بڑھانے کا بھی موقع ملا۔ اسی زمانہ میں سہیل کا تعارف وحید الدین سلیم پانی پتی اور مولانا حسرت موہانی جیسی عظیم المرتبت اور با کمال شخصیات سے ہوا جو شام کو مولانا فراہی کی قیام گاہ پر تشریف فرما ہوتے۔ اقبال سہیل ان بزرگوں کی صحبتوں سے خوب مستفید ہوئے اور اس سے ان کے شعروادب کے ذوق کو بھی جلا ملا۔

اقبال سہیل نے اگرچہ عربی زبان میں اپنی کوئی تحریر یادگار نہیں چھوڑی ہے جس سے ہم ان کے اسلوب نگارش اور زبان وبیان کی خوبیوں یا خامیوں پر تبصرہ کریں۔ لیکن ان کی حیات اور علمی وادبی اکتسابات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے میں ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال سہیل نہ صرف عربی زبان وعلوم میں کامل دسترس رکھتے تھے بلکہ عالم عرب کی سیاست اور عرب دنیا کے مسائل پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ وہ عرب دنیا سے شائع ہونے والے رسائل ومجلات کا مطالعہ بڑی دقت نظر سے کرتے تھے۔ اس کا ثبوت ان کا وہ مضمون ہے جو مولانا حسرت موہانی کے رسالہ ''اردوئے معلی'' کے ''مصطفیٰ کامل پاشا'' نمبر میں ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ مضمون کسی مصری جریدے سے ماخوذ تھا جس کے ترجمے کا کام اقبال سہیل نے انجام دیا تھا۔ یہ سہیل کے زمانہ طالب علمی کا کام تھا جب کہ ان کی عمر بمشکل ۲۳ یا ۲۴ رسال تھی (۳) (کلیات سہیل، ص: ۱۶)

اسی طرح مولانا فراہی کو اقبال سہیل کے عربی ادب کے ذوق پر اتنا اعتماد تھا کہ جب ان کے پاس مصر سے جدید مطبوعات کی فہرست آئی تو انھوں نے سہیل کو حکم دیا کہ ''ایک ہزار روپے کی قیمت تک کی کتابیں منتخب کردو تمہارا ذوق انتخاب نہایت بلند ہے (۴)''۔ (ذکر سہیل۔ افتخار احمد اعظمی، ص: ۶۰) غرض یہ واقعہ جہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ مولانا فراہی کو اپنے اس شاگرد کے علمی

ذوق پر پورا بھروسہ تھا ویں یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سہیل مصر کی جدید مطبوعات سے بخوبی واقف تھے۔

عربی ودینی تعلیم کے حصول کا سلسلہ ۱۹۰۹ء تک جاری رہا، عربی سے فراغت کے بعد اقبال سہیل نے بنارس کے ایک انگریزی اسکول (Queens College) سے ایف اے (انٹر میڈیٹ) کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۱۴ء میں پھر علی گڑھ گئے اور ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ کالج سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے اپنے وطن اعظم گڑھ واپس ہوئے۔ یہاں پر انھوں نے وکالت شروع کی، سیاست میں سرگرم رہے اور الیکشن جیتا۔ اپنے استاذ علامہ شبلی اور مولانا فراہی کی یادگار شبلی کالج اور مدرسۃ الاصلاح کی تعمیر وترقی میں بھی اپنا رول ادا کیا۔ جب تک زندہ رہے بزم شعروادب کے نیر تاباں بنے رہے۔ بالآخر ۸/نومبر ۱۹۵۵ء کی شب میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علی گڑھ کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں سہیل وہاں کی ادبی وثقافتی فضا پر چھائے رہے۔ کالج میں ان کی سرگرمیاں متنوع تھیں۔ یونین کا الیکشن لڑانا، اس کے جلوس میں تقریر کرنا اور شعروسخن کی محفلیں سجانا وغیرہ۔ یونین میں اقبال سہیل کی ایک تقریر جس کا تعلق عربی زبان کی اہمیت وخصوصیت سے ہے اس کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے:

''۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے پروفیسر خواجہ کمال الدین (مشہور قادیانی مقرر) کے اعزاز میں یونین میں ایک جلسہ ہوا۔ خواجہ صاحب کی فاضلانہ تقریر کے بعد سہیل نے بھی ''اُم الألسنۃ'' عربی پر برجستہ تقریر شروع کی، سہیل کا اندازِ بیان اس درجہ دل نشین اور لطیف وموثر تھا کہ خواجہ صاحب نے جوشِ مسرت میں گلے لگا لیا اور فرمایا ''تمہارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کردوں''۔ (مضامین رشید، ص:۴۰)

اقبال سہیل اپنی پیشہ ورانہ مجبوریوں، سیاسی سرگرمیوں اور شعروشاعری کی طرف طبعی میلان کے باعث تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین کی طرف بہت کم متوجہ ہو پائے۔ حالانکہ ان کے اندر وہ تمام قابلیتیں اور صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک کامل الفن مصنف کے لئے ضروری ہیں۔ بعض شعرائے

اردو کے دواوین پر مقدموں اور تبصروں کے علاوہ سہیل نے اپنے استاذ گرامی علامہ شبلی نعمانی کی سیرت لکھنی شروع کی تھی جو اگرچہ نامکمل رہی لیکن برادرم فضل الرحمٰن اصلاحی کی توجہ وعنایت سے وہ اب شائع ہوگئی ہے۔

اس کے علاوہ اسلامیات اور عربی ادبیات کے حوالہ سے جس کتاب کو اقبال سہیل کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے وہ ان کی تصنیف ''حقیقت الربا'' ہے، یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اقبال سہیل کی عربی دانی، نکتہ شناسی اور قوت استدلال جابجا نظر آتے ہیں۔ اس کتاب سے سہیل کے عربی واسلامی علوم وفنون پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب اقبال سہیل کو ہندوستان کے جید علماء اور صف اول کے محققین میں جگہ دلانے کے لئے کافی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں ''حقیقت الربا'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ مصنف نے مسئلہ زیر بحث پر جملہ آیات قرآنی، احادیث نبوی اور فقہی آراء کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد حالات حاضرہ کو ملحوظ رکھ کر ربا کی جامع تعریف پیش کی ہے تاکہ مسلمان بین الاقوامی اقتصادیات میں حاشیہ پر نہ آجائیں۔ مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ فقہاء نے ربا کو ''مراطلت'' اور ''بیع صرف'' سے خلط ملط کردیا ہے، جب کہ اس کا تعلق صرف بیع سلف یعنی ادھار کے معاملات سے ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے ربا کی لغوی تشریح، ربا سے متعلق آیات واحادیث کی ترجمہ وتشریح، قرآنی آیات کے شان نزول، آیت تحریم ربا پر غور وخوض، اضعافا مضاعفۃ کی وضاحت، ربا اور صدقہ کا تقابلی مطالعہ نیز دار الحرب اور دار الاسلام جیسے موضوعات پر دلائل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لفظ ربا کی لغوی تشریح کرتے ہوئے مصنفِ کتاب لکھتے ہیں:

> ''لغۃً ربا کے معنی مطلق زیادتی یا اضافہ کے ہیں۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ مطلق زیادتی یا اضافہ وہ ربا نہیں جو شرعاً حرام ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی وہ آیات جو حرمت ربا کی نسبت نازل ہوئی ہیں ان میں ہر جگہ لفظ ربا ''الربوٰ'' یعنی الف لام کے ساتھ مستعمل ہوا ہے، یہ بھی مسلم ہے کہ الف لام استغراق کا نہیں ہے ورنہ اضافۂ مالی کی ہر صورت مثلاً نفع تجارت بھی حرام ہوتی۔ اس لئے الف لام عہد ذہنی ہے اور کوئی خاص قسم کا اضافہ مراد ہے جو شرعاً حرام کیا گیا ہے (۶)''

(ربا کیا ہے۔ اقبال سہیل، ص: ۳۰، ۳۱)

اسی طرح آیت قرآنی "وإن تبتم فلكم رؤس أموالكم، لا تظلمون و لا تُظلمون" (البقرۃ: ۲۷۹) معانی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ذوق ادب کہتا ہے کہ یہاں پر واو حالیہ ہے اور "لا تظلمون" میں جو نہی ہے اس کی وجہ "ولا تُظلمون" سے ظاہر کی گئی ہے۔ ورنہ مظلومیت جو دوسرے کے افعال کا نتیجہ ہوتی ہے اور جو مجبوراً واقع ہوتی اس کی نہی کا کیا معنی؟ (۷)"

(حوالہ سابق، ص: ۴۷)

اس کے بعد مصنف نے اس آیت کے تعلق سے امام رازیؒ کا قول نقل کیا ہے پھر لکھتے ہیں "یہ تفسیر (امام رازی کی تفسیر) ادبی حیثیت کے علاوہ عقلاً بھی محل نظر ہے۔ مذکورہ بالا اقتباسات سے سہیل کی عربی دانی اور علوم لغت و بلاغت میں ان کی دقت نظر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے تفسیر وحدیث، فقہ وفلسفہ، عربی زبان وادب، قدیم عربوں کی تاریخ ومعاشرت اور عرب تہذیب وتمدن سے سہیل کی گہری معرفت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح عربی واسلامیات کے مصادر ومراجع اور امہات الکتب ان کی نگاہوں میں تھیں بلکہ متعلقہ مباحث میں جابجا ان سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں جب سہیل کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن جیت کر یوپی اسمبلی میں پہنچے تو وہاں انھوں نے زمینداری کے خلاف ایک تقریر کی اور ایک نظم بھی پڑھی اور یہ اعلان کیا کہ زمینداری حرام ہے اور اس پر استدلال قرآنی آیت: "إن الأرض لله" سے کیا۔

اقبال سہیل ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے، لیکن جس میدان میں انھوں نے سب سے زیادہ جولانی طبع دکھائی وہ شاعری ہے۔ شعر وسخن میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ شاعری کا ملکہ ان کے اندر اکتسابی نہیں بلکہ فطری تھا۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے بلکہ اپنی فارسی شاعری کو اردو سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اقبال سہیل نے اپنے اشعار میں بھی قرآنی آیات اور تعبیرات کا برمحل استعمال کیا ہے۔ فارسی میں کہے گئے قطعات وفات میں جس مہارت اور سلیقہ سے انھوں نے قرآنی آیات ومحاورات کو سمویا ہے وہ سہیل کی قرآن فہمی کے ساتھ ساتھ ان کی عربی دانی پر بھی دلیل ہے۔

اسی طرح اقبال سہیل مولانا فراہی کے پوتے اور ڈاکٹر محی الدین آزاد فراہی کے والد مولانا ابو الحسن علی کی بارات بندول اعظم گڑھ بذریعہ بس جا رہے تھے۔ راستہ کچا تھا اکثر باراتیوں کا جسم گرد آلود ہو گیا تھا۔ بس میں سہیل صاحب کی نشست کے قریب اعظم گڑھ کے معروف وکیل و شاعر امجد غزنوی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ غزنوی کے وجیہ و خوبصورت چہرے پر بھی گرد کی تہہ جم گئی تھی۔ سہیل صاحب نے ان کی طرف دیکھا اور فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا

ڈالی حسن غزنوی پر گردِ رہ نے جب نقاب
عشق کا فر بول اٹھا یا لیتنی کنت تراب (۸)

"یا لیتنی کنت تراب" کا استعمال جس خوبصورتی اور مہارت سے شاعر نے کیا ہے، اس سے عربی سمجھنے والے ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس طرح مولانا فراہی کی صحبت اور تربیت کے نتیجہ میں اقبال سہیل کو قرآن فہمی کی نعمت میسر آ گئی تھی اسی طرح علامہ شبلی کی شاگردی اور ان کے فیضان نظر سے سہیل کے نبی کریمؐ کی ذات مبارک سے عشق و محبت اور شیفتگی و وارفتگی کے جذبات موجزن ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تمام ذہنی و فکری صلاحیتوں کو توحید خالص، خاتم النبیینؐ اور اصحاب رسولؐ کی تعلیمات کو عام کرنے اور متشککین کے ناروا حملوں کے دفاع کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ ان کے اشعار اگر غور سے پڑھے جائیں تو اس میں وہ سب کچھ اجمالاً ملے گا جو حالی و اقبال کے یہاں مفصل ملتا ہے۔

سہیل نے نبی کریمؐ کی شان میں بیسیوں نعتیں لکھیں، نیز اصحاب رسول اور خلفائے راشدین کے لئے منقبتیں کہیں۔ ان کی مشہور نعت "موجِ کوثر"، جس کے ہر بند کے آخر میں ﷺ آتا ہے جب شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ انھوں نے محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مرحوم کی خدمت میں بھی روانہ کیا۔ مولانا نے اسے پڑھا اور فرط مسرت میں عربی میں ایک بند منظوم کر کے انھیں مبارکباد پیش کی۔ ظاہراً مولانا اعظمی کو سہیل کی عربی دانی سے متعلق صرف خوش گمانی ہی نہیں تھی بلکہ انھیں یقین کامل تھا کہ سہیل ان کے تہنیتی عربی بند کو پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے۔ وہ عربی بند ملاحظہ ہو:

إنک إن تقرأه علیه	یوم المحشر حین تراه
فارجو منه أن یتبسم	صلی الله علیه وسلم

(مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر)(۹)

اقبال سہیل کی ذہانت، علمی کمالات، تفسیر وحدیث پر ان کی گہری نظر اور عربی زبان وعلوم میں ان کی مہارت کا اعترافات سہیل کے معاصر علماء نے دل کھول کر کیا ہے۔ اسی طرح اقبال سہیل کے علمی مقام ومرتبہ کا اعتراف کرتے ہوئے اعظم گڑھ کے ایک شاعر رحمت علی مبارکپوری نے انھیں عربی میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ عربی قصیدہ کے چند اشعار پیش ہیں:

إقبال أحمد اسمه — ممدوح عقلاء الزمن
علام أخبار الورىٰ — ربّ الكلام واللسن
أشعاره رائقة — مطربه كل فطن
الواعظ التحرير والحبر — الأريب والشَّقن
رحمت على أدع له — بالمصطفىٰ واستشفعن

(اقبال سہیل حیات اور شاعری، ص:۷۰)(۱۰)

علامہ سید سلیمان ندوی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

”وہ علامہ حمید الدین فراہی کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ احادیث اور قرآن کے بارے میں وہ علامہ فراہی سے جو نکات سنتے اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتے۔ قرآن پر اقبال سہیل کی نظر کسی بلند نظر مفسر سے کم نہ تھی۔ انھیں حدیثیں کثرت سے یاد تھیں۔ مولانا فراہی ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت آخذہ کے قائل تھے(۱۱)“۔

(ذکر سہیل، ص:۶۰)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے بھی سہیل کی عربی زبان پر قدرت اور قدیم عربی ادبیات سے ان کے شغف کا اعتراف کیا ہے، لکھتے ہیں:

”اقبال احمد خاں سہیل صحیح معنوں میں عبقری اور جینیس تھے۔ ان کو اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا...... جو کچھ پڑھا تھا وہ اخیر تک دماغ میں محفوظ رہا۔ عربی کی تعلیم شروع میں حاصل کی تھی اس کے بعد اس سے بہت کم اشتغال رہا، مگر حماسہ، سبعہ معلقہ اور متنبی وغیرہ کے اشعار نوک زبان تھے اور مقامات حریری کی

عبارتیں زبانی یاد تھیں (۱۲)"۔

(انتخاب کلام اقبال سہیل، ضیاء الدین اصلاحی، ص:۶و۸)

اس کے علاوہ اقبال سہیل کے علم وفضل، ذہانت، شاعری، انسان دوستی اور قومی خدمات کا اعتراف رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی اپنی اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

شاہ معین الدین احمد ندوی نے اقبال سہیل کی علمی وادبی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اگر ان کی صلاحیتیں صحیح مصرف میں صرف ہوتیں تو ہندوستان کے مشاہیر فضلاء میں ان کا شمار ہوتا۔ لیکن یہ علم وادب کی بدقسمتی ہے کہ جو شخص علمی کاموں کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس کی ساری صلاحیتیں وکالت کے پیشہ کی نذر ہو گئیں (۱۳)"۔

(ذکر سہیل، ص:......)

اقبال سہیل کے متعلق یہ قول بہت مشہور ہے کہ شاعری نے ان کے علم کو تباہ کیا اور وکالت نے ان کی شاعری کو برباد کیا جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ وکالت، سیاست اور شاعری سب نے مل کر ایک ایسے عبقری عالم وفاضل اور محقق ودانشور کو برباد کر دیا جس کی تلافی سے علمی دنیا قاصر ہے۔

☆☆☆

اقبال سہیل کی فارسی شاعری پر عربی کا اثر

ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی ☆

ابو الظفر حامد اقبال سہیل (وفات: ۱۹۵۵ء) اعظم گڑھ کے ان کہنہ مشق شعراء میں سے تھے جنھوں نے قومی وعالمی دونوں سطح پر اپنی براعت علمی وادبی کا لوہا منوایا ہے۔ ہندوستان نے جہاں ان کی شاعری کی تعریف کی ہے تو عالم عرب وغرب نے ''حقیقت ربا'' کی تالیف پر ان کی ذہانت اور علوم اسلامیہ پر ان کی مہارت کا اعتراف کیا ہے۔ آپ اردو اور فارسی دونوں کے یکساں باکمال بلکہ استاذ شاعر تھے۔ اور دونوں زبانوں میں قابل قدر ادبی سرمایہ چھوڑا ہے الایہ کہ اردو کے بالمقابل ان کا فارسی کلام تعداد میں کم ہے مگر شاید اس کمی کے پیچھے ان کی قلت گویائی نہیں بلکہ اپنی تخلیقات کے تئیں ان کا عدم التفات اور جامعین کلامِ سہیل کی قصر الباعی ہے۔ یہ جامعین اگر مزید کوشش کرتے تو عین ممکن تھا کہ ان کے کچھ اور فارسی کلام تک رسائی ہو جاتی جواب ہمارے لئے ناممکن الحصول ہے۔

بہر حال جو بھی کلام ہم تک پہونچا ہے اس کو پڑھ کر بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اردو و فارسی کے باکمال شاعر تھے اور انھیں ریسرچرز ونقاد کی طرف سے وہ التفات نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے، اور اس میں جہاں غیروں کی کوتاہی ہے وہیں اپنوں نے ان پر کم ظلم نہیں کیا ہے، ورنہ ان کے بعض اشعار کو پڑھ کر بلا خوف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا یہ شاعر غالب سے کہیں کم نہ تھا۔

میری بحث کا موضوع چونکہ آپ کی فارسی شاعری ہے اور وہ بھی عربی کے حوالے سے ورنہ میں دکھاتا کہ اردو شاعری میں حضرت سہیل نے کہاں کہاں غالب کی ایڑی ماری ہے، اور نہ صرف غالب بلکہ عربی کے بڑے بڑے شعراء بھی آپ سے پیچھے نظر آتے ہیں، جس کی ایک جھلک ہم ان

☆ شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

کے فارسی کلام پر تبصرہ کرتے وقت دکھائیں گے۔

فارسی شاعری کی ابتداء اور تلمذ: آپ کی فارسی شاعری سے متعلق پہلا اور اہم سوال یہ ہے کہ آپ نے فارسی کس سے سیکھی اور شاعری میں کس سے اصلاح لی؟

آپ کے تذکرہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے فارسی اپنے والدین سے سیکھی چنانچہ آپ کی والدہ نے آپ کو گلستاں و بوستاں وغیرہ پڑھائی جب کہ آپ نے اپنے والد سے مزید اعلیٰ ادب کی کتابیں پڑھیں۔ آپ کے والد جیسا کہ مذکور ہے، فارسی زبان کا ستھرا مذاق رکھتے تھے اور یہی نہیں بلکہ سہیل صاحب کی سیرت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے چنانچہ جب وہ مندرجہ ذیل مصرعہ:

تَرَحَّمْ علی حالیا یا الٰهی

بار بار پڑھ رہے تھے تو حضرت سہیل نے اس پر فی البدیہ مندرجہ ذیل دوسرا مصرعہ یوں لگایا:

طفیلِ جنابِ رسالت پناهی

سہیل صاحب نے جب یہ مصرعہ لگایا اس وقت آپ کی عمر صرف نو سال تھی۔

یہ مصرعہ تین باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ نو سال تک اتنی فارسی سیکھ گئے تھے کہ اس میں اشعار نظم کر سکتے تھے، دوسرے یہ کہ آپ کی شاعری کی ابتداء بدیہہ گوئی سے ہوئی اور تیسرے یہ کہ انھیں بچپنے سے حضورِ پاک سے مناسبت تھی جس کا اظہار اور جس پر دلیل خود ان کے وہ قصائد و قطعات ہیں جنھیں انھوں نے رسول پاک، امہات المومنین، صحابہ کرام اور دیگر متعلقینِ رسول و رسالت پر کہا ہے۔ موجِ کوثر پڑھئے اور داد دیجئے بلکہ عجم کے تفوقِ بر عرب پر فخر کیجئے۔ اب تک میری دانست میں عربوں میں کوئی ایسا شاعر نہیں پیدا ہوا جو اس میدان میں سہیل صاحب سے آنکھ ملا سکے بلکہ عالمی ادب اس متاعِ گراں کا بدل پیش کرنے سے اب تک قاصر ہے۔

آپ کے بچپنے کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں:

عندلیبِ گلشنِ فردوس ہستم حامدا   مدح خوانیِ نبی کار است طوبیٰ جائے من

بچپنے کا یہ کلام دیکھ کر سید سلیمان ندوی نے آپ کو فطری شاعر گردانا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو پڑھ لکھ کر قابلیت کے زور سے شاعر

بنتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہوکر آتے ہیں۔ وہ کچھ نہ بھی پڑھتے تو بھی شاعر ہی ہوتے، پہلے لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں اور دوسرے فطری شاعر ہوتے ہیں، البتہ تعلیم ان کی شاعری کو جلا دیتی ہے، ہمارے دوست اقبال سہیل صاحب دوسری قسم کے شعراء میں سے ہیں یعنی فطری وطبعی شاعر ہیں"۔

(کلیات سہیل، ص:۷)

لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو شاعری کا مذاق اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا جسے بعد کے دو فطری شاعروں نے جلا بخشی۔

وہ دو فطری شاعر شبلی نعمانی اور عبدالحمید فراہی تھے۔ شبلی کا امتیاز یہ تھا کہ آپ نہ صرف ہندوستانی شعراء کے ادبی وارث تھے بلکہ ایرانی شعراء سے آنکھیں ملاتے تھے۔ خسرو، بیدل اور غالب کے بعد وہی ہندوستان کے ترجمان فارسی شاعر تھے۔ اس لئے سلسلۂ خاتمہ شعرِ فارسی در ہند کو غالب کے بعد شبلی تک ممتد کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

رہے حمید فراہی تو فردوسی کے بعد وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خالص فارسی زبان میں شاعری کی ہے۔ خالص فارسی سے میری مراد بے آمیز زبان عربی ہے۔ ہم یہاں غالب کی دستنبو کو چھوڑ رہے ہیں کیوں کہ وہ خالص فارسی ہونے کے باوجود نثر میں تھے۔

مگر فردوسی وفراہی میں ایک واضح فرق ہے: فردوسی اس زمانے کا شاعر ہے جب خالص فارسی زبان میں شاعری کا چلن تھا بلکہ اہل ایران سے معذرت کے ساتھ خالص فارسی شاعری کی ایک وبا تھی جو اس وقت پورے ایران میں عام تھی مگر دوسری طرف عبدالحمید فراہی نے اس زمانے میں شاعری کی جب خالص فارسی شاعری کی پوری تاریخ میں وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خالص فارسی میں شاعری کی اس کے باوجود کہ وہ عربی کے باکمال شاعر تھے۔

اقبال سہیل کی فارسی شاعری پر ایک مختصر تبصرہ: اقبال سہیل کی فارسی شاعری پر ایک مختصر تبصرہ بھی شاید اتنا طویل ہو جائے کہ تنگدامانی وقت کی شکایت کرنی پڑے اور اصل موضوع تک رسائی نہ ہو پائے مگر چونکہ اب تک ان کی شاعری پر مقالات احسان کے علاوہ کوئی تبصرہ نہیں آیا ہے اس لئے مجبوراً اسے لکھنا ہی پڑا۔

ہم ذیل میں شاعری کی عام خصوصیات کی ممکنہ انواع کو لیں گے اور اقبال سہیل کی شاعری سے مثالیں پیش کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ سہیل صاحب بھی اچھے شاعر تھے۔ ہماری یہ بحث اشاروں پر مبنی ہوگی کیوں کہ شاعری کی خصوصیات کے ذکر کے لئے ایک الگ دفتر درکار ہے۔

اقبال سہیل کا موجودہ فارسی کلام: سہیل صاحب کا فارسی مجموعۂ کلام جو آپ کے کلیات کی زینت ہے کل ۶۲۹ اشعار پر مشتمل ہے جن میں فرد، قطعہ، رباعی، غزل، ترکیب بند، تہنیت، قصائد، نظمیں اور مختلف مناسباتی اشعار شامل ہیں۔ یہ حصہ جسے ''نوائے شیراز'' کا نام دیا گیا ہے ناتمام حمد کے دو شعر سے شروع ہوتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

الٰہی آنچنانم کن کہ در شوقِ لقائے تو — بہ دل دارم ہوائے تو بہ لب دارم ثنائے تو
زیم در ابتغائے تو، بمیرم در رضائے تو — چناں بیگانہ باشم، اے خدا، از ماسوائے تو

کہنے کو تو یہ کل دو اشعار ہیں مگر ان دو اشعار میں شریعت اسلامیہ کی پوری روح کارفرما ہے۔ جہاں بندہ خدا پر ایمان لاتا ہے اور اس کی عبادت صرف اس لئے کرتا ہے کہ خدا اس سے خوش ہو اور محشر کے دن وہ اس کی دید سے محروم نہ ہو۔ اور یہی ایک مومن کی معراج ہے۔ آخری شعر کا آخری مصرعہ ''چناں بیگانہ باشم، اے خدا، از ماسوائے تو'' قرآن کے مشہور توکلی جملہ ''وَاِنّ اِلیک الرجعیٰ'' کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔

اس مجموعہ میں کوئی نعت نہیں ہے جبکہ حضرت سہیل نعت گوئی میں نہ صرف مشہور تھے بلکہ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ نے ضرور کوئی نہ کوئی نعت کہی ہوگی مگر ان کی دوسری فارسی تخلیقات کی طرح وہ بھی دست بردِ زمانہ سے بچ نہ سکی۔

اس کے بعد صحابۃ الرسول رضی اللہ عنہم کی مدح ہے جو ناتمام ہے۔ شاید پوری نظم جامعین کلامِ سہیل کو مل نہ سکی۔ مگر اس کے باوجود موجودہ دستیاب ناقص نظم کا ہر شعر روحِ صحابیت، حبِّ رسول اور احترامِ صحابہ سے لبریز ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ نظم سن کر طاعت وحبِّ رسول ہر سامعین کی زبان سے خود بخود نکل پڑے گی۔ چند اشعار سے آپ بھی محظوظ ہوں:

نظر در دیدہ ہمچو بادہ در پیمانہ می رقصد — جگر در سینہ، ہمچو رند در میخانہ می رقصد
جواں بختانِ ملت راچہ باشد جوشِ سرمستی — کنوں کز شادمانی ہا فلک پیرانہ می رقصد

بہ آں مجلس گذارم شد کہ نور از عرش می بارد سزد گر بر جبینم سجدۂ شکرانہ می رقصد

ایک اور شعر سنتے چلیں:

چو تصدیقِ رسالت از لب صدیق بر خیزد تبسم بر لب سرورؐ چہ بیتابانہ می رقصد

اس آخری شعر میں اس مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب صدیق اکبرؓ نے رسول اکرمؐ کی رسالت کی تصدیق کی تھی۔ تلمیح کا یہ انداز سہیل صاحب کے اکثر اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے بالخصوص استاذ شبلی کے مرثیہ اور علامہ اقبال کے اعتراض کے جواب میں جو نظمیں لکھی گئی ہیں۔

اس کے بعد ترتیب میں ایک غزل آتی ہے۔ شاید جامع کلیات کو سہیل صاحب کی کوئی اور فارسی غزل نہ مل سکی مگر صرف اس ایک غزل کو پڑھ کر سہیل صاحب کے تغزل کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پوری غزل آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

دل بردز من عشوہ گرے، آفت جانے شمشاد قدے، لالہ رخے، غنچہ دہانے

بازارِ جہاں گشتم وحقا کہ ندیدیم کالائے گراں ارز محبت بہ دکانے

دل برمژۂ بند اگر دیدہ نباشی صد عقدۂ دل واشدن از نوکِ سنانے

ہاں مردہ دلاں را کہ رساند خبر از من بیروں جہد از ہر نفسم خردۂ جانے

شبنم زدہ کاہے است بہ گلزارِ محبت نازش بکنم بر مژدۂ اشک فشانے

مژگانِ ترم بیں، اگرت ذوقِ تماشا است خوش سبزۂ تر ہست لبِ جوئے روانے

اے بے خبرِ لذتِ آزارِ محبت صد گوہرِ گفتار نہ سنجد بہ فغانے

اقبالِ حزین مژدہ کہ در مشہدِ عشقش سرمایۂ کونین فروشند بہ جانے

مندرجہ بالا غزل میں محبوب کی صفات کا مسلسل بیان ہے جو مسلسل غزل کی غمازی کرتا ہے پھر دردِ دل کی مافوق العادیت اور تجربہ عشق۔ ان سب پر مستزاد نادر تشبیہات واستعارات کا استعمال۔ اس مختصری اکلوتی غزل کو پڑھنے سے قبل اگر ہم حافظ شیرازی اور حمید فراہی کے ان اشعار کی طرف ایک نگاہ ڈال لیں جہاں اس طرح کے موضوعات کا ذکر ہے تو اس غزل کی اہمیت ومعنویت دونوں اور بڑھ جاتی ہیں۔

غزل کے بعد قصائد ومناسباتی منظومات کا ایک جانفزا، سحر آگیں اور خالص فارسیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو دیر تک چلا جاتا ہے اور جسے ریسرچرز و ناقدین نے سہیل صاحب کی خصوصیات

میں اولین نمبر پر رکھا ہے۔ یہ بہترین ادبی اور شعری سلسلہ دیر تک ہماری نگاہوں کو خیرہ کرتا چلا جاتا ہے جس قصیدہ یا نظم کو لیجئے اس میں ندرتِ تعبیر، علوِ فکر، بلندئ خیال، منظر نگاری، صداقت فی التعبیر اور علوم جدیدہ کی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ تصویر کشی، اچھوتی تعبیریں اور برمحل الفاظ کا استعمال ہر شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

رہی سہیل صاحب کی بدیہہ گوئی تو اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ تقریباً اکثر نظمیں اور قصیدے ایک رات میں لکھی گئی یا چند گھنٹوں کی تخلیق ہیں۔ سہیل صاحب کے مجموعہ میں ہر ایک فنکاری و براءت کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں مگر میں تنگئ وقت کے سبب ان کے ذکر سے احتراز کرتا ہوں۔

عربی الفاظ ومحاورات: اقبال سہیل چونکہ عربی زبان وادب سے بخوبی واقف تھے اس لئے اپنی شاعری میں عربی کے الفاظ ومحاورات، قرآنی آیات اور نبی کے اقوال کا برمحل استعمال کرتے ہیں بالخصوص وہ نظمیں جو حضور پاک کی مدح، صحابہ کی منقبت اور اسلامی ادباء وشعراء کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔

رہا عربی کے الفاظ وکلمات کا استعمال تو اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ اردو شاعری سے قطع نظر خود ان کی فارسی شاعری میں عربی الفاظ اور کلمات کی بھرمار ہے مگر اس طرح کہ فارسی شاعری اس سے متاثر نہیں ہوتی بلکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ الفاظ بھی فارسی ہی کے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مدح میں لکھتے ہیں:

چو سر بجیب خفا شہر یارِ خاور زد ۔۔۔ مہِ دو ہفتہ بسر تاجِ خسروی بر زد
پکر دودِ تفنگ است، اختران گوئی ۔۔۔ شرار ہاست کزیں دودِ بے اماں سر زد
مگر سحاب قنادل بزورِ قش افگند ۔۔۔ کہ فلکِ خسروِ خاور بہ بحرا خنجر زد
نماند بر سرِ گردوں نظامِ استبداد ۔۔۔ زمانہ طرحِ نو افگند ونقشِ دیگر زد
ہلال آمد وپرچم بر آسماں افراشت ۔۔۔ شخودِ سینۂ ظلمت چو نوکِ خنجر زد
بلند گشت چو طیارۂ زحل بہ فلک ۔۔۔ عطارد آمد وتیرش بہ سینہ اش در زد
ہنوز تیغ مہِ نو نہ رفتہ بد بہ نیام ۔۔۔ کہ بر ممالکِ گردوں سپاہِ اختر زد
بروں شتافت بفرِ سپہبدی بہرام ۔۔۔ بکف حسام گرفت وبفرق مغفر زد

رسید بدر وبکنگاش زہرہ وبرجیس به مہر دولتِ مشروطه سکه بر زر زد

مندرجہ بالانو اشعار میں کل تیس سے زائد عربی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جیسے جیب، خفا، شرارہ، سحاب، قنادل، زورق، فلک، بحر، اخضر، ظلمت، کف، حسام، فرق، مغفر وغیرہ۔

نہ صرف الفاظ وکلمات بلکہ عربی اسماء ومعارف کو کسی نہ کسی موقع پر بڑی خوبی سے برتا ہے، دیکھیں:

یکے زتار فسردہ نوائے تر انگیخت یکے بجامِ بلوریں رحیق احمر زد

فسونِ زمزمہ ام بد کہ کوسِ نکتہ دری زہیر وطرفہ واعشٰی، لبید وعنتر زد

شبلی کی تعریف میں لکھی گئی نظم کا ایک شعر ہے:

نطقِ او خال وخط الہام را آئینہ دار کلکِ اوروح القدس راتر جمانے بودہ است

شبلی ہی کی تعریف میں ایک اور شعر ہے:

من نمی گویم تو خود از جرجی زیداں پرس
نوکِ کلکش، چشمِ کز بیں را سنانے بودہ است

مصطفیٰ کمال پاشا کے مرثیہ کا ایک شعر ہے:

برخیز مصطفیٰ وبہ بیں حالِ زارِ قوم چشمے نما بہ برہمی کاروبار قوم

مندرجہ بالا اشعار میں رحیق احمر، زہیر، طرفہ، اعشٰی، لبید، عنترہ، روح القدس، جرجی زیدان اور مصطفیٰ وغیرہ اسماء ومعارف خالص عربی ہیں۔

اسماء کے بعد محاوروں کا نمبر آتا ہے۔ حضرت اقبال نے اپنی اردو شاعری کے باوصف خود اپنی فارسی شاعری میں عربی محاوروں کا برمحل استعمال کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

علامہ سید سلیمان ندوی کی صحت یابی پر جو قطعہ لکھا ہے اس کی ابتداء یوں ہوتی ہے:

للہ الحمد شبِ تار، بپایاں آمد صبح چوں طالعِ بیدار، درخشندہ آمد

حضرت شبلی نعمانی کی یاد میں ایک طویل قصیدہ لکھا ہے جس کا ایک شعر ہے:

دردا کہ گنج دارِ معارف ز دہر رفت وا حسرتا کہ شبلی معجز نگار شد

مصطفیٰ کمال پاشا کے مرثیہ کا ایک شعر ہے:

ہو سو شد است شیون و ماتم بپا چہ شد   بر ہر لب است نالۂ واحسرتا چہ شد

نظام الملک آصف جاہ کی علی گڑھ آمد کے موقع پر کہے گئے استقبالیہ کا ایک شعر ہے:

ھنیئاً لک، حماک اللہ کرم کردی بدانش گہ

سزد گر تا باوجِ سرش از افتخار آمد

مندرجہ بالا اشعار میں واحسرتا، ہنیئاً لک اور حماک اللہ عربی محاورے ہیں جو کسی پر افسوس، کسی کے استقبال اور کسی کے لئے دعا کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ قرآنی آیات اور نبی کے اقوال سے بھی ان کی فارسی شاعری خالی نہیں۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ کتنی خوبی سے ان آیات واحادیث کا استعمال کیا ہے۔

حسین احمد مدنی پر اقبال کے ذریعہ لکھے گئے چند معترضانہ اشعار کے جواب میں سہیل صاحب نے ''اقبال بنام اقبال'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدائے گفت بقرآن ''لکل قوم ہاد''   ولے بنکتہ کجا نے برد کسے کہ غبی است

سلوکِ رفق ومدارا بہ ''جار ذی القربیٰ''   عمل بحکمِ الٰہی واتباع نبی است

محبتِ وطن است از شعائرِ ایمان   ہمیں حدیثِ پیمبر ''فدیتہٗ بأبی'' است

بہ قومِ خویش خطابِ پیمبراں بنگر   پر از حکایتِ ''یا قوم'' مصحفِ عربی است

اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی کی تعریف میں لکھی گئی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

باز خواں ''ملۃ أبیکم'' را   کہ کلامِ خدائے ذو المنن است

چیست معنی ''لسان قومہ'' را   گر نہ بنیادِ قوم بر وطن است

ان دونوں نمونوں میں ''لکل قوم ھاد''، ''جار ذی القربی''، فدیتہٗ بأبی''، ''یا قوم''، ''ملۃ أبیکم'' اور ''لسان قومہ'' یا تو قرآنی آیات ہیں یا احادیث نبویہ۔

اسی طرح مولانا مرحوم کی بھتیجی عابدہ کی وفات پر کہے گئے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فرشتہ سیَر، حافظہ عابدہ   خدائش دہد ''عیشۃ الراضیۃ''

در آغوش پرورد اسلام را   ہمیں کرد ''فی عمرۃ الماضیۃ''

بر افشاند دامن زدنیائے دون   سبک رفت ''فی جنۃ عالیۃ''

چو سالش بجستم ندارد سروش | کہ ''رجعت الی ربہا راضیۃ''

اسی طرح چودھری حفاظت حسین کی وفات پر آپ نے لکھا ہے:

دلِ ازود ہاتف چو سالِ وصالش | بگفتا ''لقد فاز فوزاً عظیماً''

مزید فرمایا:

قرآں پئ سالِ رحلتش گفت | ''فی الجنۃ خالدین فیہا''

مندرجہ بالا اشعار میں ''عیشة الراضية''، ''فی جنة عالية''، ''رجعت إلى ربها راضية''، ''لقد فاز فوزاً عظيما'' اور ''فی الجنة خالدين فيها'' وغیرہ قرآنی آیات ہیں جن میں بعض جگہوں پر سہیل صاحب نے ترکیب وتقفیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے تصرف بھی کیا ہے چنانچہ ''عمر'' کو ''عمره'' لکھا ہے کیوں کہ قافیہ میں ''الماضية'' تھا۔

یہی نہیں اگر ہم ان کے بعض فارسی اشعار کا عربی کے مشہور ومعروف شعراء کے اشعار سے موازنہ کریں تو ہم پائیں گے کہ ہمارا یہ عجمی شاعر عرب کے مشہور ومعروف شعراء سے کم نہیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

خنساء جو عرب کی مشہور مرثیہ گو شاعرہ ہیں بلکہ اس میدان میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ اپنے جواں سال بھائی کی وفات پر ایک مرثیہ میں لکھتی ہیں:

أعينيّ جودا ولا تجمدا | ألا تبكيان لصخر الندى

ألا تبكيان الجرىء الجميل | ألا تبكيان الفتى السيدا

طويل النجاد رفيع العما | دساد عشيرته أمردا

إذا القوم مدّوا بأيديهم | إلى المجد مدّ إليه يدا

(شرح دیوان الخنساء: ۱۵)

خنساء کے مندرجہ بالا اشعار کو پڑھنے کے بعد آیئے سہیل کے قلم سے نکلے ہوئے مصطفیٰ کمال پاشا کے مرثیہ کے چند اشعار پڑھتے ہیں:

دانی کنون چہ بر سر اسلامیاں گذشت | گویند مصطفیٰ زجہاں نوجواں گذشت

اے دل بدیدہ لختِ جگر ارمغاں فرست | وے دیدہ ایں متاع بہ مژگاں نثار کن

شد آفتابِ قوم نہاں از نگاہِ ما اے وائے تیرہ بختی وارو سیاہِ ما

رفت آں کہ می نہاد بہر زخم مرہمے رفت آنکہ ساخت چارۂ حالِ تباہِ ما

نے نے نمرد او کہ نکویاں نمردہ اند او گنجِ قوم بود بخاکش سپردہ اند

خلاصۂ کلام: اس مختصر سی گفتگو سے اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرتِ سہیل نے فارسی نثر و نظم اپنے وقت کے ماہرینِ فن سے سیکھی جسے ان کی ذاتی کاوش و مطالعہ نے مزید جلا بخشی اور آپ نے آگے چل کر اس زبان میں ایسی شاعری کی جس میں اعلیٰ فارسی شاعری کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اور اب ہم بلا خوف و مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، شبلی و فراہی پر نہیں بلکہ حضرتِ سہیل پر ختم ہوتی ہے۔

☆☆☆

اقبال سہیل کی غزل اور قومی یکجہتی

ڈاکٹر محمد شارق☆

اقبال سہیل اردو ادب کے باب میں وہ شاہکار ہیں جن کے جمال فن اور معنی روشن کے فیض سے شعر و سخن کا کوئی گوشہ محروم نہیں خواہ وہ نظم ہو، غزل، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، نعت یا منقبت ہو۔ ان سبھی اصناف میں احساسات و جذبات کی سحر طرازیوں کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں، ان کی شاعری انسان دوستی، مذہبیت، حب الوطنی، قوم پرستی، سیاسی شعور اور اخلاقی اقدار کا حقیقی پرتو معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں قدر و منزلت کا جذبہ اور اخلاقیات کا درس اس قدر بام عروج پر تھا کہ ان کی شاعری میں اعلیٰ مقام نعت گوئی کو حاصل ہوا۔ چونکہ دنیا میں انسانی اقدار کا اعلیٰ نمونہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات ہے اس لئے انھوں نے کثرت سے نعتیہ کلام تخلیق کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ غزل کے اعلیٰ اور دلکش نمونے بھی پیش کئے، رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق غزل اردو شاعری کی آبرو ہے، اس لئے اقبال سہیل نے غزل کی آبرو کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے تخیل کے ذریعے ادب میں جامع افکار وخیالات کا اضافہ کیا۔ لہٰذا حب الوطنی، تحریک آزادی اور قوم پرستی ان کا شعار بن گیا۔

محبت ہے وطن کی گل زمیں سے ہمیں اب کیا غرض خلد بریں سے

آل احمد سرور نے سچ کہا ہے:

''مولانا سہیل کے قصائد وغزلیات کے مطالعے سے سب سے پہلے مولانا کی گہری مذہبیت ان کے شدید حب وطن ان کی قوم پرستی، ان کی رجائیت، ان کی بے پناہ ولولہ حیات اور ان کے لالہ کار اور تازہ کار تخیل کا احساس ہوتا ہے۔''(۱)

اقبال سہیل کی انسان دوستی اور قوم پرستی نے ان کے جذبات کو اس قدر برانگیختہ کر دیا کہ ہستی کا

☆اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عرفان اور اس عرفان کو عام کرنے کی کوشش نے ان کے کلام میں پیغمبرانہ شان پیدا کردی۔ یہی وجہ ہے انھوں نے مذہبی، قومی اور انسانی رواداری کے ذریعہ ذات پات، مذہب وملت، رنگ ونسل اور لسانی افتخار سے بالاتر ہوکر انسانیت کا درس دیا غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رگ رگ میں نظام فطرت کی، رقصاں ہے محبت کی بجلی
ہو لاکھ تضاد، اضداد میں بھی، اک رابطہ باہم ہوتا ہے
مل جل کے برنگ شیر وشکر دونوں کے نکھرتے ہیں، جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے

ان اشعار کی تعبیر وتشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے ہندوستانی تہذیب کو سامنے رکھ کر غزل کی بنیاد رکھی کہ کس طرح ہمارا ملک گنگا جمنی تہذیب کا علم بردار ہے اور ہمیں کس طرح متحد ہوکر اس ملک کے تحفظ اور بقا کے لئے عملی طور سے حصہ لینا چاہئے۔ اثر لکھنوی نے بجا فرمایا ہے:

''سہیل نے انسانیت اور بلند ہمتی کے جو جو اصول پردۂ شعر ونغمہ میں بتائے ہیں ان میں سے اگر ایک عشر عشیر پر بھی قوم کے افراد کاربند ہوں تو دنیا نمونہ بہشت بن جائے۔ لیکن شرط یہ ہے مذہب کے قیود سے بالاتر ہوکر سرگرم عمل ہوا جائے۔ مذہب ہر انسان کی ذات اور خدا کے مابین واسطہ ہے مذہبی اختلافات کی بنا پر انسان کی مخاصمت انسان سے کیوں ہو اور ہندوستان میں تو نہ معلوم کتنی قومیں اور کتنے مذاہب اور ان میں بھی نا معلوم کتنے فرقے اور کتنی گوتر ہیں۔ (۲)

اقبال سہیل کا عہد انگریزی سامراج کی ظلم وزیادتی کا زمانہ تھا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا عوام بے دست وپا محسوس کر رہی تھی، ہر طرف خانہ جنگی کا عالم تھا حساس تخلیق کار نہایت مضطرب اور بے چین تھا' اقبال سہیل نے ــــــ مشاہدہ کیا اپنے افکار وخیالات کے ذریعے ایسی غزلیں تخلیق کیں جس سے قومی یکجہتی' مساوات، تقسیم ہند کے مسائل وغیرہ کا درد واضح طور سے نمایاں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ تحریک آزادی کے لئے اقبال سہیل نے اپنی غزلیہ شاعری کے ذریعہ ملک کے جانباز سپاہیوں کو متحرک کیا اور ان جانثاروں کے اندر عزم وہمت قوت وشجاعت اور بے باکی پیدا کی اور قوم وملت کے رگ وپے میں ایک بجلی سی دوڑادی۔

صیاد اب قفس سے ڈراتا ہے کیا مجھے تیرے کرم سے شکل وہی آشیاں کی ہے

ہو عقل تو سبق لے دریا کے جزر و مد سے | کہ جوش دل میں پیدا گر ہے ہوس علو کی
قفس میں دیتے ہو کیا طعن ست پروازی | فضا کھلی ہوئی ملتی تو امتحاں ہوتا

اقبال سہیل کی حیثیت نہایت بلیغ اور جامع تھی وہ حالات کی نزاکتوں سے بخوبی واقف تھے وہ اپنے ملک سے بے پناہ محبت کرتے تھے ان کے ذہن میں ملک کے جمہوری نظام کا اور ملک کی تعمیر و ترقی کا ایک خاکہ تھا، وہ تقسیم ہند کی شدید مخالف تھے، یہی جذبات ان کی غزلوں کو بقائے دوام بخشتے ہیں احسن بیگ رقمطراز ہیں۔

''سہیل ہندوستان کی تقسیم کی شدت سے مخالفت کرتے تھے انھوں نے یہاں کی عوام کو قومی یکجہتی اور اتحاد کے جذبے سے سرشار کیا، فرقہ پرست عناصر کی تخریبی سرگرمیوں کی کھل کر مذمت کرتے تھے، وہ اس احساس کا درس دیتے تھے کہ تفرقے انگریزی حکومت کی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہیں تاکہ وہ اپنی حکومت کی بنیادوں کو ملک کے گوشہ گوشہ میں مستحکم کرسکیں۔ وہ امن وآشتی، اخوت ومحبت اور صلح کل کے علمبردار تھے، اور انگریزی حکومت کی شرانگیزیوں اور ریشہ دوانیوں پر تنقید کرنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔(۳)

اس اقتباس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اقبال سہیل کا جذبہ حریت انگریزوں کی منفی پالیسی، فرقہ واریت کو طول دینے کی کوشش اور ملک کو تقسیم کرنے کی جہد مسلسل جیسے موضوع پر طنز سے بھرپور نشتر اپنی غزل میں پیوست کیا ہے غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

تقسیم گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی | گلزار لٹ رہا ہے کچھ اس کی خبر نہیں
جدا ہے سب سے رسم وراہ حسن کے دریا کی | نہ قول اعتماد کا نہ بات اعتبار کی
اٹھائے ہیں یہ فتنے نرگس غماز نے ورنہ | نہ بت کو شیخ سے ضد ہے نہ کعبے سے برہمن کو
کوئی حد بھی ہے یارب مدت رنج اسیری کی | نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اب تو برق شعلہ افگن کو
پوچھتے کیا ہو دیار دل کی مہماں پروری | جو بلا باہر سے آئی وہ مقامی ہوگئی
خدا سمجھے بت سحر آفریں سے | گریباں کو لڑایا آستیں سے

اقبال سہیل نے تخیل کی کارفرمائی سے غزل میں ایسے احساسات وجذبات کو پیش کیا ہے جس سے ذہن ودل پر سحر انگیزی طاری ہوجاتی ہے مگر اس پیرائے کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کے معاشرتی حقائق کو تسلیم کیا اور اس کو رمز وکنایہ کے ذریعہ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ان خشک حقائق

میں ایسے شاعرانہ پیرائے بیان کا طرز اختیار کیا کہ غزل کی شیرینی اور کشش میں کمی واقع نہ ہو یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ دکھتی ہوئی رگوں پر جس موثر انداز میں چوٹیں لگائیں ہیں وہ کسی ملایا واعظ کی تلخ نوائی سے بھی ممکن نہیں تھا۔

صحن حرم نہ کنج صنم خانہ چاہئے — اے بے خودی مجھے ترا کاشانہ چاہئے
دو تیلیاں قفس کی ہیں ان کی بساط کیا — مرغ اسیر! ہمت مردانہ چاہئے
برق نگہ کا پاس ادب ہے تو لازمی — چشمک دل و جگر میں رقیبانہ چاہئے

اقبال کی شاعرانہ صفات کا تجزیہ کرتے ہوئے مرزا احسان احمد بیگ لکھتے ہیں۔

''شاعرانہ پیرایہ بیان کا یہی کمال کہ شاعر جو کچھ چاہے کہے خواہ اس کا تعلق فلسفہ سے ہو یا اخلاق سے، مذہب سے ہو یا سیاست سے لیکن وہ ہر موقع پر شاعر ہی رہے خشک مزاج فلسفی یا ملائے مسجد نظر نہ آئے ورنہ اس کی تمام سعی قلم بے اثر ہو کر رہ جائے گی، غزل کے لہجے میں شاعر نے دکھتی ہوئی رگوں پر جس موثر انداز سے چوٹیں لگائیں ہیں کسی واعظ تلخ نوا کی زبان کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

اقبال سہیل نے انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی یہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان حسن مطلق کا ایسا مظہر ہے جو سکون نا آشنا ہے، جس کے باطن میں بے قراری و اضطرابی کا ایسا تلاطم ہے جو اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کرنے کے لئے کسی نہ کسی فن کا سہارا لیتی ہے اگر انسان اپنے داخلی جذبات و احساسات کو ظاہر نہیں کر پاتا تو اس کی بے قراری میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس بے قراری کو کم کرنے کے لئے فن ایک ایسا شعبہ ہے جو داخلی غبار کو اپنے حسین پیرائے اظہار کے ذریعہ تزکیہ نفس کرتا ہے۔ اقبال سہیل کا یہی غبار جب غزل کے لب و لہجے میں رونما ہوتا ہے تو اشعار کی ایسی لڑی تیار ہوتی ہے جو قاری اور سامع کے دل کی آواز اور قوم و ملت کے لئے بہار لالہ و گل کی خوشبو بن کر فضا کو معطر کر دیتی ہے۔

شاید حیات اسی کو کہتے ہیں کہنے والے — ہوتی ہے اک چبھن سی رگ رگ میں آرزو کی
ہم نشیمن کو بھی روئیں تو خطا ہوتی ہے — پھونک ڈالیں وہ چمن بھی تو ہنر کرتے ہیں
اگر چلنا تو نقش پا بھی لغزش سے مٹا دینا — نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتا دینا
کیا حسن کی محفل میں حاجت لب گویا کی — ہر آہ شکایت ہے، ہر اشک فسانہ ہے

—☆—

اقبال سہیل کی قومی وملی شاعری کا مختصر جائزہ

ڈاکٹر شفیق اعظمی ☆

ایک علمی وادبی گہوارہ کی حیثیت سے ضلع اعظم گڑھ کو ایک خاص مقام حاصل ہے، یہاں پر ایک سے ایک علمی وادبی ہستیاں پیدا ہوئیں جن پر ہمیں ہی نہیں پوری دنیائے اردو کو ناز ہے، انھیں میں سے ایک اقبال سہیل بھی ہیں۔ ضلع اعظم گڑھ کے لئے اقبال سہیل نے کبھی کہا تھا۔

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر، فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے، وہ نیر اعظم ہوتا ہے

ان کا یہ شعر خود ان پر بھی صادق آتا ہے، اقبال سہیل خود سرزمین اعظم گڑھ سے اٹھے اور آسمان علم وادب پر نیر اعظم بن کر چمکے۔ بقول اثر انصاری۔

آسمانِ ہند کا وہ نیر اعظم ہوا کردیا جس کی شعاع فکر نے روشن فضا
جوہر قابل وہ علامہ سہیل اقبال تھا

اقبال سہیل ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں موضع بڑہریا میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے بچپن کا نام ابوظفر حامد خان تھا۔ آپ کا گھرانہ علمی وادبی اعتبار سے بہت ممتاز گھرانہ تھا۔ آپ کے والد ماجد فارسی زبان وادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی بہت اچھی فارسی جانتی تھیں۔ آپ کو بھی فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ اثر انصاری کہتے ہیں۔

فارسی دانی میں کوئی اس کا ہم پایہ کہاں
اہل فارس بھی نہ تھے اس کی طرح شیریں بیاں

☆ پٹھان ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آپ علی گڑھ چلے گئے تھے۔ جہاں سے آپ ۱۹۱۸ء میں ایم - اے - ایل - ایل - بی کر کے وطن واپس لوٹے، وہاں سے آنے کے بعد پیشۂ وکالت سے منسلک ہو گئے۔ شاعری کا شوق انھیں اوائل عمری ہی سے تھا۔ بہت جلد نہ صرف اچھا کہنے لگے تھے بلکہ استادانہ مہارت بھی حاصل کر لی تھی، کیوں نہ کر لیتے، انھیں علامہ شبلی نعمانی جیسے عظیم المرتبت شاعر سے شرف تلمذ حاصل تھا، جلد ہی آپ کا شمار خود اساتذہ میں ہونے لگا تھا آپ کی شاعری نہایت ہی اعلیٰ درجے کی تھی، اور اسلوب بھی سب سے منفرد بقول شاہ معین الدین احمد ندوی ''شاعری میں ان کا درجہ بہت بلند تھا، وہ اپنے تمام معاصرین میں امتیازی درجہ رکھتے تھے۔''(۱) اثر انصاری فرماتے ہیں ؎

جس کے اندازِ تکلم سے کھل اٹھتا تھا چمن ۔۔۔ وہ کہ اپنی ذات سے تنہا تھا رشک انجمن
یعنی سب سے منفرد تھا جس کا اسلوب سخن ۔۔۔ جس کو قدرت نے دیا تھا علم وفن کا بانکپن

آپ نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً نظم، غزل، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، مثنوی وغیرہ وغیرہ اور ہر جگہ ممتاز و منفرد ہیں، بالخصوص قصیدہ گوئی، نعت نگاری اور قومی وملی نظموں میں تو ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ اثر انصاری صاحب نے کیا خوب کہا ہے ؎

شاعر بے مثل تھا، اس کی نہیں کوئی مثال ۔۔۔ اس کو حاصل تھا نہایت زود گوئی میں کمال
اس کی پرواز تخیل تک پہنچنا ہے محال ۔۔۔ اس کی نظمیں لاجواب اس کے قصیدے لازوال

اور نعت کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ہوگئی ہے زندۂ جاوید جس کی نعت پاک ۔۔۔ کر دیا جس کی نظر نے پردۂ اسرار چاک

اس سلسلے میں شاہ معین الدین احمد ندوی کی یہ رائے بڑی متوازن اور جامع ہے کہ ''یہ ممکن ہے کہ شاعری کی کسی خاص صنف مثلاً غزل میں بعض شعراء ایسے نکل آئیں جو ان سے (اقبال سہیل سے) بڑھ کر ہوں لیکن نفس شاعری اور قادر الکلامی خصوصاً قصائد میں ان کا کوئی حریف نہیں ان کی نعت ومنقبت وقصائد اردو میں کیا فارسی پر بھی بھاری ہیں، یہی حال ان کی قومی وملی نظموں کا ہے۔''(۲) میرا موضوع اس وقت صرف ان کی قومی وملی نظموں کا ایک مختصر جائزہ ہے۔

ہندوستان میں قومی شاعری کا آغاز انگریزوں کی آمد کے بعد سے ہوتا ہے، انگریز ہندوستان میں آئے تو تھے تجارت کی غرض سے، لیکن اہل ہند کی سادہ لوحی اور بعض کمزوریوں کے بموجب جلد ہی

یہاں کے حاکم بن بیٹھے پہلے انھوں نے کوٹھیوں میں قلعہ بندی کی۔ رفتہ رفتہ جب ان کی طاقت مضبوط ہوگئی تب وہ آس پاس کی ریاستوں پر اور پھر اس کے بعد دلی پر دھاوا بول دیا اور مغل شہنشاہ کو اپنا قیدی اور وظیفہ خوار بنا کر دہلی کے لال قلعے میں محصور کر دیا اس کے ساتھ ہی ساتھ بادشاہ اور رعایا دونوں کے اختیارات کو محدود کرنا شروع کر دیا، نیز ان کی سختیاں بھی روز بروز بڑھتی گئیں اور مظالم بھی روز افزوں ہونے لگے لیکن انھیں سختیوں اور مظالم کی وجہ سے ہندوستانی عوام میں اپنے وطن کے تئیں محبت اور الفت کے جذبات بھی بیدار ہونے لگے اور انگریزوں کے خلاف نفرتیں بھی جنم لینے لگیں، اہل ہند یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جب تک ملک ان بدبختوں کے خونیں چنگل سے آزاد نہیں ہوگا ہمارے مقدر کا سورج یوں ہی بدلیوں میں چھپا رہے گا۔ چنانچہ ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف بے چینی، ناراضگی اور نفرت کے جذبات ایک روز لاوا بن کر پھوٹ پڑے جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا اور اہل ہند اسے پہلی جنگ آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس پہلی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور بہت زیادہ جانی و مالی نقصانات اٹھانے پڑے اور انگریزوں کی فتح ہوئی، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ دہلی پر نہ صرف قابض ہو گئے بلکہ انھوں نے شہر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں وہ لوٹ مار کی اور قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کیا کہ اللہ کی پناہ۔ چونکہ اس جنگ میں مسلمان پیش پیش تھے، اس لئے سب سے زیادہ انھیں کو انگریزوں نے عتاب کا نشانہ بنایا ویسے انگریزوں نے کسی کو نہیں بخشا جسے بھی پایا بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا۔

لیکن جوں ہی حالات کچھ معمول پر آئے اور اہل ہند نے اس سنگین صورت حال سے چھٹکارا پایا پھر سے جدوجہد آزادی میں جٹ گئے کیونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مجاہدین آزادی کو ناکامی و شکست کا منھ دیکھنا پڑا تھا مگر اس سے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ اگر منظم اور متحد ہو کر، جدید اسلحہ کے ساتھ ان سے مقابلہ کیا جائے تو انھیں شکست بھی دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد جدوجہد آزادی کی پھر سے ابتدا ہو گئی جو کسی نہ کسی صورت میں ۱۹۴۷ء تک مسلسل جاری رہی اور بالآخر مجاہدین آزادی کو فتح نصیب ہوئی اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر اپنے ملک بھاگنا ہی پڑا، اس طویل جدوجہد آزادی میں ملک کے تمام لوگ بغیر کسی امتیاز مذہب و ملت کے شریک تھے ہر طبقہ، ہر ذات، ہر قوم کے لوگوں کی مساعی جمیلہ اس میں شامل تھی متعدد سیاسی پارٹیوں اور سماجی تنظیموں نے مل کر فرنگیوں

کا مقابلہ کیا تھا۔ درجنوں سیاسی، سماجی اور قومی رہنماؤں نے اپنی جان کو جان نہ سمجھ کر ہر قیمت پر اس ذلت بھری غلامی کی زندگی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ ہمارے ادباء اور شعراء بھی اس جدوجہد آزادی میں کسی بھی موڑ پر کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے بھی تھے جو عملی طور پر بھی جنگ آزادی میں شامل تھے اور کچھ جو کسی وجہ سے عملی طور پر حصہ نہیں لے سکتے تھے قلمی معاونت ہی کے ذریعے مسلسل تحریک آزادی کو زندگی بخش رہے تھے۔ اقبال سہیل کا شمار بھی اسی قبیل کے شعراء میں ہوتا ہے، جنھوں نے وطن کی آزادی کے لئے ہر موڑ پر قلمی معاونت کی ہے اور اپنا خون جگر دے کر شمع تحریک آزادی کی لو کو تیز تر کرتے رہے ہیں۔

اقبال سہیل نے اپنے اشعار کے ذریعے حریت پسندوں، آزادی کے متوالوں اور قوم کے جیالوں کے دل میں جوش وخروش کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کے جذبات کو بھی برانگیختہ کیا۔ انھیں مولانا حمیدالدین فراہی، سرسید اور وحیدالدین خاں سلیم جیسی قدآور شخصیتوں کے درمیان رہنے کا شرف حاصل تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا حسرت موہانی کی قربت نصیب تھی اور مولانا شبلی نعمانی جیسے جید عالم اور مجاہد آزادی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا، جس کے سبب ان کے جذبہ حب وطن کو اور بھی جلا مل رہی تھی۔ اقبال سہیل کا دل وطن کی محبت سے نہ صرف سرشار تھا بلکہ ان کے دل میں وطن کے لئے بہت کچھ کر گزرنے کی آرزو بھی تھی جس کا اندازہ ان کے اشعار کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں کہتے ہیں ؂

ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — زمانے کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمیں ساری دنیا سے پیارا وطن

سنا دے سنا، حب قومی کا راگ — دلوں میں لگا دے حمیت کی آگ
ابھی جگمگا اٹھے سارا وطن

ایک دوسری نظم کے بھی کچھ اشعار پیش خدمت ہیں، جن کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کو وطن عزیز کی مٹی سے کس قدر وابستگی تھی۔ کہتے ہیں ؂

دل قوم درد آشنائے وطن ہو — تو کیوں غیر فرماں روائے وطن ہو
جیوں تو کلاہ وطن زیب سر ہو — مروں تو کفن میں ردائے وطن ہو

وہی سر ہے جو قوم پر ہو تصدق   وہی جان ہے جو فدائے وطن ہو

نہ لوں مشتِ خاک وطن کے عوض میں   اگر ملک جم بھی بجائے وطن ہو

ان دنوں آزادی کی حمایت میں آواز بلند کرنے والوں کو قید میں ڈال دیا جاتا تھا، جہاں انھیں بڑی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ ملک کے تمام قید خانے آزادی کے متوالوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اقبال سہیل ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

دو تیلیاں قفس کی ہیں ان کی بساط کیا   مرغ اسیر ہمت مردانہ چاہئے

اتنا ہی نہیں کہ قید و بند کی اذیتیں جھیل رہے آزادی کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ہی انھوں نے اشعار کہے بلکہ بعض اشعار میں انھوں نے انگریز حکام کو للکارا بھی ہے۔ مثلاً ایک شعر ان کا اس طرح ہے کہ۔

قفس میں دیتے ہو کیا طعن ست پروازی   فضا کھلی ہوئی ہوتی تو امتحاں ہوتا

انگریز حکام اپنی حکومت کو قائم اور دائم رکھنے کے لئے اور تحریک آزادی کو کمزور کرنے کی غرض سے ہندوستانی عوام کو لڑایا بھی کرتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، وہ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لیتے تھے، کبھی مندر مسجد کا جھگڑا کھڑا کر دیتے تھے، تو کبھی زبان کا، تو کبھی گائے کا اور لوگ آپس میں لڑ بھی پڑتے تھے، مگر کچھ ذی ہوش اور دور اندیش ایسے بھی تھے، جو ان کی اس گھناؤنی چال کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اقبال سہیل نے بھی اسے سمجھا اور محسوس کیا اور اہل وطن کو ہر طرح کی فرقہ واریت سے دور رہنے کی تلقین بھی کی، مثال کے طور پر دو تین شعر پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اٹھائے ہیں یہ فتنے نرگس غماز نے ورنہ
نہ بت سے شیخ کو ضد ہے نہ کعبے سے برہمن کو

☆

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے   گریباں کو لڑایا آستیں سے

وہ فتنہ گر ہے اپنا ساقی میخانہ برسوں سے   کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

انھوں نے مجاہد آزادی کے دل میں آزادی کی لہر کو تیز کرنے کے لئے مختلف قسم کے متعدد اشعار کہے۔ ان کا کہنا تھا کہ غلامی کی زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے۔ اس لئے دونوں عالم کو بھی

قربان کر کے آزادی کی نعمت حاصل ہو سکے تو لینے میں تامل نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

دو جہاں کی نعمتیں اس ایک نعمت پر نثار ذوقِ آزادی، غم سود و زیاں سے کم نہیں
ایک لمحہ بھی جو آزادی سے ہو جائے بسر بندگی کی زندگی بے کراں سے کم نہیں
آتش دوزخ سے رسوا تر غلامی کی حیات مرگِ آزادی بہشت جاوداں سے کم نہیں

تمام محبِ وطن کی طرح اقبال سہیل کے دل میں بھی صبح آزادی کو دیکھنے کی کتنی آرزو تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے درج ذیل اشعار کو ملاحظہ فرمائیں۔

ہوئیں مدتیں غیر کے دام میں نہ رسوا ہو دنیا کی اقوام میں
نہ کر اب تو ذلت گوارا وطن
تو غیروں کے پھندے سے آزاد ہو پشیمان باہر کا صیاد ہو
دکھا دے یہ دلکش نظارا وطن
بدیسی کی فرماں بری چھوڑ دے غلامی کی زنجیر کو توڑ دے
دلی جوش کر آشکارا وطن
غلامی کا مٹ جائے دامن سے داغ جلے گھر میں مسجد سے پہلے چراغ
چمک جائے تیرا ستارا وطن

اور اللہ نے بالآخر وہ دن بھی دکھایا کہ فرنگیوں کو ہندوستان چھوڑ کر بھاگنا ہی پڑا اور تمام ہندوستانیوں کو صبح آزادی کا دیدار نصیب ہوا، تمام ملک کے بچے بچے نے اس صبح آزادی کا بڑے جوش وخروش کے ساتھ استقبال کیا۔ اقبال سہیل نے بھی صبح آزادی کو سچے دل سے خوش آمدید کہا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں صرف دو شعر پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

اب دورِ مسرت آنے دو، قومی پرچم لہرانے دو
جاتی ہے غلامی جانے دو، صدیوں کا ذلدر جاتا ہے
ہم کو تو بسر کرنا ہے یہیں، جینا ہے یہیں، مرنا ہے یہیں
اٹھو یہ چمن شاداب کرو، وہ غاصب خود سر جاتا ہے

سینکڑوں سال کی جدوجہد آزادی اور ناقابل بیان قربانیوں کے بعد آزادی تو ضرور ملی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کو ایک نئے سانحے سے بھی گزرنا پڑا، وہ سانحہ تھا ملک کی تقسیم کا۔ کچھ لوگ ملک کو دو حصوں میں بانٹ دینا چاہتے تھے، لیکن کچھ محب وطن ایسے بھی تھے جو اس کے سخت مخالف تھے۔ اقبال سہیل صاحب بھی تقسیم کے خلاف تھے۔ انھوں نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے والوں پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا۔

تقسیم گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی گلزار لٹ رہا ہے کچھ اس کی خبر نہیں

لیکن بالآخر ہندوستان تقسیم ہو کر ہی رہا اور اس بٹوارے کے ساتھ ساتھ ملک کا جو حال ہوا، جتنی بربادی وقتل وغارتگری ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ کسی کو بھی یہ توقع نہیں تھی کہ آزادی کی صبح اتنی بھیانک ہوگی جس کا ذکر اقبال سہیل نے اپنے ایک شعر میں بڑے موثر انداز میں کیا ہے، فرماتے ہیں۔

آئی شب غم کے بعد سحر، غمناک رہا پھر بھی منظر
وہ غنچہ و گل کا ہنس ہنس کر شبنم کو رلانا کیا کہیے

نہ جانے کیوں یک بیک ملک کے کچھ سیاسی رہنماؤں کے خیالات ونقطۂ نظر میں بھاری تبدیلی آگئی تھی، ان کے اس طرح کے رویے کو دیکھ کر اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اقبال سہیل نے کہا تھا۔

پیچھے ہے قدم، آگے ہے نظر، جانا ہے کدھر، جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمت سفر، رفتار زمانہ کیا کہیے

اس طرح دیکھا جائے تو اقبال سہیل کی قومی وملی شاعری جدوجہد آزادی سے لے کر حصول آزادی اور پھر اس کے بعد تک کے واقعات وحالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، جس سے وطن عزیز سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس وقت کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے بقول ڈاکٹر منور انجم ''اقبال سہیل کی قومی وملی شاعری کے مطالعہ سے ان کی انسانیت دوستی، ان کی جمہوریت پسندی اور ان کے شدید محب وطن ہونے کا اندازہ ہوتا ہے، قومیت کا وہ تصور سہیل کے یہاں ہرگز نہیں جو ہوس گیری پر آمادہ کرتا ہے، وہ انسانی شرف، انسانی آزادی، انسانی وحدت، انسانی امن، انسانی مسرت اور انسانی ارتقاء کے نقیب ہیں، ملکی اتحاد کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام قومیں متحد ہو کر

ملک کے سیاسی ومعاشی سود وزیاں کو سمجھ کر اپنے تہذیبی دائرے میں رہتے ہوئے ملک کی تعمیر و ترقی میں قومیت اور صلاحیت کو صرف کردیں اور اس طرح ہندوستان کی سیاسی وحدت اور تہذیبی سنگم کو مستحکم کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔(۳)

مل جل کے برنگ شیر و شکر، دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر، تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے

غرض یہ کہ ایک محب وطن اور قومی شاعر کی حیثیت سے بھی انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

حواشی:

(۱) ''ارمغان حرم'' شاہ معین الدین ندوی بحوالہ ''اقبال سہیل حیات اور شاعری'' ڈاکٹر منور انجم ص ۳۹۶

(۲) ''ارمغان حرم'' شاہ معین الدین ندوی بحوالہ ''اقبال سہیل حیات اور شاعری'' ڈاکٹر منور انجم ص ۳۹۶

(۳) ''اقبال سہیل-حیات اور شاعری'' از ڈاکٹر منور انجم، ص: ۱۹۶

☆☆☆

علامہ اقبال سہیل کی غزل گوئی

(بالخصوص عشق و محبت کے حوالے سے)

ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی ☆

غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر بے شمار موضوعات کو سمونے کی بے پناہ طاقت موجود ہے۔ غزل نے ہر دور کے سیاسی و سماجی افکار و تصورات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے، ہر فلسفے اور رجحان کو نرالے انداز سے پیش کیا ہے۔ طرز اظہار اور اس کا داخلی نظام ہی غزل کی جان ہے، اس کی خصوصیت یعنی ابہام رمز و ایماء، اجمال اور کفایت لفظی بے شمار امکانات کو وسیع کرتے ہیں۔ خارجی حقائق بھی داخلی نظام میں ڈھل کر دلچسپ اور پراثر بن جاتے ہیں، فیض کی غزلیں اس کا واضح ثبوت ہیں جن کے یہاں انقلابی پیکر احساسات کا لطیف روپ لئے ہوئے ہیں۔ ترقی پسند دور کے عمرانی و سیاسی نشیب و فراز ہوں یا فطرت کی نیرنگیاں تصور خدا ہو یا فلسفۂ کائنات۔ بندہ کی ذات ہو یا فرد کی شناخت کا مسئلہ، غرض دنیا و مافیہا کا کوئی بھی موضوع احساس اور عشق کے لطیف اور نازک پیرایے میں ڈھل کر جب قاری کے سامنے آتا ہے تو حیرت کدے قائم ہو جاتے ہیں، جب عشق کے سامنے خود حسن جلوہ افروز ہو تو ہر کیفیت قیس اور ہر رنگ محمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال سہیل کی غزلوں کے کئی اشعار اس صحرا کی جانب اشارہ کرتے ہیں، جہاں جنوں کا بازار لگتا ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ علامہ کہیں تو گردِ راہ عشق سے دامن محفوظ رکھتے ہیں، کہیں احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں اور کہیں صورت قیس بگولے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، کہیں حسرت کی طرح محبوب سے نظریں ملا کر اسے نادم کرتے ہیں تو کہیں حسن کے تار سے خود کو گھائل کر بیٹھتے ہیں، کہیں اقبال کی طرح خودی کا روپ لیتے ہیں،

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

آہنگ کو بلند کرتے ہیں اور کہیں میر کی طرح عشق کے تہذیبی رویہ کا پاس بھی رکھتے ہیں۔

علامہ کی شاعری میں خطیبانہ آہنگ، پرشکوہ لہجہ، مضامین کا تسلسل، انقلاب کی گونج، سیاسی افکار، عشق وتصوف جیسے اوصاف موجود ہیں۔ ان کے یہاں مسلسل غزلوں کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ کئی غزلیں غالب، اقبال اور اصغر کی زمین میں بھی نظر آتی ہیں۔ قدماء کے مضامین کو بھی انھوں نے بڑی ہنرمندی اور منفرد طریقے سے برتا ہے بقول افتخار اعظمی:

> ''اقبال کی غزلوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ ان کے یہاں وطن دوستی بھی ہے، نوع انسانی سے محبت بھی ہے، ارضی حقائق بھی ہیں، کائنات اور ماورائے کائنات کے مسائل بھی ہیں، آتش رفتہ کا سراغ بھی ہے، حال کی تعمیر کا جذبہ بھی ہے اور فردا کا تصور بھی ہے۔ انھوں نے غزل کو حکیمانہ سنجیدگی، مجاہدانہ وقار، قلندرانہ شان استغناء اور فلسفیانہ وسعت نظر عطا کی۔'' (تابش سہیل)

لیکن ان تمام باتوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہر جگہ اقبال سہیل ہی ہوتے ہیں۔ وہ موضوعات کو پیش کرتے وقت مضمون شعر کو آگے بڑھاتے ہیں۔ معاملات تصوف اور داخلی احساسات کو نئے زاویہ سے پیش کرتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان کی شاعری پر کس کے گہرے اثرات ہیں یا کس کس کی زمینوں پر انھوں نے شعر کہے ہیں، ہم ان اشعار کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں جو عشق ومحبت کی کیفیات سے پُر ہیں، جہاں عشق ایک نئے انداز سے جلوہ نمائی کرتا ہے، جہاں رجائیت، تصوف، خود شناسی جیسے موضوعات کے ساتھ تشکیک، اعتدال اور احتیاط کی فضا بھی گردش کرتی ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ جدید شاعری میں حالؔی اور چکبستؔ کے بعد اقبال سہیل واحد ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی غزلوں میں سیاست جیسے بے کیف موضوعات کو اس انداز سے حل کر دیا کہ وہ غزلیہ شاعری کا ایک خاص کلاسیکی موضوع محسوس ہوتے ہیں، جدید شاعری میں ان کا یہ رجحان جسے حالؔی نے شروع کیا تھا اقبال سہیل نے اسے عروج تک پہنچا دیا۔ ایسے اشعار رمز وایماء سے بھرپور ہوتے ہیں۔ غزل کی کلاسیکی لفظیات کا استعمال ہوتا ہے۔ علامہ کی ایسی غزلوں میں اس صفت کو سیاسی رمزیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

انجام وفا بھی دیکھ لیا اب کس لئے سرخم ہوتا ہے

نازک ہے مزاج حسن، بہت سجدے سے بھی برہم ہوتا ہے

ان کا یہی بالواسطہ اظہار ان کی شاعری کو دیرپا اور امکانات کی سطح پر وسعت بخشتا ہے۔ شعر کا حسن اسی وجہ سے قائم ہوتا ہے کہ ان کا انداز بیان علامتی ہے جس سے ایک خصوصی کیفیت عمومی اور ایک محدود خیال بے انتہا وسیع ہو جاتا ہے۔ یہ شعر اس کی خوبصورت مثال ہے۔ انگریزوں کی منفی سیاست پر علامہ نے اپنی غزلوں میں سخت تنقید کی ایسے موقع پر ان کے یہاں طنزیہ کیفیت نمودار ہو جاتی ہے جس کا ذکر رشید احمد صدیقی نے بھی اپنے مضمون میں خصوصی طور پر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی غزلوں کا ایک خاص وصف رجائیت بھی ہے۔ ہر موقع پر وہ جوش، انقلاب، امنگ اور امید کو قائم رکھتے ہیں۔ ایسے موقع پر علامہ اقبال کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ ہر گام پر روایتی لفظیات اور مشرقی لوازمات کا خوبصورت استعمال موجود ہوتا ہے۔ علامہ نے خودی کے فلسفے کو بھی بڑی عمدگی سے اپنی غزلوں میں برتا ہے، خودی ان کے یہاں عظمت، خودداری اور خود شناسی سے عبارت ہے۔ اس طرح انسان خدا اور کائنات کے جزو میں شامل ہو جاتا ہے اور کائنات کی تخلیق و ترصیع میں اہم کردار نبھاتا ہے۔

علامہ سہیل کی شاعری کا ایک اہم موضوع فلسفۂ تصوف بھی رہا ہے۔ اس امر میں وہ کسی خاص مکتب فکر کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ عشق و محبت کی مختلف کیفیات کو اس حوالے سے برتنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں عشق کے تمام مراتب اور تعلق کے درجات الگ الگ انداز سے جلوہ نمائی کرتے ہیں۔

لاکھ گناہ گار ہوں، حسن کا راز دار ہوں عکس کمال یار ہوں، آئینۂ قصور میں

گم تھی فضائے عشق میں کل کائنات حسن اٹھا غبار قیس تو محمل نہیں رہا

ایسے مقامات پر علامہ ایک فلسفی، مفکر اور دانشور نظر آتے ہیں جن پر شاعری کے تمام تر لوازمات کی واقفیت ہونے کے ساتھ مسائل تصوف و عشق، تصور خدا اور فلسفہ کائنات کے تمام تر عقدے وا ہیں۔ مگر ان کے یہاں غزلوں میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن سے کہ غزلیہ شاعری اپنا سنگھار کرتی ہے۔ واردات عشق اور معاملات عشق میں جہاں عاشق حسن کی دلفریبیوں اور نزاکتوں پر رقص بسمل کرتا ہے، کہیں گھبراتا ہے، کہیں ڈرتا اور ہوش گنواتا ہے، کہیں اداؤں پر گھائل ہوتا ہے اور طرح طرح کے تجربوں سے گزرتا ہے۔

علامہ سہیل نے عشق ومحبت میں اضطراب اور مسلسل تڑپ کی کیفیت کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، اب یہ مسئلہ پوری زندگی کی تفسیر بھی ہے کہ دل جن چیزوں کی آماجگاہ ہے اس کے نتیجے میں تڑپ، چبھن، سوز اور زخموں کا حصول ہوتا ہے، تنہائی اور جدائی حصے میں آتی ہے اور ان کا شمار عاشق کی بیش بہا دولت میں ہوتا ہے۔

شاید حیات اسی کو کہتے ہیں کہنے والے ہوتی ہے اک چبھن سی رگ رگ میں آرزو کی
اک مشق اضطراب کا رکھا ہے نام عشق اُف بے کسی کہ وہ بھی نہیں اختیار میں

عشق کی یہی کیفیت جب اپنی انتہا کی منزلوں کو طے کرنے لگتی ہے تو عدم احساس کا مقام شروع ہو جاتا ہے اور عاشق کو ایک نئے رویے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ علامہ کا یہ شعر اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

طبیعت وحشت سے بھی مائل رم ہوتی جاتی ہے
مری وحشت ترقی پر ہے یا کم ہوتی جاتی ہے

شعر میں حرف 'شین' اور 'ت' کی تکرار ایک منفرد صوتی آہنگ قائم کرتی ہے جس سے شعر میں گونج کا صوتی حسن پیدا ہوتا ہے۔ کنفیوژن اور ابہامی رویہ نے شعر کے امکانات میں اضافہ کر دیا ہے، یہی شعر کا بنیادی حسن ہے۔

علامہ کے یہاں عشق میں سرمستی کی فضا بھی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ اس سرمستی اور سرشاری کی کیفیت کو انھوں نے الگ الگ انداز سے برتا ہے، کہیں مستی اور بے خودی دونوں جانب ہے اور کہیں یک طرفہ عاشق اس کی یاد میں خود کو اور دنیا کو بھولا ہوا ہے۔

وہ مست ناز حسن، میں سرشار آرزو وہ اختیار میں ہیں، نہ میں اختیار میں
سب غم تھے فراموش، جہاں تجھ کو کیا یاد ہر درد کی ہے مجھ کو یہی ایک دوا یاد

علامہ کی غزلوں کا ایک اہم وصف احتیاط اور اعتدال ہے۔ ایسے کئی اشعار ہیں جن میں عاشق کا رویہ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے موقع پر ایک سنجیدہ، سلجھا ہوا، سمجھ دار اور دل کے مقابلے عقل کو شامل حال رکھنے والا عاشق اپنی دلی کیفیات کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور معاملات محبت نبھاتا ہے۔ یہ امر انتہائی دلچسپ ہو جاتا اور حد درجہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے کیوں کہ عاشق کا رویہ بہت سے اندیشوں کو جنم

دیتا ہے جس میں اس دور کی سیاسی وسماجی حالات کی گونج مخفی ہے، اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ احتیاط، اعتدال، تشکیک اور کشمکش کی یہ مثال اس سے قبل الطاف حسین حالی کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

اگر چلنا تو نقشِ پا بھی لغزش سے مٹا دینا نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتہ دینا

آشوبِ اضطراب میں کھٹکا جو ہے تو یہ غم تیرا مل نہ جائے غمِ روزگار میں

لگاوٹ کا یہ فن بادِ صبا نے مجھ سے سیکھا ہے گلوں کو گدگدایا اور نہ لپٹے خارِ دامن کو

آخر الذکر دونوں اشعار میں تجربے کی پختگی اپنے عروج پر ہے، اور زندگی جینے کا فن عاشق نئے ماحول میں سیکھ چکا ہے۔ اس کا یہ تجربہ نئے دور کے چیلینجز کی وضاحت کرتا ہے جس میں عاشق کی ذمہ داری میں اضافہ ہو چکا ہے۔

علامہ سہیل کی غزلوں میں رومانی کیفیت کا بھی اظہار ملتا ہے۔ ان کے نزدیک ''محبت کا جذبہ ایک عالمگیر حقیقت ہے اور صحیح حدود کے اندر اس کی مصوری کوئی معصیت نہیں۔'' جب ہم ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو محبت کی ہر کیفیت اور معاملہ میں تہذیب وشائستگی اور آداب وحدود کا گہرا رشتہ قائم رہتا ہے۔ اس طرح سے وہ محبت کے معاملات کا ایک معیار رکھتے ہیں جہاں عاشق اپنی ارتفاعی شان کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔

دل خطاوارِ اشتیاق سہی لب گنہگارِ التجا نہ ہوا

اتنا تو ہوش ہے اسے دیوانہ کیوں کہیں جو توڑتا ہے سر تری دیوار دیکھ کر

رخِ جاناں پہ دیکھی کشمکش شرم و تبسم کی قیامت تھا نگاہِ آرزو کا گدگدا دینا

آخر الذکر شعر میں عشق کا اثر حسن پر اس طرح پڑ رہا ہے کہ حسن کی حالت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے، شعر میں متحرک منظر ہے، ایک مکمل ایکٹ ہے اور دو طرفہ تجربے کا اظہار ہے، شعر نازک ہے اور لطف سے بھرپور ہے۔ اسی قبیل کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو جہاں حسن، عشق کے اثر سے پگھلا پڑ رہا ہے اور مزید حسین ہو رہا ہے۔

نیازِ عشق نے کیا کہہ دیا ناز آفریں ہو کر جھکی پڑتی ہیں وہ مخمور آنکھیں شرمگیں ہو کر

لیکن علامہ کی غزلوں میں کچھ ایسے اشعار بھی موجود ہیں جہاں عاشق حسن کے ہر وار پر قربان

ہوتا ہے، صحرا میں آہیں بھرتا ہے اور اس کا کوئی بھی داؤ کامیاب نہیں ہوتا جیسے یہ اشعار:

کس سے ہو پھر امید کہ تار نظر مرا   خود جا کے مل گیا صف مژگان یار میں

تری نگہ کا تبسم، تری جبیں کی شکن   یہ ابتدا ہے مری اور یہ انتہا میری

مجموعی اعتبار سے یہ بات علامہ کی غزلوں پر صادق آتی ہے کہ ان کے یہاں ہوش وجنوں کے تمام رنگ موجود ہیں، وہ اپنی غزلوں میں امام وخطیب کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور انقلاب وآزادی کے نقیب بھی ہیں، وہ وادی جنوں میں رم بھی کرتے ہیں اور خانقاہ رومی واقبال میں شراب عشق بھی نوش فرماتے ہیں۔ غزل کے قدیم تہذیبی ظروف کی پاسداری بھی کرتے ہیں اور درد نہاں کے لئے حکمت کی دوا بھی بھرتے ہیں۔

اقبال سہیل کا تصورِ جمال

ڈاکٹر رشید اشرف خان☆

فلسفہ، علوم عقلیہ کا ایسا مجموعہ ہے جس میں بہت سے علوم کی شاخیں پائی جاتی ہیں مثلاً علم النفس، اخلاقیات، منطق، جمالیات، نقاشی، فنونِ لطیفہ وغیرہ۔ جمال بھی اسی فلسفہ کی ایک اہم شاخ ہے جو حسن و آرائش، دل کشی و دل آویزی، دلبری و نظر فریبی سے عبارت ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ جمالیات فلسفہ کی ایک ہمہ گیر اور کثیر المطالعہ شاخ ہے جسے انگریزی میں Aesthetics کہا جاتا ہے۔ فارسی میں اسے زیبائی شناسی اور ہندی میں رس شاستر کہتے ہیں۔ مغرب میں جمالیات کو پہلی بار روشناس کرانے کا سہرا جرمن مفکر ''بام گارٹن'' کے سر ہے جس نے ۱۷۳۵ء میں اپنا تحقیقی مقالہ Aesthetica کے عنوان سے لکھا جو ۱۷۵۰ء میں شائع ہوا۔ اس تحقیقی مقالے کی اشاعت کے بعد مغرب میں باقاعدہ طور سے ''جمالیات'' ایک علاحدہ شعبۂ علم کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں جمالیات کے حوالے سے ماہرین نے بھرت منی کی سنسکرت زبان میں لکھی گئی ''ناٹیہ شاستر'' کو ہندوستانی جمالیات کا نقش اول قرار دیا ہے۔ اس کتاب میں رس یعنی جذبہ کے ذریعے ہندوستانی جمالیات کی تاریخ بیان کی گئی ہے جب کہ اردو زبان و ادب میں جمالیات کے تعلق سے مجنوں گورکھپوری نے ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا کہ:

> ''جمالیات کی اصطلاح اردو میں آئے ہوئے پچیس تیس سال ہو چکے ہیں، پھر بھی اردو پڑھنے والوں میں ایسوں کی کافی تعداد نکلے گی جو اس اصطلاح اور اس کے مفہوم کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں، اس لئے کہ یہ اصطلاح علمی ہے اور علمی اصطلاحوں سے کسی

☆ پوسٹ ڈاکٹرل فیلو (U.G.C.) شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، موبائل: 8828282874

ملک اور کسی زبان میں بھی ہر ہزاری اور ہر بزاری مانوس نہیں ہوتا۔ اول اول ہیگل
نے اس لفظ کو فلسفۂ فنون لطیفہ کے معنوں میں استعمال کیا۔ اسی رعایت سے عربی اور
اردو میں اس کا ترجمہ جمالیات کیا گیا اور اب اس کو اردو میں قبول کر لیا گیا ہے۔"

(مقدمہ: تاریخ جمالیات باردوم ۱۹۵۹ء سرفراز قومی پریس لکھنؤ)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ جمالیات کا اطلاق براہ راست تمام فنون لطیفہ اور اس کے موضوع کا ادراک حواس خمسہ اور حسن کی ماہیت پر ہوتا ہے۔ شعر کی صحیح جمالیاتی تفہیم کے لئے قاری کا صاحب ذوق ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ ذوقِ شعری کے بغیر تفہیمِ شعر کا حق ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ جمالیات کی کما حقہ تفہیم کے لئے جذبات اور احساسات کی آنچ میں تپ کر اور ذہن کو جمالیاتی سطح سے گزار کر ہی متن کی تفہیم کے دروازے قاری پر کھلتے ہیں تبھی وہ جمالیاتی تجربے سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ خصوصاً جمالیات کے ضمن میں یہ ذہنی پختگی از حد ضروری ہے۔ جمالیات کے حوالے سے یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ جمالیاتی مطالعہ ادبی مطالعے سے کہیں زیادہ وسعت اور ہمہ گیریت کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ کہ جمالیاتی مطالعہ لفظوں کے ذریعے ظہور پذیر ہونے والے فن پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ فنون لطیفہ کے جملہ اقسام اس کے مطالعہ کے دائرۂ کار میں آتے ہیں۔ لہٰذا اسی کلیہ کے پیش نظر اس مقالے میں اقبال سہیل کے تصور جمال کو مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اطالوی مفکر کروچے (Bendetto Croce) (جو اٹلی میں نیپلز کے پاس ایک قریہ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا) نے فلسفۂ جمالیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ اظہاریت اس کے یہاں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس اظہاریت (Expressionalism) کو کروچے کے جمالیات کی اساس سمجھنا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھنا یہ چاہئے کہ شاعر یا ادیب کے اظہار فن کا انداز کیسا ہے۔

اس قول کی روشنی میں جب ہم اقبال سہیل کے کلام پر خصوصی زاویۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے یہاں اظہار جذبات و خیالات پر مکمل گرفت موجود ہے۔ اس گرفت کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ وہ اظہار کے بیشتر وسائل سے کام لیتے ہیں اور لفظ و معنی کے انتہائی دلکش ادغام سے اپنی ایک ایسی غیر معمولی شعری کائنات کے خالق بن جاتے ہیں جو ان کے وضع کردہ اصولوں کے منفرد معیار کو قائم رکھ سکے۔ ہم بڑی حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری خود اپنے ہی

وضع کردہ اصولوں کے سانچوں میں اتنی مہارت کے ساتھ ڈھلی ہے کہ وہ ہمارے سامنے فکری میلانات ور جحانات کے رنگ برنگے مرقعے پیش کردینے پر قادر ہے۔اس مضمون میں اقبال سہیل کی اس تھیوری کو سمجھنے کے لئے ان کے تصور جمال کو نقطۂ مطالعہ بنایا گیا ہے۔

اقبال سہیل کی زندگی کا تانا بانا ان کی زندگی میں ظہور پذیر ہونے والے اہم اور غیر اہم واقعات کی یکجائی (Amalgamation) یا باہمی موانست (Co-ordination) کا زائیدہ تھا۔ ممکن ہے کہ بہتوں کو اعتراض ہو کہ یہ کوئی بات نہ ہوئی، دنیا میں سبھی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ بہرحال یہ کہنا مبنی بر مبالغہ نہ ہوگا کہ اقبال سہیل محض ایک شاعر اور معمولی عقل و ہوش رکھنے والے انسان نہ تھے بلکہ غیر معمولی قوت احساس، انفرادی فکر اور مشاہدۂ کائنات کا تجزیاتی شعور رکھنے والے عبقری اور دانشور بھی تھے۔ ان کی شاعری محض اشتراکیت کا پروپیگنڈہ نہ تھی بلکہ اس میں عالمگیر واقعات وحوادث کی پرچھائیاں بھی تھیں۔ وہ نفسیات انسانی کے نباض، سائنسی ترقیوں سے باخبر، فلسفیانہ مباحث سے آشنا اور فنون لطیفہ کی لطافتوں سے بخوبی واقف تھے۔ یہی ان کی جمالیات کا محور تھا۔ یہاں پر اس بات کا ذکر غیر ضروری نہ ہوگا کہ دنیا میں جتنے بھی فنون لطیفہ ہیں وہ کم وبیش سبھی فلسفۂ جمالیات سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر قاضی عبدالستار کا یہ محاکمہ قابل توجہ ہے:

> ''جمالیات کو جب فنون لطیفہ کا فلسفہ کہا گیا ہے تو درحقیقت اس تعریف میں یہ منطق مضمر رکھی گئی ہے کہ جمالیات بھی فلسفے ہی کی طرح مختلف فنون لطیفہ کے مظاہر جمال کی قدر جمال کو جانچتا اور پرکھتا ہے۔ (جمالیات اور ہندوستانی جمالیات، ص:۹۱)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں کلیات سہیل کا مطالعہ بلاشبہ مسرت بخش اور بصیرت افروز ہے۔ بعض کم علم، جلد باز اور تنگ نظر اشخاص غزل کو ایک محدود، پسماندہ اور تنگ دامن صنف سخن سمجھتے ہیں جیسا کہ کلیم الدین احمد نے سمجھا اور سمجھایا، یا بعض نام نہاد ترقی پسندوں نے اس غلط نظریے کی تبلیغ کی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ غزل کی تثلیث (عاشق، محبوب اور رقیب) کائنات کی وسعتوں کو آشکار کرتے آئے ہیں۔ کلیات سہیل میں نظموں کے مقابلے غزلوں کی تعداد بھلے ہی کم ہیں لیکن وہ فنی لحاظ سے بہت عمدہ ہیں جو ایک سنجیدہ قاری سے اقبال سہیل کی صناعی اور فن کاری کی داد مانگتی ہیں۔ تقریباً 313 صفحات پر مشتمل کلیات سہیل میں غزلوں کے علاوہ مختصر وطویل نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان کے موضوعات الگ

الگ ہیں اور ان کا فنی اسلوب بھی ایک دوسرے سے جداگانہ ہے لیکن موج تہہ نشیں کی طرح بیشتر غزلوں اور نظموں میں جمالیاتی کیفیت قریب قریب بھی میں نمایاں ہیں۔

اقبال سہیل کی غزلیہ شاعری کا اگر غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے، تو سب سے پہلے ان کا اسلوب ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ یہ اسلوب ہی ان کے کلام کی سب سے نمایاں شناخت ہے۔ اگر ہم بغور دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جمالیاتی احساس کی وحدت ان کے اسلوب کا سب سے بڑا مظہر ہے، جو سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ معنوی اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے۔ ان کا یہی مخصوص اسلوب ہے، جو دنیا و مافیہا کے بعض اہم مسائل کو ان کے کلام میں تمام تر جزئیات کے ساتھ منعکس کرتا ہے۔ مثلاً غزل کے یہ اشعار دیکھیں:

تجودِ شوق کی رعنائیاں ہم سے کوئی پوچھے — کہ خود سنگ حرم آتا ہے مشتاق جبیں ہو کر
عجب تاثیر ہے آب و ہوائے بزم جاناں کی — فغاں بھی لب پہ آتی ہے تو شورِ آفریں ہو کر

☆

رہ جائے اگر کچھ بھی ترے غم کے سوا یاد — وہ ہوش بھی کیا ہوش ہے، وہ یاد بھی کیا یاد

☆

مجھے تو دہر کی ہر شے حسیں نظر آئی — عمومِ حسن ہے یا پرتوِ جمال نظر

محولہ بالا غزلیہ اشعار سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اقبال سہیل نے کلاسیکی روایات کے چشمۂ فیضان سے استفادہ تو ضرور کیا ہے لیکن شعری اظہاریت اور ان سے پیدا ہونے والے معنیاتی نظام خود ان کی تخلیق کردہ ہے جو نہ صرف ان کے احساس جمال کے مظہر ہیں بلکہ ان کی تخلیقیت کا یہی غیر معمولی جادوئی لمس ہے جو انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔ علاوہ ازیں تعمیر متن اور لفظیات کی ترتیب اور اس کے باہمی ربط میں بھی اقبال سہیل نے اپنی قوت مدرکہ کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار میں تجودِ شوق، سنگ حرم، مشتاق جبیں، شور آفریں، عمومِ حسن اور پرتوِ جمال وغیرہ اس قدر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور اس قدر لطیف پیرایے میں بیان ہوئے ہیں کہ معنی کا ایک سیل اپنے پورے انسلاکات کے ساتھ قاری کے باطن میں تلاطم پیدا کر دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اقبال سہیل ایک انتہائی ثقہ اور متدین باپ کے بیٹے تھے ان کے خمیر

میں شامل دینی جذبہ اور اسلامی شعار نے ان سے نعتیں بھی لکھوائیں اور وطنیت کے پر جوش ترانے بھی تخلیق کروائے۔ دین اسلام سے حقیقی وابستگی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی عقیدت کے نقوش اقبال سہیل پر اتنے گہرے تھے کہ ہمہ وقت پاکیزہ اشعار ذہن پر نازل ہوا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا جمال اقبال سہیل کو تابندہ بنا دیا کرتا تھا۔ ان کے تخلیق کردہ حمدیہ اور نعتیہ اشعار ایسے ہی ایمان افروز روشن لمحات کی یادگار ہیں۔ کلیات سہیل (مرتبہ عارف رفیع ۱۹۸۸ء) میں صفحہ ۳۳ تا ۴۷ میں حمد، نعت اور منقبتی نظمیں شامل ہیں۔ نعتیہ شاعری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ۸۶ اشعار پر مشتمل ''موج کوثر'' اقبال سہیل کا ایک ایسا تاریخ ساز کارنامہ ہے جس کی مثال اردو کی نعتیہ شاعری پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مذکورہ نعت کا ہر ہر شعر اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ اس عہد کی تمام تر جزئیات کو نہ صرف منعکس کرتا ہے بلکہ سیرت النبی کے محور پر گردش کرتا نظر آتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایک ایسی نعت ہے جو بذات خود ایک تفصیلی مضمون کا تقاضا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری میں حسن عقیدت اور جذبات، عزت و تکریم کی بیشتر کارفرمائی ہوتی ہے لیکن قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس قسم کی روایتی شاعری میں بھی اقبال سہیل نے محاسن شعری علی الخصوص تذکرۂ جمال کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ یقیناً ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ مثال کے طور پر واقعۂ معراج کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

براق و جبرئیل آخر کے سدرہ کی منزل پر — کہ تھی یہ انتہائے سرحد اقلیم امکانی
یہاں سے لے چلیں پھر آپ کو موجیں تجلی کی — وہ رفرف ہو کہ انوارِ ازل کا جوشِ فیضانی
جوارِ عرش میں دیکھا یہاں صدیق اکبر کو — تماشائے جمالِ لم یزل میں محو حیرانی

بظاہر نعت نبی سے متصف مذکورہ اشعار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد و ثنا کے مظہر ہیں لیکن معبود حقیقی میں پائی جانے والی ''جمالیت'' کے افسانہ خواں بھی ہیں۔ جمالیات کا بنیادی تقاضہ یہی ہے کہ کسی کے حسن کی خصوصیات کو اپنی نگاہوں، اپنی حس پسندیدگی اور قلب مصفی کے ذریعے اپنی زندگی کا نہ صرف ایک جزو بنالے بلکہ اس کے سہارے انجذاب جمال کائنات کے دیگر مواقع بھی تلاش کرے اور یہ ایک سچے شاعر کے لئے اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ اقبال سہیل کی طرح نگاہ نکتہ شناس اور قلب مطہر کا مالک ہوگا وہ اس جلوۂ جمال کامل پر قربان ہو جائے تب کہیں اسے عشق حقیقی کا وجدان ہوگا۔

اقبال سہیل کی حیات مطالعہ کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی

زندگی کا کم وبیش ہر گوشہ اور ہر پہلو عشق حقیقی سے معمور ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک صاحب ایمان شاعر کی اپنی داخلی کیفیات کو عقیدہ اور عاقبت دونوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر حضور کی سیرت طیبہ کو شعری جامہ پہنایا ہے اور تخیلات کی سنگلاخ زمینوں میں خیال کی پاکیزگی، جذبہ ایمانی کی حرارت اور احساس کی تمازت سے ایک ایسی روح پرور فضا تشکیل کی ہے جو اقبال سہیل کے مشاہدۂ جمال یعنی ان کے قلب وحواس کا سرچشمہ ہے۔ اقبال سہیل کی نعتیہ شاعری کے ضمن میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ''اسلامی انقلابات نے بھی ان کے بسازِ طبع پر مضراب کا کام دیا، ذات پاک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ان کی سچی عقیدت ان کی شاعری کے جسم کی روح ہے، وہ سچے ''سنی شاعر'' ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کی منقبت میں ان کا کلام نہایت موثر اور ایمان پرور ہے۔''
>
> (کلیات سہیل، ص: ۸)

اقبال سہیل کی غزلیہ اور نعتیہ شاعری کے علاوہ ان کی نظموں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف ہندوستان کی تاریخ اُسطور کو پڑھا ہے اور نہ صرف عہد مغلیہ وشاہان دکن کے زمانوں کو سمجھا ہے بلکہ امرت منتھن کی طرح اس بحرِ ذخار سے نورِ جمالیات کی بازیافت بھی کی ہے۔ ایک دانشور شاعر کا یہی کمالِ فن سمجھا جاتا ہے کہ وہ معمولی سے معمولی اور قدیم سے قدیم تر معاملات، واقعات اور سانحات کو بخوبی سمجھ کر اور اپنی شخصیت میں جذب کر کے ایک نئی تصویر بنا لے۔ درحقیقت یہی مقتضائے فن کاری اور روحِ جمالیات ہے۔ اقبال سہیل کی نظم نگاری کے ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کلیات سہیل میں شامل نظمیں زیادہ تر تاثراتی یا شخصی ہیں لیکن اس کے باوجود اس میں شاعر کے جذبات کا ردعمل، باطنی تحرکات کی وحدت، فن پر حاکمانہ قدرت اور تخلیقیت کا جادوئی لمس ہے جو قاری کو جمالیاتی جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ ایسے ہی مختلف النوع تجربوں کی مدد سے اقبال سہیل نے ایک دلفریب اور لذت آمیز فضا خلق کی ہے، جس کی تخلیق میں انھوں نے نئی زبان اور نئی ترکیبیں وضع کی ہیں خواہ وہ کلاسیکی روایات سے مستعار ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک بڑے شاعر کا یہ تجربہ، حیرت واستعجاب کی مٹی سے پھوٹتا ہے اور مسرت آگیں حیرت اور مسرت آمیز استعجاب پیدا کرتا ہوا ایک متحرک مجسمہ بن کر ایک نئی لذت اور

سرمدی سے روشناس کراتا ہے۔ مثال کے طور پر نظم ''جگنو'' کے یہ اشعار ملاحظہ کریں:

اے شرارِ مضطرب، اے برقِ بے تاب زمیں — شمعِ کنجِ گلستاں، روشن دلِ صحرا نشیں

سچ بتا اے شعلۂ احساس کیوں ہے بے قرار — کس کی شمعِ حسن پر مرتا ہے تو پروانہ وار

ابلق ایام کا بے شک تو نور العین ہے — نور و ظلمت، روز و شب کا مجمع البحرین ہے

مذکورہ بالا اشعار شاعر کے احساس جمال کی صاف صاف نشان دہی کرتے ہیں اور ہمیں بتاتے ہیں کہ محض اپنی قوت تخیل اور انتخاب لفظیات سے اگر شاعر چاہے تو پیکر تراشی کر کے شعر میں محاکاتی کیفیت پیش کرسکتا ہے۔ یہ خوبی ہر شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی بلکہ صرف اقبال سہیل جیسے فن کاروں کا حصہ ہے جو مبدأ فیض سے یہ صفت لے کر دنیا میں آئے تھے۔

اقبال سہیل کی دیگر نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسانی نفسیات سے ان کی واقفیت اور سماج میں بدلتی ہوئی جمالیاتی قدروں کے زیر اثر انسانی نفسیات میں ہونے والے تغیر و تبدل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ وہ انسانی عمل اور ردعمل کا اظہار اس انداز سے کرتے تھے جو فطرت سے بعید نہیں ہوتا، اسی لئے ان کی نظموں میں تصنع اور بناوٹ کے بجائے حسی ادراک واضح طور پر نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں اقبال سہیل نے نظمیہ شاعری کے ذیل میں سماجی وسیاسی موضوعات پر جو نظمیں کہی ہیں وہ متن کے اعتبار سے کسی نہ کسی حد تک قاری کے جذبات کو مہمیز کرنے میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ یہ نظمیں اقبال سہیل کو ایک ایسے شاعر کے طور پر پیش بھی کرتی ہیں جو شاعری کے ذریعے سماج کی صالح اقدار کو پروان چڑھانے میں یقین رکھتا ہے۔ اقبال سہیل کی نظموں میں ان کی شخصیت ایک ایسے شخص کے طور پر ابھر کر آتی ہے جس کے سینے میں ایک دردمند دل اور کلام میں قوت شفا ہے۔ جو اپنے گرد و اطراف کی دنیا کو پر امن اور حسین وجمیل بنانے کی کوششوں میں منہمک ہے۔

مختصر یہ کہ کلیات سہیل کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے وقت قاری کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے مقام پر عجیب و غریب ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے تمثال گری (Visualisation) کے جس ہنر کے ساتھ اپنے سخنوری کے جوہر دکھائے ہیں وہ ان کی مسلسل جمالیاتی ریاضت کے نتیجہ میں نقطۂ کمال تک پہنچ گئے ہیں اور شاعر نے اپنا وہ رنگ بالآخر پا ہی لیا ہے جس کا وہ متلاشی تھا۔ یہ مجموعہ اپنے قاری پر یہ راز افشا کرتا ہے کہ اب شاعر نے ساتوں آسمانوں میں

بکھری ہوئی ساری آفاقیت کو اپنے شعور جمال کی مدد سے شعری استعارہ بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ خاک، ہوا، چاند، سورج، ستارے، شفق، قوسِ قزح، بادل، برق باراں، شبنم اور کہکشاں، غرض کہ تمام اجرام فلکی کے حوالے بار بار ان کے اشعار میں ملتے ہیں اور ہر بار نئے مفاہیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اقبال سہیل نے اپنے وسیع مطالعۂ فطرت سے جمالیاتی شعور کی بازیافت کی ہے۔ مطالعۂ فطرت اور جمالیاتی فکر کے ضمن میں پروفیسر ثریا حسین نے لکھا ہے کہ:

> ''جمالیاتی تجربے میں ادراک حسی اور ذہنی عمل کے مابین قوت متخیلہ کا تعاون شامل ہوتا ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اس پر غور وخوض کرنے سے فن وجود میں آتا ہے اور فنی حسن کے تاثر وفکر سے جمالیات جنم لیتی ہے۔''
>
> (جمالیات شرق وغرب، ص:۱۱۰)

موجودہ زمانے کے بدمذاق ماحول اور تہذیبی وتمدنی زوال کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اقبال سہیل کی شاعری فانی کی غزل یا میر انیس کا مرثیہ بن جاتی لیکن ان کی جمال آشنا فکر نے یہاں بھی ایک نئے انداز کی شان دکھائی ہے۔ نئی تشبیہات، جدید ترین علامات واستعارات، خودساختہ الفاظ اور تازہ بہ تازہ شعری اصطلاحات کے نئے طرز احساس نے ان کی شاعری کو جو اچھوتا آہنگ بخشا اس میں میر وغالب کی شعری روایت بھی موجود ہے اور وہ روایت بھی جو شاعری کے نئے اور پائیدار معیار بھی قائم کرتی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں اقبال سہیل کی جملہ شعری تخلیقات کا معروضی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر کے ان کے فن کو جمالیات کی کسوٹی پر کسنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔

اقبال سہیل غزل شکنی سے غزل پرستی تک

ڈاکٹر شاہ نواز عالم☆

انگریزوں کی غلامی کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں پر دو مصیبتیں نازل ہوئیں۔ پہلی تو فرنگیوں کی پیدا کردہ تھی جس کے تحت انگریز ہمیں مہذب بنانے میں ہمہ تن مصروف رہے، اور دوسری مصیبت یہ نازل ہوئی کہ صدیوں کی غلامی کی وجہ سے ہمیں اپنی تہذیب کمتر لگنے لگی اور مغربی تہذیب سے آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اور ہم اپنی تہذیب کے شکست کو ماتم کے بجائے جشن کا رنگ دینے میں مصروف ہوگئے۔ ایسا صرف ہندوستان ہی میں نہیں ہوا بلکہ یورپ بھی اس کا شکار ہو چکا تھا۔ (Charles Baudelair) چارلس بودیلیئر (۱۸۶۷-۱۸۲۱) نے اپنی کتاب 'The flower of Evil-1857 (Les Fleurs dumai) بدی کے پھول" کے دیباچے میں لکھا ہے:

''فرانس ابتذال کے دور سے گزر رہا ہے۔ پیرس بین الاقوامی حماقت کا سرچشمہ ہے۔''

(The flower of Evil, Translated by George Dillan' Page no.6)

یورپ نے تو اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کے لئے احتجاج بلند کیا لیکن ہم ہندوستانی یورپ کے ان دانشوروں کی آواز نہ بن سکے کہ انگریز جس تہذیب کا تحفہ لائے ہیں یورپ میں اس کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ فتح محمد ملک نئی شاعری اور جدید شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کیا عجیب بات نہیں کہ جس زمانہ میں مولانا حالی اردو شاعروں کو ایسی شاعری کرنے کی تلقین فرما رہے تھے جو ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے مفید ہو اسی زمانے میں چارلس بودیلیئر اپنا مجموعہ کلام پبلشر کو سونپتے ہوئے کہہ رہا تھا ''یہ کتاب بیویوں اور بہنوں کے لئے ہرگز نہیں ہے۔'' (دیباچہ بدی کے پھول)

☆۱۵۶ روصی آباد، نوراللہ روڈ، الہ آباد ۳۔ موبائل نمبر ۹۳۳۵۵۲۸۷۲۸۔

(نئی شاعری اور جدید شاعری از فتح محمد ملک، فنون لاہور، جلد۲، شمارہ نمبرا، اپریل ۱۹۶۳ء، ص:۵۳)

مولانا حالی اور چارلس بودیلیئر کے اندازِ فکر کے اس حیرت انگیز تضاد ہی سے آج کی شاعری کا المیہ شروع ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے شاعری میں اصلاح کی جو تحریک شروع کی تھی اولاً وہ ایک سیاسی تحریک تھی شاعری سے اس کا تعلق ثانوی بلکہ ضمنی تھا۔ شاعری کو خالص سیاسی مقاصد کے حصول کا آلہ کار بنا کر مولانا حالی نے قوم کی زبوں حالی کو دور کرنے کا جو کارنامہ سرانجام دیا تھا اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن انھوں نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں ملٹن کارلائل اور مختلف مغربی مفکرین کے عینک سے شعر، شاعر اور شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ قصیدہ اور غزل جیسی اصناف سخن کی مخالفت کی، یہ سب حکومت وقت کی سیاسی مصلحتوں کا شکار تھی۔ مولانا آزاد اور حالی نے انگریزی ادب سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کے لیے زمین ہموار نہیں کی تھی بلکہ انگریز حاکموں کی واضح ہدایات کے تحت ان بزرگوں کو اردو شاعری کی جاندار سرچشموں سے علاحدہ کرنے کی کوششیں کرنا پڑی تھیں۔ نیچرل شاعری کے سب سے پہلے مشاعرے میں مولانا آزاد نے جو تقریر کی تھی وہ آزاد کی نہیں کرنل ہالرائیڈ کی تھی۔ اس تقریر سے پہلے کرنل ہالرائیڈ نے آزاد کے نام ۲۶ نومبر ۱۸۷۴ء کو جو طویل خط لکھا تھا آزاد کی تقریر کے سارے خیالات اس سے ماخوذ ہیں۔ اس خط کی پس نوشت قابل غور ہے۔

"ہمیں یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کی چلائی ہوئی اردو شاعری میں اصلاح کی تحریک روز بروز زیادہ کامیاب ہوتی جارہی ہے۔"

اردو شاعری کی یہ اصلاحی تحریک آزاد، حالی سے عظمت اللہ خاں تک پہنچتے پہنچتے واضح طور پر انگریزوں کی بدلتی ہوئی سیاسی مصلحتوں کے تحت اپنے مقاصد میں تبدیلیاں کرتی جاتی ہیں۔ اصل میں اس عہد میں انگریز مسلمانوں کی باغیانہ سرگرمیوں سے خائف تھا۔ اس زمانے میں انگریزوں کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ اردو شاعر اور اس کا قاری ہم عصر زندگی کو بے نقاب نہ دیکھنے پائے اگر شاعر ہم عصر زندگی کے موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنائے گا تو تباہی، ذلت اور بے اطمینانی کے مظاہر اس کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔ ظاہر ہے ایسی شاعری انگریزوں کے سیاسی استحکام کے لئے خطرہ تھی۔ چنانچہ آزاد نے بتایا کہ:

"اے میرے عزیز دوستو! شاعری تو وہ ہے جو نیچرل ہو۔ اور نیچرل شاعری وہ ہے جس میں

مظاہر فطرت کے بارے میں منظوم تاثرات پیش کیے جائیں۔"

مولانا آزاد اور حالی صرف شاعری کے مواد پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے جو تنقیدی نظریات پیش کیے ہیں وہ حالی کے اس شعر میں سمٹ آئے ہیں:

حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں بس اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

آزاد اور حالی کی تنقیدی نظریات کے زیر اثر جس قسم کی شاعری پروان چڑھی اس میں ہم پیرویٔ مغرب کی پہلی منزل پر پہنچتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں کی شاعری اور تنقید پیرویٔ مغرب کی دوسری اور زیادہ خطرناک منزل ہے۔ سریلے بول کے شروع میں انھوں نے 'شاعری' عنوان سے ایک طویل مضمون شامل کیا ہے اس میں وہ انگریزوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں تاج برطانیہ کی حکومت نے ہندوستان کو بدامنی کے ڈراونے خواب سے نجات دی تو تعلیم کی بنیاد ڈالی۔"

(مقدمہ: سریلے بول از عظمت اللہ خاں)

عظمت اللہ خاں کی تنقیدی بصیرت ہمیں بتاتی ہے کہ اردو شاعری کے سارے عیوب کی جڑ انگریزوں کی آمد سے پہلے کی نظام تعلیم ہے۔ عظمت اللہ خاں کا پسندیدہ نظام تعلیم ہمیں تنقید اور گیت کے تحفے دیتا ہے۔ وہ جن تنقیدی نظریات سے روشناس کراتے ہیں ان میں اردو شاعری کو غزل اور قافیہ کے استبداد سے نجات دلانا اور نظام عروض کو عربی کے بجائے پنگل کی بنیادوں پر قائم کرنا زیادہ اہم ہے۔ ان کے خیال میں اردو شاعری کو اسلامی روایات سے الگ کرکے آریائی بود و باش و ینا وقت کا سب سے اہم ادبی مسئلہ ہے۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر نیچرل شاعری کی تحریک ہو یا جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریک' یہ سب تحریکیں مغربی ادب کے زیر اثر پیدا ہوئیں۔ اور دم توڑ گئیں۔ ان تحریکوں سے جو اردو ادب کو فائدہ ہوا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اردو ادب کی جو اصل روح تھی وہ کہیں گم سی ہو کے رہ گئی۔ آزاد کی نیچرل شاعری، حالی کا مقدمہ اور عظمت اللہ خاں کی روش نے اردو ادب میں ایک طوفان برپا کردیا۔ گیت، نظم اور تنقید جو اردو ادب میں ضمنی حیثیت رکھتے تھے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کرگیا۔ غزل کی ریزہ خیالی کے خلاف نعرہ بلند ہونے لگا۔

غزل کی مخالفت کی شروعات حالی سے ہوئی اور عظمت اللہ خاں تک آتے آتے گردن زدنی کی نوبت آگئی۔ پھر بعد کو جوش ملیح آبادی، اقبال سہیل اور کلیم الدین احمد نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ اقبال سہیل کا ایک مضمون انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی کا علمی و ادبی سالنامہ سہیل جنوری ۱۹۳۶ء میں ''غزل گوئی پر ایک نظر'' عنوان سے ملتا ہے۔ 'سہیل' کا یہ شمارہ پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔ جس میں غزل گوئی پر مضمون کے ساتھ ساتھ اقبال سہیل کی ''تجلیات' عنوان کے تحت ایک نظم صفحہ نمبر ۲۲۹ر اور ایک غزل صفحہ نمبر ۲۴۶ر شامل ہے۔ اس کے مرتب رشید احمد صدیقی اور معاون مرتب آل احمد سرور ہیں۔ اس مضمون میں اقبال سہیل نے غزل کی مختلف برائیاں گنانے کے بعد لکھا ہے کہ:

''غزل گوئی نے تو اردو ادب کو وہ عظیم نقصان پہنچایا جس کی تلافی صدیوں میں ممکن نہیں۔ ایک طرف تو اس غزل گوئی کی بدولت روز بروز ایک نحیف اور گندے لٹریچر کا انبار لگتا جاتا ہے اور تخریب اخلاق کے لئے جو اسباب موجود تھے ان پر ایک مزید محرک کا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دوسری جانب قوم کے بہت سے افراد جن کو قدرت نے شاعر پیدا نہیں کیا تھا محض موزوں طبعی کے دھوکے میں اپنے آپ کو فطری شاعر سمجھ کر وقت ایسی قیمتی چیز کو شاعری جیسے بیکار شغل میں ضائع کر رہے ہیں۔ کاش یہی وقت کسی تصنیف و تالیف یا دوسرے کارآمد اور مفید شغل میں صرف ہوتا۔'' (ص:۱۲۲)

وہ آگے لکھتے ہیں:

''جس طرح تیز مرچوں کا عادی سادہ اور لطیف غذائیں پسند نہیں کرتا اور افیونی کو چسکی لئے بغیر چین نہیں پڑتا، اسی طرح ہمارے سخن فہم حضرات جو بیدل و غالب کے دلدادہ ہیں ان کو سادہ اور لطیف نظموں میں مزہ نہیں آتا اور غزل جیسی ادنی ترین صنفِ نظم کو کمال شاعری قرار دیتے ہیں۔'' (ص:۱۲۴)

یا یہ کہ:

> ''گذشتہ چار صدیوں کے اندر غزلوں کا جو دفتر بے پایاں اردو اور فارسی میں جمع ہوگیا ہے، ان کا ۹۹ فیصد حصہ غرقِ مئے ناب کر دیئے جانے کا مستحق ہے۔'' (بحوالہ شوکت سلطان علی حماد عباسی، افکارِ سہیل، شبلی نیشنل کالج میگزین، ۱۹۵۷ء ص ۲۱۳)

اقبال سہیل کی مخالفت ریزہ خیالی سے کم، طرحی مشاعروں سے زیادہ ہے کیوں کہ وہ اپنے

مضامین میں غزل کے جس پہلو کی مخالفت کرتے ہیں ان کی غزلوں میں وہ تمام جز شامل ہیں وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

"اس تمہید کا یہ مقصد نہیں کہ میرے نزدیک غزل یک لخت قابل ترک چیز ہے، مقصد صرف اس قدر ہے کہ طرحی مشاعروں کو قطعاً بند کر دینا چاہئے اور غزلیں اگر کہی جائیں تو اس طرح کہ یا تو کوئی مکمل خیال پیش نظر رکھ کر ایک مسلسل غزل کہی جائے۔" (افکار سہیل ص ۲۰۷،۲۰۶ مندرجہ بالا حوالہ)

اقبال سہیل کو صنف غزل سے براہِ راست کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ اس میں برتے گئے مضامین سے تھی اور جوش، کلیم الدین احمد کی طرح غزل کی ریزہ خیالی کی وجہ سے مخالفت کرتے ہیں لیکن ان کو اس صنف سے جذباتی لگاؤ بھی ہے اور وہ اپنی غزل گوئی پر ناز کرتے ہیں۔ تعلّی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہر حرف حقائق کا دفتر، ہر لفظ معانی کا جوہر ہے تیری غزل یا سلک گہر اقبال یگانہ کیا کہیے

☆

دبیرِ چرخ بھی سنتا جو یہ غزل تو سہیل نثار جنبش کلک گہر فشاں ہوتا

☆

یہ ادنیٰ فیض ہے اقبال کی آتش نوائی کا فروغ معنیٔ روشن سے محفل جگمگا دینا

خیر! اقبال سہیل نے غزلیں کہیں اور غزل کی تمام آرائش وزیبائش کے ساتھ ان کا ادبی سفر چھ سات سال کی قلیل عمر سے شروع ہوتا ہے، ہر اردو شاعر کی طرح اقبال سہیل نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی، غزلیہ شاعری ان کے ماحول میں رچی بسی تھی۔ لیکن اقبال سہیل کو غزل کی ریزہ خیالی پسند نہیں آئی اور وہ نظمیہ شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے، حالانکہ ان کی غزلیہ شاعری فنی اعتبار سے اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ ان کی کلیات میں کل ۴۷ غزلیں ہیں اور زیادہ تر مسلسل۔ ۴۷ غزلوں میں مقطع کی روایت سے انحراف کیا گیا ہے۔ 'تابش سہیل' میں غزلوں کی تعداد ۵۵ ہے۔ ان کی دستیاب شدہ غزلوں میں پہلی غزل ۱۹۱۷ء اور آخری غزل ۱۹۵۰ء کی ملتی ہے۔ ۱۹۱۷ء سے پہلے کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ 'تابش سہیل' میں افتخار اعظمی نے ان کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک پہلا اور

۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۰ء تک دوسرا دور۔

ان کے پہلے دور کی غزلوں میں صوفیانہ اور عشقیہ رنگ غالب ہے۔ اقبال سہیل کی یہ غزلیں اردو غزلوں کی روایت میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہیں دوسرے دور کی غزلوں میں سیاسی افکار کی کثرت ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس میں عملی طور پر شامل ہو گئے تھے۔ ان کی زیادہ تر غزلیں کسی خاص مقصد کے لئے لکھی گئی تھیں۔ جس میں سیاسی رمزیت پائی جاتی ہے اور طنزیہ پہلو شعوری طور پر برتے گئے ہیں۔ اقبال سہیل کی غزلوں میں ہمیں منظر نگاری، جذبات نگاری اور کہیں کہیں کردار نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ یہی ان کے نظموں کی بھی خصوصیات ہیں۔

غزل چونکہ رمز و ایما کی شاعری ہے اس لئے اس میں تاریخی، سیاسی اور سماجی واقعات اس طرح ضم ہو جاتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا۔ غزل کی معنوی تہہ داری اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اقبال سہیل کی غزل بھی اسی خصوصیت کی حامل ہے۔ ان کی غزلیں ایک طرف تو اپنے دور کی سیاسی، سماجی اور جنگ آزادی کی نمائندگی کرتی ہے تو دوسری طرف روایت سے بھی گہری وابستگی رکھتی ہے۔ ایک زاویے سے دیکھا جائے تو فرنگیوں کو ہدف ملامت بناتی ہے اور دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو محبوب کا شکوہ شکایت کرتی ہوئی معلوم پڑتی ہے۔ چمن، آشیاں، بلبل، صیاد، باغ، جنگل، گل، گلچیں، قفس، ساقی، میکدہ، رند، اغیار، واعظ اور محتسب وغیرہ استعارے و علامات کو وطن، آزادی، غلامی اور انگریز کے پس منظر میں استعمال کیا ہے اور پیمانِ وفا کی آڑ میں انھوں نے انگریزی حکومت کو نشانہ بنایا ہے۔ استعاروں اور علامتوں کی مدد سے انھوں نے نئے مفاہیم پیدا کئے ہیں۔ ان کا انداز بیان تغزل میں اس قدر رچا بسا ہے کہ ان کی سیاسی رمزیت کو عام عاشقانہ جذبات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس کے علاوہ تحریکِ آزادی، زبان بندی اور مجاہدین آزادی کی صعوبتوں کا ذکر انھوں نے اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے، اسیرِ غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہے باغباں نے، تو آئے گلچیں بھی لوٹ جائے

☆

صیاد اب قفس سے ڈراتا ہے کیا مجھے تیرے کرم سے شکل وہی آشیاں کی ہے

☆

الٰہی خیر کہ صیاد لے کے دستۂ گل　　چلا ہے آج سجانے کو آشیاں اپنا

☆

کریں آزاد پھر دیکھیں ہمارا جوشِ جاں بازی　　ستم کش بھی، ستم گر کی کہیں امداد کرتا ہے

انھیں حق ہے لٹائیں شام کو، لوٹیں فلسطیں کو　　مگر کیوں جرمنی، پولینڈ کو برباد کرتا ہے

☆

قفس میں دیتے ہو کیا طعن سستِ پروازی　　فضا کھلی ہوئی ملتی تو امتحاں ہوتا

☆

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا　　ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

☆

وہ چشم فتنہ گر ہے ساقیِ میخانہ برسوں سے　　کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

مندرجہ بالا اشعار کو مدنظر رکھ کر ہی رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''اردو شاعری کو سیاسی نظمیں شبلی اور ظفر علی خاں نے دیں، لیکن غزل میں سیاسی طنز کے نوک و نشتر سہیل کا عطیہ ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی غزلوں میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔ سہیل میں یہ بات شبلی سے آئی لیکن نشتریت کا التزام ارادی اور شعوری طور پر جتنا سہیل کے یہاں ہے اتنا نہ شبلی کے یہاں ہے نہ محمد علی جوہر یا حسرت کے یہاں۔۔۔ غزل گوئی کو بھی اور روایتی طنز سے نکال کر سیاسی طرز سے اس طرح آشنا کرانا کہ غزل اور طنز دونوں کا حق ادا ہو جائے، سہیل کا بڑا اہم اور قابل قدر کارنامہ ہے۔ اس رنگ میں ان کا ہمسر اب تک نظر نہ آیا۔'' (بحوالہ اقبال سہیل کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ از صدف پرویز، ص ۱۰۷، عرشیہ پبلیکیشن، ۲۰۱۷ء)

رشید احمد صدیقی کے اس اقتباس اور اقبال سہیل کے اشعار سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ اقبال سہیل کی غزلیں اپنے دور کی سیاست، سماج اور تحریک آزادی کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ انھوں نے غزل کے دائرے میں رہتے ہوئے ان موضوعات کو سمویا ہے۔ ان کی غزلیں ایک طرف انگریزوں

کو ہدف بناتی ہیں تو دوسری جانب دیکھنے میں لگتا ہے کہ محبوب سے شکوہ وشکایت ہے۔

اقبال سہیل کے عہد میں مذہبی تفریق زوروں پر تھی۔ انگریز 'بانٹو اور حکومت کرو' کی پالیسی پر عمل کرر ہے تھے۔ ہندو مسلمان کو آپس میں لڑار ہے تھے جب کہ اقبال سہیل اتحاد اور انسان دوستی کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے تھے۔ کعبہ و بت خانہ، زنار و تسبیح، ناقوس و اذاں، شیخ و برہمن کی تفریق مٹا دینا چاہتے تھے۔ چند اشعار اسی ضمن میں ملاحظہ فرمائیں:

مل جل کے برنگِ شیر و شکر، دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے

کوئی دیر و حرم تک یہ میری فریاد پہنچا دے
وہ شیخ و برہمن کیا جو نہ رہ سکتے ہوں انساں بھی

وہ چشم فتنہ گر ہے ساقیِ میخانہ برسوں سے
کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

اسی سنگم کے دو دھارے ہیں ہندو بھی مسلماں بھی
گلے مل مل کے روئے بھی ہوئے دست و گریباں بھی

اقبال سہیل کے کلام میں فلسفہ حیات و ممات سے متعلق بھی بہت سارے اشعار ہیں۔ زندگی کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے، انسان کی پیدائش کیوں ہوئی، روح کا جسم سے کیا تعلق ہے، موت کیا ہے، ان تمام موضوعات پر اقبال سہیل کے یہاں اشعار مل جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اٹھی تھی بحرِ حسن سے ایک موج بے قرار　　فطرت نے اس کو پیکرِ انساں بنا دیا

☆

بس اتنی کائنات ہے حیاتِ مستعار کی　　شباب ہے حباب کا، بہار ہے شرار کی

☆

منصور جو ہوتا اہلِ نظر، تو دعویٰ باطل کیوں کرتا
اس کی تو زباں کھلتے ہی نہیں جو راز کا محرم ہوتا ہے

اقبال سہیل کی غزلوں میں جابجا اسرار و معارف سے متعلق اشعار بھی نظر آتے ہیں جس میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں نظریات سے مطابقت رکھتے ہوئے اشعار مل جاتے ہیں۔ **من عرفہ نفسہ، فمن عرفہ ربہ،** (جس نے خود کو پہچان لیا گویا اس نے خدا کو پہچان لیا) کو دیکھئے کس طرح شعری جامہ پہنایا ہے:

مری نگاہ کا پردہ ہے خود مری ہستی ۔۔۔ وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا تو رازداں ہوتا

(وحدت الوجود)

تصوف کے متعلق دو شعر اور ملاحظہ فرمائیں:

کیا ایک میں ہی میں ہوں، اس آئینہ خانہ میں ۔۔۔ مجھ کو تو کشفِ راز نے حیران بنا دیا

(وحدت الوجود)

جلوہ تیرا وہی سہی، شانِ شہود ہے جدا ۔۔۔ فرق ہے عرش و فرش کا وادئ قلب و طور میں

(وحدت الشہود)

اقبال سہیل کے یہاں عشقیہ شاعری بہت کم ہے کیوں کہ انھوں نے عشق کو اپنی شاعری کا مقصد نہیں بنایا۔ لیکن ان کے یہاں جو عشقیہ عناصر ہیں ان میں کہیں بھی فحش و عریانیت نہیں ہے۔ اقبال سہیل عشق کے اعلیٰ خیالات و جذبات کو ہی معیاری شاعری کا جزو سمجھتے ہیں۔ ہوس پرستی اور معاملہ بندی ان کے یہاں نہیں ہے۔ عشقیہ جذبات کو قلم بند کرتے وقت بھی خودداری، عزتِ نفس اور حمیت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ عشقیہ مضامین میں غالب کے اثرات نمایاں ہیں:

جدا ہے سب سے رسم و راہ حسن کے دیار کی ۔۔۔ نہ قول اعتماد کا، نہ بات اعتبار کی

☆

زخموں کی لب فریاد ملے، خودداریٔ غم کی داد ملے ۔۔۔ دنیائے محبت میں یہ بھی، ہوتا ہے مگر کم ہوتا ہے

☆

سن نہ کلیم کی طرح، حسن کی لن ترانیاں ۔۔۔ حرمتِ عشق کی قسم، عشق کو ملتجی نہ دیکھ

☆

دل بے مدعا دینا، لب بے التجا دینا　　میں تجھ سے کیا کہوں اے فیض فطرت مجھ کو کیا دینا

اقبال سہیل، مرزا غالب اور علامہ اقبال سے بیحد متاثر تھے۔ ان کے کلام میں غالب اور اقبال دونوں کے فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ غالب کا اعتراف انھوں نے اس شعر سے کیا ہے:

مری چشم بصیرت کھول دی، اس کی بشارت نے
الٰہی نور سے معمور کر، غالب کے مدفن کو

غالب کے رنگ میں اور سیاق وسباق میں ان کے بہت سے اشعار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

(اقبال سہیل)

آخر کلیم سُنی پڑیں لن ترانیاں
اب بھی کہو گے عجز گدایا نہ چاہیے

اگر چلنا تو نقشِ پا بھی لغزش سے مٹا دینا
نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتہ دینا

اب ضبط شوق کا متحمل نہیں رہا
دل جلوہ گاہ حسن کے قابل نہیں رہا

(مرزا غالبؔ)

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

اقبال سہیل، علامہ اقبال سے بہت متاثر ہیں۔ خاص طور سے خطیبانہ اندازِ بیان، جہد و عمل وغیرہ سے۔ ایک ہی سیاق و سباق میں دونوں حضرات کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

(علامہ اقبالؔ)

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

آج بھی ہو جو ابراہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

(اقبال سہیلؔ)

شیر و شہباز کا اعزاز کہاں سب کو نصیب
ناصح آساں نہیں قابلِ زنداں ہونا

اے سوزِ ناتمام! کہاں جائے اب خلیل
آتش کدے کو بھی تو گلستاں بنا دیا

پہلے پیدا تو کر آتش کدۂ شوقِ خلیل
آج بھی سہل ہے شعلوں کا گلستاں ہونا

ان سب کے علاوہ اقبال سہیل کی غزلوں میں مادی زندگی اور ہم عصر سماجی نظام میں موجود

خباثتوں، بے انصافیوں اور استحصال کی، اکثر مقامات پر نشاندہی ملتی ہے۔ اور ان مسائل کو پیش کرتے ہوئے کسی ایک جگہ بھی انھوں نے غزل کی روایت کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ ہر غزل کی روایت کا رچا ہوا انداز ان کی غزلوں میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر صدف پرویز اپنی کتاب 'اقبال سہیل کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ' صفحہ نمبر ۱۳۲، سن ۲۰۱۷ء، میں لکھتی ہیں کہ:

''اقبال سہیل کی غزلیں گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ تغزل کی رعنائیوں سے بھرپور ہیں۔ انھوں نے اپنے زیادہ تر اشعار میں ملک کی سیاسی رفتار کا تجزیہ کیا ہے، اس کی خوبیاں ابھاریں، نوجوانوں کو للکارا ــــــ ان کے یہاں غلامی کا احساس اور آزادی کے لئے جو امنگ ملتی ہے اردو کی سیاسی شاعری میں ایک اہم مقام کا متقاضی ہے۔''

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اقبال سہیل کے یہاں کلاسیکی غزل کی علامتیں اور استعارے بعض خفیف سی تبدیلیوں کے ساتھ ایک معنوی نفسیاتی اور لفظیاتی دنیا بساتے ہیں جن سے سیاسی رمزیت میں ڈوبی ہوئی جدید غزل کو ہم عصری صداقتوں کا پیکر بنا دیا ہے۔ اردو زبان و ادب اور تہذیب سے محبت قوم پرستی اور حب الوطنی ان کے کردار کا قابل قدر حصہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں عہد حاضر کی روح بھی موجود ہے اور گہرا سماجی شعور بھی اور یہ سب ان کے یہاں غزل کی روایت کا حصہ بن کر آتے ہیں۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ جو انھیں دوسرے ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

اقبال سہیل کا تصور حب الوطنی اور قومی یکجہتی

ڈاکٹر محمد زبیر☆

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جو اپنی متنوع خصوصیات کی بنا پر دنیا کے دیگر ممالک سے مختلف و منفرد ہے۔ یہاں ابتدا ہی سے مختلف قوموں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ قومیں وقتاً فوقتاً ہندوستان آئیں اور یہاں کی خوشگوار فضا، جغرافیائی ماحول، زرخیز زمین اور آب و ہوا سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ وہ پھر یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ بعد میں آنے والی قوموں کو بھی موجودہ قوموں نے اسی طرح قبول کیا، جس طرح ابتداء میں سرزمینِ ہند نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ فراق گورکھپوری نے ہندوستان کی تعمیر و تشکیل کا بہت عمدہ نقشہ کھینچا ہے:

سرزمین ہند پر اقوام عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا

ان قافلوں کی مشترکہ زندگی کے اجتماعی شعور نے ان میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کو جنم دیا۔

حب الوطنی ایک مرکب لفظ ہے جو حب اور وطن کے اشتراک سے وجود میں آتا ہے۔ مختلف لغات میں اسے وطن سے محبت کے معنی میں پیش کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے پیٹریاٹزم (Patriotism) لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے، جس کے معنی بھی وطن سے محبت کرنے کے ہیں۔ ان تمام لغات کے معنی سے جو مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ وطن سے محبت۔ کہیں کہیں پر حب کو دوست کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، لیکن یہاں پر محبت کے معنی میں استعمال مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح سے حب الوطنی سے مراد وطن سے محبت ہے۔

☆ شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔ 500032۔

حب الوطنی ایک ایسا جذبہ ہے جس کے تحت کسی ملک یا وطن کے باشندے اپنے دل میں اس ملک یا وطن کے تئیں ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہیں، یعنی اس سے محبت کرتے ہوئے اس کی فلاح و بہبود کے تئیں فکر مند رہتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو انسان کے وجود کے ساتھ جنم لیتا ہے۔ سماجی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی تربیت سے یہ جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ تمام مذاہب میں وطن سے محبت کی تبلیغ کی گئی ہے۔ مذہب اسلام میں وطن سے محبت کو فوقیت دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں اس جذبے کو اس طرح پیش کیا گیا ہے: "حُبّ الوطن من الایمان"۔ یعنی وطن سے محبت ایمان ہے۔ اسلام میں وطن سے محبت کو ایمان قرار دینے سے حب الوطنی کی اہمیت مزید واضح ہوتی ہے۔

قومی یکجہتی حب الوطنی کی ایک ذیلی پیداوار ہے۔ جب کسی مخصوص جغرافیائی حدود میں رہنے اور بسنے والے انسانوں کا ایک ایسا گروہ جس کی تہذیب، طرز معاشرت، بود و باش، آداب خورد و نوش و غیرہ میں یکسانیت پائی جائے تو اسے ایک قوم تصور کیا جاتا ہے اور جب کسی قوم کے اشخاص اپنے تمام تر افتراقات و اختلافات کے باوجود خود کو ایک قومی دھارے سے منسلک کرتے ہیں تو اس عمل کو قومی یکجہتی کا نام دیا جاتا ہے۔

قومی یکجہتی بھی ایک مرکب لفظ ہے۔ جس میں قوم اور یکجہتی دو الفاظ شامل ہیں۔ یکجہتی کے لغوی معنی یکجا ہونا، شامل ہونا، ایک سمت ہونا، اور اصطلاحی معنی اتحاد اور دوستی کے ہیں، لیکن مفہوم کے لحاظ سے ہم اسے ہم آہنگی کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ کا مماثل Harmony ہے، جس کے معنی ہم آہنگی کے ہیں۔ اگر ہم قومی یکجہتی کو ایک مشترک معنی میں دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ کسی قوم کا ایک فکر و خیال کے تحت آپس میں متحد ہونا ہی قومی یکجہتی ہے۔ قومی یکجہتی ایک ایسا تصور ہے، جس کے معنی کسی ملک یا سماج میں نسلی اختلافات، کثیر زبانیں، مختلف مذاہب اور طبقات ہونے کے باوجود سماج کے لوگوں میں سیاسی، سماجی اور معاشی سطوح پر ہم آہنگی پائی جائے، اور جس کے تحت افراد کا اپنے ذاتی مفاد سے زیادہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کا جذبہ پیدا ہو، قومی یکجہتی کہلاتا ہے۔ اجتماعی و قومی مفادات کی تکمیل میں انفرادی و شخصی مفادات کی تکمیل کا یقین کامل پیدا ہوتا ہے۔ یہی یقین کسی قوم اور ملک کی یکجہتی کا سبب بنتا ہے۔

قومی یکجہتی کا تصور ہندوستان کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں تقریباً تمام

مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں۔ یہ ملک تہذیبوں، ثقافتوں اور ادیان و ملل کا وہ سنگم ہے جہاں انسانی وجود کے کتنے ہی دھارے مدغم ہوتے ہیں۔ اسی لیے دانشوروں نے اسے زبانوں کا عجائب گھر اور تہذیبوں کا سنگم قرار دیا ہے۔ وحدت میں کثرت اس کی شان ہے اور کثرت میں وحدت اس کی پہچان ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

چمن میں اختلاف رنگ و بو سے بات بنتی ہے
تم ہی تم ہو تو کیا تم ہو، ہمیں ہم ہیں تو کیا ہم ہیں

قومی یکجہتی کے متعلق ڈاکٹر بانو سرتاج اپنی کتاب ''قومی یکجہتی اور اردو شاعری'' میں راشٹریہ ایکتا کونسل کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''قومی یکجہتی ایک نفسیاتی عمل ہے، جس میں اتفاق اور جذباتی ہم آہنگی کے خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ملک میں وفاداری اور مشترکہ شہریت کا عمل پیدا ہوتا ہے۔'' (۱)

اردو ادب میں قومی شاعری کا تصور بہت قدیم ہے۔ اردو شاعری نے اس تصور کی مدد سے ہمیشہ ملک و قوم کی رہنمائی و رہبری کا کام انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر مجاور حسین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو کی قومی و سیاسی شاعری جنگ آزادی کے دوش بدوش چلتی رہی ہے۔'' (۲)

اس موضوع کو اردو شاعری میں کم و بیش سبھی شاعروں نے اپنا موضوع سخن بنایا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اقبال سہیل اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی کا نام ہے۔

اقبال سہیل اپنی علمی و ادبی صلاحیت کی بنا پر اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ گرچہ انھیں اپنے زمانے میں جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہ مل سکا۔ دراصل اقبال سہیل ادب میں مقام بنانے سے کہیں زیادہ عوام کے دلوں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ اسی لیے وہ عوامی امور و مسائل کو اپنی شاعری میں کلاسیکی زبان و بیان میں پیش کرتے تھے۔ وہ ایک ادیب تھے، ادیب کا کام ادب تخلیق کرنا ہے۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے، جس میں سماج کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے اس عہد کا سماج و معاشرہ موجود ہے۔ اقبال سہیل کا سفر زندگی (۱۸۸۴ تا ۱۹۵۵) ۷۱ سال رہا۔ انھوں نے اس

مدت میں مختلف جہات میں نمایاں خدمات انجام دیں، جن میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی شاعری شامل ہے۔

اقبال سہیلؔ کی شخصیت ایک دردمند انسان، قومی ہمدرد اور وطن دوست کی ہے۔ ان کی شخصیت کے یہ پہلوان کے خاندانی ماحول و وراثت اور ان کے استاذ گرامی مولانا محمد شفیع اور علامہ شبلی نعمانی کی رہنمائی و سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ کالج کے زمانے کی ادبی و سیاسی ہنگامہ آرائیاں اسے نکھارنے اور سنوارنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ ان کی شخصیت کے یہ نمایاں پہلوان کے دینی وعصری علوم کا حسین امتزاج ہے۔

اقبال سہیلؔ کی حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ملک کی تحریک آزادی کو محیط ہے، دوسرا دور ملک کی آزادی اور فوراً بعد کے زمانے کو محیط ہے۔ تیسرا دور تقسیم ملک کے بعد کے زمانے کو محیط ہے۔ اقبال سہیلؔ کی شاعری کے یہ تین مختلف ادوار ان کی حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی شاعری کو تین مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔

اقبال سہیلؔ کی شاعری کا پہلا دور نہایت پر جوش اور ولولہ خیز رہا ہے۔ اقبال سہیلؔ گرچہ اپنی پوری شاعری میں ملک اور قوم کی بات کرتے ہیں اور اس کی فلاح و بہبود اور تحفظ و بقا کے خواہش مند اور اسے آزاد و خود مختار دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ مشکل گھڑی میں بھی اپنا اور اپنے ساتھیوں کا حوصلہ قائم رکھتے ہیں۔ حوصلے وامید کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انھیں یقین قائل ہے کہ حوصلہ اور امید ہی ایک ایسا آلہ ہے جس کی مدد سے ہر منزل سر کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں رجائیت کا پہلو غالب ہے۔ اس دور کی شاعری میں وہ ہر طرح سے پر امید ہیں اور عوام سے پورے اعتماد سے بات کرتے نظر آتے ہیں۔

اقبال سہیلؔ اپنی نظم ''نوائے وطن (۱۹۳۶)'' میں قوم کو درس انسانیت دیتے ہیں۔ انھیں ان کی ذمے داریوں سے آگاہ کراتے ہیں۔ وہ انھیں ان کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان میں عزم پیدا کراتے ہیں اور اگر انھیں محسوس ہوا کہ اب بھی بات نہیں بنی تو انھیں شرم وحیا کا واسطہ بھی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک وطن کی حفاظت جان سے بڑھ کر ہے، وہ اسے زندگی کا راز سمجھتے ہیں، جسے ذیل کے اشعار میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

زندگی کا راز یہ ہے، اے عزیزانِ وطن　　جان جائے پر نہ جائے، حرمتِ شانِ وطن
رائے، عصمت، آبرو، ایماں نہیں، بکنے کی شے　　چاہیے کچھ شرم اے عزت فروشانِ وطن

اقبال سہیلؔ وطن کو نہ صرف دل میں بساتے ہیں بلکہ اسے کل کائنات تصور کرتے ہیں۔ وہ خود کو زمین ہند کا وارث مانتے ہیں۔ ان کی حب الوطنی کی ایک بہترین مثال ان کی نظم ''یوم آزادی'' بھی ہے، جس کے کچھ اشعار سے اس پہلو کو محسوس کیا جاسکتا ہے؛

وطن پیارے وطن تیری محبت دل میں بستی ہے
یہی ہے کائنات اپنی یہی کل اپنی ہستی ہے
نہ شوقِ بادہ خواری ہے نہ ذوقِ مئے پرستی ہے
یہ کمزوری نہیں عشقِ وطن کا جوشِ مستی ہے
ہمارے پاؤں جو ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتے ہیں
چھڑائی جا نہیں سکتی محبت ہند کی ہم سے
کہ پائی ہے وراثت میں زمیں یہ ہم نے آدم سے
نکلنا ہے بہر صورت غلامی کی جہنم سے
لگائیں گے ہم اپنی لو اب آزادی کے پرچم سے
اسی جادو سے ہم سوئی قسمت جگاتے ہیں

اقبال سہیلؔ کی وطن دوستی کے پیچھے صدیوں کی تاریخ ہے، جس سے وہ خود کو مستحکم پاتے ہیں۔ اسی رشتے کے سبب جان کی قیمت پر ملک وقوم کی حفاظت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہی احساس عوام میں بھی پیدا ہو۔ وہ اپنی نظم ''بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے (۱۹۳۹)'' میں اس بات کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں؛

آدم نے یہیں خلد سے کی آکے اقامت　　خواجہ نے دکھائی یہیں باطن کی کرامت
اللہ رہے یہ چمنِ کہنہ سلامت　　ہر چند مری جان پہ آجائے قیامت
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

اقبال سہیل اپنے ملک کو سارے جہان میں سب سے اچھا مانتے ہیں۔انھیں اللہ کی ذات پر مکمل ایمان اور اپنی قوت پر یقین کامل ہے۔وہ ملک کی غلامی سے مکمل طور پر بے چین ہیں۔انھیں کسی بھی صورت غلامی کی زندگی پسند نہیں۔ان کا خیال ہے ملک سلامت رہا،تو لوگ سلامت رہیں گے اور لوگ سلامت رہے تو عبادت گاہیں سلامت رہیں گی۔اس لیے ملک کی حفات کو سرِ فہرت تسلیم کرتے ہیں۔وہ اپنی نظم ''ترانہ وطن'' میں اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں ؎

ہوئیں مدتیں غیر کے دام میں | نہ رسوا ہو دنیا کی اقوام میں
نہ کر اب تو ذلت گوارا وطن

تو غیروں کے پھندوں سے آزاد ہو | پشیمان باہر کا صیاد ہو
دکھا دے یہ دلکش نظارہ وطن

غلامی کا مٹ جائے دامن سے داغ | جلے گھر میں مسجد سے پہلے چراغ
چمک جائے تیرا ستارا وطن

اقبال سہیل اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔اسے اپنی شان سمجھتے ہیں۔وہ موت و زندگی سب کچھ اسی ملک میں چاہتے ہیں۔اس کے عوض وہ تمام دنیا کی دولت کو ٹھکرا دینے کی بات کرتے ہیں۔وہ اپنے نوجوانوں سے بڑی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں لیکن صرف امیدیں ہی نہیں بلکہ ان امیدوں کو بروئے کار لانے کے لیے ان میں جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔وہ اپنی نظم صدائے سروش (۲۸ جنوری ۱۹۳۷) میں اسی طرح کا خیال پیش کرتے ہیں؛

نہ لوں مشتِ خاکِ وطن کے عوض میں | اگر ملکِ جم بھی بجائے وطن ہو
اٹھو لے کے قومی علم نوجوانو! | تمھیں نخلِ بستاں سرائے وطن ہو
تمھیں قوم کے مرکزِ آرزو ہو | تمھیں پاسبانِ بنائے وطن ہو
کرو ایسی کوشش جوانانِ ملت | کہ دنیا میں اونچا لوائے وطن ہو

اقبال سہیل کو وطن کے ذرے ذرے سے محبت تھی۔اپنی نظم ''کوہِ مسوری (۱۹۲۸)'' میں فطرت کے نظاروں کا ذکر اس اطرح کرتے ہیں؛

مرحبا کوہِ مسوری یہ تری شانِ جمال | تیری چوکھٹ چومتے ہیں سرفروشانِ جمال

جا بجا خمدار سڑکیں، اس پہ پھولوں کا ہجوم جیسے بل کھاتی ہوئی زلفِ عروسانِ جمال

ملک کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے لوگوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ انھیں اتحاد کا سبق پڑھا کر ملک کی آزادی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوم و ملک کی خدمت اور اس پر مر مٹنے کا حاصل حیاتِ جاوداں ہے؛

قوم پر مٹنے سے ملتی ہے حیاتِ جاوداں ٹوٹ کر خود بحر بنتا ہے حبابِ زندگی

اقبال سہیل ایک فراخ دل انسان ہیں۔ وہ نہ صرف وطن سے محبت کرتے ہیں، بلکہ وطن سے محبت کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ ان کی حب الوطنی کا خاص وصف ہے کہ وہ اپنے ملک کے ہر اس فرد سے محبت کرتے ہیں جسے اپنے ملک اور قوم سے محبت ہے۔ وہ ملک کے رہنماؤں اور جدوجہد آزادی کے پروانوں کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اقبال سہیل کی حب الوطنی میں مذہب و ملت کی تفریق حائل نہیں ہوتی۔ وہ وطن کو مذہب و ملت کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو ایک اتحاد کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ یہ اتحاد ہی ان کی حب الوطنی کو قومی یکجہتی سے قریب کرتا ہے۔ وہ اپنی نظم "بتقریب آمد چیف صاحب" (۳ مئی ۱۹۴۷) میں کہتے ہیں؛

کشش خاکِ وطن کی ہے اٹل قانون فطرت کا
وطن پر جان دے گا جو سعادت مند انساں ہے
وطن کا جو بھی ہو فرزند اس سے ربط ہے ہم کو
وہ عیسائی ہے یا ہندو ہے، سکھ ہے یا مسلماں ہے

اقبال سہیل اپنے ملک کے رہنماؤں اور مجاہدینِ آزادی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے کارناموں کو سراہتے ہوئے ان کی شخصیات کو بلا تفریق مذہب و ملت تسلیم کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو جیسی کئی عظیم شخصیات کے لیے خصوصی نظمیں کہیں ہیں۔ اپنی نظم "گاندھی جی" میں گاندھی جی کے تئیں اپنے دلی جذبات کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں؛

وہ کتابِ صلح کا سرورق، کہ مٹا ئی کشمکشِ فرق
وہ قتیلِ خنجرِ صبر و حق، کہ وطن پہ خود کو مٹا دیا

وہ بودھ اور کرشن کا جاں نشیں، ہمہ تن عمل ہمہ تن یقیں

وہ تبسم سحر آفریں ، کہ چمن لبوں سے کھلا دیا

تری خامشی وہ زبان تھی کہ دلوں کو جوشِ نوا دیا

تن فاقہ کش میں وہ جان تھی، کہ حصار کبر ہلا دیا

اقبال سہیلؔ مولانا محمد علی جوہرؔ کی وفات پر فرط جذبات سے لبریز ''مرگِ حیات آفریں'' میں مولانا کے تئیں اپنی عقیدت کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں؛

آہ محمد علی، آہ شہید وطن ٭ زبدۂ اہلِ کمال، مرجع ارباب فن

چھوڑ کے تو چل دیا دہر کا دارالمحن ٭ ملتِ مرحوم کی سونی ہوئی انجمن

خیر مبارک تجھے سیرِ بہشتِ بریں

پنڈت جواہر لال نہرو کے تئیں اپنے خیالات کو اس طرح قلم بند کرتے ہیں؛

آئینہ، محبتِ وطن کا ٭ وہ عارضِ روشن جواہرؔ

شیدائے وطن، فدائے ملت ٭ سر تا بہ قدم ولائے ملت

اور سروجنی نائڈو کے لیے لکھتے ہیں کہ؛

جس نے بھی تجھے دیکھا بے ساختہ بول اٹھا ٭ اعجاز ہے فطرت کا یہ پیکرِ نسوانی

اقبال سہیلؔ نے اپنی شاعری کی مدد سے پہلے عوام میں وطن سے محبت کا جذبہ پیدا کیا اور اسی جذبے کی مدد سے قومی اتحاد کا درس دیا۔ جب حب الوطنی کا جذبہ اور قومی یکجہتی کا عمل بارآور ہوا تو ملک و قوم کو غلامی سے رہائی کا کارہائے نمایاں انجام دیا۔ اقبال سہیلؔ کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور ملک صدیوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔

اقبال سہیلؔ کی شاعری کا دوسرا دور بھی نہایت پرجوش اور باعمل رہا ہے۔ آزادی کے جشن کا انتظار ان کی زندگی کا ماحصل رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سہیلؔ کی شاعری کا عین مقصد ملک کی آزادی تھا۔ انھوں نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔ نظم ''نغمۂ بیتاب'' میں وطن کی آزادی پر ان کا جذبۂ اظہار پرمسرت اور ولولہ انگیز نظر آتا ہے۔

گلزار وطن آباد ہوا ہر سرو چمن آزاد ہوا

رخصت وہ ستم ایجاد ہوا وہ قہر گیا وہ لوٹ گئی

طوفانِ مسرت اٹھا ہے نغموں کا تلاطم برپا ہے
اقبالؔ سخنور کے لب سے بھی مہر خموشی ٹوٹ گئی

اقبالؔ سہیل کی شخصیت محسنِ انسانیت اور قومی ہمدردکی ہے۔ وہ ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے حامی ہیں۔ ان کی فکر بہت واضح ہے۔ تعصب اور بغض وعناد کو وہ پسند نہیں کرتے، وہ ملک میں ہر صورت اتحاد واتفاق چاہتے ہیں۔ آزادی کے بعد اپنی نظم ''منظر رخصت'' میں اپنی قوم کو درس حقیقت دیتے نظر آتے ہیں:

اے اہل وفا ماتم نہ کرو وہ وعدہ شکن گر جاتا ہے
جاتا ہے مسافر غم نہ کرو مہمان ہی تھا گھر جاتا ہے
ہم تم کو بسر کرنا ہے یہیں جینا ہے یہیں مرنا ہے یہیں
اٹھو یہ چمن شاداب کرو اب غاصبِ خود سر جاتا ہے
انجام سے غافل نادانو! مانو کہ نہ مانو تم جانو
اک درس حقیقت دے کے تمھیں اقبالؔ سخنور جاتا ہے

اقبالؔ سہیل کی حب الوطنی میں ایک طرح کا والہانہ پن اور خلوص دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم ''مبارک بادِ آزادی'' میں یہ طرز خاص دیکھنے کو ملتا ہے:

گلزار وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج — سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت وچمن آج
غنچوں کی صبا توڑ گئی قفل دہن آج — ہے ہر گلِ خنداں کی زباں پر یہ سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندانِ محن آج

اقبالؔ سہیل ماضی کی روشنی میں حال کو بہتر بناتے ہیں اور ماضی وحال کے تجربات کی آمیزش سے مستقبل کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ وہ حال کی خوشیوں میں مستغرق ہو کر بھی مستقبل کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ حال سے باخبر اور مستقبل کے لیے فکر مند رہتے ہیں:

ارباب وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل — ہاں جشن منالو کہ ہے موقع اسی قابل
ہو جانا نہیں جوشِ طرب میں کہیں غافل — تخریب تو آسان تھی تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

اقبال سہیل نے اسی نظم میں شیر میسور ٹیپو سلطان، مغلیہ سلطنت آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر ،جھانسی کی رانی لکشمی بائی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑے مہذب انداز میں مژدہ جاں بخش سنایا ہے؛

اے باد صبا خواب سے ٹیپو کو جگا دے — مرحوم ظفر شاہ کے شانوں کو ہلا دے
پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکا دے — پھر دونوں کو یہ مژدۂ جاں بخش سنا دے
آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

ہوں گی اسی دنیا میں کہیں جھانسی کی رانی — وہ خالدۂ ہند وہ نوشابۂ ثانی
ہے فخر وطن جن کی شجاعت کی کہانی — ان کو بھی سنا جا کے یہ پیغام زبانی
پوری ہوئی آزادی قومی کی لگن آج

ہے یاد ہمیں حضرت جوہر کا وہ ارشاد — آئیں گے نہ وہ ہند میں جب تک نہ ہو آزاد
کہہ دے کوئی ان سے کہ ہوئی ختم وہ معیاد — اجڑی ہوئی محفل ہے کریں اس کو پھر آباد
آجائیں کہ پورا ہوا وہ عہد کہن آج

اسی طرح مختار انصاری، اجمل خاں، بال گنگا دھر تلک، دیسائی، اشفاق اللہ خان، بھگت سنگھ، رام پرشاد بسمل، چندر شیکھر آزاد وغیرہ کی قربانیوں کو بھی یاد کیا ہے۔

سرمایۂ ملت ہوئی جانبازیٔ افراد — قربانی وایثار کی آخر تو ملی داد
کہتے ہیں یہ اشفاق و بھگت، بسمل و آزاد — اللہ نے سن لی دلِ مظلوم کی فریاد
زینہ ہے حکومت کا وہی دار و رسن آج

اقبال سہیل اپنی اس نظم میں نہ صرف فدائے ملک وقوم کو آزادی کی مبارک باد پیش کرتے ہیں بلکہ ہم تمام لوگوں کو ان کی عظمت وحرمت کا درس بھی دیتے ہیں۔

اقبال سہیل کی شاعری کے اس دور پر ایک مایوسی کی فضا سی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ چونکہ اقبال سہیل جس جوش وجذبے کے ساتھ ملک کی جدوجہد آزادی میں شریک ہوئے تھے۔ جن تمناؤں اور آرزوؤں کو اپنے دل کے نہاں خانے میں سجائے بیٹھے تھے اور جس طرح کا ہندوستان دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ افسوس! کہ وہ بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ ان کی قومی شاعری کا یہ حصہ ان کے اسی

جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔اس حقیقت کے برعکس ان کی شاعری کا خاص وصف ان کا رجائی پہلو ہے، جو مایوس کن ماحول میں بھی رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ناامیدی میں امید کا پہلو تلاش کر لینا اقبال سہیل کا ہی خاصہ ہے۔ان کی نظم "یوم آزادی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بلند و پست میں ،اب تک بھی باہم سرگرانی ہے
زبانوں پر ابھی تک داستانِ پاستانی ہے
ابھی تک مسلم و ہندو میں باقی بدگمانی ہے
زباں کی کشمکش اب تک حجاب درمیانی ہے
مگر آثار ہیں یہ سب اسی دور غلامی کے
نتیجے ہیں یہ سودائے وطن خواہی کی خامی کے

☆

دھوئیں سے جنگ کے مسموم ہے آب و ہوا اب تک
غبار مغربیت سے مکدر ہے فضا اب تک
دلوں میں زخم تقسیم وطن کا ہے ہرا اب تک
کئی صدیوں کا کوڑا کچھ نہ کچھ ہے بچ رہا اب تک
مگر یہ سب اندھیرا جلد ہی اب مٹنے والا ہے
اور اس کے بعد صدیوں تک اجالا ہی اجالا ہے
فدا اس کی حفاظت میں ہم اپنی جان کر دیں گے
وطن پر سب متاعِ زندگی قربان کر دیں گے

ملک کے رہنما ملک کو آزاد کرانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن مکار قوم انگریز کی سیاسی چالوں سے خود کو اور ملک کو متاثر ہونے سے نہ بچا سکے نتیجتاً ملک آزاد تو ہو گیا پر متحد نہ رہ سکا ملک فرنگی چالوں میں پھنس کر فرقہ پرستی کا شکار ہوا اور منقسم ہو گیا۔ تقسیم کا المیہ ملک میں ایک نئی تبدیلی کے ساتھ سامنے آیا۔ اقبال سہیل کا خواب ایک آزاد ملک ،ایک متحد ملک جہاں مذہب وملت کی کوئی قید و بند نہ ہو ایک جھلک دکھا کر پل میں غائب ہو گیا۔ان کی تمام خوشیاں ان کا تمام جوش سرد ہو گیا وہ نہایت افسردگی اور

مایوسی سے یہ کہنے کے لیے مجبور ہو گئے کہ ـ

یہ دن جب اگلے برس تھا آیا بڑی امیدوں سے تھا منایا
خوشی سے ہر دل تھا جگمگایا کہ وقتِ نیلِ مرام آیا
پھر ایسے فتنوں نے سر اٹھائے کہ اپنے بھی بن گئے پرائے
قدم ہزاروں کے ڈگمگائے وہ لغزشوں کا پیام آیا
غلامی غیر کی معصیت، ہوئی جو صدیوں کے بعد رخصت
تو لے کے تیغِ نفاق و نفرت جنون پے انتقام آیا
جو مدتوں سے تھے بھائی بھائی انھیں میں باہم ٹھنی لڑائی
نہ آدمیت کو شرم آئی نہ لب پہ غیرت کا نام آیا

آئی شبِ غم کے بعد سحر، غمناک رہا پھر بھی منظر
وہ غنچہ و گل کا ہنس ہنس کر، شبنم کو رلانا کیا کہیے
کیوں بزمِ طرب کے صدر نشیں، پائیں کے بھی اب ہم اہل نہیں
کل وادیٔ غم میں ہم دونوں، تھے شانہ بہ شانہ کیا کہیے

ہماری پستیِ فطرت نہ تھی یوں آشکار اب تک
کہ تھی دیوارِ زنداں رازِ دل کی پردہ دار اب تک
گیا ساقی تو کیا، بیخود ہیں اس کے جرعہ خوار اب تک
سروں میں ہے اسی صہبائے دوشیں کا خمار اب تک

شبِ غم کاٹ دی تھی جس کے جاں پرور تصور میں
چھپی ہے کہر کی تہہ میں وہ صبحِ زرنگار اب تک

اقبال سہیلؔ کی شخصیت کا یہ پہلو قابلِ ستائش ہے کہ وہ مایوس تو ضرور ہوتے لیکن نا امید نہیں

ہوتے ہیں۔ وہ حالات کی سنگینی میں بہتر حالات کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ تقسیم کے بعد ملک کی آلودہ معاشرتی فضا میں ماضی کے جھروکھوں سے مستقبل کے بہتر ہونے کی امید کرتے ہیں، جس کی ایک جھلک ۱۹۴۸ کی ایک غزل کے ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے؛

اسی سنگم کے دو دھارے ہیں، ہندو بھی مسلماں بھی
گلے مل کے روئے بھی ہوئے دست و گریباں بھی
انھیں موجوں کی ٹکر نے اٹھائے کتنے طوفاں بھی
یہی اب مل کے سینچیں گے، وطن کا باغ ویراں بھی
رہیں گے متحد باوصف تقسیم گلستاں بھی
چمن کے لالہ و گل بھی، چمن کے سرو و ریحاں بھی

اقبال سہیل قومی اتحاد کو ملک کی اصل جاگیر تصور کرتے تھے۔ وہ مختلف اوقات میں مختلف انداز سے قومی اتحاد کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نسلِ انسانی کے تمام تر افتراقات اور اختلافات کو تسلیم کرتے ہوئے انھوں نے خود کو کبھی کمزور نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی رجائی فطرت کی بنا پر سدا پر امید رہتے ہیں۔ ان کی یہی رجائی فطرت انھیں اور ان کے پیغام کو قوت بخشتی ہے۔

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یہاں ایک
اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود و زیاں ایک
ہم سب کا خدا ایک ہے ہم سب کا نشاں ایک
پھر دل میں ہو کیوں خارِ عداوت کی چبھن آج

وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہب اسلام
جو دیں بھی ہو، دیتا ہے محبت ہی کا پیغام
مذہب کو خدا کے لیے مت کیجیے بدنام
کل شیر و شکر ہوں یوں ہی کل ہند کی اقوام
سنگم پہ ہے جس طرح ملی گنگ و جمن آج

الغرض یہ کہ علامہ اقبال سہیلؔ مختلف الجہات شخصیت کا نام ہے۔ دنیائے اردو کے باشعور لوگ تو اس شخصیت اور اس کی جہتوں سے واقف ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ عوام میں جتنی مقبولیت اور شہرت انھیں ملنی چاہیے تھی وہ نہ مل سکی۔ مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ شبلی کالج نے اب اس طرف مثبت اور مستحکم قدم اٹھایا ہے جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ علامہ اقبال سہیلؔ کو اب ان کے شایانِ شان مقام و مرتبہ حاصل ہوگا۔ انشااللہ۔

حوالہ:

(۱) ڈاکٹر بانو سرتاج، قومی یکجہتی اور اردو شاعری، ص۔ ۱۳۲

(۲) اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، مجاور حسین، ص۔ ۲۵

کتابیات

(۱) کلیات اقبال سہیلؔ، عارف رفیع (مرتب و ناشر)۔

(۲) ڈاکٹر منور انجم، اقبال سہیلؔ حیات و شاعری۔

(۳) ضیاالرحمٰن صدیقی، اقبال سہیلؔ کا فن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

☆☆☆

اقبال سہیل کا نظریۂ شاعری

صدف پرویز☆

اقبال احمد خان سہیل ایک صاحب طرز شاعر اور بلند پایہ خطیب تو تھے ہی، لیکن وہ ایک قابل ذکر نقاد بھی کہے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے باقاعدہ طور پر نقدِ شعر کی کوئی کتاب تحریر نہیں کی ہے بلکہ متفرق مضامین کی صورت میں شاعری کے متعلق ان کے نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے مختلف شاعروں اور مصنفین کے مجموعۂ کلام پر جو مقدمے اور تبصرے لکھے ہیں ان کے ذریعے شاعری اور خصوصاً غزل سے متعلق ان کے دقیقہ رس زاویۂ نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مضمون ''شبلی کی جامعیت'' اس کے علاوہ حبیب احمد صدیقی کے مجموعۂ کلام ''جلوۂ صد رنگ'' کے تبصرے شفیق جونپوری کے مجموعۂ کلام ''خرمن عشق پر مقدمہ'' بیخود موہانی کے تنقیدی مضامین ''گنجینۂ تحقیق'' کا تفصیلی ریویو، فطرت واسطی کے مجموعۂ کلام ''حدیث حسن'' کا مقدمہ، ضمیر حسن خان دل شاہجہاں پوری کے مجموعۂ کلام ''نغمۂ دل کا مقدمہ'' خط بنام حضرت سلام سا گری کے علاوہ سیماب کی نظم ''موحد اعظم'' پر ایک تنقیدی خط بنام رسالہ ادیب دہلی میں اقبال سہیل نے کہیں اجمالی اور کہیں مفصل انداز میں اپنے نظریۂ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاط روح'' کا تبصرہ اقبال سہیل کے انتقادِ نظر کی عمدہ مثال ہے، جس میں انھوں نے تفصیل سے شعر کے محاسن و معائب پر نظر غائر ڈالی ہے۔ ان تمام مضامین کو پڑھ کر مجموعی انداز میں اقبال سہیل کے شعری نظریات کے توسط سے جو خیالات مرتب ہوتے ہیں انھیں کو اگلے صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اقبال سہیل کے شعری نظریات پر بحث کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اقبال سہیل کی نظر میں نقد و انتقاد کی کیا معنویت ہے اور انھوں نے تنقید

☆ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

شعر کے لئے کن پہلوؤں کو مدنظر رکھا ہے۔

اقبال سہیل نقد شعر کو دیارِ سخن کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق نقاد کی ذرا سی لغزش ہی ادبی معصیت ہے جس کا کفارہ کسی صورت ممکن نہیں، کیوں کہ دیار سخن میں معیاری ادب کے ساتھ خزف ریزے بھی فروغ پاتے ہیں۔ لہٰذا معیاری ادب سے ان خزف ریزوں کی نشاندہی کرنا نقاد ادب کا اولین فرض ہے۔

اقبال سہیل نے تنقید شعر کی دو قسمیں بتائی ہیں جن میں ایک قسم اجمالی و اصولی ہے اور دوسری قسم جزئی اور تفصیلی۔ وہ پہلی قسم کی صراحت اس طرح کرتے ہیں کہ اول الذکر قسم میں اصل فن، اس کے تدریجی نشو ونما مختلف ادوار میں مختلف تغیرات اور ان تغیرات کی تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی اسباب سے بحث ہوتی ہے۔ اس کے بعد فلسفیانہ حیثیت سے کسی ادبی تخلیق کے جمالیاتی، نفسی اور اجتماعی پہلو پر نظر کی جاتی ہے۔ تنقید ادب کی دوسری قسم کی تعریف اقبال سہیل نے اس طرح کی ہے کہ اصولی اور عمومی مباحث کے علاوہ دوسری قسم میں جزئیات کو توجہ کا مرکز بنایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بتایا ہے کہ اس قسم میں نقاد مصنف کے نتائج فکر کو لے کر اس کے معانی و مطالب کی توضیح محاسن و معائب کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ ایک ایک خط وخال سامنے آجائیں، مثلاً الفاظ کی وضاحت یا ثقل، تراکیب کی چستی و روانی یا تنافر و تنقید، تخیل کی بلندی یا پستی، طرز ادا کی ندرت یا سوقیت ایک ایک کر کے دیکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس قسم میں نقاد دوسرے اساتذہ کے ہم رنگ کلام سے موازنہ کرتا ہے یا دوسرے ناقدین کے آراء و خیالات پر محاکمہ کر کے شاعر کے کلام پر اپنا زاویۂ نظر پیش کر سکتا ہے۔ تنقید ادب کی اسی دوسری قسم کو اقبال سہیل نے اپنے نقد شعر کے لئے منتخب کیا ہے اور اسی طرز تنقید کے ذریعے ان کی تراوش قلم تمام شاعروں کے مجموعۂ کلام کا محاکمہ کرتی ہے، جس کی عمدہ مثال سیماب اکبرآبادی کی نظم ''موحد اعظم'' ہے۔ اس نظم پر اقبال سہیل نے اپنی دقیقہ رس نگاہ ڈالی ہے۔ چونکہ نظم میں سیماب اکبرآبادی نے ابلیس کو معلم الملکوت کہا ہے اور اس کی قصیدہ خوانی میں پوری نظم لکھی ہے۔ یہ نظم صراحت قرآنی کے بہ نسبت اسرائیلی روایات کے زیادہ قریب ہے۔ مثلاً یہ نظریہ کہ ابلیس نے اپنی توحید پرستی کی وجہ سے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اسرائیلی روایت ہے جب کہ نص قرآنی سے ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس کا نسبی غرور انکار کی وجہ ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ سیماب اکبرآبادی

نے نظم میں بیان کیا ہے کہ قرآن میں سب سے زیادہ تعداد میں ابلیس کا نام آیا ہے۔ چونکہ یہ نظم ایک مسلمان کی تراوشِ قلم ہے اس لئے اقبال سہیل کو نظم میں بیان کردہ علمی حقائق سے اختلاف ہے۔ نظم میں علمی بحث سے قطع نظر سہیل نے اس کے فنی اغلاط کی نشاندہی بھی کی ہے۔ سیماب اکبر آبادی نے نظم میں فارسی مصدر سرشت کو اردو اگر سرشتاً یعنی حرکت فتح مع التنوین لکھا ہے اور اس کی وضاحت اقبال سہیل نے اس طرح کی ہے کہ لفظ سرشت، سرشتن کا حاصل مصدر ہے، جو فارسی زبان کا ایک مشتق لفظ ہے اور جو عربی کے اعراب (رفع، نصب، جر) سے یقیناً بے نیاز ہے۔ حرکت فتح مع التنوین جو عربی اسماء کے لئے مخصوص ہے، فارسی زبان کے لفظ پر مسلط نہیں کی جاسکتی۔ جہاں تک نظم میں بیان کردہ واقعات کا تعلق ہے تو وہاں ایک فیصد اقبال سہیل کے نظریہ پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ شاعری کوئی فقہی مسئلہ نہیں جہاں روایت کی صحت کی جانچ کی جائے۔ برعکس اس کے اگر فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال سہیل کی وسعت نظر کا احساس ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ باریک سے باریک غلطی کی طرف بھی پڑتی ہے۔

اقبال سہیل کی یہی تنقیدی نظر جب شاعری پر پڑتی ہے تو شاعری کے متعلق ہمیں ان کے نظریات سے آگہی ہوتی ہے۔ شاعری سے متعلق ان کے قلم سے درج ذیل خیالات سامنے آتے ہیں:

> ''شاعری پیمبری کا ایک پرتو ہے، کیوں کہ الہامات شعری بھی براہ راست فیضِ ازل کے عطیات ہوتے ہیں'' (اقبال سہیل: شبلی کی جامعیت مشمول افکار سہیل: شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڑھ، ص: ۱۷)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں شاعری کو ایک طرح کا مرض اور دماغی خارش سمجھتا ہوں اور اگر اس سے نجات مل سکتی اور علاج ممکن ہوسکتا تو پہلے اپنی شفا کی کوشش کرتا، مگر مجبوری یہ ہے کہ یہ روگ فطری ہے'' (خط بنام حضرت سلام سا گری، افکار سہیل، ص: ۲۱۱)

ایک اور جگہ شاعری کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

> ''شاعری حقیقت میں حسن مجرد کی اس مصوری کو کہتے ہیں جس میں لطیف موسیقی بھی شامل ہو اور جب آج تک حسن صوری کی تمام اداؤں اور نغمہ مادی کی تمام کیفیات کے لئے زبان میں الفاظ نہیں ملتے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ۔

بسیار شیوه ہاست بتاں را کہ نام نیست

ترجمہ: بتوں یا معشوقوں کے بہت سے ایسے انداز ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حسن معنوی اور نغمہ روحانی یعنی شاعری جیسی ذوقی اور وجدانی چیز کی نسبت ہماری کیفیات نفسی کی تعبیر الفاظ میں کی جاسکے“

(تبصرہ برنشاط روح، افکار سہیل، ص: ۱۱۲)

درج بالا اقتباسات تمام تعریفوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال سہیل شاعری کو نغمہ روحانی تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں شاعر کا خطاب صرف اپنی ذات سے ہوتا ہے لہٰذا وہ جس جذبے سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے اندر جو محرک باطنی کا شعور ابھرتا ہے اسی کو کبھی اضطرار اور کبھی بلا ارادہ نغمہ موزوں میں ڈھال لیتا ہے یعنی حقیقی شاعر کی دنیا خود اپنے تاثرات تک محدود ہوتی ہے۔ ان کی نظر میں شاعر کا کام تاجر، خطیب اور نبی سے مختلف ہوتا ہے۔ یہیں پر پہنچ کر اقبال سہیل ان تمام شاعری پر جو ترقی پسندی کے نام پر مزخرفات کی شکل میں ایک انبار کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی، اس کے مخالف نظر آتے ہیں۔ اقبال سہیل کو ترقی پسند ادبی شاعری پر یہ اعتراض تھا کہ ترقی پسند ادب اعلانیہ طور پر ”ادب برائے زندگی“ کا نعرہ لگاتے ہوئے ادباء و شعراء کو اپنی نگارش سخن تخلیق کرنے پر ابھارتا ہے، یہیں پر اقبال سہیل کا شعری نظریہ ترقی پسند نظریہ کا مخالف ہو جاتا ہے کیوں کہ اقبال سہیل ایسی شاعری کو پسند نہیں کرتے جس سے شعراء کا ذہن ایک مخصوص خانے میں بندھ جائے جب کہ ان کی نظر میں شاعری تو ایسی دیوی ہے جو شعراء پر الہامی طور پر خود وارد ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شعراء کا ذہن اپنے تمدنی و معاشرتی حالات سے متاثر ہو جائے۔ لہٰذا یہ شاعر پر منحصر ہے کہ اس کے ذہن پر کون سے حالات و واقعات اثر انداز ہوں جو اس کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر رونما ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اقبال سہیل افادی یا مقصدی شاعری کو سرے سے ہی قابل رد قرار دیتے ہیں، بشرطیکہ ان کا تعلق شاعر کے قلبی واردات سے ہو نہ کہ خارجی دباؤ سے۔ لہٰذا وہ رقمطراز ہیں:

”اس میں شک نہیں کہ ہمارا قدیم اسلوب شاعری اپنی مدت حیات ختم کر چکا۔ اب اس میں اتنی حرارت غریزی باقی نہیں ہے کہ کچھ دنوں اور زندہ رہ سکے اور عصر حاضر سے یہ توقع فضول ہے کہ فرسودگی کی اس مردہ نعش کو تادیر کاندھے پر لئے

پھرے گا، زمانہ اپنا رنگ بدل چکا ہے، لٹریچر بھی کیوں نہ بدلے مگر اس تبدیلی وتغیر کو اصلاحی وتدریجی ہونا چاہئے نہ کہ تخریبی وغیر معتدل اور بہر حال جو کچھ بھی ہو علی وجہ البصیرت ہو، کورانہ تقلید اور اندھا دھند تجدید تو سرسامی کیفیت کا مظاہرہ ہے، صحت مذاق کی علامت نہیں ہے کہ آج چند جھوٹے سکے رواج عام پا گئے ہیں اور ہر شخص جو شاعری کے قلمرو میں قدم رکھتا ہے اسی نمونے کے جعلی سکے ڈھال کر اپنا بازار گرم کرنا چاہتا ہے، سرمایہ داروں پر تبرا، مظلوموں اور کسانوں کی مظلومیت پر مصنوعی فریاد و بقا، مذہب سے بغاوت، غلط اور بے محل لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال، فنی ضوابط سے بیگانگی، ادعائے تہذیب کے باوجود اظہار خیال میں حیا سوز عریانی، غرض ہر طرح کی ادبی، اخلاقی اور معاشرتی گمراہیوں کا نام ترقی پسند رکھ لیا گیا ہے"۔

(مقدمہ خرمن عشق، مجموعۂ کلام شفیق جونپوری، افکار سہیل، ص: ۱۵۳)

اقبال سہیل ترقی پسند ادب کے اس شعوری لائحۂ عمل کی تردید کرتے ہیں جس کے تحت ہر کلام سے ایک مخصوص پیام کی تلاش کی جاتی ہو۔ حالانکہ اقبال سہیل کا نظریہ اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن اس کے باوجود بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند ادب کے تحت لکھی جانے والی شاعری نے دیار ادب کو تنہائی، مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، ایک لڑکا، طفلی کے خواب، جیسی لازوال نظمیں عطا کیں۔ اسی طرح ستم کی رسمیں بہت تھی لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے...... دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے...... حجاب فتنہ پرور، اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا...... جیسی بے مثال نظموں سے بھی اردو ادب کو مالا مال کیا۔ اقبال سہیل کو ان تمام ترقی پسند ادبی شاعری سے شکایت تھی جو رومانی شاعری کے نام پر خود ان ہی کی عبارت میں "تاج محل کی نزہت آفریں فضا میں شامپین کی کئی بوتلیں خالی کرنے کے بعد مزدور اور مفلس کسانوں کے ماتم میں لکھی گئی ہو"۔

اقبال سہیل شاعری میں بہت شوخی ورنگین نوائی کے قائل نہیں تھے جب کہ بقول شبلی "شاعری تو وہ حمام ہے جہاں سعدی وحافظ بھی آکر ننگے ہو جاتے ہیں" اقبال سہیل نے علامہ شبلی نعمانی کے تمام ادبی نظریات کی خوشہ چینی کی ہے لیکن شاعری کے اس حصے پر اقبال سہیل کا نظریہ شعر شبلی سے تھوڑا الگ ہو جاتا ہے۔ شبلی شاعری میں رنگین نوائی کے حد درجہ قائل تھے بھی، لیکن اقبال سہیل شاعری کے اخلاقی

وافادی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ ایسی تمام شاعری کی مخالفت کرتے ہیں جو اخلاقی گراوٹ کا سبب بنے۔

انھیں اخلاقی وافادی پہلوؤں کے پیش نظر اقبال سہیل کو شاعری کی جملہ اصناف میں سے صنف غزل سے مخالفت تھی کیوں کہ صنف غزل کے پس پردہ معمولی سے معمولی شاعر بھی شاعری کی دنیا میں حاضری دے دیتا اور اپنی حساسیت شباب اور روداد شبانہ کا تذکرہ کرکے اردو شاعری کو گراں بار کرتا نظر آتا ہے۔ غزل سے متعلق متفرق اوراق میں بکھرے ہوئے ان کے خیالات کا مطالعہ یہاں پر ناگزیر ہے۔

اقبال سہیل کی نظر میں شاعری کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں شاعر کا مخاطب خود اس کا نفس ہوتا ہے، یعنی کہ شاعر پر جو جذبات طاری ہوتے ہیں وہی نغمۂ موزوں کی شکل میں ادا ہوتے ہیں جس کے لئے اقبال سہیل چرواہے کی مثال دیتے ہیں کہ جیسے وہ محض اپنا دل بہلانے کے لئے سنسان جنگل میں بانسری بجاتا ہے ہو بہو وہی کیفیت شاعر کی بھی ہوتی ہے۔ دوسرا پہلو شاعری کا مقصدی یا افادی ہوتا ہے۔ اس میں شاعر کا خطاب دوسروں سے ہوتا ہے اور وہ شعوری طور پر اپنے احساسات وجذبات سے دوسروں کو متاثر کرنا چاہتا ہے، اس میں شاعر تین طریقے اپنا سکتا ہے۔ جس کا سب سے اعلیٰ طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس میں بظاہر شاعر کسی کو مخاطب نہیں کرتا، بس اپنا پیغام دیدہ ودانستہ پہنچا دیتا ہے، دوسرے طریقے میں شاعر دوسروں کے حالات وجذبات کی مصوری اس انداز میں کرتا ہے کہ شاعر کو جس منظر کی نشاندہی مقصود ہوتی ہے وہ ''سر دلبراں وحدیث دیگراں'' کی زبان میں ادا کر دیتا ہے۔ تیسری شکل میں شاعر باقاعدہ ہادی وواعظ کا کردار ادا کرتا ہے۔ لہذا یہ تمام صورتیں تو شاعری کی اس صنف نظم کی دلالت کرتی ہیں جو خیالات کو تسلسل کے ساتھ پیش کر سکے۔ لہذا صنف غزل اس تعریف پر پوری نہیں اترتی۔ غزل کی اسی کوتاہ دامنی کی وجہ سے ان کو یہ صنف سخن کچھ خاص پسند نہیں۔ لہذا وہ لکھتے ہیں:

> ''غزل اور صرف غزل کو شاعری کا معیار قرار دے دیا گیا ہے حالانکہ ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے اصناف نظم میں غزل سے زیادہ قابل اصلاح بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ قابل ترک کوئی دوسری صنف نہیں ہے''۔

نغمۂ دل کے مقدمے میں اقبال سہیل نے غزل کے (مقدمہ حدیث حسن بشمول افکار سہیل ص ۱۹۲) متعلق خیالات پیش کیے ہیں، ملاحظہ ہوں:

''لغوی حیثیت سے تو غزل اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں عشق کی داستان درد خود عاشق کی زبان سے ادا کی جائے اور عشق بھی وہ جو با اصطلاح مولانائے روم ''فساد خوردن گندم'' ہے یعنی ''صنف قوی کا جنسی رابطہ صنف نازک سے''۔ معنوی حیثیت سے غزل اس صنف نظم کا نام ہے جس میں بلاترتیب و تخصیص دنیا بھر کے سارے مضامین یہاں تک کہ عشق و فحاشی سے لے کر عالم ملکوت کے اسرار تک ایک ہی نظم کے مختلف اشعار میں ادا کیے جا سکتے ہیں، اب آیئے حیثیت صوری پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ میرے خیال میں جہاں تک ہیئت ترکیب کا تعلق ہے تمام اصناف نظم میں غالباً غزل کا موزوں کر لینا سب سے زیادہ آسان ہے...... یہی مجذوب کی بڑ غزل کا معیار ہے''۔ (ص: ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳)

''ہمارے لٹریچر میں صنف غزل کی ہردلعزیزی، طرحی مشاعروں کی یہ وبائے عام اور غزل گو شعراء کی یہ غیر معمولی فراوانی اس وجہ سے نہیں ہے کہ غزل بجائے خود ادبی حیثیت سے کوئی زیادہ قابل قدر اور ممتاز صنف نظم ہے، یہ صحیح ہے کہ جذبات شباب کا حیوانی پہلو جو غزل کا مایۂ خمیر ہے فطرت انسانی کی ایک ضروری اور عالمگیر کمزوری ہے جس سے کوئی رند و پارسا محفوظ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بھی ایک سبب غزل کی مقبولیت کا ہو سکتا ہے، لیکن انھیں جذبات غزل کی یہ کثرت کیوں؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یہی قسم نظم ہر شخص کے بس کی ہے۔ غزل گوئی کی اس سہولت اور رواج نے زبان اردو کی ترویج میں جو مدد دی ہے مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن شاعری بہ معنی قافیہ سنجی کون سا ایسا کمال ہے کہ سرمستان ازل کے سوا ہر کس و ناکس کو اس میکدہ میں بادہ پیمائی کی دعوت دی جائے''۔ (ص: ۲۰۴)

''عام سطح سے بالاتر اور ممتاز غزل گوئی حد درجہ مشکل ہے جو ۹۹ رفیصد مدعیان شاعری کے امکان میں نہیں ہے۔ ہر زمانے میں صرف معدودے چند اس کڑی کمان

کوزہ کر سکتے ہیں"۔ (ص: ۲۰۶)

اس تمہید کا یہ مدعا نہیں ہے کہ میرے نزدیک غزل یکلخت قابل ترک چیز ہے۔ مقصود صرف اس قدر ہے کہ طرحی "مشاعروں کو قطعاً بند کر دینا چاہئے اور غزلیں اگر کہی جائیں تو اس طرح کہ یا تو کوئی مکمل خیال پیش نظر رکھ کر ایک مسلسل غزل کہی جائے تا کہ تصویر کے تمام ضروری پہلو سامنے آ جائیں، یا منفرد حکیمانہ خیالات کو لطیف پیرایہ بیان کے ساتھ مختصر غزلوں میں یکجا کر دیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نہ ہو کہ فلسفہ، سائنس و تصوف کی مصطلحات ومبادی کو بجنسہٖ نظم کر دیا جائے بلکہ اسرار وحقائق، فلسفہ وسیاست کو گل وبلبل کی داستان اور حسن وعشق کا فسانہ بنا کر پیش کیا جائے" (مقدمہ نغمۂ دل بشمول افکار سہیل، ص: ۲۰۶، ۲۰۷)

درج بالا اقوال کی روشنی میں اقبال سہیل کی غزل تنقید سے یہ نکات اخذ ہوتے ہیں کہ اقبال سہیل کو غزل میں برتے گئے فرسودہ مضامین، ردیف وقافیہ کے التزام، اور غزل کی ریزہ خیالی پر اعتراض تھا۔ ان کے نزدیک غزل اپنی ہیئت کے مطابق اتنی آسان ہے کہ ہر کس وناکس کو دعوت سخن دیتی ہے، ورنہ اچھی غزل تحریر کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سہیل غزلوں کا تقریباً ۹۹ رفیصد حصہ غرق مئے ناب کر دینے کے حق میں ہیں۔ اسی وجہ سے وہ طرحی مشاعروں کو بھی بند کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں کیوں کہ یہ وہ پلیٹ فارم ہے جو شاعر ومتشاعر دونوں کی تعداد میں کثرت سے اضافہ کر رہا ہے۔ واضح رہے کہ اقبال سہیل صنف غزل کے ایسے مخالف نہیں ہیں کہ "غزل کی گردن بے تکلف مار دینی چاہئے" یا غزل "نیم وحشی صنف سخن ہے"۔ ان کے مطابق تغزل ابہام واشاریت، جذبات انسانی کی مصوری غزل کی خاصیت ہے۔ جس کو مثنوی، مسدس، قطع میں بھی تو ادا کیا جاسکتا ہے۔ اقبال سہیل کو صرف غزل کی ریزہ خیالی سے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک مسلسل غزل کی شکل میں اپنے خیالات کا اظہار زیادہ احسن طریقے سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہاں پر میں اقبال سہیل کے نظریے سے اختلاف کرتی ہوں۔ انسانی جمالیاتی حس قدر غزل کے ایک شعر سے لطف اندوز یا متاثر ہوسکتی ہے نظم یا مسلسل غزل میں اس کی وہ تاثیر باقی نہیں رہتی۔ مثلاً یہ شعر ؎

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

اس شعر کو پڑھ کر اطاعت و فرمانبرداری کا یہ سبق انسانی ذہن پر جو فوری تاثر قائم کرتا ہے وہ مسلسل غزل یا نظم سے ذہن پر مرتسم نہیں ہوتا۔ لہذا غزل کی ریزہ خیالی ہی غزل کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔ جس نے غزل کو بقائے دوام عطا کیا ہے۔

یہاں تک اقبال سہیل کے صنف شاعری سے متعلق ان نظریات پر روشنی پڑتی ہے جو ان کے متفرق مضامین میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاط روح'' کے تبصرہ میں نفس شاعری پر اجمالاً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جس سے شاعری کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ کھل کر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ اقبال سہیل کے تنقیدی نظریات میں استاذ محترم شبلی نعمانی کی جمالیاتی تنقید کی صدائے بازگشت نظر آتی ہے۔ ان کی نظر میں مقدمہ شعر و شاعری اور شعر العجم کے علاوہ اردو میں تنقید کی اور کوئی بہتر کتاب نہیں ہے۔ نفس شاعری پر انھوں نے ''نشاط روح'' کے تبصرے میں جو بحث کی ہے اس کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے بیشتر خیالات استاذ محترم کے خیالات سے لئے گئے ہیں۔ اقبال سہیل کے نزدیک فنون لطیفہ کے اقسام اربعہ میں شاعری کا مقام ہی سب سے بلند تر ہے۔ ان کے مطابق شاعری میں بقیہ عناصر کے محاسن بھی یکجا ہیں۔ اس کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں کہ جہاں ''مصوری و موسیقی کو کوئی دسترس نہیں اور مصور کا قلم صرف ان ہی کیفیات نفسی کی تصویر کھینچ سکتا ہے جن کا اظہار عوارض جسمانی سے ممکن ہے لیکن شاعری کی نگاہ نفس انسان کو ان گہرائیوں تک پہنچاتی ہے جہاں کیف و کم کی گنجائش نہیں، ایک بت تراش کی تخئیل العباد ثلاثہ کے حدود سے متجاوز نہیں ہوسکتی، مگر ایک شاعر عالم قدس تک پرواز کرتا ہے۔ ان کے مطابق ایک مغنی اپنے ترانہء جاں نواز سے صرف روح میں انبساط پیدا کرسکتا ہے مگر ایک شاعر اپنے ترنم سے نفس ناطقہ پر بھی وجد و حال طاری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس نقطے پر اقبال سہیل کے خیالات شبلی کے خیالات کے مشابہ ہوجاتے ہیں۔ اقبال سہیل نے استاذ کے نظریے سے اپنا چراغ تو روشن کیا ہی ہے ساتھ ہی عملی طور پر شعر میں اس کو برت کر دکھایا بھی۔ ان کی مثنوی ''حکایت ہستی'' کا ایک شعر ہے:

بسکہ صہبائے تجلی تھی بہت مینا گداز
خاک کے پتلے کو اس دولت سے بخشا امتیاز

شعر کا مدعا صرف یہ ہے کہ خدائے لم یزل کو دنیا میں خود اپنے حسن کو جلوہ گر کرنا تھا لہذا اس نے

یہ بزم کن فکاں پیدا کی۔ اسی خیال کو غالب نے اپنے مشہور قصیدے کی مطلع میں پیش کیا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

لہٰذا فنون لطیفہ کے ارکان اربعہ میں صرف شاعری ہی اس باریک نقطے کو پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ ہو سکتا تھا۔

اقبال سہیل کے نزدیک شاعری چار چیزوں کا نام ہے۔ موسیقی، بت تراشی یا ایجاد و تخلیق، مصوری، اسرار و معارف۔ ان کے مطابق ہر شاعری میں ان میں سے کم از کم دو خصوصیات کا پایا جانا لازمی ہے۔ علاوہ ازیں جو شاعری ان چاروں عناصر کا مرکب ہوگی اسے شاعری کی معراج کہیں گے۔

اقبال سہیل کے نزدیک اصطلاح شاعری میں موسیقی ان خصوصیات کا نام ہے جہاں کسی کیفیت سے متاثر ہو کر شاعر کی زبان سے ایک شعر نکلتا ہے، اور وہ ان الفاظ میں ادا ہو جن کا تلفظ اور ترکیب باہمی اپنے معنی کی طرف رہبری کر سکے۔ اس کے لئے اقبال سہیل مولانا حالی کے ایک مصرعہ کی مثال دیتے ہیں جو حالی نے ہندوستانی اقوام کو مخاطب کر کے لکھا تھا:

تو نے اے غارت گر اقوام واکال الامم

اقبال سہیل درست فرماتے ہیں کہ اس مصرعے میں ''اکال الامم'' کا لفظ ہی اس قدر بھیانک اور ڈراؤنی تصویر ابھارنے کے لئے مناسب تھا۔ انھوں نے موسیقی کے لئے انتخاب الفاظ کو ضروری خیال کیا ہے۔ ان کے مطابق الفاظ کے انتخاب میں خیال رکھنا چاہئے کہ ''نامانوس نہ ہوں، پامال نہ ہوں، تلفظ میں دشواری نہ ہو، محل استعمال میں سوقیت نہ ہو، الفاظ کو معنی سے مناسبت ہو، مثلاً میت، جنازہ، ناف، جذبات، کشش، ثقل وغیرہ'' الفاظ ان کی نظر میں شاعری کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اقبال سہیل انتخاب الفاظ میں ترکیب الفاظ، ندرت ادا، الفاظ کا محل استعمال، لطافت ذوق و اعتدال وغیرہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق شعر کا خطاب شریف ترین انسانی جذبات سے ہوتا ہے۔ اس لئے شعر کی موسیقی بھی شریفانہ ہونی چاہئے، اراذل و اجلاف میں جس طرح کا گانا بجانا موسیقی سمجھا جاتا ہے، اس سے شائستہ جماعت کا لطف اندوز ہونا تو درکنار بلکہ کراہیت کا باعث ہوتا ہے۔ یہاں پر اقبال سہیل شاعری میں مبتذل اور ادنی خیالات پیش کرنے کی

اجازت نہیں دیتے۔ شبلی بھی شاعری کو اخلاقی تعلیم دینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن اقبال سہیل ان سے ایک قدم آگے نظر آتے ہیں۔

شعروادب کے سلسلے میں اقبال سہیل کا نقطہ نظر افادی ہے۔ وہ شاعر پر پابندیاں عائد تو نہیں کرتے، البتہ کہتے ہیں کہ زمزمۂ نشاط اور نالۂ ماتم دونوں میں ہی خیالات میں یکساں تاثیر کی قابلیت ہے۔ لہذا کشاکش حیات میں زندہ رہنے کے لئے ہم کو رجز خوانی کی زیادہ ضرورت ہے، اس لئے شاعر کو چاہئے کہ وہ اپنے کلام میں ایسے خیالات کا انتخاب کرے جو طبیعت میں سعی وعمل کی روح پھونک سکے۔ یہاں پر اقبال سہیل، شبلی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ شبلی کے مطابق بھی عربوں میں رجز کا ایک مصرعہ ہی ان کے خون کو گرمانے کے لئے کافی ہوتا تھا اور وہ اس سے مرنے اور مارنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اقبال سہیل نے اس کی مثال اصغر کی شاعری سے پیش کی ہے لیکن خود کلیات سہیل میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو

ہماری خاک کا ہر ذرہ اب دوشِ صبا پر ہے
شہیدان وفا رہتے نہیں بارِ زمیں ہوکر

سنی غزل سہیل کی تو بول اٹھے جوہری
یہ نظم ہے کہ اک لڑی لآلیِ خوش آب کی
اللہ ری بہاریں فردوس آرزو کی
خلوت کدے میں دل کے دنیا ہے رنگ وبو کی
زباں پہ یہ پیام ہے، ہر ایک موج آب کی
حیات جس کا نام ہے، وہ خود ہے اضطراب کی

اقبال سہیل کے نزدیک شاعری کے لئے دوسری لازمی چیز بت تراشی ہے۔ ان کے مطابق جس طرح ایک بت تراش پہلے اپنے ذہن میں ایک صورت قائم کرتا ہے اور اس پیکر خیالی کے مطابق ایک مجسمہ گھڑتا ہے اور مجسمہ میں ان ہی پہلو کو زیادہ نمایاں کرتا ہے جسے نمایاں کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے، ہر بت تراش اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی معلومات مجازی بجائے خود مستقل ہوں۔ شاعر کی

حالت بھی بجنسہ یہی ہوتی ہے، وہ اپنی استعدادِ فکری کے تقاضے سے اکثر اختیاری اور کبھی اضطراری کیفیت کو نغمۂ موزوں میں ظاہر کرتا ہے۔ اقبال سہیل کے مطابق کسی شاعر کے ذہن میں شاذ و نادر ہی کوئی نیا خیال پیدا ہوتا ہے۔ شبلی کی طرح وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ پرانے خیالات میں بداعت اسلوب ندرت بیان اور طرفگی ادا سے ہی سحر پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے وہ تین اہم طریقے بتاتے ہیں۔ شاعر پرانے خیالات میں کچھ اضافہ کرکے داد ایجاد دیتا ہے، یا ایک ہی خیال کے ایک پہلو کو بدل کر دوسرا پہلو پیش نظر کردیتا ہے یا پھر دو مختلف خیالات کی ترکیب و امتزاج سے ایک نیا پیکر خیالی پیدا کرتا ہے اقبال سہیل کے مطابق تشبیہ و استعارے کی مدد سے صہبائے کہن کو نئے ساغر و مینا میں پیش کیا جاتا ہے۔ خود کلیات سہیل میں اس بات کا التزام ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جدا ہے سب سے رسم و راہ حسن کے دیار کی نہ قول اعتماد کا، نہ بات اعتبار کی

☆

یہ آنکھیں مدتوں سے خوگر برق تجلی ہیں نشیمن بجلیوں کا ہے مرا کاشانہ برسوں سے

لن ترانی سنیں، جناب کلیم کیجئے اور گفتگو مجھ سے

مصوری کو اقبال سہیل شاعری کا تیسرا اہم جز قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق یہی میدان شاعر کے تخیل کے لئے اصلی جولانگاہ ہے اور یہیں پر ایک شاعر کو اپنے کمال فن کی سحر کاریاں دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ اقبال سہیل فرماتے ہیں کہ مصوری کے دو مدارج ہیں کمال مصوری اور حسن مصوری۔ ان کے نزدیک کمال مصوری میں تخیل کے ساتھ لطافت احساس، قوت مشاہدہ اور صدق اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اقبال سہیل حسن مصوری اور کمال مصوری میں یہ تفریق کرتے ہیں کہ کمال مصوری یہ ہے کہ تصویر خود بول اٹھے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ تصویر کس چیز کی ہے اور حسن مصوری یہ ہے کہ شاعر قصداً واقعیت کا کوئی حصہ حسن تصویر میں قائم رکھے۔ حسن مصوری کے لئے بھی اقبال سہیل سلیقۂ انتخاب، حسن ترکیب اور سلاست مذاق کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ مصوری کی ضمن میں بھی کلیات سہیل میں مثالیں موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

سہیل خستہ کو جور فلک نے گو مٹا ڈالا مگر ہر حرف باقی رہ گیا ارژنگ چیں ہوکر

ہجود شوق کی رعنائیاں ہم سے کوئی پوچھے کہ خود سنگ حرم آتا ہے مشتاق جبیں ہوکر

حشر کس کی بزم ہے یارب کہ دوڑے سر کے بل رند ساغر چھوڑ کر، زہاد منبر چھوڑ کر

تمام فنون لطیفہ سے مزید شے جو صرف شاعری کا خاصہ ہے، اقبال سہیل کی نظر میں وہ اسرار و معارف کے مضامین کے برتنے کا سلیقہ ہے۔ کہتے ہیں کہ "اگر ایک شاعر عالم رنگ و بو سے گزر کر فلسفۂ حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ، مذہب کے اسرار و رموز اور مراحل سلوک و عرفان کی کیفیات کو مجرد اسی ترنم، اسی جدت بیان اور اسی حسن مصوری کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس کی شاعری سحر سے گزر کر اعجاز بن جاتی ہے۔ اس کے لئے وہ شاعر میں بصیرت، تاثیر اور قوتِ بیان کو لازمی جز قرار دیتے ہیں۔ اس کی بھی عمدہ مثالیں کلیات سہیل میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو انسان کے ذہن وقلب پر اپنا دیرپا تاثر قائم کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کسی نے لے لیا خود بڑھ کے آغوش محبت میں ہوا ملک قدم خلوت سرائے حسن امکانی

برق ادا نہ رک سکی، سینۂ موج نور میں فطرتِ اضطراب دل، آ ہی گئی ظہور میں

محشر میں نقش نام محمدؐ نے اے سہیل داغ گنہ کو درہم ایماں بنا دیا

اقبال سہیل نے ان خیالات کے علاوہ شاعری میں تصوف اور اس کے مدارج سے بھی بحث کی ہے اور سرقہ، استفادہ، ترجمہ اور توارد پر بھی تفصیل سے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

اقبال سہیل بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن جب وہ شاعری کی تنقید پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ اس کے مرد میداں نظر آتے ہیں۔ ان کی تنقید کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے کہیں حالی سے تو کہیں شبلی سے استفادہ کر کے اپنے نظریات کی بنیاد ڈالی ہے اور اسی تنقیدی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

☆☆☆☆

اقبال سہیلؔ کے تنقیدی نظریے

احرار اعظمی☆

اقبال سہیل کے تنقیدی نظریے پر گفتگو سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان افکار اور مفکرین کا سرسری ذکر کیا جائے جن سے سہیل متاثر ہوئے ہیں اور ساتھ ہی بیسویں صدی نصف اول میں ان کے ہم عصر اردو کے ان نقاد کے نظریہ نقد کا بھی ذکر کیا جائے جن سے کچھ مناسبت کے باوجود بھی ان کی راہ الگ تھی۔ اس طرح سہیل کے تنقیدی نظریوں کی اہمیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اردو میں باضابطہ جدید نقد ونظر کے سلسلے میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ تینوں صاحبان ادب اور اخلاق کے رشتے اور اقدار پر زور دیتے ہیں۔ شبلی الفاظ کو معانی پر فوقیت دیتے ہوئے فصاحت وبلاغت کے پیمانے کو افضل قرار دیتے ہیں۔ شبلی کے خیال میں ''اصل شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو'' سہیل نے شبلی کے نظریہ نقد سے زیادہ اثر قبول کیا ہے اور وہ الفاظ اور معنی دونوں پر زور دیتے ہیں۔ شبلی کے افکار کا ماخذ عربی نقد ونظر ہے۔ عربی تنقید میں سب سے پہلے عہد عباسی میں جاحظ نے فضیلت لفظ پر زور دیا اور لفظ کو معنی پر مقدم قرار دیا، لیکن وہ معنی کی اہمیت کا بھی اعتراف کرتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں عبدالقادر جرجانی نے جاحظ کے خیال کی تردید کرتے ہوئے شاعری کی جمالیاتی اقدار کا تعلق الفاظ کے بجائے معانی پر بتایا، ابوبکر باقلانی اور ابن رشیق نے لفظ کو جسم اور معنی کو روح سے تعبیر کیا، ان دونوں کے مطابق ایک کو دوسرے کے بغیر دیکھا ہی نہیں جاسکتا، فارسی میں شاعری کی پرکھ کے اصول عربی تنقید کی اسی روایت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس طرح سہیل کا نظریہ شبلی کے توسط سے ابوبکر باقلانی اور ابن رشیق سے جاملتا ہے، علاوہ ازیں انھوں نے علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں مغربی نقد ونظر سے بھی استفادہ کیا ہے۔

☆ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

انیسویں صدی کے اواخر میں عقلیت پسندی کی تحریک کے زیرِ اثر تنقید نے قدر شناسی کو ایک نئی راہ دکھائی۔ ڈرائڈن کے اصولِ تنقید کے مطابق [۱] ہر قوم کی پسند و ناپسند کا اپنا معیار ہوتا ہے جو اس کے ذوق اور اس کی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ [۲] تنقید کے اصول اضافی ہوتے ہیں، انھیں آفاقی نہیں کہا جاسکتا، نہ تو ان کا اطلاق ہر دور پر کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ایک زبان کی ادبی اقدار کی روشنی میں دوسری زبان کے ادب کا مطالعہ صحیح نتیجے تک پہنچا سکتا ہے۔ (۱)

اسی دور کے جمالیاتی اور تاثراتی نقادوں میں آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے مطابق، فن افادہ بخش نہیں ہوتا، وہ صرف حسین ہوتا ہے، اگر وہ مفید ہے تو حسین نہیں (۲) جمالیاتی تنقید کے چند بنیادی اصول اس طرح ہیں

[۱] جمالیاتی تنقید حسن اور اس کے متعلقات کو مطالعے کا موضوع بناتی ہے۔

[۲] جمالیاتی تنقید حسن کی شناخت پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے تشکیلی عناصر کا تجزیہ بھی کرتی ہے۔

[۳] جمالیات کا تعلق فقط شعر و ادب سے نہیں ہوتا بلکہ تمام فنونِ لطیفہ اور ان سب میں مشترک حسن کی قدر جمالیاتی تنقید کا موضوع ہے۔ (۳)

اسی نظریے کے بطن سے رومانیت کا وجود ہوا، بیسویں صدی کی ابتدا سے اردو میں رومانیت کی قلقاری سنائی دی جو جلد ہی رجحان کی شکل میں بدل گئی۔ رومانیت انسان کو سماجی اور تہذیبی پابندیوں سے نجات دلا کر فطرت کی طرف لانا چاہتی تھی اور ہر سطح پر پرانے نظام اور اصول سے بغاوت کے درپے تھی۔ اس کے کچھ بنیادی اصول اس طرح ہیں:

[۱] شاعری کا مقصد سچائیوں کی جستجو نہیں بلکہ مسرت بہم پہنچانا ہے۔

[۲] رومانی تنقید کا بنیادی حوالہ، جذبہ، تخیل اور مسرت ہے۔

[۳] رومانیت کا اصل الاصول ہر قسم کی اصول پرستی اور روایت پرستی کے خلاف بغاوت ہے۔ (۴)

مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے تصورِ فن میں آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کی گونج سنائی دیتی ہے اور ساتھ ہی رومانیت کے اثرات بھی، لہٰذا یہ حضرات تاثراتی نقاد کے ساتھ ساتھ رومانی نقاد بھی ہیں اور یہاں سہیل کی راہ ان سے الگ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ سہیل فن کو افادہ بخش بھی سمجھتے ہیں اور حسین بھی۔

بیسویں صدی ربع اول سے اردو میں سائنٹفک تنقید کے بھی ہلکے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سائنٹفک تنقید، ادب، ادیب اور قاری کو ایک دوسرے سے منسلک رکھتی ہے اور زندگی کے نئے تقاضوں اور بدلتے ہوئے عصری حالات سے رشتہ استوار رکھتی ہے۔ اس میں علمی وادبی فنی زاویہ سے ادبی فن پاروں کا جائزہ لیتے ہوئے تخلیق کے تمام انفرادی اور اجتماعی اسباب کا غیر جانبدارانہ اور معروضی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چوتھی دہائی میں اردو تنقید میں نفسیاتی تنقید کا دور شروع ہوتا ہے، اردو میں نفسیاتی تنقید کو باضابطہ اور اصولی طور پر میراجی نے متعارف کروایا۔ نفسیاتی تنقید میں کسی فن پارہ کا مطالعہ تخلیق کار کی شخصیت اور اس کی ذہنی کیفیات کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ نظریۂ جبلت، نظریہ لاشعور اور نظریۂ تحلیل نفسی اس کے عملی طریقۂ کار ہیں۔ نفسیاتی تنقید میں تحلیل نفسی کے عملی طریقے کو بڑا فروغ ملا۔ یہ وہ طریقۂ کار ہے جس سے انسانی ذہن کی تہہ میں چھپی ہوئی باتوں کا پتا لگایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فرائیڈ اس عمل کا موجد ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۸۱ء میں اس نے اس طریقۂ کار کو علاج کے لئے استعمال کیا اور بعد میں ادب کی پرکھ کے لئے ان اصولوں پر عمل کیا گیا۔ (۵)

میراجی اردو میں پہلے نفسیاتی نقاد ہی نہیں بلکہ پہلے نفسیاتی شاعر بھی ہیں۔ وہ اور ن۔ م۔ راشد کی شاعری کس حد تک گئی تھی اس سے اردو ادب کے قاری خوب واقف ہیں۔ میراجی کے بعد سلیم احمد جو کہ نفسیاتی تنقید کا اہم نام ہے۔ نفسیاتی نقد ونظر پر ان کی کتاب ''نئی نظم پورا آدمی'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی جس میں انھوں نے کہا کہ ''اردو میں زیادہ تر ادیب وشاعر کے یہاں کمر کے بعد کا ''نچلا دھڑ'' (۶) ہے ہی نہیں۔ میراجی اور ن۔ م۔ راشد کے یہاں ان کو پورا آدمی ملتا ہے۔ (۷) اگر ''نچلا دھڑ'' کا ذکر کرنا ہی پورا آدمی ہونے کی دلیل اور نفسیاتی تنقید ہے تو میراجی اور سلیم احمد کے حواریوں کو مبارک ہو۔ یہ نظریہ جنسی ناآسودگی کا غماز ہے۔ پوری نفسیاتی تنقید کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ نفسیاتی تنقید کا وہ عملی طریقۂ کار ہے جسے تحلیل نفسی کہتے ہیں اسے ایک پہلو یا انسانی نفسیات کا ایک رخ کہہ سکتے ہیں، یہ بات پوری نفسیاتی تنقید پر صادق نہیں آتی۔ انسانی نفسیات کے دوسرے بھی رخ ہیں جن کی جھلک بیسویں صدی کے ربع اول میں ہمارے ناقدین کے یہاں ملتی ہے جن میں سے ایک سہیل بھی ہیں، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کے یہاں مشرقی اور مغربی تنقیدی نظریے کا امتزاج ملتا ہے۔

تنقید کی دو قسمیں ہیں، ایک نظریاتی اور دوسری عملی، سہیل کی نظریاتی تنقید ان کے مضامین میں

جا بجا بکھری ہوئی ملے گی، عملی تنقید میں تبصرہ ''نشاطِ روح'' تبصرہ ''جلوۂ صد رنگ'' تبصرہ ''گنجینۂ تحقیق''، خط بنام حضرت سلام ساگری'' اور سیماب اکبر آبادی کی نظم ''موحد اعظم پر ایک تنقیدی خط'' وغیرہ اہم ہیں۔ سُہیل کے تنقیدی نظریے کو ان دونوں قسموں سے جانچنا طوالت کا متقاضی ہے۔ جس کا متحمل یہ مقالہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس مقالے میں صرف ان کی نظریاتی تنقید کے حوالے سے بات کی جائے گی۔

اصغر گونڈوی کے شعری مجموعہ ''نشاطِ روح'' ۱۹۳۵ء، پر سُہیل کا نقد و تبصرہ ان کے جمالیاتی تنقیدی نظریے کی روشن مثال ہے۔ مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے یہاں تاثراتی اور رومانی تنقید کے علاوہ جمالیاتی تنقید کے بھی ہلکے اشارے ملتے ہیں، بعد میں سید عابد علی عابد کی کتاب ''اسلوب'' نے اس نقطہ نظر پر روشنی ڈالی اور پھر شکیل الرحمٰن نے اس طرف خاص توجہ دی، لیکن ''نشاطِ روح'' کے مقدمے سے پہلے اردو ادب میں جمالیاتی تنقید کو علمی اور فلسفیانہ سطح پر اس طرح نہیں برتا گیا جس طرح سُہیل نے سعی کی اور نہ ہی اس وقت تک اردو ادب میں جمالیاتی تنقید کے اصول مرتب کئے گئے تھے۔ اس خیال کو اس طرح بھی تقویت ملتی ہے کہ جمالیات پر مجنوں گورکھپوری کا مقالہ، رسالہ ''ایوان'' ۱۹۳۱ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا اور پہلی بار کتابی شکل میں ''ایوانِ اشاعت'' گورکھپور سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا، جس کے دیباچے میں مجنوں کہتے ہیں:

> ''موضوع کے اعتبار سے ''جمالیات'' ایک بالکل نئی چیز ہے اور اردو کے لئے خصوصیت کے ساتھ۔ ہماری زبان میں جمالیات پر جو کچھ بھی کسی کے قلم سے نکل جائے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔'' (۸)

سُہیل کے جمالیاتی نقطۂ نظر سے شاعری فنونِ لطیفہ کی جامع محاسن ہے اس لئے شاعری میں ان چار عناصر کا ہونا ضروری ہے یا ان میں سے ایک دو صفات کا ہونا لازمی ہے ورنہ وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، وہ چاروں عناصر بالترتیب اس طرح ہیں: [۱] موسیقی [۲] بت تراشی یا ایجاد و تخلیق [۳] مصوری [۴] اسرار و معارف (۹) اور آگے وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر شاعر یہ عناصر اور لطافت پسندی فطرت سے لے کر نہیں آیا ہے تو سعی و اکتساب سے اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ (۱۰) اس کے بعد ان چاروں عناصر کے تحت سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں اور ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اسی نظریے کے تحت اصغر گونڈوی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔

حبیب احمد صدیقی کے مجموعہ کلام ''جلوۂ صد رنگ'' کے تبصرے اور شفیق جون پوری کے مجموعہ کلام ''خرمن عشق'' کے مقدمے میں سہیل نے انسانی نفسیات کے مدنظر ناقد کے معیار نقد اور منصب نقد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق ہر فرد فطرت سے مذاق پسندی کا ایک متعین معیار لے کر آتا ہے، جس کا اثر اس کے دست و قلم کے نقوش پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ کسی شے کے متعلق اپنی پسندیدگی کا معیار مقرر کرنے میں افتادِ مزاج کے علاوہ ماحول کے اثرات اور علمی و فکری استعداد کو بھی ایک حد تک دخل ہے۔ ناقد کی ذمہ داریوں کے علاوہ بھی وہ نقد و نظر کے اس رخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس مراحل سے ناقد گزرتا ہے:

> ''بسا اوقات اپنے ذوق و رجحان کے خلاف بھی بعض سطحی اور نا قابل اعتنا ادبی کاوشوں کی بھی داد دینی پڑتی ہے، دوسری جانب یہ تجربہ جتنا وسیع اور یہ بصیرت جتنی دقیقہ رس ہوتی جاتی ہے، اسی قدر معیار نقد و نظر بلند تر اور دائرۂ انتخاب محدود تر ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دوسروں کے نتائج فکر تو الگ رہے، خود اپنے زادہائے طبع بھی نظر میں نہیں بچتے۔'' (۱۱)

ناقد بھی انسان ہوتا ہے فطرت انسانی سے مفر ممکن نہیں، جہاں اپنی پسند اور معیار نظر آیا تعریف کی اور جہاں اپنے زاویۂ نگاہ سے اختلاف پایا تو، فنکار کے ادبی محاسن کو بھی معائب میں بدل دیا۔ سہیل کے خیال میں سخن گوئی اور سخن سنجی کی حدیں مختلف ہیں، سخن گو صرف اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے لیکن سخن سنج کو اپنی پسند سے قطع نظر کر کے شاعر کے محاسن ادبی کا اندازہ لگانے، اور رد و قبول کا معیار اپنی ذاتی پسند کے بجائے عام فلسفیانہ اور نفسیاتی اصول پر مبنی کرنا چاہئے۔ (۱۲)

گنجینۂ تحقیق کے تبصرے ۱۹۳۱ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور تک کے مغربی تنقیدی افکار سے اردو ناقدوں نے کافی حد تک استفادہ کر لیا تھا۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ تنقید کی دو قسمیں ہیں ایک نظریاتی اور دوسری عملی۔ سہیل پہلی قسم کو ''اجمالی و اصولی'' اور دوسری قسم کو ''جزئی اور تفصیلی'' بتاتے ہوئے ان قسموں کی صراحت اس طرح کرتے ہیں:

> ''ایک میں اصل فن اس کی تدریجی نشو و نما مختلف ادوار میں مختلف تغیرات اور ان تغیرات کے تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی اسباب سے بحث ہوتی ہے، پھر

فلسفیانہ حیثیت سے کسی ادبی تخلیق کے جمالیاتی، نفسی اور اجتماعی پہلو پر نظر کی جاتی ہے۔'' (۱۳)

سہیل نے یہاں تنقید کی پہلی قسم، نظریاتی تنقید کے بارے میں ذکر کیا ہے، اس اصول کے تحت یہ سائنٹفک نظریہ ہے، جو مغربی تنقیدی اصول سے اخذ ہے اور اردو تنقید میں بیسویں صدی ربع اول تک اس کے نمونے کم کم ہی نظر آئیں گے۔ آگے وہ تنقید کی دوسری قسم پر روشنی ڈالتے ہیں جو مشرقی تنقید کے اصول رہے ہیں، جس کی عمدہ مثال شبلی کے یہاں ملتی ہے:

''دوسری قسم تنقید اصولی اور عمومی مباحث سے اگرچہ قطع نظر ممکن نہیں ہے مگر زیادہ توجہ جزئیات پر صرف کی جاتی ہے اور اسی سے مصنف کے نتائج فکر کو لے کر اس کے معانی ومطالب کی توضیح اور محاسن ومعائب کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایک ایک خدوخال سامنے آجائے، مثلاً الفاظ کی فصاحت یا ثقل، تراکیب کی چستی وروانی، یا تنافر وتعقید، تخیل کی بلندی یا پستی، طرز ادا کی ندرت یا سوقیت ایک ایک کر کے دکھائی جاتی ہیں اور بعض اوقات دوسرے اساتذہ کے ہم رنگ کلام سے موازنہ کیا جاتا ہے یا دوسرے ناقدین کے آرا و خیالات پر محاکمہ ہوتا ہے۔'' (۱۴)

اس دور کے اردو ادب میں ان تنقیدی مضامین کی کثرت تھی جس میں تعصب، مخاطب کی تحقیر یا ضرورت سے زیادہ تعریف وستائش، ذاتیات سے بحث اور اپنی بات کی برتری پر زور دیا جاتا تھا۔ محاسن ومعائب کا اظہار تعصب یا ہمدردی کے تحت ذاتی پسند پر ہوتا تھا۔ سہیل کے مطابق تنقیدی عبارتیں تصنع اور تکلف سے پاک ہونی چاہئیں، جو کچھ لکھا جائے وہ دیانتِ نقد، منصفانہ اور محققانہ ہو۔ اس طرح کے مضامین اگر ذاتیات سے علاحدہ ہوکر صحیح تنقیدی معیار کے مطابق لکھے جائیں تو منتہیوں کے لئے بہترین دماغی تفریح اور مبتدیوں کے لئے مفید ترین درس بصیرت ہوسکتے ہیں۔ ان باتوں سے سہیل کے اس نظریے کی وضاحت بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے تاثیر اور تنقید کو مختلف شعبہ قرار دیتے ہوئے تاثیر، تاثر اور تنقید کے فرق پر کچھ اس طرح اپنی رائے دی ہے:

''تاثیر وتنقید دو مختلف شعبے ہیں جو ایک دوسرے سے بمراحل دور ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک نغمۂ دلکش میری روح پر رقص پیہم کی کیفیت پیدا کرے، لیکن یہ

ضروری نہیں کہ اس نغمہ کی تاثیر اور میری روح کے تاثر میں جو ربط معنوی ہے، اس پر میں حکیمانہ اور فلسفیانہ نظر بھی رکھتا ہوں، یا اس کے مخفی اسباب وعلل کو الفاظ میں ظاہر کرنے پر بھی قادر ہوں۔'' (۱۵)

سہیلؔ کے ان نظریوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس دور اور اس سے پہلے کے بیشتر تنقیدی مضامین پر تاثر کا غلبہ نظر آتا ہے اور وہ مضامین، تنقید کے بجائے تنقید نما معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سہیلؔ کے یہاں غزل اور اس کے مضمون پر مثبت اور منفی دونوں نظریے کا اظہار کئی موقعوں پر ملتا ہے اور حالی کی طرح وہ بھی غزل کی اصلاح کے حامی تھے۔ غزل کی حمایت میں ان کا نظریہ کچھ اس طرح ہے:

(۱) غزل صرف حسن وعشق کی محاکات اور فطری جذبات کی عکاسی نہیں ہے۔ (۲) بے ربطی اشعار اور پابندی ردیف وقافیہ کی بنا پر تغزل کی تحقیر صحیح نہیں ہے۔ (۳) غزل کو صرف جنسی جذبات کی مصوری کا آلۂ کار سمجھنا اس صنف کی توہین ہے۔ (۴) قافیہ وردیف کی پابندی اظہارِ خیال میں سدِ راہ ہیں مگر یہی زنجیر بے راہ روی اور یاوہ گوئی سے بچاتی بھی ہے۔ (۵) قادر الکلام شاعر دنیا کا ہر مضمون غزل میں ادا کر سکتا ہے۔ (۱۶)

سہیلؔ کے مثبت نظریے کی روشنی میں غزل کی سات سو سالہ تاریخ پر غور کیا جائے تو صداقت واضح ہو جاتی ہے، یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ انھوں نے شعر کے بجائے غزل میں مضمون ادا کرنے کی بات کی ہے، کیوں کی ہے؟ اس کا جواز بھی وہ پیش کرتے ہیں جس کا ذکر غزل کی اصلاح کے ضمن میں آگے آئے گا۔ علاوہ ازیں جو غزل پر انھوں نے اعتراضات کئے ہیں اس کا ماحصل اس طرح ہے کہ [۱] صرف غزل کو شاعری کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (۱۷) [۲] غزل نے جہاں زبان وادب کی ترویج واشاعت میں مدد دی ہے، وہیں بدترین نقصان بھی پہنچایا ہے۔ [۳] غزل کی وجہ سے روز بہ روز گندے لٹریچر کا انبار لگ رہا ہے اور تخریب اخلاق کے اسباب میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ [۴] غزل، ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے غیر فطری اور مصنوعی ہے اور تمام اصنافِ نظم میں سب سے زیادہ قابل اصلاح ہے۔ (۱۸) غزل کی تکنیکی کمزوری پر ان کا نظریہ غور طلب ہے:

''الفاظ محض ادائے معنی کا ذریعہ ہیں، نہ کہ تخلیق معانی کا سبب، اس لئے بلحاظ

ترتیب عمل انسانی دماغ میں پہلے خیال آنا چاہئے، پھر اس کے لئے موزوں عبارت اور موثر پیرایۂ بیان تلاش کرنا چاہئے۔۔۔۔۔غزل گوئی کی وہ دنیا ہے جہاں لفظ اپنے لئے معانی کی تلاش کرتا ہے، یہ طریقہ خلاف فطرت ہونے کے علاوہ اتنا مصنوعی ہے کہ ہر کس و ناکس تھوڑی سی محنت کے بعد شاعر ہو جاتا ہے۔" (۱۹)

لکھنؤ کی غزلیہ شاعری جس میں ڈوبی ہوئی نبضیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں، نزع کی ہچکیاں، نوحہ گروں کی سینہ کوبیاں، تابوت و مرقد، جنازہ و کفن اور زندہ در گور ماتمیوں کی بدمذاقیاں کے علاوہ، سوقیت، ابتذال، حیاباختگی، عریاں نگاری، تصنع اور نسائیت، جو لکھنؤ اسکول کی خصوصیات ہیں۔ (۲۰) سہیل کو ان سب سے نفرت تھی جس کا اظہار انھوں نے کئی موقعوں پر کیا ہے۔ رسالہ "ادیب" دہلی کے مدیر کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ پورب کا رہنے والا ہوں، اور قرب مکان کا تقاضہ تو یہ تھا کہ مجھ کو لکھنؤ سے دلچسپی ہوتی لیکن لکھنؤ کا تمدن، اس کی زبان، اور معاشرت جن افسوسناک تاریخی واقعات کی یادگار ہیں اور اس کے ہاتھوں ہندوستان میں اسلامی سیادت، اسلامی اخلاق، اور اسلامی روایات کو جو نقصان پہنچے ہیں، اس کی بنا پر لکھنؤ اور متعلقات لکھنؤ سے ایک طرح کی کراہت سی پیدا ہو گئی ہے۔" (۲۱)

سہیل غزل کے تخریبی پہلو کو ختم کرنے اور غزل کی اصلاح کے خواہاں تھے۔ غزل کو، وہ "مجذوب کی بڑ" اور "بے وقت کی راگنی" نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ "غزل کی گردن مارنے" کے حق میں بھی نہیں ہیں اور نہ ہی اسے "نیم وحشی صنف سخن" قرار دیتے ہیں۔ غزل کی اصلاح کے لئے ان کی رائے میں، طرحی مشاعروں کو قطعاً بند کر دینا چاہئے اور غزل کہی جائے تو اس میں کوئی مکمل خیال پیش نظر رکھ کر مسلسل غزل کہی جائے۔ منفرد اور حکیمانہ خیالات کو لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ مختصر غزلوں میں یکجا کیا جائے۔ محض غزل پر سرمایۂ شاعری محدود کرنے کے بجائے دیگر اصناف کے رواج پر بھی توجہ صرف کرنی چاہئے۔ وہ اپنے دور میں حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کی غزل گوئی سے کسی قدر مطمئن نظر آتے ہیں۔ پھر بھی حسرت کے ابتدائی کلام میں معاملہ بندی اور فانی کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں میت و جنازہ کے مضامین کی کثرت کو غلط ماحول کے نتائج اور قابل حذف عناصر قرار دیتے ہیں۔ (۲۲) خط بنام حضرت

سلام سا گری میں سہیل نے نفس شاعری پر اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے:

''..... تمام اقسام نظم میں سے غزل کو سب سے زیادہ نا قابل التفات بلکہ ایک حد تک مضر، ترقی ادب میں مانع اور شاعر کی سخنورانہ صلاحیت کے نشو ونما میں حارج سمجھتا ہوں۔ نفس تغزل بشرطیکہ معیار اخلاق سے فروتر نہ ہو، معنوی حیثیت سے بجائے خود معیوب نہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ غزلوں کے رواج عام نے اگرچہ فن کو بڑی حد تک نقصان پہنچایا مگر زبان کی ترویج میں بڑی مدد دی۔'' (۲۳)

شاعر کے تعلق سے سہیل کے تنقیدی نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ [۱] شاعر مخرب اخلاق نہ ہو بلکہ بلندی اخلاق کی روح اس میں موجود ہو۔ [۲] شاعر کا خطاب صرف اپنی ذات سے ہو۔ (۳) شاعر بازی گر نہیں جو دوسروں کے تاثرات کی نقالی کرے۔ (۴) شاعر کوئی تاجر ہے نہ خطیب جو کسی مالی یا ملی مقصد کو پیش نظر رکھے یا گاہکوں اور حاضرین مجلس کی رضا جوئی اس کا مقصود ہو (۵) تاثر کا ظہور قدرتی طور پر تاثیر کا ضامن ہو، لیکن یہ تاثیر شاعر کا مقصد نہیں (۲۴)۔ (۶) شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے موضوع شعر کی تمام تفصیلات ایک فلسفی کی طرح پیش کرنے کی کوشش کرے۔ (۷) شاعر کا روئے سخن جذبات کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا اس کو صرف ایک تاثر انگیز پہلو دکھا کر گزر جانا چاہئے۔ شعر کی معنوی ترسیل کے لئے ان کا یہ مشورہ قابل قبول ہے: (۲۵)

''بسا اوقات شاعر کا موضوع سخن ایک ایسی بے کیف وکم اور نا قابل اظہار حقیقت ہوتی ہے جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتی، وہاں شاعر کی مصوری صرف اس قدر ہے کہ اپنے موضوع شعر کی طرف دور سے ایک اشارہ کر کے مخاطب کے احساسات وادراکات کو اسی طرف مائل کردے اور جو کچھ شاعر نے دیکھا تھا اگر ٹھیک وہی نہیں تو قریب قریب وہی چیز شاعر کے مخاطب کو بھی نظر آنے لگے۔'' (۲۶)

قاری یا سامع کی نفسیات کو نظر میں رکھ کر کہتے ہیں کہ ہر کسی کے رجحانات وعواطف مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص شاعر کے ہر خیال سے متفق ہو، یا اس کے حسیات کا صحیح ادراک کر سکے۔ (۲۷)۔ مذکورہ بالا اقتباس اور سہیل کے ان خیال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قاری یا سامع اور شاعر وادیب کے درمیان رد وقبول کا تصور اردو ادب میں پہلے سے تھا اور یہی نظریہ مغربی

تنقید کے ذریعہ اردو تنقید میں قاری اساس تنقید کو استحکام دینے میں معاون ثابت ہوا۔

سہیلؔ کے خیال میں شاعری کا تعلق محض حسیات وجذبات سے ہے۔ شاعری کسی خارجی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کرنا مفہوم شعر کے منافی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر شاعر کسی قومی، مذہبی، ملکی یا اخلاقی ولولہ سے سرشار ہے تو لازمی طور پر یہ رنگ اس کی شاعری میں بھی نمایاں ہوگا۔ کیوں کہ شاعری شاعر کی باطنی کیفیات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اسی طرح فلسفہ وحکمت یا نفسیات وتصوف کی مصطلحات کا بے ضرورت اعادے کو بھی وہ صحیح نہیں سمجھتے بلکہ حقائق ومعارف کو گل وبلبل کی زبان اور بادہ وساغر کے رنگ میں پیش کرنے کو کمالِ شاعری سمجھتے ہیں۔ (۲۸)

بیسویں صدی نصف اول تک اردو میں مغربی ادب کے زیر اثر جو ادب پروان چڑھا اس سے کون واقف نہیں ہے۔ سہیلؔ جدید رجحانات، جدید رنگ یا جدید اسلوب شاعری اور لٹریچر کے مخالف نہیں ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ اس میں جو بھی تبدیلی وتغیر ہو وہ اصلاحی وتدریجی ہو نہ کہ تخریبی اور غیر معتدل۔ کورانہ تقلید اور اندھا دھند تجدید صحت مذاق کی علامت نہیں سمجھتے اور اس پر تعرض کرنا ان کے نزدیک قوم کے مذاق ادبی کو گمرہی سے بچانا ہے جسے وہ ارباب بصیرت کا فرض سمجھتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۵ء کے درمیان ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ اردو ادب پر کہتے ہیں:

> ''سرمایہ داروں پر تبرا، مزدوروں اور کسانوں کی مظلومیت پر مصنوعی فریاد وبکا، مذہب سے بغاوت، غلط اور بے محل لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال، فنی ضوابط سے بے گانگی، ادعائے تہذیب کے باوجود اظہار خیال میں حیاسوز عریانی، غرض ہر طرح کی ادبی، اخلاقی اور معاشرتی گمراہیوں کا نام ترقی پسند ادب رکھ لیا گیا ہے۔ تنقیدات ادبی بھی اسی ہذیانی کیفیت سے متاثر ہوتی ہیں، ہر شاعر کے کلام میں اس کے مخصوص پیام کی تلاش ہوتی ہے، گویا ہر شاعر ایک مختصر سانبی فرض کرلیا گیا۔'' (۲۹)

سہیلؔ ترقی پسند ادب کو قدیم رنگِ تغزل کی جدید پیداوار مانتے ہیں جو مغربی لباس میں جلوہ گر ہے۔ اس میں وہی عریانی اور فحاشی ہے جس کو ترقی پسندوں نے نیا ادب کہا اور ادب کو زندگی سے ہم آہنگ بتایا ہے۔ لیکن سہیلؔ اسے ناقابل عفو جرم قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں زندگی کے تمام اعمال ووظائف اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ برسر عام عمل میں لائے جائیں، بعض فطری فرائض ایک دوسرے

کے سامنے انجام نہیں دیے جاسکتے:

"فطرت کے بہت سے جائز مقتضیات اپنے ظہور کے لئے خلوت واخفا کے طالب ہوتے ہیں اور زندگی کے بہت سے حقائق زبان وقلم تک اس لئے نہیں لائے جاتے کہ انسان کا ملکۂ حیا اس کو گوارا نہیں کرتا، یا قومی تہذیب ان کو مسلمہ معیار اخلاق سے فروتر سمجھتی ہے، ورنہ حضرت چرکین کو نئے ادب کا معلم اول ماننا پڑے گا۔" (۳۰)

یحییٰ اعظمی کے شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے ترقی پسند ادب پر ان کا تنقیدی نظریہ طنزیہ لہجہ اختیار کر لیا ہے سہیل نے نظم معریٰ کی اصطلاح کہیں پر استعمال نہیں کی، ہر جگہ نثر مرجز یا غیر مقفیٰ نظم کہا ہے اور ان کے انداز سے لگتا ہے کہ انھوں نے آزاد نظم کو کبھی قبول نہیں کیا اور ترقی پسندوں کا خاص موضوع، مزدور اور مفلس کسان کو وہ فرض ماتم خیال کرتے ہیں۔ یحییٰ اعظمی کے کلام کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس میں صرف ان احساسات کا اظہار ہوا ہے جن کے لئے اسلامی اخلاق یا ایشیائی تہذیب مانع نہ ہوں۔" (۳۱)

بیخود موہانی کی تصنیف "گنجینۂ تحقیق" نقد و تحقیق پر بے مثل کتاب ہے جس کی خوبی اور خامیوں پر سہیل کی آرا بڑی عالمانہ ہے۔ وہ سخن گوئی اور سخن فہمی کو دو جداگانہ مراحل مانتے ہیں اور اس کا اجتماع لازمی قرار نہیں دیتے۔ ان کے مطابق سخن گوئی کے لئے طبیعت کی مناسبت اور ذوق سلیم کافی ہے مگر سخن فہمی کے لئے وسعتِ علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

سہیل کے مطابق شاعری کے تین پہلو ہو سکتے ہیں: پہلا پہلو اضطراری یا ذاتی ہے، جس میں شاعر کا مخاطب خود اس کا نفس ہے، یعنی یہ شاعر کے اندرونی جذبات کا بے اختیارانہ اظہار ہے۔ جس میں شاعر کا مقصد دوسروں کو متاثر کرنا نہیں ہوتا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ شاعر دیدہ ودانستہ ان جذبات کا اظہار کرتا ہے جن کی تبلیغ مقصود ہوتی ہے۔ شاعر کا خطاب دوسروں سے ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالات اور احساسات سے دوسروں کو متاثر کرنا چاہتا ہے لیکن بظاہر کسی سے مخاطب نہیں ہوتا۔ تیسرا پہلو افادی شاعری کا ہے جس میں شاعر بغیر کسی نقاب کے واعظ، ہادی، یا مبلغ کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنا پیام دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ (۳۲)

سید شمیم احمد فطرتؔ واسطی کے مجموعۂ کلام ''حدیثِ حسن'' کے مقدمے میں شاعر اور شاعری کے تعلق سے سہیل کی رائے قابلِ توجہ ہے، مقدمۂ دیوان حالیؔ اور ''شعر العجم'' کے بعد اردو میں نفسِ شاعری پر کثرت سے مضامین لکھے گئے، بقول سہیل ''یہ مرض وبائے عام کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے'' اور اس بات پر زور دیا گیا کہ شاعری کا کوئی مقصد اور شاعر کا کوئی مخصوص پیام ہونا چاہیے، اور آگے چل کر ترقی پسند تحریک کا یہ نصب العین رہا ہے کہ ادب برائے زندگی ہونا چاہیے۔ سہیل کے خیال میں شاعری کی نزاہت جمال مادی فوائد اور تجارتی مقاصد کا تحمل نہیں کر سکتی۔ ان کے نزدیک شعر اس نغمہ بے تاب کا نام ہے جو جذبات کے تموج سے خود بہ خود پیدا ہوتا ہے۔ (۳۳) اسی طرح وہ نظم اردو کی تجدید و اصلاح کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ اس کی اصلاح بتدریج ہونی چاہیے تھی نہ کہ جدت کا رنگ اختیار کرنے میں باغیانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ ان کے خیال میں اصلاح اس طرح ہونی چاہیے:

> ''اصلاح کے لئے تدریج اور تنوع کے لئے ہم آہنگی کامیابی کی کلید ہے، کسی ملک یا جماعت میں جو مذاق متوارث ہوتا ہے اس کو دفعتاً محو کر دینا انفرادی کیا اجتماعی کوشش سے بھی ممکن نہیں ہے، اس کے دو وجوہ ہیں، اولاً تو جو خیال یا مذاق قبولیت عامہ کی سند حاصل کرتا ہے اس میں خود بھی کچھ محاسن ہوتے ہیں اور وہ ملکی حالات اور آب و ہوا سے مطابقت اور طبائع سے مناسبت رکھتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ فوری تغیر سے انسان کے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگتی ہے اور اپنی غلطی کا آسانی سے اعتراف کر لینا انسانی فطرت کو گوارا نہیں ہوتا۔'' (۳۴)

حالانکہ یہ بات انھوں نے نظم بے قافیہ یعنی نظم معریٰ کے ضمن میں کہی ہے لیکن ان کی پوری گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات ان تمام ہیئتوں اور موضوعات کے لئے کہی گئی ہے جس میں نامانوس خیالات اور طرزِ ادا میں اجنبیت پائی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں اس طرح قبولیت کی توقع رکھنا عبث ہے، لیکن جن لوگوں نے اندازِ بیان قدیم قائم رکھتے ہوئے خیالات میں تنوع یا جدت پیدا کی انھوں نے مفتیانِ قدیم کی مخالفت کے باوجود بھی قبولیت عامہ کی سند حاصل کر لی۔ (۳۵) سہیلؔ کا تنقیدی شعور قابلِ تحسین۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بجا فرمایا کہ ''علی گڑھ میں شعر اور تنقید و ادب کے امام سہیل تھے'' (۳۶) یہی بات رشید احمد صدیقی قدرِ تفصیل سے اس طرح کہتے ہیں:

''شعروادب کا صحیح وصالح ذوق پیدا کرنے، تنقید کا علمی انداز عام کرنے، نیز گفتگو اور روزمرہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کردی تھی۔'' (۳۷)

۱۹۴۴ء میں (۳۸) کانپور کے ایک مشاعرے کی صدارت میں انھوں نے ہندوستان کے لسانی مسائل پر جو خطبہ دیا تھا اور اس میں انھوں نے اردو ہندی کے مسائل اور ان کے حل کے لئے جو رائے اور نظریہ پیش کیا تھا اگر اس پر عملی اقدام کئے جائیں تو ان دو زبانوں اور دونوں قوموں کے درمیان جو متعصبانہ رویہ ہے اسے اتحاد و اتفاق میں تبدیل کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے صدیوں سے اپنے اپنے طور پر کوششیں ہوتی آرہی ہیں۔ ان دونوں قوموں میں علماء اور ادباء کا ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو اپنی نیک نیتی اور ملکی ہمدردی کے تحت اردو اور ہندی زبان کے مسائل اور ان کے حل پر غور و خوض کرتا رہتا ہے تا کہ ان دونوں زبانوں اور قوموں کے درمیان تعصب کو اتحاد و اتفاق میں تبدیل کیا جاسکے۔ کچھ مفکرین کا خیال تھا کہ ان دونوں زبانوں کو آپس میں ملا کر ایک متحد زبان قائم کی جائے، اس کار خیر کے لئے کئی انجمنوں نے اپنے اپنے طور پر لائحہ عمل تیار کیا۔ ہمارے مفکرین کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو دونوں زبانوں کو ملا کر ایک نئی اصطلاح ''ہندوستانی'' ایجاد کرنا چاہتا تھا جس کے لئے وہ دونوں زبانوں کے الفاظ میں تبدیلیوں کا خواہاں تھا۔ مثلاً سایہ، کو چھاؤں یا چھایا، ریت کو ریتی، ہاتھی کو ہستی اور دیہاتی گنوار کو گرامی وغیرہ۔ اس طرح ان لوگوں کے خیال میں دونوں زبانوں کو آپس میں ملانے سے ہندوستان میں متحدہ زبان کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔

سہیل کے خیال میں یہ نظریہ بالکل غلط تھا، جس کی تردید میں ان کا جواز یہ ہے کہ اول تو بول چال میں یہ مشترک تو ہیں لیکن ادب اور انشا کے تعلق سے یہ دونوں زبانیں بالکل علاحدہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے زبان کی تعمیر و تشکیل میں اپنی عمریں صرف کی ہیں وہ کبھی یہ پسند نہیں کریں گے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی دیگر معروف زبانیں جیسے بنگالی، سندھی، کشمیری، پنجابی، تامل اور تیلگو وغیرہ کبھی اس کو قبول نہیں کریں گی۔ لہٰذا وہ زبانوں کی ظاہری شکل کی تبدیلی کو زبانوں کے اتحاد کا علاج تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے دلوں کا اتحاد ہونا چاہئے، زبان کا اتحاد خود بخود ہو جائے گا۔ سہیل کے نظریے کے مطابق ان دونوں قوموں کے لئے ایک دوسرے کی

روایت اور تہذیبی سرچشموں کا جاننا ضروری ہے۔ ایک دوسرے کی تاریخ، تمدن اور علوم کا ہمدردانہ مطالعہ کریں اور اپنی زبان میں لائیں۔ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ رامائن اور مہابھارت کے واقعات اور ویدانت کے فلسفۂ توحید کو دلکش طور پر اردو نظم ونثر میں ادا کریں۔ ہندو صاحبان اسلامی تاریخ اور اکابر اسلام کے کارنامے، ہندی نظم اور نثر میں شائع کریں۔ اس طرح دونوں طرف کی کوششوں سے دونوں زبانوں کو اظہار خیال کے لئے ایک نئی دنیا ہاتھ آئے گی۔ اس کے لئے یہ خیال رکھنا ہوگا کہ طرفین کو فطری طور پر زبان عام فہم اور دونوں زبانوں کے عناصر سے مخلوط رکھنی پڑے گی۔ اس طرح دونوں میں باہمی اعتماد اور خلوص ترقی کرے گا اور دونوں کا ادب ایک دوسرے سے قریب ہوتے جائیں گے۔

اس دور میں لٹریچر کے ذریعے بھی دونوں زبانوں اور قوموں کو قریب کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، مثلاً ترجمہ اور ناٹکوں کے ذریعہ جیسے کالی داس کی ''وکرم اروسی'' کا ترجمہ عزیز احمد نے کیا تھا اور اسی طرح کئی بنگالی زبان کے ناول اردو میں منتقل کئے گئے۔ سہیل کے مطابق اس طرح قومی اتحاد کا قصر تعمیر نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی زبانیں متحد ہوکر ایک دوسرے سے قریب ہوسکتی ہیں۔ ان کے خیال میں محض بازاری عشق کے افسانے کسی زبان کو ادب یا لٹریچر نہیں بناتے۔ یہ درجہ حاصل کرنے کے لئے زبان کو علمی خیالات کا ذریعہ اظہار بنانا ہوگا۔ قبولیت اور افادیت کے لئے صحیح مذہبی یا قومی جذبات کی ترجمانی کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں، وطن کے ہر طبقہ میں اس کی قبولیت حاصل کرنے کے لئے ہر جماعت کو انفرادی حیثیت کے بجائے قومی اور مذہبی حیثیت سے زبان میں دل چسپی کا سامان فراہم کرنا ہوگا۔ جس کے لئے ان کا مشورہ ہے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں میں ہزاروں ایسی بلند مرتبہ شخصیتیں گزری ہیں جن کا لوگ احترام کرتے ہیں اور ان سے عقیدت رکھتے ہیں، اگر ان ممدوحین کے کارنامہ ہائے فخر ہم اپنی نظموں کا موضوع بنالیں اور حدود جائز کے اندر ان کا احترام کریں تو یہ طرزِ عمل قومی اخلاق کی تشکیل اور وطنی اتحاد کی تعمیر میں معاون ثابت ہوگا۔ یہاں قوموں کے درمیان اختلاف، مذہب نہیں بلکہ صحیح مذہب سے بے گانگی کا باعث ہے۔ ان کے خیال میں مذہب کے تعلق سے کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے، فرق صرف تعبیر کا ہے۔

لکھنؤ میں اہلِ سنت جماعت نے مدح صحابہؓ پر سالانہ آل انڈیا مشاعرے کا سلسلہ شروع کیا

تھا، افکار سہیل میں ان کے دو صدارتی خطبے شامل ہیں (۳۹) جن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء کے درمیان انھوں نے چار بار صدارت کا فریضہ انجام دیا۔ سہیل کے صدارتی خطبوں کے مطالعے سے ان مشاعروں کے انعقاد کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ دراصل اس دور میں ترقی پسند ادب کے نام پر مارکسی نظریے کے تحت نوجوان نسل میں مذہب بیزاری عام ہوتی جارہی تھی اور وہ مسلمان جو مذہبی اور قومی سطح پر اپنی عظمت گزشتہ کو یکسر فراموش کر چکے اور ذہنی طور پر پستی و تنزلی کا شکار تھے، ایسے میں انھیں جماعت اہل سنت والے مشاعرہ مدح صحابہؓ کے ذریعے، صفات صحابہؓ کے کارنامے یاد دلا کر اپنی قوم کے ایمان کو پھر سے تازہ کرنے کی سعی کررہے تھے۔ سہیل کو مسلمانوں کے حالات اور سیاست وادب کے گمراہ کن مسائل کا احساس تھا۔ ان کے خیال میں ''مدح صحابہؓ'' کا مشاعرہ اس مسموم فضا کے لئے تریاق کا کام کرے گا اور نوجوان شعرا کا ذوق سخن صحیح اور مفید ادبی خدمت کی طرف مائل ہو سکے گا۔ نغمہ کی تاثیر اور نظم کی دل پذیری کی اہمیت کو نظر میں رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ تاریخ اسلام کو حقیقی معنوں میں زندہ رکھنے کی سب سے زیادہ موثر شکل یہی ہے کہ مدح صحابہؓ کے مشاعرے بکثرت منعقد کیے جائیں۔

بیسویں صدی کے نصف تک اور دو عالمی جنگوں کے درمیان قائدین و فاتحین کو جس طرح ہیرو بنا کر ان پر نظمیں لکھی جاتی تھیں، سہیل کے خیال میں اس سے بہتر ہے کہ خلفائے راشدین کا طرز حکومت، طرز زندگی، عدل وانصاف اور صحابہ کرام کے طریق جہاد کو اپنے لئے شمع ہدایت بنائیں۔ غیر مذہبوں کے ساتھ مساویانہ اور برادرانہ سلوک اور دشمنوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنا یہ سب وہ مثالیں ہیں جن کی مثال پیش کرنے سے دنیا آج عاجز ہے۔ ایسے میں مشاعرہ مدح صحابہؓ انسانیت کی خدمت ہوگی۔

۲۰۱۶ء میں ایک تیرہ سال کی بچی مریم عارفہ صدیقی، بھگوت گیتا چمپئن شپ مقابلے میں اول آئی تھی، جس نے اسٹار پلس، ایچ ڈی، ٹی۔ وی، کے ایک پروگرام میں سنسکار کے تعلق سے کہا کہ ''ٹیکنالوجی آگے بڑھے گی، وہ کہیں رکنے والی نہیں ہے لیکن جو سنسکار ہیں وہ کہیں نہ کہیں رک جاتے ہیں ٹیکنالوجی کی وجہ سے'' بہت اچھی بات کہی ہے اس بچی نے، اس کے افکار اس کی صحیح تربیت کی سمت اشارہ کررہے ہیں اور جب اس کے والد آصف صدیقی سے پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ ''جب مریم آٹھ سال کی تھی تو اسی وقت سے میں نے اسے سبھی گرنتھوں کے بارے میں جانکاری دینا شروع کی،

میرا اپنا خیال ہے کہ ہم دھارمک بعد میں بنیں، پہلے انسان بنیں اور ہم کوئی بھی دھرم پال رہے ہوں، اپنے گھر کے اندر۔ میں اسلام کا ماننے والا ہوں اپنے گھر کے اندر۔ جب میں دروازے سے باہر نکلوں میرے ساتھ ایک دھرم ہونا چاہئے وہ ہے انسانیت کا۔ اور یہی میں مریم کو دینا چاہتا ہوں۔'' (۴۰)

ہمارے ملک میں اکثریت آصف صدیقی جیسے لوگوں کی ہے جو انسانیت کو ایک الگ دھرم سمجھتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو دھرم میں انسانیت تلاش کرتے ہیں۔ اول الذکر مذہبی کتابوں کو صرف عبادت کی غرض اور ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ آخر الذکر کتابوں کے ان اقوال پر بھی توجہ کرتے ہیں جس میں انسانیت اور اخلاق کا درس موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے درمیان شعرا وادباء کی ایک بڑی جماعت وسیع المشربی کی دھن میں لادینیت کا شکار ہوئی۔ اور شبلی کی دوررس نگاہوں نے آنے والے وقت کا پہلے ہی اشارہ سمجھ کر ان سے سیرت اور سوانح پر کام کروایا، اور سہیل نے اپنے صدارتی خطبوں میں اسی نظریے کی وضاحت کی۔ ان کا یہ شعر بھی اسی نظریے کی دلیل ہے:

وطن پیارا ہے ہم کو، دیں مگر اس سے بھی پیارا ہے
فدا ہوں گے وطن پر رہ سکے گر ہم مسلماں بھی

اور علامہ اقبال نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی نظریے کی طرف اشارہ کیا ہے:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یعنی اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہر مذہب میں انسانیت، اخلاق، اخلاص، رواداری، مساوات، ایمان داری اور عدل وانصاف کی تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم اپنی عملی زندگی میں بھی مذہب سے جدا ہو کر یا صرف انسانیت کے سبق کو الگ سے ایک دھرم مان کر ترقی نہیں کر سکتے اور نہ ہی ملک وقوم کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ گمراہ کن خیالات تصوف میں بھی در آئے ہیں جس سے اکثر علماء نے اختلاف کیا ہے اور سہیل نے بھی۔ لیکن اپنی شاعری میں ضرورت کے مطابق صوفیانہ رنگ بھی اختیار کیا ہے۔ شاید اس لئے کہ ''بنتی نہیں ساغر و مینا کہے بغیر'' شاہ معین الدین احمد ندوی نے کہا ہے کہ ''وہ (سہیل) تصوف کے سخت خلاف تھے'' (۴۱) یہ بات سہیل کے اس طنزیہ قول سے بھی واضح ہے:

''قرآن کی صراحت ہے کہ آدم کو اجنہ اور ملائکہ پر تفوق محض علم اسماء کی

بنا پر ہوا، تسبیح و تہلیل الٰہی تو ملائکہ کی فطرت ہی میں داخل تھی پھر آخر وہ کون سے فنون تھے جن کا درس ابلیس کے سپرد تھا، غالباً تصوف ہوگا۔'' (۴۲)

موج کوثر میں اکرام کے اس قول کو ''نئی نسل پر سرسید سے زیادہ شبلی کا اثر ہے'' آل احمد سرور درست قرار دیتے ہوئے سہیل کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''شبلی کی مشرقیت، شبلی کا جذبہ حریت، ان کا تبحر علمی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ شوخی اور نکتہ سنجی جس طرح مولانا سہیل کے یہاں آئی ہے اور کسی کے یہاں نہیں۔'' (۴۳)

سہیل کی شاعری کے تعلق سے اثر لکھنوی کا یہ قول اُن کے تنقیدی نظریے پر بھی صادق آتا ہے:

''سہیل کو نظر انداز کرنا اپنے آپ کو ایک بڑی ادبی نعمت سے محروم رکھنا ہے۔'' (۴۴)

سہیل میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی کسی کمی کے اظہار میں تامل نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اپنی رائے اور اپنے نظریۂ نقد کو حرفِ آخر سمجھتے تھے۔ اپنے شعر کے مقابل اگر کسی کا شعر عمدہ ہے تو اس کی داد دیتے اور اپنے اشعار کے وسعتِ مفہوم کی کمی پر کھلے دل سے اعتراف بھی کرتے تھے۔ (۴۵) علمی معاملات میں اختلاف رائے کے اظہار پر بھی اپنی آراء کی برتری کا دعویٰ نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی رائے کی صحت کو قبول کرنے پر زور دیتے تھے۔ (۴۶) اپنی عملی زندگی وکالت اور سیاست میں مصروفیت کی وجہ سے انھوں نے عصری اردو لٹریچر سے اپنی عدم واقفیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ (۴۷)

سہیل کے تنقیدی نظریات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زبان و ادب کے جمالیاتی پہلوؤں، فنی جہات، لسانی خصوصیات، اخلاقی اقدار کی آفاقیت اور انفرادی ذوق پر بھی نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنے نظریۂ نقد کے اظہار میں مصلحت کے بجائے جرأت اور بے باکی سے کام لیتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی ہی رائے کو دوسروں پر افضل اور مقدم نہیں جانا۔ سہیل نے تنقید کی ہر صالح قدر کا خیر مقدم کیا ہے، وہ چاہے تاثراتی اور جمالیاتی ہو یا نفسیاتی۔ یا پھر کوئی اور نقطہ نظر ہی کیوں نہ ہو۔

حوالہ جات:

(۱) ص ۷۵۔ (۲) ص ۸۳۔ (۳) ص ۱۲۶۔ (۴) ص ۱۲۷۔ (۵) ص ۱۴۳۔ (۶) ص ۱۵۱۔

پانچواں پرچہ ،ادبی تنقید، ایم اے، اردو، سال دوم ۔MANUU۔

(۷) مضامین سلیم احمد۔ مشمولہ: نئی نظم پورا آدمی ۔ مرتب: جمال پانی پتی ۔ اشاعت اول، جنوری ۲۰۰۹ء

(۸) مجنوں گورکھپوری ۔ تاریخِ جمالیات ۔ ص ۷ ۔ بار دوم، جنوری ۱۹۵۹ء، پبلشر: انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔

(۹) ص ۳۹ ۔ (۱۰) ص ۴۱ ۔ (۱۵) ص ۳۷ ۔ (۲۶،۲۵) ص ۵۹ ۔ (۴۸) ص ۳۸ ۔ ۴۴ ۔ ۴۹ ۔ ۷۸ ۔ ۸۱ ۔ ۸۲ ۔ مجموعہ کلام اصغر گونڈوی "نشاطِ روح" ۔ مرتب: احسان احمد بیگ ۔ طبع اول ۔ ۱۹۳۵ء۔

(۳۶) ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ ص ۹ ۔ مشمولہ: اقبال سہیل کا فن ۔ مرتب: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی ۔ ۲۰۰۷ء

(۴۳) آل احمد سرور ۔ ص ۲۱ ۔ مشمولہ: اقبال سہیل کا فن ۔ ایضاً۔

(۳۷) رشید احمد صدیقی ۔ ص ۲۹ ۔ تابش سہیل ۔ مرتب: افتخار اعظمی ۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء

(۴۴) جعفر علی خاں اثر لکھنوی ۔ ص ۳۷ ۔ تابش سہیل ۔ ایضاً۔

(۱۱) ص ۱۳۶ ۔ (۱۲) ص ۱۵۳ ۔ (۱۳) ص ۱۶۲ ۔ (۱۴) ۱۶۲ ۔ (۱۶) ص ۱۳۸ ۔ (۱۷) ص ۱۹۲ ۔ (۱۸) ص ۲۰۴ ۔ ۲۰۵ ۔ (۱۹) ص ۲۰۵ ۔ (۲۰) ص ۲۱۶ ۔ (۲۱) ص ۲۲۱ ۔ (۲۲) ص ۲۰۶ ۔ ۲۰۷ ۔ (۲۳) ص ۲۱۲ ۔ (۲۴) ص ۱۵۳ ۔ (۲۷) ص ۱۹۵ ۔ (۲۹) ص ۱۵۳ ۔ (۳۰) ص ۲۶۲ ۔ (۳۱) ص ۲۶۲ ۔ (۳۲) ۲۱۴ ۔ (۳۳) ص ۱۹۰ ۔ (۳۴) ص ۱۹۳ ۔ (۳۵) ص ۱۹۳ ۔ (۳۸) ص ۲۲۷ ۔ (۳۹) ص ۲۳۷ ۔ ۲۴۲ ۔ (۴۱) ص ۸ ۔ (۴۲) ص ۲۴۴ ۔ (۴۵) ص ۱۴۱ ۔ (۴۶) ص ۱۸۸ ۔ (۴۶ گنجینۂ تحقیق ۔ اشاعت اول: رسالہ معارف، دار المصنفین، اعظم گڑھ ۔ ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۳۱ء و جنوری ۱۹۳۲ء ۔) (۴۷) ص ۶۲ ۔ ۱۹۹ ۔ افکار سہیل، شبلی نیشنل کالج میگزین ۔ اعظم گڑھ ۔ اشاعت: اگست ۱۹۵۷ء۔

(۴۰) مریم عارفہ صدیقی ۔You Tube

☆☆☆

اقبال سہیل کی غزلوں کے فکری عناصر

محمد شہنواز عالم☆

اعظم گڑھ کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سرزمین اعظم گڑھ شروع سے ہی علمی اعتبار سے بہت زرخیز رہی ہے یہاں وقفے وقفے سے ایسے علماء، صوفیاء، شعراء، ادباء، اور ارباب فضل وکمال پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے علم وتصوف اور شعروادب کی دنیا میں نہ صرف اپنی چھاپ چھوڑی ہے بلکہ کائنات کے ایک بڑے حصے کو اپنے علمی وروحانی فیض سے سیراب بھی کیا ہے۔ ان ہی غیر معمولی شخصیتوں میں ایک منفرد نام اقبال احمد سہیلؔ کا بھی ہے جن کی ذات میں علم وحکمت، فکر وفلسفہ، اخلاق وتصوف اور ادیان عالم کے جوہر بدرجہ کمال موجود تھے۔ قدرت نے انھیں علم وفضل کی گہرائی، فکر وفقر کے اوصاف، سیرت کی بلندی، عشق کا ولولہ اور خرد کی سرفرازی اس فراخ دلی سے عطاء کی تھی کہ وہ جہاں بھی رہے جس حال میں رہے، یگانۂ روزگار اور اپنی مثال آپ رہے۔

انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے دوسری، تیسری اور چوتھی دہائی ہنگامہ خیز تھی، ان ہی دہائیوں میں مختلف ادبی وسیاسی تحریکات ورجحانات منظر عام پر آئے۔ لوگوں کا ذہن بالیدہ اور شعور پختہ ہوا اور آزادی کے لئے دستوری جدوجہد کرنے کا سلیقہ آیا۔ آریہ سماج، برہمو سماج اور سرسید تحریک سب اسی عبوری عہد میں رونما ہوئیں، مسلم لیگ اور کانگریس بھی اسی دور میں وجود میں آئی، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کی صحبت وتربیت نے اقبال احمد خاں سہیلؔ کو ان تحریکوں سے روشناس اور ان کے اغراض کو بخوبی سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے آل احمد سرور رقمطراز ہیں۔

☆اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، اے۔ جے۔ سی۔ بوس کالج، (کولکاتا)

''شبلی کی شخصیت اور شاعری کا سب سے دلآویز اور نکھرا ہوا رنگ مولانا سہیل کے کلام میں نظر آتا ہے۔ شبلی کی مشرقیت، شبلی کا جذبۂ حریت، ان کا تبحر علمی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ شوخی اور نکتہ سنجی، جس طرح مولانا سہیل کے یہاں آئی ہے اور کسی کے یہاں نہیں ہیں، شبلی کے الفاظ میں دوسروں کے کفر میں بوئے ایمان بھی ہے۔ مولانا سہیل اس راہ سلوک میں دودل نہیں ہیں اور اس لئے ان کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، علم و فضل کے باوجود وہ شاعری کی محفل میں حسن کاری اور شگفتگی کی دولت بیدار لے کر آئے ہیں۔'' (۱)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقبال احمد سہیل نے شبلی کے طریقۂ کار کو اور ان کی قائم کردہ روایت کو مزید تقویت بخشی، جس کا اندازہ ہمیں ان کے تخلیق کردہ اس مرثیہ سے ہوتا ہے، جس کو انھوں نے اپنے ماموں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر کیا تھا جو عین جوانی میں ہی داغ مفارقت دے گئے تھے۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے پورے خاندان کو ماتم کدہ بنا دیا، چونکہ سہیل پر ان کے ماموں کی بڑی کرم فرمائیاں تھیں، اس لئے وہ اس حادثے کی تاب نہ لا سکے، انھوں نے جس بحر میں اپنے ماموں کا مرثیہ لکھا تھا دراصل اسی زمین میں علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنے والد محترم کے وصال پر مرثیہ کہا تھا۔ سہیل کی اس مرثیہ کی خوب پذیرائی ہوئی اور جب سہیل کا یہ مرثیہ علامہ شبلی نعمانی کی نگاہوں سے گذرا تو انھوں نے اقبال سہیل کو طلب کیا اور ان کی ہمت افزائی کی، سہیل کا بیان ہے ملاحظہ فرمائیں۔

''مولانا نے اس مرثیہ کی حد سے زیادہ داد دی اور میری موزوں طبعی اور ذوق فارسی پر اظہار مسرت فرمایا۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''تیری شاعری پر مجھ کو خود اپنے کلام کا دھوکا ہو رہا تھا۔ آخر یہ رنگ سخن تو نے کب اور کیوں کر حاصل کیا؟'' مولانا کی اس ہمت افزائی نے میرا حوصلہ اتنا بڑھا دیا کہ اصلاح کلام کی استدعا کی تو یہ ہدایت ہوئی کہ کسی کو اپنا کلام اصلاح کی غرض سے نہ دکھاؤں اور اپنے نتائج فکر کی معاندانہ تنقید کرتا رہوں۔ اس مشق و ممارست سے چند ہی دنوں میں بازوئے فکر توانا ہو جائیں گے اور جو تبدیل و تغیر اپنے کلام میں خود کیا جائے گا وہ استاد کی اصلاح سے بسا اوقات بہتر اور ترقی استعداد میں بہرحال زیادہ معاون ہوگا۔'' (۲)

یہ بات بالکل درست ہے کہ شاگرد کے حق میں استاد کی تعریف و توصیف اور اعتماد ہی اس کی قابلیت، صلاحیت، لیاقت اور کامیابی کی سند ہوتی ہے گویہ کہ اقبال سہیل کو یہ تمام چیزیں ان کے استاد

علامہ شبلی نعمانی کی جانب سے حاصل تھیں۔ اس ضمن میں سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں۔

''کسی شاگرد کو اگر استاد کی تحسین حاصل ہو تو اس کے کمال کی سند ہے مولانا مرحوم سے میں نے اقبال سہیل صاحب کی بدیہہ گوئی کی تعریف سنی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں مولانا شبلی کے حادثۂ پا پر جب مولانا حالی وغیرہ اوران کے احباب نے حسن تعلیل کی رباعیاں کہیں تو سہیل صاحب نے چند رباعیاں کہہ کر پیش کیں، جس کو مولانا نے پسند فرمایا۔'' (۳)

کلیات سہیل کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال سہیل کی طبیعت کو قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی اور غزل جیسی اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی، وہ جب اور جو کچھ تحریر کرنا چاہتے تھے، ان کے قلم کی روانی و برجستگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ ان کے دماغ میں ہر قسم کے فصیح اور بلیغ الفاظ اور لطیف و نازک ترکیبوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا، انھیں تغزل کے تمام آداب سے واقفیت تھی، اسی لئے انھوں نے تغزل کی تمام مصالح روایت، عبارات، اشارات اور ناز و ادا کے آداب کو اپنی غزلوں میں موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں عشق مطلق اور حسن مطلق ہے وہیں فلسفہ و حکمت کی نکتہ طرازیاں، بادۂ تصوف کی سرمستیاں، ارضی حقائق، کائنات اور ماورائے کائنات کے مسائل بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کی غزلوں کے موضوعات متنوع ہیں اس سلسلے کے اشعار ان کی مختلف غزلوں سے ملاحظہ فرمائیں۔

تنگ ہے صید زبوں ہمت عالی کے لئے — میری مشکل ہے مرے کام کا آساں ہونا
پہلے پیدا تو کر آتش کدۂ شوق خلیل — آج بھی سہل ہے شعلوں کا گلستاں ہونا

وا رفتگان عشق کو سمجھا ہے تو نے کیا — ان میکشوں میں ہوتے ہیں یزداں شکار تک

غلامی میں وفا بے سود، سجدہ رائیگاں میرا — نہ خود اپنی جبیں میری، نہ ان کا آستاں میرا
انھیں ذروں سے کل دنیا نئی تعمیر کرنی ہے — سنبھال اے دامنِ فطرت غبار ناتواں میرا

بلائے جاں جو نہ ہوتی کشاکش ہستی — سکونِ عیش میں جینا بلائے جاں ہوتا

یہ کیا کہ شمع سے شعلہ طلب ہے پروانہ　　خود اپنے سوزِ دروں سے شرر فشاں ہوتا

ننگ ہے بے عمل قبولِ بہشت　　یہ تو صدقہ ہوا صلا نہ ہوا
عشق اور حسن سے سوالِ کرم　　یہ تو غیرت کا اقتضا نہ ہوا

اٹھی تھی بحرِ حسن سے اک موج بیقرار　　فطرت نے اس کو پیکرِ انسان بنا دیا
اے سوزِ نا تمام کہاں جائے اب خلیل　　آتش کدے کو بھی تو گلستاں بنا دیا
اے ذوقِ جستجو! تیری ہمت پہ آفریں　　منزل کو ہر قدم پہ گریزاں بنا دیا

پھر موجِ زندگی میں نہیں شورشِ عمل　　پھر کوئی سنگ راہ مقابل نہیں رہا
گم تھی فضائے عشق میں کل کائنات حسن　　اٹھا غبارِ قیس تو محمل نہیں رہا

ہر ایک ساز سے سنتا ہوں اپنی ہی آواز　　فضا میں گونج رہی ہے فقط صدا میری

چلنا سنبھل کے وادیٔ الفت میں ہے حرام　　یاں ہر قدم پہ لغزشِ مستانہ چاہیے
آخر کلیم! سننی پڑیں، لن ترانیاں　　اب بھی کہوگے عجزِ گدایانہ چاہیے

مذاقِ سربلندی ہو تو پھر دیر و حرم کیسے
جبیں سائی کی فطرت نے کیئے ہیں سنگ در پیدا

درج بالا اشعار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سہیل ایسی غزلوں کے قائل ہیں جس میں خوددارانہ شان، مردانہ بلند آہنگی، قوت تاثیر اور جوش بیان کے ساتھ سنجیدہ انسانی قدروں اور زندگی کے قیمتی تجربات کو پیش کیا گیا ہو، یہی وجہ ہے کہ سہیل اپنی غزلوں میں جن افکار و تصورات کو پیش کرنا

چاہتے ہیں پہلے اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں سمو کر اس کی چھان پھٹک کرتے ہیں اس کے بعد اسے فن کے قالب میں ڈھال کر نہ صرف موثر انداز میں پیش کرتے ہیں بلکہ لوگوں کو اس کے پس پردہ مجاہدانہ وقار، قلندرانہ شان استغناء، حکیمانہ سنجیدگی اور فلسفیانہ وسعتِ نظر عطا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مرزا احسان احمد لکھتے ہیں۔

''ممکن ہے کہ ان کی غزلوں میں کسی شوریدہ مزاج کے پر گداز عاشقانہ جذبات کی شرر باریاں نظر نہ آئیں، لیکن ہم کو مسرت ہے کہ وہ اس مئے کدہ میں ایک رسوائے سر بازار کی متبدل اداؤں کے ساتھ نہیں بلکہ ایک بلند حوصلہ اور عالی نظر رند کی حیثیت سے داخل ہوئے، جس کا ہر قدم عزت نفس اور خودداری کے احساس کے ساتھ اٹھتا ہے، جو بندگی کی لعنت کے ہوتے ہوئے زندگی کی صورت دیکھنا گوارہ نہیں کرتا، جس کو خود اپنے دست و بازو کا تعمیر کردہ نشیمن دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہے، جس کی غیرت عشق کسی حال میں حسن سے سوال کرم پر آمادہ نہیں ہوتی، جس کے ذوق جستجو کے ہمت منزل کو ہر قدم پر گریزاں بنا دیتی ہے، جس کی موج زندگی کو شورش عمل کے لئے ہمیشہ پر خطر راہوں کی تلاش رہتی ہے، جس کا غم کدۂ حیات جہان غیر کے مہر و ماہ سے نہیں، بلکہ خود اپنے ہی سوز دل کی تراوش نور سے جگمگاتا رہتا ہے۔'' (۴)

درج بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سہیل کے یہاں جو عشقیہ کیفیت پائی جاتی ہے وہ ان کے تربیت یافتہ عشق کا نتیجہ ہے، کیونکہ عشق اگر تربیت یافتہ ہوگا تو عاشق کی سوچ و فکر بھی بلند ہوگی اور جب فکر بلند ہوگی تو فعل اعلیٰ و ارفع ہوگا اور جب فعل اعلیٰ و ارفع ہوگا تو جذبۂ خودداری اور خود شناسی پیدا ہوگی اور یہی خودداری اور خود شناسی جہد حیات میں حصہ لینے کا ولولہ اور طوفانِ حوادث سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ لہٰذا سہیل کے یہاں جو عشق پایا جاتا ہے وہ نشاط زیست، خود آگہی، علوِ کردار اور عرفان حیات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سہیل کے یہاں احترام حسن بھی ہے اور توقیر جنون بھی۔ اشعار دیکھئے:

جو دردِ عشق نہ ہوتا تو دل کہاں ہوتا
بہارِ زیست کا ہر لمحہ رائیگاں ہوگا

میرے نجود شوق سے ہو جائے بے نیاز
اتنا بلند حوصلۂ سنگ در نہیں

دل خطاوارِ اشتیاق سہی   لب گنہگار التجا نہ ہوا

پاسِ ادب سے کر نہ سکا شرحِ آرزو   میں بیخودی میں بھی کبھی غافل نہیں رہا

اتنا تو ہوش ہے، اسے دیوانہ کیوں کہیں   جو توڑتا ہے سر تری دیوار دیکھ کر

وہ آتے یا کرم مرگ ناگہاں ہوتا   کوئی تو چارہ نوازِ بلا کشاں ہوتا

اس جانفزا عتاب کے قرباں جایئے   ابرو کی ہر شکن کو رگِ جاں بنا دیا

صدا فریاد کی آئے کہیں سے   وہ ظالم بدگماں ہوگا ہمیں سے

چشمِ کرم کی شوخیٔ طرزِ ستم نہ پوچھ   غم بھی بقدرِ حوصلۂ دل نہیں رہا

اب ہجر کا شکوہ، نہ تغافل کا گلہ یاد   آئی جو تیری یاد، تو کچھ بھی نہ رہا یاد

فریب کاریاں نہ پوچھ جوشِ انتظار کی   تمام شب سنا کیے صدا خرامِ یار کی

سہیلؔ نے اپنی غزلوں میں حقائق و معارف کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ غزل کی شیرینی، لطف و ندرت اپنی جگہ قائم ہے یعنی ان کی غزلوں میں اشارت، جدت، لطافت اور ندرت کے تمام لذائذ موجود ہیں۔ ان کے متصوفانہ اشعار خود اس بات کی دلیل ہیں کہ اس میں شاعرانہ رعنائی بھی ہے اور وجدانی کیفیت بھی لیکن اس کے باوجود یہ اشعار کدو کاوش سے بے نیاز اور تصنع سے یکسر پاک ہیں اس قسم کے اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

وارفتگانِ شوق کو کیا دیر، کیا حرم
جس در پہ دی صداء درِ جاناں بنا دیا

برقِ جمالِ یار! یہ جلوہ ہے یا حجاب
چشمِ ادا شناس کو حیراں بنا دیا

لاکھ گناہگار ہوں، حسن کا راز دار ہوں
عکسِ کمالِ یار ہوں آئینہ قصور میں

جمالِ دوست پنہاں پردۂ شمس و قمر پیدا
یہی پردے تو کرتے ہیں تقاضائے نظر پیدا

اک میں ہی بد نصیب گرفتارِ غم نہیں
دنیا اسیرِ حلقۂ زلفِ دراز ہے

اف کیا مزہ ملا ستمِ روزگار میں
کیا تم چھپے تھے پردۂ لیل و نہار میں

تری نگہ کا تبسم، تری جبیں کی شکن
یہ ابتدا ہے مری اور یہ انتہا میری

اک مشقِ اضطراب کا رکھا ہے نام عشق
اف بے کسی کہ وہ بھی نہیں اختیار میں

بس اتنی کائنات ہے حیاتِ مستعار کی
شباب ہے حباب کا، بہار ہے شرار کی

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ پہلے پہل انگریز ہندوستان بحیثیت تاجر آئے لیکن جب انھیں ہندوستانیوں کی بدحالی، بے بسی، لاچاری، کم فہمی اور ناخواندگی سے واقفیت ہوئی تو انھیں اسی دن اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنا بہت مشکل نہیں ہے غرض یہ کہ ان کا یہ خواب ایک دن شرمندۂ تعبیر بھی ہوا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کے شروع میں جب ہندوستانیوں کا ذہن ذرا بیدار اور انگریزوں کی حکمتِ عملی سے روشناس ہوا تو ہندوستانیوں نے ان کے ظلم و جبر، بربریت، منافقت، بے حسی اور بداخلاقی کے خلاف اپنی آواز بلند کی، تو شاطر انگریز انھیں یہ

کہہ کر بہلانے اور پھسلانے لگے کہ ہم تو یہاں ایک مقدس مشن لے کر آئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہاں کچھ دن اور رہنے دیا جائے تا کہ ہم اپنے مشن کی اشاعت صحیح طریقے سے کر پائیں۔ علامہ اقبال سہیل ان کی سازشوں سے خوب واقف تھے اور اپنے اشعار کے ذریعے تمام ہندو مسلمانوں کو آگاہ بھی کر رہے تھے کہ دیکھو انگریزوں کی عیاری اور مکاری کے شکار نہ بنو اور انگریزوں کو بھی یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ ہم تمہاری ریشہ دوانیوں کو سمجھ رہے ہیں اور تم کو تمہارے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ ذیل کے اشعار دیکھئے کہ علامہ اقبال سہیل کا سیاسی شعور ایک ایک لفظ میں چھلکا پڑتا ہے۔

خیال ان کے سخن میرا زباں ان کی دہن میرا
بہار ان کی چمن میرا گل ان کے گلستاں میرا

تاراج نشیمن کھیل سہی صیاد مگر اتنا سن لے
جب عشق کی دنیا لٹتی ہے خود حسن کا ماتم ہوتا ہے

حقیقت فریب حسن عالم آشکار کی — یہ ابتدائے فتح ہے جنون پختہ کار کی

الٰہی خیر کہ صیاد لے کے دستۂ گل — چلا ہے آج سجانے کو آشیاں اپنا

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے — گریباں کو لڑایا آستیں سے

وہ چشم فتنہ گر ہے ساقی مے خانہ برسوں سے
کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے، اسیر غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہے باغباں نے، تو آئے گلچیں بھی لوٹ جائے

ستم بھی ہوگا تو دیکھ لیں گے کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے

یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے، یہ مہربانی کا جھوٹ جائے

بلا سے قزاق آ کے لوٹیں یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے

اچک لے شاہین تو غم نہیں ہے قفس تو کم بخت ٹوٹ جائے

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا ملک آزاد ہوا، لیکن مجاہدین آزادی کو وہ آزادی نہ ملی جس کے لئے انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کیا تھا۔ یعنی آزادی کے متعلق ان لوگوں نے جو خواب دیکھا تھا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا، مجاہدین آزادی ہندوستان کی آزادی کے ساتھ امن وسکون، انصاف، مساوات اور اس کی سالمیت کے خواہاں تھے لیکن ہندوستان آزاد ہوتے ہی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ بٹوارے کے نتیجے میں اہل وطن سے جو بہیمانہ اور وحشیانہ حرکتیں سرزد ہوئیں تمام مجاہدین آزادی کے لئے عام طور سے اور سہیل جیسے محب وطن کے لئے خاص طور سے ناقابل برداشت تھیں۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے جو اشعار کہے ان میں ان کے دل کے درد کو بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے، دیکھئے ذیل کے اشعار سہیل کچھ یوں شبنم فشاں ہوتے ہیں ۔

شب غم کاٹ دی تھی جس کے جاں پرور تصور میں

چھپی ہے کہر کی تہہ میں وہ صبح زرنگار اب تک

بہا ڈالے ہزاروں خانماں سیل حوادث نے

دلوں میں تہہ نشیں ہے پھر بھی صدیوں کا غبار اب تک

نہ پوچھ اے ہم نفس! چاک گریباں کی تبہ کاری

الجھتا ہے نفس کے تار سے دامن کا تار اب تک

دل برباد کی خاک آج بھی دوش صبا پر ہے

کھٹکتا ہے زمانہ کی نظر میں یہ غبار اب تک

آئی شب غم کے بعد سحر، غمناک رہا پھر بھی منظر
وہ غنچہ و گل کا ہنس ہنس کر، شبنم کو رلانا کیا کہیے

پیچھے ہیں قدم آگے ہے نظر جانا ہے کدھر، جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمت سفر رفتار زمانہ کیا کہیے

غرض کہ سہیلؔ کی دوررس نگاہوں نے ان تلخیوں اور محرومیوں کو بھی دیکھ لیا تھا جس سے آج کے باشندگانِ ہند دوچار ہیں، آزادی کے فوراً بعد ملک میں نفرتوں کی ایک وبا پھوٹ پڑی تھی جو فرقہ پرستی، تعصب، تنگ نظری اور شرپسندوں کو تقویت عطاء کر رہی تھی، جس سے ملک کے امن وسکون میں خلل پیدا ہوگیا تھا نتیجتاً ملک کے جاں باز سپاہیوں کے حوصلے پست اور شرپسندوں کے ارادے بلند ہونے لگے لیکن ان حالات میں بھی اقبال سہیلؔ پوری ہمت وحکمت سے کام لیتے ہیں وہ آہ وبکا کرنے کے برعکس بلند حوصلگی، اولوالعزمی، حمیت اور رجائیت کو پیش کرتے ہیں جو ان کی شخصیت کے خاص عناصر ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مرا صبر حد سے گذرا، مگر اے سہیلؔ اب بھی
وہ زباں نکال پھینکوں، جو طلب کرے ترحم

سہیلؔ اس بے نوائی پر بھی ہمت کا یہ عالم ہے
عوض خاک وطن کے میں نہ لوں ملک سلیماں بھی

سہیلؔ اس چلتی پھرتی چھاؤں سے دل گیر کیا ہونا
یہ دنیا کروٹیں لیتی رہی ہے بار بار اب تک

ابرام نہیں گو شرط ادب، الحاح سے بھی ہیں دوختہ لب
دعوے سے نہ کر سکتے ہوں طلب تو ملتجیانہ کیا کہیے

مختصر یہ کہ سہیل کی غزلوں کا یہی وصف ہمیں مایوس کن حالات میں بھی مذاق سربلندی احساس خودداری، توقعات، صبر وثبات، انسانیت دوستی، انقلاب کا شعور، زندگی جینے کا حوصلہ اور جہد حیات میں حصہ لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ حبیب احمد صدیقی کا خیال ہے کہ:

''ان کی غزلوں میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو شاعری کو دوام بخشتے ہیں۔ ان کو محض وطنیت کا شاعر کہنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ان کے یہاں تصوف کی وجدانی فراست بھی ہے، اور حقائق زیست کی رمز شناسی بھی، وہ کاروبار شوق کے صحت مند جذبات کو لبیک بھی کہتے ہیں اور برق نظر سے کسب سعادت بھی کرتے ہیں۔ وہ حسن کے مرتبہ داں بھی ہیں مگر عشق کی عظمت کو بھی نہیں بھولتے۔ وہ زندگی کو ماہرانہ نظر سے دیکھتے اور عارفانہ انداز سے برتتے ہیں۔ ان کی غزل سے دل لذت، نظر بصیرت اور روح فرحت پاتی ہے اور اسی کو کمال شاعری کہتے ہیں۔'' (۵)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اقبال احمد سہیل اپنے عہد کے ایک منفرد اور صاحب طرز غزل گو شاعر تھے، ان کی غزلوں میں لہجے کی انفرادیت، زبان و بیان کی ندرت، سلاست وصفائی، بندش کی چستی، استعارے کی چمک دمک، شوخی ورنگینی، ردیف وقوافی کی متنوع دریافت اور اسلوب کی دلکشی موجود ہے۔ جس کی بنا پر وہ اپنے ہم عصروں میں ہی نہیں بلکہ بعد کے سخن وروں میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔

حواشی:

(۱) ''سہیل کا تغزل'' از۔ آل احمد سرور، از۔ تابش سہیل، مرتب: افتخار اعظمی، صفحہ: ۷۶، ناشر: مرکز ادب، جہانگیر آباد پیلس، لکھنؤ، سن اشاعت، اکتوبر ۱۹۵۸ء

(۲) عرض ناشر، کلیات سہیل، مرتبہ: عارف رفیع، صفحہ: ۱۵، ناشر: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، اشاعت دوم، نومبر ۲۰۱۱ء

(۳) ''تابش سہیل'' از۔ مولانا سید سلیمان ندوی، کلیات سہیل، مرتبہ: عارف رفیع، صفحہ: ۸، ناشر:

دارالمصنفین شبلی اکاڈمی، اشاعت دوم ۲۰۱۱ء

(۴) ''یادِ سہیل'' از- مقالات احسان۔ مصنف: مرزا احسان احمد صاحب، صفحہ: ۱۲۸، ناشر: در مطبع معارف، اعظم گڑھ، طبع گردید، سن اشاعت: ۱۹۶۸ء

(۵) ''اقبال سہیل غزل گو کی حیثیت سے'' حبیب احمد صدیقی۔ از- تابش سہیل، مرتبہ: افتخار اعظمی۔ صفحہ: ۱۳۲، ناشر: مرکزِ ادب جہانگیر آباد پیلس، لکھنؤ۔ سن اشاعت: اکتوبر ۱۹۵۸ء

—☆—

اقبال سہیل: شخص اور شاعر

ڈاکٹر رفیق اشفاق☆

کسی بھی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اس کے عہد و ماحول اور خاندانی پس منظر کو بڑا دخل ہوتا ہے، اس پس منظر میں جب اقبال سہیل کی زندگی اور شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال سہیل کو علمی و ادبی ماحول کے علاوہ خاندانی پس منظر سے بھی بہت کچھ سیکھنے کے مواقع حاصل تھے، ان کی علمی شخصیت کو نکھارنے اور پروان چڑھانے میں ان کے والدین اور اساتذہ نے جو گراں قدر رول ادا کیا ہے وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس سلسلے میں اقبال سہیل کی زندگی کے مختلف علمی و ادبی گوشوں پر جس تفصیل سے محترم افتخار اعظمی نے ''تابش سہیل'' میں لکھا ہے میرے خیال میں سہیل شناسی کی یہ اولین کوشش ہے، جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال سہیل کے بزرگوں کا آبائی وطن کھیتا سرائے ضلع جونپور ہے، ضیاء الدین خان، اقبال سہیل کے پردادا تھے جن کی شادی اعظم گڑھ کے ایک رئیس خیر اللہ خان کی بیٹی نصیبہ خانم سے ہوئی تھی۔

کچھ خانگی معاملات کے باعث ضیاء الدین خان نے اپنا آبائی وطن جونپور چھوڑ دیا اور اعظم گڑھ میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں عدالت میں مختاری کے پیشہ سے وابستہ ہو گئے۔ اقبال سہیل کے والد محترم کا نام عزیز اللہ خان اور دادا کا نام امانت اللہ خان تھا، جو تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھے۔

عصر حاضر کے نامور اسلامی اسکالر اور مفکر مولانا وحید الدین خان نے الجمعیۃ دہلی ۸؍ دسمبر ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں اقبال سہیل کا سن ولادت ۱۸۸۲ء لکھا ہے۔ افتخار اعظمی نے ''تابش سہیل'' میں سن پیدائش ۱۸۸۴ء لکھا ہے۔ عبد الحی اعظمی نے ''افکار سہیل'' میں ۱۸۸۴ء ہی لکھا ہے۔ جب کہ اردو زبان

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو ڈی سی ایس، کے (پی جی) کالج مئوناتھ بھنجن۔

وادب کے نامور دانشور علی جواد زیدی نے اپنی کتاب ''قصیدہ نگاران اتر پردیش'' میں صفحہ ۷ا پر اقبال سہیل کی تاریخ ولادت ۷رجنوری ۱۸۸۷ء تحریر کیا ہے، ڈاکٹر منور انجم نے اپنے تحقیقی مقالہ ''اقبال سہیل کی حیات اور شاعری'' میں اقبال سہیل کی مستند تاریخ پیدائش ۷ارجنوری ۱۸۸۶ء لکھا ہے۔ جب کہ اقبال سہیل کی بیٹی مسلمہ خانم کے بقول افتخار اعظمی صاحب کی روایت صحیح ہے۔ واضح رہے ''کلیات سہیل'' کے مرتب عارف رفیع اور انتخاب کلام اقبال سہیل کے مرتب مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے مذکورہ کتابوں میں اقبال سہیل کی ولادت کا سن ۱۸۸۴ء ہی لکھا ہے۔ ڈاکٹر انیس ادیب نے اپنے تحقیقی مقالہ ''مشاہیر شعراء اردو کی فارسی شاعری'' میں اقبال سہیل کا سن ولادت ۱۸۸۴ء ہی لکھا ہے۔ تاریخی شواہد اور ہجری وعیسوی سن کی تقویم کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۸۸۴ء ہی زیادہ مستند معلوم ہوتا ہے۔

وقت وحالات اور زمانے کے رواج ودستور کے مطابق اقبال سہیل کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، اقبال سہیل کے آباء واجداد کے پاس مال ودولت کی فراوانی تھی، گھر کا ماحول کافی خوش حال اور خوشگوار تھا، انھیں خانگی زندگی میں کبھی کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ والدین نے اکلوتی اولاد کی خصوصی تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ دی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال سہیل کی والدہ محترمہ ام کلثوم اور والد محترم عزیز اللہ خان نے اپنے لخت جگر کی تعلیم وتربیت کے لئے نامور عالم اور بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر مولانا محمد شفیع صاحب کی خدمات حاصل کیں، ان کے زیر سایہ اقبال سہیل کی تعلیم وتربیت ہوئی، اس ابتدائی تعلیم کی ٹھوس بنیادوں نے آگے چل کر ان کی علمی وادبی شخصیت کو نکھارنے اور پروان چڑھانے میں جو گراں قدر رول ادا کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اقبال سہیل ایک علمی خانوادے کے چشم وچراغ تھے، والدین اردو زبان وادب کے ساتھ ہی فارسی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے، گھر پر ابتدائی تعلیم کے دوران ہی سہیل کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ فارسی میں خط لکھتے اور اس پر اپنے والد محترم سے اصلاح لیتے، انھوں نے شیخ سعدی شیرازی کی مایۂ ناز کتاب گلستاں اور بوستاں اپنی والدہ محترمہ ام کلثوم سے پڑھی۔ اس طرح فارسی دانی میں مہارت اور قدرت کاملہ حاصل کی۔ اقبال سہیل کے اساتذہ کی تعلیم وتربیت کا اثر چند ہی سالوں میں نظر آنے لگا اور وہ تقریباً بارہ سال کی عمر تک پہنچ کر فارسی تحریر وتقریر میں صلاحیت پیدا کر چکے تھے۔ اسی زمانے میں شعر فہمی اور فارسی گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی جو آگے چل کر مستقل اظہار خیال کا وسیلہ بھی ثابت ہوئی۔

تقریباً چودہ سال کی عمر میں اقبال سہیل ۱۹۹۸ء میں جب اپنے نانا کے یہاں مقیم تھے اس وقت آپ کو علامہ شبلی نعمانی سے اکتساب فیض کے خوشگوار مواقع حاصل ہوئے۔ جس طرح اردو شعر وادب میں مرزا غالب کو اپنے شاگرد عزیز مولانا الطاف حسین حالؔی پر ناز تھا، اسی طرح علامہ شبلی کو بھی اپنے شاگرد رشید اقبال سہیل پر بجا فخر تھا۔ اقبال سہیل نے علامہ شبلی سے دیوان حماسہ کے علاوہ دیگر مشہور ومعروف کتابیں پڑھیں اور درسی کتب کے علاوہ علامہ سے شعروشاعری میں بھی اکتساب فیض کیا۔ علامہ شبلی کی تربیت شعری کا اعتراف کرتے ہوئے اقبال سہیل نے لکھا ہے کہ:

> ''اساتذہ کے اکثر اشعار جو ان کی صحبتوں میں سنتا یا جو تنقیدی نکتے استاذ محترم ارشاد فرماتے حافظہ میں نقش ہو جاتے اس آب حیات کا ہر جرعہ اور بھی تشنگی بڑھاتا۔ اور اس آرزو میں کہ شاید مولانا کی زبان سے کوئی شعر یا حکیمانہ نکتۂ ادب سننے کو مل جائے اکثر پورا دن اسی بزم شرف میں گزار دیتے۔''
>
> (اقبال سہیل: حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر منور انجم، مطبوعہ ۱۹۹۵ء ص ۲۹)

۱۹۰۷ء میں جب مولانا حمید الدین فراہی اے ایم اے او کالج علی گڑھ میں عربی زبان کے پروفیسر تھے۔ اقبال سہیل نے اسی دوران مولانا فراہی کے یہاں قیام کیا اور ان سے مشرقی علوم خصوصاً قرآنیات اور حدیث وتفسیر کی تعلیم حاصل کی، مولانا فراہی عربی کے ساتھ فارسی زبان وادب پر قدرت کاملہ رکھتے تھے، اقبال سہیل نے اپنی فارسی کی استعداد بڑھانے میں مولانا فراہی سے اکتساب فیض کیا، قرآنیات، حدیث وتفسیر اور مشرقی علوم کی تحصیل کا یہ سلسلہ ۱۹۰۹ء تک جاری رہا، اسی سال سہیل رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے، آپ کی شادی مولوی حفیظ اللہ خان کی بیٹی عمدۃ النساء سے ہوئی، خان صاحب ان دنوں بنارس میں مختاری کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ سہیل کے والدین کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے مواقع اس وقت نصیب ہوئے جب اقبال سہیل نے عصری علوم کی جانب توجہ دیتے ہوئے بنارس کے کوئنس کالج (QUEENS COLLEGE) میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۴ء میں اس کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے پھر علی گڑھ چلے گئے۔ اس کالج سے ایم اے، ایل ایل بی، کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں اقبال سہیل اپنے وطن اعظم گڑھ واپس آئے اور یہیں سے اقبال سہیل کی زندگی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہوئی اور وہ پیشۂ وکالت سے وابستہ

ہوگئے۔

قدرت نے جس کی تخلیق علم وادب کی آبیاری کے لئے کی تھی اس نے اپنی علمی صلاحیت ولیاقت کا استعمال وکالت کے پیشہ میں کیا، اگر اقبال سہیل اس پیشہ سے وابستہ نہ ہوتے تو ان سے وہ علمی وادبی کارنامے انجام پاتے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں، شہرستان ادب وآگہی اعظم گڑھ میں اقبال سہیل وکالت کے پیشہ سے ۱۹۱۹ء میں وابستہ ہوئے اور یہ سلسلہ عمر کے آخری مرحلہ یعنی ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔

بحث ومباحثہ، حاضر دماغی کے معاملہ میں اقبال سہیل اپنے عہد کے کامیاب ترین وکیلوں میں شمار کیے جاتے تھے، ان کی دوراندیشی اور جواب دہی سے ان کے موکلوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہونے لگا اور بادل ناخواستہ وہ اسی پیشہ وکالت سے اس حد تک وابستہ ہوگئے کہ عمر کا بقیہ حصہ عدالت کی چہار دیواری میں صرف کردیا، شاید یہی وجہ ہے کہ اس نازک اور غیر علمی پیشہ کو اختیار کرنے کے بعد وہ علم وادب کی جانب خصوصی توجہ نہ دے سکے۔ وکالت کے پیشہ میں ان کی مہارت کا ذکر کرتے ہوئے افتخار اعظمی یوں رقم طراز ہیں:

> ''انھوں نے وکالت میں بھی قانونی کتاب سے زیادہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور طلاقت لسانی پر بھروسہ کیا، وہ جب کسی مقدمہ کے سلسلے میں جرح وبحث کرتے تو ان کی نکتہ طرازیاں اس وقت بھی قابل داد ہوتیں، خصوصیت کے ساتھ خلع، طلاق، وراثت اور وقف وغیرہ کے مقدمات لڑنے میں انھیں عجیب مہارت حاصل تھی۔''
>
> (تابشِ سہیل' افتخار اعظمی، مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ ۱۹۵۸ء ص ۱۴)

اردو زبان کے نامور ادیب ودانشور علی جواد زیدی نے اقبال سہیل کی وکالت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''ان کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں تھا، مکان پر اور عدالتوں میں ان کے گرد وپیش ہر وقت موکلوں کا میلہ لگا رہتا تھا، جرح کے وقت ان کی ذہانت کے جوہر قابل دید ہوتے تھے، حافظہ تو غضب کا تھا ہی جو بات ایک بار بھی سن لی وہ دماغ میں پتھر کی لکیر بن گئی۔ تمام بحث زبانی کرتے تھے۔'' (''کلیات سہیل'' مرتبہ: عارف

رفیع، مطبوعہ شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء ص ۲۰)

وکالت کے پیشہ سے اقبال سہیل کی وابستگی علمی وادبی دنیا کے لئے ایسا زیاں تھی جس کی تلافی کبھی ممکن نہ ہوسکی، اس علمی خسارہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اقبال سہیل کے مخلص دوست مرزا احسان احمد بیگ نے لکھا ہے کہ:

''اقبال سہیل میرے ہم وطن اور عزیز خاص تھے، قدرت نے ان کو ایک غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا، جب بیمار ہوکر وکالت کے کام سے معذور ہوئے تو ان کی حیثیت ایک مفلس قانع کی تھی، مجھ کو ان کی اس تہی دستی اور بے نوائی کا غم نہیں، البتہ چمنستان شعروادب کے اس بلبلِ رنگین نوا کی عدالتوں میں دیہاتی جہلا کے ساتھ جرح میں الجھتے دیکھتا تو مجھ کو گردش روزگار کا عجب عبرت ناک منظر نظر آتا تھا۔ ممکن ہے مرحوم اپنی وکالت کی کامیابی پر خوش رہے ہوں لیکن ایک دماغ جس کی نکتہ سنجیوں سے علم وفن کے بہت سے حقائق بے نقاب ہوسکتے تھے اس کے لئے عدالتی مقدمات کی ترتیب کوئی ایسا کمال نہیں تھا جس پر فخر کیا جاسکے، ان کا اصلی سرمایۂ فخر وناز ان کی وہ گوناگوں علمی ودماغی خصوصیات تھیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے غلط روی اختیار نہ کی ہوتی تو علم وادب کے افق پر سہیل نہیں بلکہ آفتاب بن کر جگمگاتے۔''
(''مقالات احسان'' مرزا احسان بیگ۔ معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء ص ۹۹)

اقبال سہیل وادیٔ شعروسخن میں

دبستانِ شبلی کے جن بلند پایہ شعراء نے اردو شعروادب کے قافلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے فارسی شاعری کو اپنی گراں قدر تخلیقات سے عظمت ووقار بخشا ہے ان میں ایک اہم اور قابل ذکر نام اقبال سہیل کا ہے جن کی اردو اور فارسی شاعری سندِ اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ خاص طور سے فارسی دانی میں ان کو جو مہارت وملکہ حاصل تھا اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو فارسی شعروادب سے دلچسپی رکھتے ہوں بہ حیثیت مجموعی ان کی پوری اردو اور فارسی شاعری اہل علم کی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبالؔ

راحت، اغیار کو دی آپ پریشاں ہوکر

فنِ شعروشاعری میں اقبال سہیل کی مہارت کا ذکر کرتے ہوئے مرزا احسان بیگ نے لکھا ہے:

''ادبی دنیا میں وہ عام طور پر ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ سہیل کے ہمہ گیر دماغ کو غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ اور رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی، جب اور جو کچھ لکھنا چاہتے تھے ان کے قلم کی روانی اور برجستگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، غیر معمولی قوت نظم کے علاوہ عربی اور فارسی تعلیم کی بدولت ان کے دماغ میں ہر قسم کے فصیح وبلیغ الفاظ اور لطیف ونازک ترکیبوں کا ایسا وسیع ذخیرہ موجود تھا، وہ فطرتاً شاعر پیدا ہوئے تھے۔'' (''مقالات احسان'' ص۱۰۳)

اقبال سہیل کی شاعری کا اصل موضوع حالات حاضرہ کی تصویر کشی ہے، انھوں نے اپنے کلام کو روایتی قسم کی شاعری سے الگ رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار ایک انفرادی حیثیت کے حامل شاعر کی صف میں ہوتا ہے۔

اقبال سہیل نے اپنی قومی شاعری میں ہندوستانی سیاست کے نشیب وفراز کو جس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے اس سے ان کی باریک بینی اور دوراندیشی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے سیاست کے میدان میں عملی طور پر حصہ بھی لیا، ۱۹۳۷ء میں جب یوپی کا پہلا جنرل الیکشن ہوا تو وہ اس میں کانگریس امیدوار کی حیثیت سے چناؤ لڑے اور کامیاب بھی ہوئے۔ الیکشن کے پس منظر میں انھوں نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں خاص طور سے ''پیام حق'' اور ''نوائے ادیب'' کو بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی ایک اہم نظم ''زمین دار اور کسان'' بھی ہے۔

اقبال سہیل کی قومی، وطنی، ملی اور سیاسی شاعری بڑی اہمیت کی حامل ہے، انھوں نے مذکورہ موضوعات پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی قادر الکلامی کے جو اوصاف ظاہر ہوتے ہیں وہ حقیقت میں فطری وطبعی شاعر ہونے کی دلیل ہے، اگر فکر معاش، فکر پرورش اولاد اور گردش روزگار نے انھیں پیشہ وکالت سے بچالیا ہوتا تو ان سے شعروادب کی وہ قندیلیں روشن ہوتیں جن کی ضیاء پاشیوں سے ایک جہان روشن ہوجاتا۔

پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ: ''مولانا نے گفتگو میں ایک بار بڑے پتے کی بات کہی تھی

بھی میں کسی پر عاشق تو ہوا نہیں اور تصوف کا دلدادہ ہونے کے باوجود صوفی بھی نہیں ہوں۔ میں نے غزل میں سیاسی حقائق بیان کئے ہیں۔''

مرا ذوقِ فن عامیانہ نہیں ہے ☆ یہاں قصۂ زلف وشانہ نہیں ہے

اقبال سہیل کو اردو شاعری کے علاوہ فارسی پر بھی قدرت کاملہ حاصل تھی انھوں نے فارسی زبان میں جو شاعری کی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے ہم بطور مثال اشعار پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اقبال سہیل کی فارسی زبان میں مہارت کا صحیح اندازہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس قول سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''کم لوگوں کو فارسی کے کلاسیکی ادب پر اتنا عبور حاصل ہوگا جتنا مولانا سہیل کو تھا۔ مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مولانا کے فارسی کلام میں اردو سے زیادہ طرفگی اور تازگی ہے، کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ مولانا فارسی نظم جلدی لکھ سکتے تھے یا اردو کچھ بھی ہو لکھتے بہت جلد تھے اتنا جلد کہ تصویر میں بھی یہ مشکل آسکتا ہے۔''

اردو کے نامور ادیب ودانشور پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ:

''مولانا اقبال سہیل کو فارسی اور اردو دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شبلی کے جانشین ہیں، اقبال سہیل کے فارسی قصائد دیکھئے تو شبلی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔''

ڈاکٹر انیس ادیب نے اقبال سہیل کی شاعری کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے:

''فارسی زبان میں اقبال سہیل کا اصل شعری سرمایہ ان کی قصیدہ گوئی ہے، ان کے فارسی کلام کا تمام تر حسن کمال قصیدہ ہی میں نظر آتا ہے، وہ قادر الکلام فن کار اور جودت پسند شاعر تھے، ان کے قصائد روایتی اور رسمی نہیں بلکہ اس میں جذبات کا خلوص ہے، انھوں نے اپنے قصیدہ کو انعام واکرام کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اپنی قوت شعر گوئی اور زور قلم کو تعمیری اور قومی ضروریات کے لئے استعمال کیا۔'' (''مشاہیر شعراء اردو کی فارسی شاعری''، ڈاکٹر انیس ادیب، مطبوعہ ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۹۹)

ہندوستان میں فارسی شاعری کے قافلہ کو جن لوگوں نے آگے بڑھایا ہے ان میں خاص طور سے

امیر خسرو، غالب، شبلی، علامہ اقبال اور اقبال سہیل کے نام بڑی افادیت و اہمیت کے حامل ہیں۔ اقبال سہیل کی اردو اور فارسی شاعری میں قوت تخیل کی سحر انگیزی، زبان و بیان کی ندرت، بندش خیال اور شوکت الفاظ کا ذخیرہ، طرزِ ادا کی روانی، جذبۂ اظہار کا کمال، ندرت خیال کی دل آویزی اور لطافت بیان کی شگفتگی یہ وہ لفظی اور معنوی خوبیاں ہیں جو ان کے قادر الکلام اور فطری شاعر ہونے کی جانب غمازی کرتی ہیں۔

ان کی شاعری قوم و ملت اور ملک و سماج کے لئے تھی، انھوں نے کبھی بھی اپنی شاعری کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا، وہ صلہ و ستائش سے کوسوں دور تھے، قدرت نے انھیں ایسا ذہن و دماغ اور قوت حافظہ دیا تھا جس کا استعمال اگر وہ خالص علمی و ادبی کاموں میں کرتے تو نہ جانے وہ کیا سے کیا ہوتے مگر ان کی غیور طبیعت نے حصول علم کے بعد کسی کی تملق و چاپلوسی گوارا نہیں۔

کلیات سہیل کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مدحیہ قصائد، منقبت، نعت، غزل، نظم، قطعہ، رباعی وغیرہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی، ان کی پوری اردو اور فارسی شاعری میں قصائد کو زبردست اہمیت حاصل ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مدحیہ قصائد جذبۂ عقیدت میں سرشار ہو کر لکھے ہیں، ان کی شاعری حقیقت میں قومی اور وطنی شاعری ہے۔ قومی اور وطنی شاعری کے حوالے سے ان کی قابل ذکر نظموں میں نوائے وطن، ترانۂ وطن، آزادیٔ ہند، یوم آزادی، وغیرہ کو زبردست شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ دیگر اہم نظموں میں آئین جدید، نوائے ادیب، زمیندار اور کسان، پیام حق، رحیق مختوم، آب حیات، شان زندگی،، گاندھی جی کا مرثیہ، مسز سروجنی نائیڈو کے لئے خیر مقدمی نظم، اور مولانا محمد علی جوہر کی وفات سے متاثر ہو کر کہی گئی نظم "مرگ حیات آفریں" بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ غزل کے میدان میں بھی آپ کے جادوئی قلم نے کمال کر دکھایا ہے مگر بحیثیت مجموعی آپ کی اردو اور فارسی شاعری میں قصائد اور نظم کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، میرے خیال میں یہی اقبال سہیل کا اصل علمی و ادبی سرمایہ بھی ہیں جس کی قدر دانی جب تک اردو زبان و ادب زندہ ہے ہوتی رہے گی۔

کتابیات

(۱) اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ ڈاکٹر محمود الٰہی۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۳ء

(۲) اردو کی نعتیہ شاعری۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۷۴ء

(۳) ارمغانِ حرم۔ افتخار اعظمی۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۶۰ء

(۴) تابش سہیل۔ افتخار اعظمی۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۵۸ء

(۵) شعرالہند۔ عبدالسلام ندوی۔ معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء

(۶) قصیدہ نگارانِ اتر پردیش۔ علی جواد زیدی۔ یوپی اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۷۵ء

(۷) مقالات احسان۔ مرزا احسان بیگ۔ معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء

(۸) لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ابواللیث صدیقی۔ اردو پبلشر، لکھنؤ ۱۹۷۳ء

(۹) نوائے حیات۔ یحییٰ اعظمی۔ معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء

(۱۰) نئے اور پرانے چراغ۔ آل احمد سرور۔ ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۷۲ء

(۱۱) ہم نفسان رفتہ۔ رشید احمد صدیقی معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۷۴ء

(۱۲) حیات شبلی۔ سید سلیمان ندوی۔ معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء

(۱۳) مشاہیر شعراء اردو کی فارسی شاعری۔ ڈاکٹر انیس ادیب، سرفراز پریس مئو ناتھ بھنجن ۱۹۹۳ء

(۱۴) ''سہیل نمبر'' مرتب نیاز احمد صدیق۔ میگزین محمد حسن انٹر کالج، جونپور، مطبوعہ ۱۹۵۳ء

(۱۵) ''افکار سہیل'' مرتب علی حماد عباسی۔ شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء

(۱۶) ''کلیات سہیل''۔ مرتب عارف رفیع۔ معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء

(۱۷) انتخاب کلام اقبال سہیل۔ مرتب ضیاء الدین اصلاحی۔ یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ ۲۰۱۰ء

(۱۸) اقبال سہیل حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر منور انجم، مطبوعہ ۱۹۹۵ء

(۱۹) کلیات اختر مسلمی۔ دانش فراحی۔ اعظم گڑھ۔ دانش فراہی اعظم گڑھ ۱۹۱۳ء

(۲۰) سخن ورانِ اعظم گڑھ۔ قمر الزماں مبارک پور ۲۰۱۵ء

(۲۱) اقبال اور دبستان شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔ ۲۰۱۵ء

(۲۲) ''اقبال سہیل کے تلامذہ کی ادبی خدمات'' محمد صالح انصاری (مقالہ برائے ایم فل۔ غیر مطبوعہ) حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی۔

☆☆☆

علامہ اقبال سہیل کی غزلیہ شاعری کا ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد ارشد اعظمی ☆

اعظم گڑھ کی سرزمین علم دانش کا مرکز رہی ہے، بڑے بڑے عظیم فنکار یہاں سے اٹھے اور آسمان علم وادب پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے، جن کی علمی وادبی تخلیقات ملت کا وہ عظیم سرمایہ ہیں جن سے انکار کرنا حقیقت سے چشم پوشی ہے۔

شبلی علم وادب کے آفتاب تھے جن سے بہتوں نے استفادہ کیا جو آگے چل کر نامور مصنف بھی بنے، لیکن ان میں صرف سہیل نے شبلی کی شاعرانہ لطافت خیال ونزاکت احساس کو اچھی طرح جذب کیا اور ان کی روایت کو آگے بڑھایا۔

وہ صحیح معنوں میں عبقری تھے اور اختراع وتخلیق کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ زبان خداداد تھی، برجستہ اشعار کہتے تھے، عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ فن کے نکتوں سے بخوبی واقف تھے اس لئے جملہ اصناف سخن پر ان کی حکمرانی یکساں تھی، ان کی انھیں خوبیوں کی بنیاد پر بعض ماہرین علم وفن جیسے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ، ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر ذاکر حسینؒ، رشید احمد صدیقی، سید سلیمان ندویؒ، مسز سروجنی نائڈو وغیرہ نے ان کا فیاضانہ اعتراف کیا ہے(۱)

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انھوں نے کتنے ہی شاعروں کی عظمت کے نقوش اجاگر کیے لیکن خود اپنے نتائج فکر کی اشاعت سے بے پرواہ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام کا بڑا حصہ خود ان کی بے پروائی سے ضائع ہو گیا۔ تاہم جو کچھ بھی محفوظ ہے وہ اردو ادب کے لئے زرو جواہر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس علمی نشست میں انشاء اللہ سہیل کی تخلیقات کے مختلف گوشے اجاگر ہو کر سامنے آئیں گے جن سے ان کے فکر وفن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ البتہ اس مقالہ میں سہیل کے ادبی آثار میں ان کی

☆ شعبۂ عربی، محمد مسعود خاں ڈگری کالج، ہنگراواں، اعظم گڑھ

غزلیہ شاعری کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی، جو اپنے موضوع کے تنوع کے لحاظ سے ایک سدابہار اور یادگار کارنامہ ہے۔

جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہیل کے شعری نقطۂ نظر کی وضاحت کردی جائے۔

سہیل ادب کے تفریحی وتعمیری دونوں کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک تفریح وہی صحیح ہے ''جو دماغی، جسمانی، یا اخلاقی وظائف میں حارج نہ ہو'' (۲) ان کے نزدیک ادب اہل ثروت کی تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ فطرت کا ترجمان، انسانیت کا خادم، عوام کے دکھ درد کا عکاس اور اعلیٰ انسانی قدروں کا محافظ ہے (۳)

وہ لکھتے ہیں ''اب ہمارا ادب ارباب اقتدار اور اہل ثروت کی سرپرستی کا محتاج نہیں رہا اب تو شاعری قیصر باغ کی بارہ دری سے آزاد ہوچکی ہے اور غریبوں کے جھونپڑے بھی ان کے نغموں سے معمور ہیں اب تو قدرتی طور پر یہ تعمیری زیادہ ہوگی'' (۴)

اکثر شعرا نے غزل میں عشق ومحبت کے مضامین کو زیادہ بیان کیا ہے لیکن ان کے نزدیک اس صنف سخن میں بھی زندگی کے تمام کوائف بیان کیے جاسکتے ہیں سہیل اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''معنوی حیثیت سے میں تغزل کا مخالف نہیں محبت کا جذبہ ایک عالمگیر حقیقت ہے لیکن میں پہلے عرض کرچکا ہوں اور پھر دوبارہ اس حقیقت کے اظہار میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ غزل کو صرف جنسی جذبات کی مصوری کا آلۂ کار سمجھنا اس صنف سخن کی توہین بھی ہے اور اس کے ہفت صد سالہ تاریخی پس منظر سے بیگانگی کا اظہار بھی'' (۵)

جس شاعر کا نقطۂ نظر شعر گوئی کے متعلق مستحکم اور وسیع ہو تو ظاہر ہے اس کی شاعری بھی اتنی ہی بلند، معیاری اور ہمہ گیر ہوگی۔ بقول سہیل:

مرا ذوق فن عامیانہ نہیں ہے یہاں قصۂ زلف و شانہ نہیں ہے
(۶)

انھوں نے شاعری کو اپنی شہرت کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔

ردو قبول خلق سے شاعر کو کیا غرض سودا نہیں سجائیں جو بازار دیکھ کر
(۷)

سہیل کا فن حالات کی رفتار سے کبھی بے نیاز نہیں رہا، ہندوستان کی غلامی، انگریزوں کی عیاریاں، فرقہ پرستوں کی تخریبی سرگرمیاں، لیگ اور کانگریس کی کشاکش، سرفروشانِ وطن کی جدوجہد، آزادی کی طلب، انقلاب حکومت کی تمنا، جمہوری عدل وانصاف کی خواہش اور ملکی تعمیر وترقی کا احساس غرضیکہ بہت سے سیاسی واقعات اور سماجی میلانات غزل کی داخلی کیفیت اور علامتی معنویت کے ساتھ ان کے کلام میں آگئے ہیں۔

وہ یقیناً عوامی شاعر تھے اور بدلتے ہوئے زمانے کے جدید تقاضوں سے بخوبی واقف تھے۔ ہندوستان میں جب بغاوت کے آثار پھیلنے لگے اور برطانوی آمریت اپنی بھیانک شکل میں نمودار ہونے لگی تو سہیل نے اپنے غم کا اظہار اس طرح کیا۔

سنائیں کس کو الٰہی غم نہاں اپنا   اس انجمن میں نہیں کوئی ہم زباں اپنا
(۸)

یہ غزل تمام تر سیاسی کوائف کی تصویر ہے۔ لیکن وقت کی ہزار گردشوں کے باوجود سہیل کی جبین پر شکست واضمحلال کی کوئی شکن دکھائی نہیں دیتی، وقت کی بے رحم بادِ صرصر اس کے دامن دل کو گرد ملال سے آلودہ نہیں کرتے، انھوں نے اس ممتاز صنف سخن میں بے شمار امکانات کے دریچے کھول دیے اور فکر و خیال کی ایک وسیع وعریض فضا میں اپنے سخن وروں کو پرواز کا حوصلہ عطا کیا۔ جب وطنی تحریک نے قوت و شوکت حاصل کی تو سہیل نے فداکاران وطن کو جرأت وہمت اور عزم وثبات سے کام لینے کی تلقین کی:

دو تیلیاں قفس کی ہیں ان کی بساط کیا   مرغ اسیر ہمت مردانہ چاہیے
(۹)

ایسے حالات میں وہ رجائیت اور آرزومندی کے شمع بردار بن کر سامنے آتے ہیں ان کی اس بے پناہ رجائیت اور حوصلہ مندی کو ہم ان کے اشعار میں قدم قدم پر محسوس کرتے ہیں۔ میرے خیال میں رجائیت کے لئے بڑی حوصلہ مندی کی ضرورت ہوتی ہے اور انسانیت کے روشن مستقبل کے بارے میں کسی یقین کلی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سہیل کتنی عظیم فکر اور کتنے بلند اعتماد کے حامل ہیں کہ انسان کے بارے میں مایوس ہونے پر کسی طرح تیار نہیں۔

موج سیل رواں سے یہ صدا آتی ہے   ننگ ہمت ہے موانع سے ہراساں ہونا
(۱۰)

ساقی سبو بدوش ہے اے ذوق تشنہ کام — دست طلب میں جرأت رندانہ چاہئے

(۱۱)

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے — بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

(۱۲)

وہ ایک سچے محب وطن تھے۔ حب الوطنی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا ان کو اپنے وطن کے ایک ایک ذرے سے محبت تھی اور اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی دولت کو بھی ہیچ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وطن پر جان نچھاور کر دینے کو ایمانی حرارت سے تعبیر کرتے ہیں۔

محبت ہے وطن کی گل زمیں سے — ہمیں اب کیا غرض خلد بریں سے

(۱۳)

عین ایماں ہے وطن کے لئے قرباں ہونا — کاش واعظ کو بھی آجائے مسلماں ہونا

(۱۴)

وہ دو قومی نظریہ کے سخت مخالف تھے۔ کیوں کہ انگریز خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر آپس میں مذہبی ولسانی اور دوسرے قسم کے اختلافات پیدا کر کے نفرت وانتشار کا بیج بوتے تھے جس کی وجہ سے ملک کا اتحاد پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں۔

غبار شیخ و برہمن نہ درمیاں ہوتا — تو خاک ہند کا ہر ذرہ آسماں ہوتا

(۱۵)

مذکورہ شعر میں قومی یکجہتی کو بلندی کا معیار قرار دیا ہے۔

آزادی وطن کے تعلق سے انھوں نے جو غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں ان میں بلا کا جوش ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں آزادی کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے جس میں جوش بیان بھی ہے اور لطافت احساس بھی۔

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے اسیر غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہے باغباں نے تو آکے گلچیں بھی لوٹ جائے

ستم بھی ہوگا تو دیکھ لیں گے کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے یہ مہربانی کا جھوٹ جائے
بلا سے قزاق آکے لوٹیں یہ پاسبانوں کو لوٹ جائے
اچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے قفس تو کمبخت ٹوٹ جائے

(۱۶)

چونکہ وہ آزادی کے آرزومند تھے اس لئے دوسرے مذاہب کے عالی حوصلہ لوگوں کی قربانیوں کو بھی اپنی شاعری میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جن میں گاندھی جی، تلک، بھگت، جے پال، جواہر لال نہرو، موتی لال نہرو، سبھاش چندر بوس، ڈسائی، جھانسی کی رانی، مسز سروجنی نائڈو خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

”حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف جو نعرۂ جہاد و بغاوت اقبال سہیل کے یہاں ملتا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا“ (۱۷)

وہ قومی یکجہتی کے علمبردار تھے اس لئے تقسیم ہند کے مخالف بھی تھے۔ انھوں نے جمہوریت اور قومی اتحاد کی طرف ہندوستان کے تمام فرقوں کو دعوت دی، وہ فرقہ پرست عناصر کے اتنے ہی مخالف تھے جتنے کی انگریزی سامراج کے۔ سہیل نے اپنی غزلوں میں انگریزوں کے شر انگیز طرز سیاست پر سخت تنقید کی ہے۔

اٹھائے ہیں یہ فتنے نرگس غماز نے ورنہ نہ بت سے شیخ کو ضد ہے نہ کعبہ سے برہمن کو

(۱۸)

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے گریباں کو لڑایا آستیں سے

(۱۹)

آزادی کے بعد حالات و واقعات کی جو رفتار رہی سہیل نے کمال فن کے ساتھ اپنی غزلوں میں ان کی تصویر کشی کی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے جو غزلیں کہیں ان میں عوام کا درد و کرب، ان کا انتشار و افلاس، ان کی محرومی و افسردگی اور ان کی ذہنی و مادی ناآسودگی روشن ہو کر سامنے آگئی ہے لیکن تلخیوں کے اظہار میں بھی وہ اپنے لب و لہجہ کا کیف اور اسلوب کی لطافت برابر قائم رکھتے ہیں۔

ہے عنادل کو وہی درس کہن یاد ابھی — کہیں بیٹھا تو نہیں گھات میں صیاد ابھی

(۲۰)

گیا ساقی تو کیا بے خود ہیں اس کے جرعہ خوار اب تک
سروں میں ہے وہی صہبائے دوشیں کا خمار اب تک

(۲۱)

صبا نے جاتے جاتے کیا سرگوشیاں کی ہیں
نہ بھولا ایک برگ گل بھی درس انتشار اب تک

(۲۲)

سہیل پاکیزہ ذہن، صالح خصلت اور حساس دل رکھتے تھے۔ دل میں سب کی عزت تھی ان کا مسلک صلح کا تھا وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی تقسیم کو تسلیم کرنے کے باوجود بھی ان کو ایک ہی قوم کے دو بھائی سمجھتے تھے اور ہر ایک کے غم میں شریک ہونا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔

مذاق سر بلندی ہو تو پھر دیر و حرم کیسے
جبیں سائی کی فطرت نے کیے ہیں سنگ در پیدا

(۲۳)

سہیل کو الفاظ و محاورہ پر پوری قدرت ہے۔ وہ ان کو برمحل اور برجستہ استعمال کرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات جدت ادا اور معنی آفرینی کا مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ انھیں اس صورت سے برتنا کی شعر میں معنی آفرینی کے ساتھ تغزل اور موسیقی پیدا ہو جائے بہت بڑا کمال ہے۔ شعر میں کوئی بات بھی کھول کر بیان نہیں کی جاتی، استعارے سے کام لیا جاتا ہے اور اختصار ہی کلام کی جان ہوتا ہے۔ سہیل نے اس کے ذریعہ اپنی شاعری میں رمزیت، معنی آفرینی اور تاثر پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے ان کی شاعری کا حسن مزید نکھر گیا ہے۔

فارسی ترکیبوں کا استعمال اردو شاعری میں بکثرت ہوتا ہے جس سے شعرا عموماً اپنے محبوب کا نقشہ کھینچنے میں مدد لیتے ہیں لیکن سہیل نے ان فارسی تراکیب جیسے غمزہ قتال، حسن فسوں گر، فتنۂ محشر، شعلۂ مضطر، سبزۂ بیگانہ، چشم فسوں گر، نرگس غماز، نگاہ سامری، قہر مجسم، سحر مصور، بت سحر آفریں، چمن، گل،

بلبل، صیاد، قفس، ساقی، مے کدہ، رند اور شیشہ و پیمانہ کو نئی علامتوں میں استعمال کر کے انگریزوں کی پالیسیوں اور ان کی شاطرانہ چالوں پر بڑے گہرے اور معنی خیز طنز کئے ہیں جس کی کاٹ اپنے اندر نشتر کا اثر رکھتی ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

''غزل گوئی کو رسمی اور روایتی طنز سے نکال کر سیاسی طرز سے اس طرح آشنا کرانا کہ غزل اور طنز دونوں کا حق ادا ہو جائے سہیل کا بڑا اہم اور قابل قدر کارنامہ ہے اس رنگ میں ان کا ہمسر اب تک نظر نہ آیا''۔ (۲۴)

اس طرح سہیل نے اپنے بعد آنے والے غزل گو شعرا کے لئے راستہ ہموار کیا ہے چنانچہ سہیل کے بعد ابھرنے والے غزل گو شعراء مثلاً فیض، جذبی اور مجروح وغیرہ نے اس اجتہاد سے فائدہ اٹھایا اور غزل کو نئی جہت اور نئی توانائی عطا کی۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

''حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کے یہاں بھی سیاسی اشعار ملتے ہیں لیکن اقبال سہیل نے غزل کے کنایات وہ اشارات کو ایک نئی سیاسی معنویت عطا کی، جس کی بنیادوں پر فیض کی شاعری کی عمارت بنی اور جس کی خوشہ چینی موجودہ دور کے بہت سے شعرا و ادباء کر رہے ہیں''۔ (۲۵)

سہیل کی غزلوں میں ان کے سیاسی اشعار ان کے شعور کی پختگی اور بیداری کے ترجمان ہیں۔ اکثر محققین نے ان کی شاعری میں سیاسی حقائق اور ان کی رمزیت کی بڑی تعریف کی ہے۔ (۲۶) سیاسی اشعار اگرچہ وقتی اور ہنگامی حالات سے متاثر ہو کر کہے گئے تھے لیکن انھوں نے اپنے فن کی قوت سے اس کو ایسی بلندی عطا کی ہے کہ آج بھی انھیں پڑھیے تو تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

سہیل کے غزلیہ کلام میں اگرچہ سیاسی حقائق کے گونا گوں پہلوؤں کی طرف عکاسی کی گئی ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کا کلام ذکر محبوب سے یکسر خالی ہو ان کے کلام میں جہاں اس کے نمونے ملتے ہیں وہاں حسن کلام کے ساتھ شدت احساس نے ساحرانہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔

اب ہجر کا شکوہ نہ تغافل کا گلہ یاد — آئی جو تری یاد تو کچھ بھی نہ رہا یاد
سب غم تھے فراموش جہاں تجھ کو کیا یاد — ہر درد کی ہے مجھ کو یہی ایک دوا یاد
رہ جائے اگر کچھ بھی ترے غم کے سوا یاد — وہ ہوش بھی کیا ہوش ہے وہ یاد بھی کیا یاد

(۲۷)

ان کا یہ والہانہ پن سننے والوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور ایسی سرشاری پیدا کر دیتا ہے جس کا اثر تادیر باقی رہتا ہے۔ میر کی طرح سہیل بھی آداب محبوب کے قائل ہیں ان کا جذبہ احترام اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ ان کے قدموں کے نشان سے محبوب کے قیام کا پتہ چلے، اس خیال کو بڑے اچھوتے انداز میں ادا کرتے ہیں جس کی مثال دوسرے شعراء کے کلام میں مشکل سے مل سکے گی۔

اگر چلنا تو نقش پا بھی لغزش سے مٹا دینا
نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتہ دینا

(۲۸)

شعر میں ''نقش پا'' کو لغزش سے مٹانا عقلی پیکر تراشی کی عمدہ مثال ہے۔

سہیل اگر چہ محبوب کے احترام کے قائل ہیں لیکن ان کا عشق خوددار ہے جو عزت نفس کا خاص خیال رکھتا ہے اس کوچہ میں وہ عربوں کے مذاق سر بلندی کے قائل نظر آتے ہیں امرؤالقیس کہتا ہے۔

اغـرك مـنـى ان حبك قـاتـلـى
وانك مـعـمـا تـامـرى القلب يفعل

ومـا ذرفـت عـيـنـاك الالتضربى
بسهميك فى اعشار قـلـب مقتل

فـان كـنـت قـد سـاتك منى خليقة
فسلـى ثـيـابـى من ثيابك تنسل

(۲۹)

سہیل کہتے ہیں:

آخر غرور حسن کو کھانی پڑی شکست
میرے نیاز عشق کو خود دار دیکھ کر

(۳۰)

عشق اور حسن سے سوال کرم
یہ تو غیرت کا اقتضا نہ ہوا

رتبہ داں تھا جبین عشق کا میں
حسن کے در پہ جبہ سانہ ہوا

(۳۱)

سہیل کے مذکورہ خیال سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تصور عشق میں احتیاج کو راہ نہیں دیتے بلکہ اس جذبے کو وہ عشق کی غیرت اور اس کی حرمت و تقدس کے منافی سمجھتے ہیں۔ وہ اس بازار میں ایک غیور اور عالی نظر رند کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ڈھونڈھنے سے ایک شعر میں ایسا نہیں ملے گا جس میں رکیک خیالات کی ترجمانی کی گئی ہو جب کہ حسرت موہانی جیسے باکمال شاعر جو

غزل کے مصلح اعظم کہے جاتے ہیں وہ بھی اس مے کدے میں اپنے دامن کو ابتذال اور فحاشی سے نہیں بچا سکے۔(۳۲)

اردو شاعری میں غم اور حرماں نصیبی کی داستانیں بہت عام ہیں۔ ہر شاعر نے یہ حکایتیں بیان کی ہیں، کسی نے حقیقی کسی نے فرضی سہیل نے بھی غزل میں غم کو موضوع سخن بنایا ہے لیکن ان کے کلام میں کہیں بھی غم سے فرار کی تعلیم نہیں ملتی بلکہ غالب کی طرح وہ بھی غم کے لذت شناس ہیں اور اس سے لطف اٹھانے کے قائل ہیں۔

غم ہے اساس فطرت دنیائے رنگ و بو کی　　شبنم کے اشک سے ہیں تر دستیاں نمو کی
دل کی بہار کیا ہے غم سے فگار ہونا　　زخم جگر کے گل کو حاجت نہیں رفو کی
(۳۳)

لذت شناش غم کو ہے اظہار غم حرام　　روتا ہوں اور دامن مژگاں بھی تر نہیں
(۳۴)

خلش غم میں بھی ہنس ہنس کے گزر کرتے ہیں
ہم ہیں وہ پھول جو کانٹوں میں گذر کرتے ہیں
(۳۵)

سہیل ڈاکٹر علامہ اقبال کی طرح حرکت و انقلاب کے پیام بر ہیں راحت طلبی سے بیزار اور مشکل پسندی کے قدر شناس ہیں؛

ننگ ہے صید زبوں ہمت عالی کے لئے　　میری مشکل ہے مرے کام کا آساں ہونا
(۳۶)

خودداری ایک نمایاں وصف ہے جس کے نمونے بھی سہیل کی شاعری میں بکثرت ملتے ہیں۔

دل خطاوار اشتیاق سہی　　لب گناہگار التجا نہ ہوا
(۳۷)

نثار اس لن ترانی کے یہ کیا کم ہے شرف اس کا　　دل خود دار نے کر لی نگاہ خود نگر پیدا
(۳۸)

میں تجھ سے کیا کہوں اے فیضِ فطرت مجھ کو کیا دینا	دل بے مدعا دینا لب بے التجا دینا
(۳۹)

ہر بڑا فن کار دوسرے عظیم فن کاروں سے ضرور استفادہ کرتا ہے اور ان کی صالح روایات کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا جتنے بھی بڑے فنکار ہیں ان کے شاہ کار فن پاروں میں دوسرے عظیم فن کاروں کا پرتو ضرور دکھائی دیتا ہے۔ ہر ذہین اور صاحب ذوق قاری کی طرح سہیل بھی مرزا غالب سے بہت متاثر ہیں۔ (۴۰) بہت سے اشعار انہی کی زمین میں کہے بھی ہیں اور ان کے فکر کی مدح سرائی بھی کی ہے۔ جیسے:

مری چشمِ بصیرت کھول دی اس کی بشارت نے	الٰہی نور سے معمور کر غالب کے مدفن کو
"نہ لٹتا دن کو تو یوں رات کو کیوں بے خبر سوتا	رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو"
(۴۱)

کہیں کہیں تو وہ غالب کے خیال سے بہت قریب ہیں۔ ذیل میں اس کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں جس کی روشنی میں ان کی فکری ہم آہنگی کا اندازہ ہو سکے گا؛

غالب کہتے ہیں:

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا	جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
(۴۲)

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا	کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
(۴۳)

سہیل کہتے ہیں:

اب ضبطِ شوق کا متحمل نہیں رہا	دل جلوہ گاہِ حسن کے قابل نہیں رہا
(۴۴)

جدا ہے سب سے رسم و راہ حسن کے دیار کی	نہ قول اعتماد کا نہ بات اعتبار کی
(۴۵)

ترے قول کا کچھ ٹھکانہ نہیں ہے فریب اس کو دے جس نے جانا نہیں ہے

(۴۶)

غالب کا شعر ہے:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

(۴۷)

سہیل کا شعر ہے:

سیل رواں سے کم نہیں طبع رواں مری تھمتا ہے جوش راہ کو ہموار دیکھ کر

(۴۸)

غالب کے علاوہ ان کے کلام میں کہیں کہیں مومن کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ مومن کا ایک شعر ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں[1]

(۴۹)

اس مضمون سے ملتا جلتا ایک دلنشیں شعر سہیل کا بھی ہے۔

لگاوٹ کا یہ فن بادسحر نے مجھ سے سیکھا ہے گلوں کو گدگدایا اور نہ لپٹے خار دامن کو

(۵۰)

اوپر کی مثالوں میں سہیل اپنے پیش رو شعراء کے ہم خیال ضرور ہیں لیکن ان کا اپنا اجتہادی رنگ ہے جس کی وجہ سے وہ تقلیدی حدود سے نکل گئے ہیں۔ فکر میں اگرچہ کہیں کہیں مماثلت بھی ہے لیکن ہر خیال اور مضمون میں سہیل کی جدت اور طرز ادا کی زیریں لہریں اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ سہیل اصغر و فانی کے معاصر تھے اس تعلق سے ان کے کلام میں کہیں کہیں فلسفہ اور تصوف کی دھوپ چھاؤں بھی ملتی ہے۔ ابتدائی غزلوں کا ہر شعر معرفت و حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ ایک سچے موحد ہیں اور خدا کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ بڑے بڑے صوفی و عارف کو بھی شاید یہ مقام مشکل سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ رحمت حق کا ہر حال میں امیدوار رہے۔

---

[1] یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔ (مرتب)

زاہد کو اپنے حسنِ عمل پر غرور ہو مجھ کو تو تیری شانِ کریمی پہ ناز ہے
(۵۱)

سہیل کے شاعرانہ فضل وکمال کا دائرہ صرف اردوداں طبقہ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ صوفیہ کی مجالس میں بھی ان کی شاعری کے تذکرے ہوتے تھے۔ راقم کے نانا محترم مولانا محمد عاصم اصلاحی ان کے کلام کے بڑے مداح تھے۔ آخیر عمر میں وہ مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی سے بیعت ہوگئے تھے۔ اس تعلق سے اکثر الہ آباد آنا جانا ہوتا تھا، ایک مرتبہ اپنی کسی ملاقات میں سہیل کے نعتیہ کلام کو پیش کر کے مولانا کی رائے جاننا چاہی تو مولانا نے ان کے کلام کی بڑی تعریف وتوصیف فرمائی اور کہا ''ارے یہ تو اس اقبال سے بھی بڑھے ہوئے ہیں'' خوش ہو کر فرمایا ''جا سہیل خدا تجھے ترے کلام کی بدولت تری لغزشوں کو معاف فرمادے گا''۔ (۵۲) ان کے حق میں ایک عارف ربانی کا یہ جملہ اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

سہیل علوم عربیہ سے پوری طرح واقف تھے احادیث نبوی اور آیات قرآنی پر ان کی نظر تھی ان کے نعتیہ کلام میں تو جا بجا اس کی بلیغ تلمیحات ملتی ہیں تاہم اس کے کچھ نمونے غزل میں بھی ملتے ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

والذین تبوّء الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجة مما اوتوا ویوثرون ولو کان بھم خصاصة (۵۳)

ترجمہ: جو لوگ اس گھر میں جگہ پکڑے رہے ہیں اور ان سے پہلے ایمان میں وہ ان سے محبت کرتے ہیں وہ وطن چھوڑ کر آئے اور اپنے دل میں اس چیز سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دی جائے اور ان کو اپنی جان پر مقدم رکھتے ہیں اگر چہ اپنے اوپر فاقہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس مضمون کو سہیل نے اپنے شاعرانہ انداز میں اس طرح ادا کیا ہے۔

نکہتِ گل کی طرح عمر بسر کی اقبال راحت اغیار کو دی آپ پریشاں ہو کر
(۵۴)

غرضیکہ اقبال سہیل ایک ممتاز غزل گو ہیں جن کی ایک منفرد شناخت ہے۔ جس کا ہر قدم عزت

نفس اور خودداری کے احساس کے ساتھ اٹھتا ہے جنہوں نے شاعری کی تمام صالح روایات کو اپنایا ہے اور غزل کو صرف سیاسی وسماجی حقائق ہی سے آشنا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں مختلف علوم کو سمو کر اس کے افق کو وسیع کیا ہے سہیل اپنی اسی منفرد شناخت کی وجہ سے اردو غزل کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آخر میں سہیل کے اس شعر پر غزل کے جائزے کا اختتام کیا جاتا ہے۔

ہر حرف حقائق کا دفتر ہر لفظ معانی کا جوہر
ہے تیری غزل یا سلک گہر اقبال یگانہ کیا کہیے
(۵۵)

حواشی و مراجع

(۱) کلیات سہیل، اقبال احمد خاں سہیل مرتبہ عارف رفیع، معارف پریس شبلی اکیڈمی ۲۰۱۱ء، ص: ۲۰-۱۸ او"تابش سہیل" ص: ۱۲-۳۴

(۲) سہیل کا اصل مضمون تو مجھے نہیں مل سکا تاہم اس کے کچھ اقتباس بعض محققین نے اپنی تحریروں میں نقل کیے ہیں تفصیل کے لئے دیکھئے "منشور سہیل اکیڈمی" افتخار احمد اعظمی، بلوا گھاٹ، جونپور ۱۹۶۵ء، ص: ۲

(۳) ایضاً، ص: ۲

(۴) ایضاً، ص: ۲

(۵) ایضاً، ص: ۴

(۶) کلیات سہیل، ص: ۲۳۴

(۷) ایضاً، ص: ۱۹۱

(۸) ایضاً، ص: ۱۹۳

(۹) ایضاً، ص: ۲۰۰

(۱۰) ایضاً، ص: ۲۳۶

(۱۱) ایضاً، ص: ۲۰۰

(۱۲) ایضاً،ص:۱۹۹

(۱۳) ایضاً،ص:۲۳۰

(۱۴) ایضاً،ص:۲۳۵

(۱۵) ایضاً،ص:۲۲۷

(۱۶) ایضاً،ص:۲۴۰

(۱۷) چند ارباب کمال، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، معارف پریس، اعظم گڑھ،۱۹۸۳ء، ص:۱۸۲

(۱۸) کلیات سہیل، ص:۲۳۵

(۱۹) ایضاً،ص:۲۳۰

(۲۰) ایضاً،ص:۲۴۶

(۲۱) ایضاً،ص:۲۴۸

(۲۲) ایضاً،ص:۲۴۹

(۲۳) ایضاً،ص:۲۲۲

(۲۴) تابش سہیل، ص ۳۱ و ارمغان حرم، افتخار اعظمی، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۶۰ء، ص:۹۲

(۲۵) افکار سہیل، شوکت سلطان علی حماد عباسی (مضمون علی جواد زیدی) ۱۹۵۷ء، ص:۲۷

(۲۶) تفصیل کے لئے دیکھئے: ذکر سہیل، افتخار احمد اعظمی، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص: ۸۷ و "یاد سہیل" معارف پریس، ۱۹۵۷ء، ص: ۳۱ و "سہیل نمبر" نیاز احمد صدیقی، (مضمون پروفیسر آل احمد سرور) محمد حسن انٹر کالج، جونپور ۱۹۵۳ء، ص ۳۸

(۲۷) کلیات سہیل، ص:۲۳۶

(۲۸) ایضاً،ص:۲۱۶

(۲۹) تاریخ الادب العربی، احمد حسن الزیات، کتب کانہ رشیدیہ، اردو بازار، جامعہ مسجد دہلی، بدون سن، ص:۳۹

(۳۰) کلیات سہیل، ص:۱۹۱

(۳۲) حسرت کا شعر ہے:

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
اس غم میں ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

رہے سینہ تا لنگر سے اس کے
یہ چوٹی اس لئے پیچھے پڑی ہے۔

ضبطِ خواہش پر ہو نازاں مگر اے حسرتِ دل
کیا ہو سوتے میں جو اس کو اکیلا دیکھوں

''دیوان حسرت'' ص

(۳۳) کلیات سہیل، ص:۲۰۶
(۳۴) ایضاً، ص۲۳۸
(۳۵) ایضاً، ص:۲۱۲
(۳۶) ایضاً، ص:۲۲۵
(۳۷) ایضاً، ص:۱۸۹
(۳۸) ایضاً، ص:۲۲۴
(۳۹) ایضاً، ص:۲۱۶
(۴۰) مقالات احسان، مرزا احسان احمد بیگ، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء، ص:۱۰۲
(۴۱) کلیات سہیل، ص:۲۳۵
(۴۲) دیوان غالب، اسد اللہ خاں غالب، فرید بک ڈپو پرائیویٹ لیمٹیڈ ۱۹۹۹ء، ص:۳۷
(۴۳) ایضاً، ص:۱۸
(۴۴) کلیات سہیل، ص:۲۰۵
(۴۵) ایضاً، ص:۲۰۲
(۴۶) ایضاً، ص:۲۳۴
(۴۷) دیوان غالب، ص:۶۰
(۴۸) کلیات سہیل، ص:۱۹۱
(۴۹) مومن کے اصل دیوان سے رجوع نہیں کیا جا سکا لیکن محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں اس شعر کو شاعر کے نام کو ظاہر کئے بغیر نقل کیا ہے دیکھئے آب حیات محمد حسین آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص:۴۱
(۵۰) کلیات سہیل، ص:۲۳۵

(۵۱)　ایضاً،ص:۲۳۲

(۵۲)　زبانی گفتگو، مشتاق احمد، پان والے کوٹھی پر، کوٹلہ، اعظم گڑھ، دسمبر ۲۰۱۷ء اس روایت کی تائید مولانا کے ایک دوسرے ہم وطن عبدالقیوم صاحب نے بھی کی۔ یہ دونوں حضرات الحمداللہ ابھی باحیات ہیں، اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ آمین۔

(۵۳)　قرآن مجید، سورۃ الحشر، الآیہ ۹

(۵۴)　کلیات سہیل، ص:۱۹۸

(۵۵)　ایضاً، ص:۲۵۳

☆☆☆
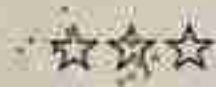
علامہ اقبال سہیل کی شاعری میں حب الوطنی وقومی یکجہتی کا جذبہ

ڈاکٹر خورشید جمال قاسم☆

آج جب کہ مسلمانوں کی حب الوطنی پر سوالیہ نشان قائم کیا جارہا ہے، اور ملک میں رہنے والا ہر مسلمان شک وشبہ کے حصار میں گھرا ہوا ہے اور خاص طور پر ہمارا یہ شہر جو مختلف جہات سے خوبیوں کا مالک ہے، کچھ فرقہ وارانہ ذہنیت کے لوگ اسے بدنام کرنے کے لئے الگ نام دے رہے ہیں، ایسے پُرفتن ماحول میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بزرگوں اور بڑوں کی قربانیوں کو اپنی نسلوں کو یاد دلائیں اور ایسی نشستوں کا انعقاد کر کے ان کی قربانیوں، حب الوطنی اور قومی یکجہتی نظریات کو دنیا کے سامنے پیش کریں، ورنہ ہمارے بزرگوں اور بڑوں کی قربانیاں جو تاریخ کے اوراق میں سنہرے لفظوں میں لکھی گئی ہیں ایک پارینہ داستان بن کر رہ جائیں گی، اس گلستان (ملک) کو جو ہم آج اپنی آنکھوں سے لہلہاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، یوں ہی وجود میں نہیں آیا بلکہ اس ملک میں رہنے والے مختلف مکتب فکر کے لوگوں نے قربانی دے کر اسے سینچا ہے۔ ملک جب غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا تو اسے غلامی سے نجات دلانے کے لئے لوگوں نے مختلف شکلوں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، دامے، درمے، قدمے، سخنے جس سے جو بن پڑا وہی کیا۔

ملک کی آزادی کے سلسلے میں جب سخن کی بات آتی ہے تو ایک اچھی خاصی تعداد ہمیں ایسی نظر آتی ہے جنھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ قوم کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی اور

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، شری بھوانند پی جی کالج، پنرجی جہانا گنج، اعظم گڑھ۔

لوگوں میں ملک کی آزادی کا سچا ولولہ وجذبہ پیدا کیا اور قومی یکجہتی کا سبق پڑھایا وسکھایا، انھیں شخصیات میں ایک مایہ ناز شخصیت علامہ اقبال سہیل کی ہے جن کے اندر حب الوطنی وقومی یکجہتی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اور یہی جذبہ وہ ملک کے لوگوں اور خصوصاً نوجوانوں میں بھی بھرنا چاہتے تھے۔

کیے ہیں چاکِ دل سے بوئے گل نے بال وپر پیدا ہوس ہے زندگانی کی تو ذوقِ مرگ کر پیدا

جوانو! یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا

دراصل اقبال سہیل کو حب الوطنی وقومی یکجہتی کا جذبہ ان کو اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملا تھا، جن اشخاص کے زیر سایہ رہ کر ان کے اس جذبے کو عروج حاصل ہوا اس میں ان کے استاذ علامہ شبلی نعمانی کا نام سر فہرست ہے، اقبال سہیل نے کبھی بھی فرقہ پرستی کی حمایت نہیں کی، بلکہ آزادی واتحاد کی تحریک کی ہمیشہ دعوت دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنی شاعری کو اپنے سیاسی نظریات وخیالات کی ترجمانی کا وسیلہ بناتے ہیں تو ان کی شاعری معراج پر پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

تاراج نشیمن کھیل سہی، صیاد مگر اتنا سن لے
جب عشق کی دنیا لٹتی ہے، خود حسن کا ماتم ہوتا ہے

اس ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ قیام پذیر ہیں اور ہر مذہب والے اپنے اپنے ڈھنگ سے مختلف چیزوں سے عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے نزدیک ان کی اہمیت ہے، جیسے دریاؤں کا سنگم جس کا تعلق مذہبی عقیدے سے ہے لیکن مختلف مذاہب کا جو آپس کا اتحاد وبھائی چارگی اور پیار ومحبت ہے وہ اقبال سہیل کے نزدیک دریاؤں کے سنگم سے بھی بڑھا ہوا ہے، انھیں قوموں کا سنگم سب سے زیادہ عزیز ہے، وہ اسے بڑے دلکش اور اچھوتے انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مل جل کے برنگ شیر وشکر دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے

اقبال سہیل سیاست جیسے خشک موضوع کو بھی غزل کے پیرائے میں اس اچھوتے انداز، لطافت ودلآویزی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں کہ نازک صنف سخن کی رعنائی ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی۔ یہ ان کے فن کا بڑا کمال ہے۔

اقبال سہیل کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی، وہ مکمل آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست

حامی تھے، اپنی اسی حب الوطنی کی وجہ سے وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں سردھڑ کی بازی لگا کر شریک ہوگئے تھے، چاہے رزم کی مجلس ہو یا بزم کی مجلس ہر جگہ وہ جوش کا نغمہ، ولولہ انگریز ترانہ گاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

تو غیروں کے چنگل سے آزاد ہو پشیمان باہر کا صیاد ہو

گائیں گے ہم آزادیٔ گلشن کا ترانہ بیکار ہے اے برق بلا ہم کو ڈرانا

غلامی، غلامی ہوتی ہے، چاہے غلامانہ زندگی میں تعیش کے سارے اسباب مہیا ہوں، پھر بھی انسان کو ذہنی آسودگی حاصل نہیں ہوتی ہے، اس کا تخیل ایک دائرے میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے اور ترقی کے تمام امکانات ختم اور آگے بڑھنے کے سارے راستے بند دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس غلامی میں رہ کر بھی نہ خود مایوس ہوئے اور نہ وطن کے متوالوں کو بھی مایوس ہونے دیا، بلکہ ان کے اندر اپنے کلام کے ذریعہ ایک نیا حوصلہ اور جذبہ پیدا کیا۔

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا
ابھی دیوار زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

جب ولولہ صادق ہوتا ہے جب عزم مصمم ہوتا ہے
تکمیل کا ساماں غیب سے خود اس وقت فراہم ہوتا ہے

اقبال سہیل ملک پر انگریزوں کے تسلط کو سب سے زیادہ معیوب سمجھتے تھے اور انھیں اس سے حد درجہ نفرت تھی، ان کے خیال میں ملک کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اور لعنت ومصیبت نہ تھی، اس لئے وہ اس تسلط کو جو ایک فتنہ کی شکل میں نمودار ہوا تھا جلد از جلد خاتمہ کے خواہاں تھے، اس لئے جب بھی انگریزوں کی شکست ہوئی چاہے وہ دوسری جنگ عظیم ہو یا دیگر اور کوئی موقع وہ اس پر خوشی کا اظہار کرتے تھے، اور اسے غلامانِ ہند کی آہ وزاری سمجھتے تھے۔

بالآخر سرفروشانِ وطن کی قربانیوں وجدوجہد کے صلہ میں جب یہ ملک غلامی کی زنجیر سے آزاد ہوا اور لال قلعہ پر قومی پرچم لہرایا تو اقبال سہیل کا دل مسرت وشادمانی کے جذبات اور جشن طرب کے نغمات سے معمور ہو گیا اور انھوں نے اپنی دلی خوشی کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

وہ دور مسرت آنے دو، قومی پرچم لہرانے دو
جاتی ہے غلامی جانے دو، صدیوں کا دلدر جاتا ہے
طوفان مسرت اٹھا ہے، نغموں کا تلاطم برپا ہے
اقبالؔ سخنور کے لب سے بھی مہر خموشی ٹوٹ گئی

سہیل کی نگاہ میں سیاسی آزادی سے بڑھ کر ملک کی خوشحالی، فارغ البالی، معاشی ترقی اور اقتصادی آزادی کا مسئلہ تھا، بلکہ وہ غربت، افلاس اور بے روزگاری کے خاتمہ ہی کو اصلی آزادی سمجھتے تھے، اس لئے ملک کے نوجوانوں کو اس نازک اور اہم موڑ پر مل جل کر ملک کا وقار بڑھانے اور اس کی تعمیر وترقی کے کاموں میں لگ جانے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں ۔

نئی سج دھج ہو گلشن کی نیا ہو بانکپن پیدا — نئے بوٹے، نئے گل پھر کرے خاک چمن پیدا
غلاموں میں بھی ہو آزاد رہنے کی لگن پیدا — الٰہی پھر دلوں میں ہو نیا درد وطن پیدا

قومی ترقی اور آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستانیوں کی باہمی خانہ جنگی تھی، جس کا فائدہ انگریزوں نے خاطر خواہ اٹھایا اور ''پھوٹ ڈالو حکومت کرو'' کی پالیسی اپنا کر اپنی حکومت کو استحکام بخشا، اقبال سہیل کی دور بیں اور دور رس نگاہ سے اہل وطن کی یہ کمزوری اوجھل نہ تھی، اس لئے جہاں وہ ملک کی سیاسی آزادی کے لئے فکر مند تھے، وہاں ان کو اتحاد واتفاق کے رشتے استوار کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ ہندو مسلم اختلافات کو دو بھائیوں کے اختلافات کی شکل دے کر ان کو ختم کرانا چاہتے تھے، کیوں کہ دو بھائیوں میں جس طرح کبھی کبھی ان بن ہو جاتی ہے، مگر پھر ایک دوسرے کے ہمدرد اور بہی خواہ ہو جاتے ہیں اسی طرح ان دونوں کو بھی اپنی تلخیوں اور کدورتوں کو دور کر کے وطن کی تعمیر وترقی کے مفید اور ضروری کاموں میں لگ جانا چاہئے۔

اسی سنگم کے دو دھارے ہیں، ہندو بھی، مسلمان بھی
گلے مل مل کے روئے بھی، ہوئے دست وگریباں بھی
انھیں موجوں کی ٹکر نے اٹھائے کتنے طوفاں بھی
یہی اب مل کے سینچیں گے وطن کا باغ ویراں بھی

اقبال سہیل کسی طرح بھید بھاؤ کے قائل نہ تھے، ان کا دل صرف محبت اور پریم کا گہوارہ تھا، ان

کا دل بغض و حسد، نفرت و عداوت اور کینہ کپٹ سے بالکل پاک وصاف تھا، ان کے نزدیک تمام مذاہب واشخاص یکساں عزت واحترام کے لائق ہیں اور وہ ہر ایک کی خوبیوں اور اچھی باتوں کی دل سے قدر کرتے تھے، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی تقسیم کو تسلیم کرنے کے باوجود بھی ان کو ایک ہی قوم اور ماں جائے بھائی مانتے تھے، ان کی دوستی محبت اور رواداری کی راہ میں کبھی مذہب، فرقہ اور طبقہ واریت کی دیواریں حائل نہ ہوئیں۔ وہ ہر ایک کے دکھ درد، مصیبت اور پریشانی کو دیکھ کر متفکر اور غم زدہ ہو جاتے تھے، اور اس کے غم میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے، وہ دوسرے مذاہب کو اس لئے قابل احترام سمجھتے تھے کہ ہر مذہب محبت و عالی ظرفی کی تعلیم دیتا ہے اور بغض و نفرت سے منع کرتا ہے۔

اقبال سہیل ایک حقیقت شناس انسان کی طرح جہاں بھی شرافت و پاکیزگی کا کوئی جلوہ دیکھتے تھے، اس کا خیر مقدم کرتے تھے، قوم پرستی اور مذہب ان کے درمیان حائل نہیں ہوتی، گاندھی جی، تلک، بھگت، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، شبھاس چندر بوس، سروجنی نائیڈو اور ہندو قوم کے دوسرے عالی حوصلہ اور شریف النفس لوگوں کو اسی وجہ سے انھوں نے خلوص و عقیدت کے انداز میں یاد کیا ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال سہیل نے اپنی شاعری کے ذریعہ حب الوطنی و قومی یکجہتی کا جو نظریہ ملک و قوم کے سامنے پیش کیا تھا اسے قائم رکھا جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ شہرت دی جائے تا کہ ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو بقائے دوام حاصل ہو، اور یہی اقبال سہیل کے ساتھ سچی خراج عقیدت ہوگی۔

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لئے

کلام سہیل میں طنز و مزاح کے عناصر

ابو رافع ☆

عام طور پر طنز و مزاح کو ادب کی ایک صنف سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ایک وسیلۂ اظہار یا تکنیک ہے جس کی اپنی کوئی ہیئت نہیں ہے۔ یہ شاعری اور نثر کی تمام اصناف میں برتی جاتی ہے، یہ دونوں لفظ عام طور پر ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کے معنی و مقصد اور طرز بیان میں نازک سا فرق ہے، ہوسکتا ہے کسی تحریر میں طنز ہو مگر مزاح نہ ہو۔ ہوسکتا ہے ایک ہی تحریر میں دونوں موجود ہوں۔ مختصر یہ کہ انسانی زندگی میں خوشی اور غم دو اہم پہلو ہیں۔ انسان ہمیشہ سے یہ چاہتا ہے کہ وہ غموں سے دور رہے اور خوشی کا ہالہ ہمیشہ اس کے اطراف رہے، لیکن یہ بات ہمیشہ ممکن نہیں ہوسکتی، نامساعد حالات اور الجھنیں انسان کو مسرت سے دور رکھتے ہیں اور جب وہ اپنے مسائل پر قابو پالیتا ہے تو ایک عجیب سی مسرت اس کے رگ و پے پر چھانے لگتی ہے، اس مسرت کا اظہار اکثر مسکراہٹ، ہنسی یا قہقہے کی شکل میں ہوتا ہے، انسان کو ہنسنے والا جانور کہا گیا ہے، کیوں کہ دوسرے جاندار اس کیفیت سے محروم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ مسرت کے اظہار کو دبا لیتے ہیں، پھر بھی چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ضرور نمودار ہوجاتی ہے۔ اس طرح کے لوگ یا تو خشک مزاج ہوتے ہیں یا پھر اپنے آپ پر سنجیدگی کا لبادہ ڈال لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زور سے ہنسنا یا قہقہہ لگانا بدتمیزی کی علامت ہے۔ لیکن ایک عام انسان شدید مسرت کو ہنسی اور قہقہے کے روپ میں ظاہر کرتا ہے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت بہت قدیم ہے۔ چنانچہ اردو کی سب سے پہلی داستان ''سب رس'' میں مزاح کے ہلکے ہلکے اشارے نظر آتے ہیں، جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ادب میں

☆ شعبۂ اردو شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

طنز و مزاح نے اپنی جگہ بنالی۔ ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس میں ادیبوں اور شاعروں نے طنز و مزاح کا استعمال نہ کیا ہو۔ زندگی کے مسائل سے مقابلہ کرنے کے لئے طنز و مزاح ایک اہم ذریعہ ہے۔ بقول حالیؔ:

"مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لئے کیا جائے، ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، ایک سہانی خوشبو کی لپٹ جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں، ایسا مزاح فلاسفر اور حکماء بلکہ اولیاء و انبیاء نے بھی کیا ہے، اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔" (مقالاتِ حالیؔ، ص ۱۶۹)

اقبال سہیل مرحوم نے شعر و سخن کی تقریباً تمام اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، نظم، قطعہ، نعت، منقبت اور رباعی وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے اور جس صنف کو ہاتھ لگایا ہے اس کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے، بالخصوص نعتیہ قصائد میں تو ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا، اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اعلیٰ پائے کی نثر بھی لکھی، نظم ہو یا نثر دونوں میدانوں کو یکساں طور پر ان کے قلم نے سیراب کیا ہے اور ہر جگہ متانت و سنجیدگی کے ساتھ اپنے افکار و خیالات کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے طنز و مزاح کو اپنی فکر کے اظہار کا ذریعہ تو نہیں بنایا لیکن ان کے مزاج میں طنز و مزاح کا عنصر بدرجۂ اتم موجود تھا، جب کبھی بے تکلف دوستوں کی محفل میں ہوتے اور کوئی دلچسپ واقعہ پیش آجاتا اور احباب فرمائش کرتے کہ اس واقعہ پر کوئی شعر کہیے تو فی البدیہہ مزاحیہ اشعار ہو جاتے۔

ایک مرتبہ جاڑوں کے موسم میں وہ اپنے گاؤں بڑہریا جا رہے تھے چند احباب بھی ساتھ میں تھے، راستہ میں کسی گاؤں کے گھورے پر بہت سی مرغیاں چر رہی تھیں، اتفاق سے ساری مرغیاں کالے رنگ کی تھیں، اس لئے بڑی اچھی لگ رہی تھیں، ایک دوست نے کالی مرغیوں کے حسن و جمال پر اشعار کہنے کی فرمائش کی تو سہیل صاحب نے چند منٹوں میں یہ اشعار کہہ دیئے۔

مردمِ دیدۂ لیلیٰ ہے، یہ کالی مرغی — مرغِ جنت کی سویدا ہے یہ کالی مرغی
کون کہتا ہے اسے بختِ سیاہِ مجنوں — طرۂ کاکلِ لیلیٰ ہے یہ کالی مرغی

(افکارِ سہیل، شبلی کالج میگزین اگست ۱۹۵۷ء ص ۳۴)

اسی طرح اقبال سہیل صاحب کے دوستوں میں ایک صاحب محمد علی خاں مختار تھے جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، مختار مرحوم بڑے زندہ دل اور سادہ لوح انسان تھے، اکثر اُن کی سادہ لوحی سے سارے احباب لطف اندوز ہوا کرتے تھے، مختار مرحوم کے یہاں لڑکی کی ولادت ہوئی، جب اقبال سہیل صاحب کو معلوم ہوا تو برجستہ ایک شعر کہہ دیا جو یہ ہے:

چماری ہے نکلی یہ کہتی ہوئی محمد علی خاں کے بیٹی ہوئی

(افکار سہیل، شبلی کالج میگزین اگست ۱۹۵۷ء، ص ۳۴)

جب سہیل صاحب علی گڑھ کے طالب علم تھے تو ان کے ایک دوست کی آنکھ میں بلنی نکل آئی، دوستوں کا اصرار ہوا کہ اس سانحہ پر بھی اقبال سہیل صاحب کو کچھ کہنا چاہئے، سہیل صاحب نے اسی وقت یہ شعر کہہ دیا:

نہیں آنکھ انجنی ہے نرگس بیمار جاناں پر
کسی کا پارۂ دل رہ گیا ہے نوکِ مژگاں پر

دوستوں نے کہا سانحہ اتنا عظیم ہے کہ اس کے لئے ایک شعر کافی نہیں ہے۔ اقبال سہیل مرحوم نے اسی وقت دس بارہ شعر لکھ دیا جو ان کی برجستہ گوئی کی عمدہ مثال ہے، ان میں سے چند اشعار یہ ہیں۔

دیکھ کر اس شوخ آہو چشم کی آنکھوں پہ زخم
میں نے پوچھا آج کیا اے حُسن قاتل ہوگیا

تیرا پیکان نظر تو اس قدر تھا بے خطا
آنکھ بھر کر جس کو دیکھا نیم بسمل ہوگیا

تو تو تھا اے شوخ خود سلطانِ اقلیم جمال
کون پھر تجھ پر بھی سلطانی کے قابل ہوگیا

چشم بددور آج یہ کیا ہوگیا ہے جانِ من
کیا کسی کے حسن پر تو خود بھی مائل ہوگیا

یہ نہیں تو کون تھا وہ زخمی بیدار بخت
متصل مژگاں کے جس کا پارۂ دل ہوگیا

یا کہ آئینے میں جب دیکھا جمال دلفروز
خود ترا تیر نظر تیرے مقابل ہوگیا

ہنس کے فرمایا، نہیں اقبال یہ باعث نہیں
گو تمہاری نکتہ سنجی کا میں قائل ہوگیا

بات یہ تھی بوالہوس سے ہوگئی تھی رسم و راہ
اس حماقت کا یہ ثمرہ مجھ کو حاصل ہوگیا

سنگ موسیٰ سے زیادہ سخت ہے ظالم کا دل
شرم سے پتھر بھی جس کے پائے در گل ہوگیا

تاک کر مارا جو میں نے اس پہ اک تیر نگاہ
تیرا چٹ کر صورتِ خاشاکِ ساحل ہوگیا

الغرض ٹکرا کے اس کے دل سے جب لوٹی نگاہ
کیا کہوں، میں اپنے ہی ناوک سے گھائل ہوگیا

(کلیاتِ سہیل، مرتبہ عارف رفیع ص ۱۷۵)

اقبال سہیل صاحب کے زمانہ طالب علمی کے ایک ساتھی جن کا نام شاہ علاء الحق تھا اعظم گڑھ کچہری کے بھی ساتھی تھے، اقبال سہیل صاحب ۱۹۳۶ء میں جب یوپی اسمبلی کا الیکشن لڑے تو شاہ صاحب ان کے مخالف ہوگئے اور ان کے خلاف کنویسنگ کرنے لگے، ایک دن کچہری میں ملاقات ہوگئی، شاہ صاحب نظر بچا کر نکل جانا چاہتے تھے کہ سہیل صاحب نے دیکھ لیا اور ان کی زبان پر برجستہ یہ اشعار آگئے۔

طیورِ باغ بھی شامل ہیں فوجِ دشمن میں — چھپے ہیں زہر کے شعلے گلوں کے دامن میں
بُلائی جاتی ہیں اب بجلیاں نشیمن میں — کہیں قفس ہے کہیں دام، صحنِ گلشن میں
یہ اہتمام ہے بلبل کی مشت پر کے لئے

ہمیشہ ہوتی رہی غیر کی یہاں تگ وتاز — رہا یہ سینہ ہمیشہ حریفِ ناوکِ ناز
خدا کے واسطے اب تو کرم ہو بندہ نواز — کبھی انھیں بھی تو مل جائے رخصتِ پرواز
ترس رہے ہیں جو تحریکِ بال و پر کے لئے

(از کلیاتِ سہیل ص ۱۸۳)

اقبال سہیل صاحب کے دوستوں میں ایک صاحب بڑے اللہ والے تھے اور تصوف سے ان کو خاص لگاؤ تھا، ایک بیوی کے ہوتے ہوئے انھوں نے دوسری شادی کرلی اور چند مہینوں بعد طلاق بھی دے دی، اقبال سہیل صاحب نے اس واقعہ سے متاثر ہوکر ایک طنزیہ نظم لکھی جس میں غضب کی نشتریت موجود ہے، نظم کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

عجیب چیز ہے یہ "طائفہ" تصوف کا — نہیں ادا کوئی جس کی فریب سے خالی
بہارِ حسن بھی لوٹی، متاعِ تقویٰ بھی — نکاح آج کیا، کل طلاق دے ڈالی

مرزا نظام الدین مرحوم جو مرزا سلطان احمد بیگ کے چچازاد بھائی تھے، جن کی رہائش نینی تال، ہلدوانی میں تھی، ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو اقبال سہیل مرحوم نے قطعۂ تاریخ کہہ دیا جو مزاح کا

بہترین نمونہ ہے:

حق نے دیا نظام کو بیٹا — پھول ہے نوکِ خار سے نکلا
ابر سے نکلا ماہِ منور — چہرہ مہرِ غبار سے نکلا
ہاتف بولا سالِ ولادت — شیر کا بچہ غار سے نکلا

(افکارِ سہیل، شبلی کالج میگزین اگست ۱۹۵۷ء، ص ۳۴)

اقبال سہیل مرحوم کے دوستوں میں ایک دوست انتہائی سیاہ فام تھے، ان سے اکثر مرحوم لطف لیتے تھے، اور کچھ نہ کچھ اُن کے متعلق کہا کرتے تھے، ایک بار دوستوں کی محفل آراستہ تھی کہ وہ صاحب بھی تشریف لائے، اقبال سہیل نے ان کو دیکھتے ہی برجستہ یہ اشعار کہے:

کیا حسن وجمال کی فراوانی ہے — یہ حسن جو اب مہ کنعانی ہے
سر پر ہیں سفید بال، چہرہ شب رنگ — مشکی ٹانگیں ہیں، ستارہ پیشانی ہے

(از کلیات سہیل ص ۲۶۶)

ایک مرتبہ یہی دوست بہت عرصہ تک بیمار رہے، بیماری نے ان کے چہرے کی رنگت کو زردی مائل کر دیا تھا، جب صحت یاب ہوئے اور اقبال سہیل مرحوم سے ملنے آئے تو کالا جوتا پہن کر اقبال سہیل نے دیکھا تو برجستہ یہ شعر ان کی زبان پر آگیا:

چہرے سے اک کلونس کی تہہ سی اُتر گئی — بیمار کیا پڑا تری رنگت نکھر گئی
جوتے میں جذب ہوگئی رعنائی بہار — گویا بلا طویلے کی بندر کے سر گئی

(از کلیات سہیل ص ۲۶۶)

انہی دوست کے عارضِ سیاہ کی چمک سے اپنے ایک شعر میں کیا پُر لطف نکتہ پیدا کیا ہے، یہ ہنر صرف اقبال سہیل صاحب ہی کا حصہ ہے، ملاحظہ فرمائیں:

غسالہ حضرتِ نورالحسن کے عارض کا — خضاب بن کے جو بکتا بہت گراں ہوتا

ایک دفعہ اقبال سہیل مرحوم کو شکار پر جانے کا اتفاق ہوا، حالانکہ ان کو شکار کا کوئی شوق نہیں تھا، لیکن سر اقبال احمد ریٹائرڈ چیف جسٹس کی فرمائش کو کیسے ٹال سکتے تھے، عمر میں وہ بڑے تھے، اس لئے

ساتھ ہو لئے، شکار کے لئے دریائے گھاگھرا کے کنارے دوارہ جانا تھا، سر اقبال احمد کی وہاں زمینداری بھی تھی، شکار میں بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اور ہاتھ بھی کچھ نہ لگا، جب دو پہر کو واپس ہوئے اور کھانے کے لئے دسترخوان لگا تو اقبال سہیل مرحوم کی رگ مزاح پھڑک اٹھی، کھانا کھاتے جاتے تھے اور شعر کہتے جاتے تھے، اس میں سے چند اشعار یہ ہیں:

یہ اہتمام اور سفر اس قدر طویل — صیادوں کا ہجوم سواری میں اسپ و فیل
جسٹس، حکیم، مولوی، مختار اور وکیل — گھومے تمام نیشکرستان و دشت و جھیل
بندوق کا نشاہ بنے فاختہ تا بہ چیل — لیکن کوئی نتیجہ جو پوچھے تو اے شکیل
سارا شکارگاہ تھا گویا کف بخیل

یہ اشعار تو ناکام شکار کے بارے میں تھا، اپنے اوپر جو بیتی تھی اس سے متاثر ہو کر جو اشعار انھوں نے کہے تھے وہ یہ ہیں:

وہ ریگ زار حضرت شبیرؑ کی قسم — تھا دشتِ کربلا سے کسی طرح بھی نہ کم
رکھتے جو آگے پاؤں تو پیچھے پڑیں قدم — ٹیلوں کا وہ چڑھاؤ وہ راہوں کا پیچ و خم
اپنا تو خیر حال زبوں کیا بتائیں ہم — ہر ہر قدم پہ سامنے تھی منزل عدم
چہرے سبھی کے خستہ و پژمردہ و گرم — لیکن جناب حضرت صابر رہے چہ غم
یوں بے مہار دوڑتے تھے ریگ زار میں — جس طرح ناقہ دوڑے عرب کے دیار میں

اقبال سہیل صاحب کی طنز و مزاح نگاری کے اصل جلوے ان نظموں میں دکھائی دیتے ہیں جو انھوں نے ۱۹۳۶ء کے اسمبلی الیکشن میں اپنے مدمقابل کے لئے لکھیں، اقبال سہیل صاحب کانگریس پارٹی کے امیدوار تھے اور ان کے حریف سید علی ظہیر صاحب کلا پور گاؤں ضلع جونپور کے رہنے والے اور مسلم لیگ کے امیدوار تھے، الیکشن پورے شباب پر تھا، حریف اور ان کے حمایتی گاؤں گاؤں جا کر ووٹروں کو رجھانے اور ان کو اپنے پالے میں کرنے کی کوششیں تیز سے تیز تر کرتے جا رہے تھے، عوام کو سبز باغ ہی نہیں دکھا رہے تھے بلکہ لالچ بھی دے رہے تھے اور رشوت بھی، اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے خاص خاص ووٹروں میں سائیکل بھی تقسیم کی گئی، ایسے ماحول میں اقبال سہیل صاحب خاموش کہاں رہنے والے تھے، ان کی شاعرانہ حس بیدار ہوئی اور طنز و مزاح میں ڈوبی ہوئی متعدد نظمیں ان

کے قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر آ گئیں، ان نظموں کی تیزی و تندی اور تلخی و ترشی سے جہاں حریف اور ان کا پورا طائفہ بدمزہ و بدحواس ہوا وہیں عوام اس قدر محظوظ ہوئے کہ یہ نظمیں گاؤں گاؤں میں پڑھی جانے لگیں اور اقبال سہیل صاحب کا رنگ پورے اسمبلی حلقہ میں جمنے لگا، ایسی ہی ایک نظم کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔

ہم پر نگاہ لطف و مدارا نہ کیجئے — لیکن وطن کے نام کو رسوا نہ کیجئے
اجناس اور بھی ہیں تجارت کے واسطے — ناموس ملک وقوم کا سودا نہ کیجئے
پھیلا ہے وطن میں نہ ذوق گداگری — ذاتی شرف کا قوم میں چرچا نہ کیجئے
اہل وطن سے بغض وعداوت سہی مگر — اربابِ لکھنؤ سے تولاّ نہ کیجئے
لڑنے کا حوصلہ ہے تو میداں میں آیئے — شوقِ مقابلہ ہے تو پردہ نہ کیجئے
کیا آپ کے گروہ میں کوئی نہیں ہے اہل — اتنا بھی انکسار خدارا نہ کیجئے
لیجے شکست وفتح کی خود ذمہ داریاں — غیروں کی آڑ لے کے تماشا نہ کیجئے
اپنے میں کچھ ہنر ہو تو جوہر دکھایئے — غیروں کے بل پہ نازشِ بیجا نہ کیجئے
غداریٔ وطن کا صلہ صرف سائیکل — ایماں ہی بیچنا ہے تو سستا نہ کیجئے
اب بھی ہے خیر دیجئے اس کو جواب صاف — حلوائی کی دکان کا قصہ نہ کیجئے
لطف خدا واہل وطن ساتھ ہیں ادیب — دشمن اگر قوی ہے تو پروا نہ کیجئے

(کلیات سہیل ص ۱۷۶، ۱۷۷)

اور جب حریف کے پاؤں میدان انتخاب سے اکھڑنے لگے تو وہ سطحی حرکتوں پر اتر آئے، اقبال سہیل صاحب نے اس موقع پر مناسب جانا کہ کمان کو اور کسا جائے اور حریف کی ان کمزوریوں پر حملہ کیا جائے جو اس نے ابھی تک کمال ہوشیاری سے چھپا رکھا ہے، چنانچہ انھوں نے زہر میں ڈوبے ہوئے طنز کے ایسے غضبناک تیر چھوڑے کہ حریف کے جیب و دامن کی دھجیاں اڑ گئیں، دیکھیں اس قسم کے چند اشعار:

عجیب شے ہیں آپ بھی جہاں بھی سایہ پڑ گیا — کہیں بہار لٹ گئی، کہیں چمن اجڑ گیا
جو سینہ ودماغ پر پڑی نگاہِ فتنہ گر — تو گھٹ گئے دل وجگر، خرد سے ہوش اڑ گیا
چلے گا اب نہ قوم پر فسونِ چشم فتنہ گر — جو رنگ تھا سو اُڑ گیا، جو نقش تھا بگڑ گیا

تمام راز کھل چکے ہیں دامن فریب کے — جو تار تھا بکھر گیا، جو بخیہ تھا ادھڑ گیا
وطن پرست نے جدھر عنانِ عزم پھیر دی — عدوئے ملک وقوم کا قدم وہاں اکھڑ گیا
ظفر نے خود قدم لئے فدائیان قوم کے — قدم جہاں پہ جم گیا، علم جہاں پہ گڑ گیا
ستم ہے بل پہ غیر کے دکھائے اب تہمتنی — وہ پہلواں جو معرکہ میں بارہا پچھڑ گیا
شمیم گلشنِ وطن سے کیوں نہ بلبلا اٹھے — جنونِ انتقام سے دماغ جس کا سڑ گیا
اٹھالیا نسیم نے ادب سے اس کو چوم کے — ادیب شاخ کلک سے مرے جو پھول جھڑ گیا

کلام سہیل کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کی شاعری میں طنز ومزاح کا عنصر کافی جاندار اور دلکش ہے جو ہمارے دلوں کو چھو لیتا ہے، ہم حنیف احمد صاحب کے اس خیال سے کلی طور پر متفق ہیں کہ'' اُن کی شاعری کا کمال ان کی طنزیہ شاعری میں بدرجہ اتم محسوس ہوتا ہے، اُن کی طنزیہ شاعری ایک راز ہے جو عیاں بھی ہے اور پوشیدہ بھی۔ اس میں بجلی جیسی آمد وروانی بھی ہے، اور اُس کی جراحت بھی، کلام میں زبان کی خوبی بھی ہے، برجستگی اور تازگی بھی، طنز کی ترشی اور تمازت کو ظرافت کی شگفتگی نے اور ظرافت کی آمد کو طنز کی سنجیدگی نے اس درجہ متوازن کر دیا ہے کہ ان کی ظرافت اور طنز میں پھول اور کانٹوں کی یکتائی محسوس ہوتی ہے۔'' (افکار سہیل ص ۳۷) اگر اقبال سہیل طنز ومزاح کو اپنے افکار وخیالات کے اظہار کا وسیلہ بناتے تو یقیناً ہمارے ادب میں یہ ایک خوشگوار اضافہ ہوتا اور اردو کا طنزیہ ومزاحیہ ادب ان کی نکتہ آفرینیوں اور جدت طرازیوں سے مالا مال ہوتا، تاہم انھوں نے جو کچھ سرمایہ طنز ومزاح کا اپنی یادگار میں چھوڑا ہے وہ ہمارے لئے انتہائی قیمتی بھی ہے اور اس فن میں ان کی مہارت کو سمجھنے کے لئے کافی بھی۔

☆☆☆

اقبال سہیل بحیثیت شاعر

ندیم احمد☆

علم وفن کے اعتبار سے اعظم گڑھ ایک مردم خیز علاقہ ہے۔ یہاں ایسے اساطین علم اور اعاظم رجال پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے علم وفن سے چہار دانگ عالم کو منور کیا ہے اور اس قحط الرجال میں بھی بہت سے علماء وادباء موجود ہیں جو اپنے اسلاف کی روایت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، ان ہی اعاظم کے بارے میں اقبال سہیل نے کہا تھا

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

اقبال سہیل کا شمار ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے علم واپنی فکر اور شعروشاعری کے ذریعہ علمی حلقوں میں اپنا نام روشن کیا ہے۔

اقبال سہیل کی پیدائش ۱۸۸۴ء میں ہوئی ان کے والد نے ان کا نام ابوالمظفر حامد رکھا لیکن ان کے دادا امانت اللہ خان انھیں پیار ومحبت میں اقبال کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی تربیت ان کے والد اور ان کے دادا کے زیر سایہ ہوئی۔ بعد ازاں ان کی تعلیم کے لئے مولانا محمد شفیع (بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر) کی خدمات حاصل کی گئیں، مولانا نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا خاص خیال رکھا، پھر ادیب زماں علامہ شبلی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے اور ان سے عربی زبان وادب کی کچھ کتابیں پڑھیں اور ان کے علم وفن سے حتی الامکان فائدہ اٹھایا، اس کے بعد آپ علامہ حمیدالدین فراہی کے ساتھ علی گڑھ چلے گئے اور ان سے تفسیر وحدیث کے علاوہ عربی زبان وادب کی کچھ کتابیں پڑھیں،

☆ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی، دہلی

فارسی کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کی اور اپنے شعری شعور کو جلا بخشی۔

اس کے بعد بعض اسباب کی بنا پر آپ نے بنارس کے انگریزی اسکول میں داخلہ لیا اور وہاں سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ایم او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور وہاں سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں اپنے وطن واپس چلے آئے اور وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور پھر اس کی پر پیچ وادیوں سے باہر نکلنا میسر نہ ہوا اور اپنی ساری صلاحیتیں اسی میں صرف کر دیں۔

آخر کار ۷ر نومبر ۱۹۵۵ء کو وہ دن آیا جس میں علم و فن کی عظیم شخصیت کا ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

اقبال سہیل کی شخصیت اور ان کے فضل و کمال کے بارے میں مختلف مشاہیر نے الگ الگ انداز سے لکھا ہے، مرزا احسان احمد بیگ ان کے فضل و کمال کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

> ''وہ تمام قابلیت جو کامل الفن مصنف کے لئے ضروری ہے ان میں موجود تھیں، وہ فطرتاً فلسفی تھے، طبیعت میں جدت اور اجتہاد کا مادہ بھی تھا، نظر تنقیدی ومحققانہ پائی تھی۔ حافظہ عجیب و غریب تھا، ہر موضوع پر خواہ اس کا تعلق مذہب وسیاست سے ہو، علم و ادب سے ان کی ہمہ گیر طبیعت یکساں حاوی تھی، عام معلومات کا ذخیرہ بھی کم نہ تھا، ان گوناگوں صلاحیت و اوصاف کے ساتھ ساتھ ایک سحر طراز اور پرزور قلم بھی ہاتھ میں تھا، جس کی ادیبانہ طرز نگارش دیکھ کر شعر العجم کے مصنف علامہ شبلی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔'' (۱)

اقبال سہیل اس حیثیت سے منفرد اور ایک الگ شناخت رکھتے ہیں کہ ان کا شمار دبستان شبلی کے نامور لوگوں میں ہوتا ہے گرچہ وہ اس دور میں صرف ایک شاعر اور قانون داں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن اگر وہ وکالت کے پیشے سے منسلک نہ رہے ہوتے تو یقیناً وہ آج فارسی اور اردو ادب کی دنیا میں بہت اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے اور اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں جگہ پاتے۔

اقبال سہیل نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، ان کے یہاں قومی ہمدردی، وطن پرستی

و دوستی اور حریت پسندی کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ علامہ شبلی سے بہت فیض یاب ہوئے تھے۔ ان کے کلام میں علامہ شبلی جیسی نہ صرف فکر ہے بلکہ انھوں نے پرفتن اور ناگفتہ بہ حالات پر بھی بہترین اشعار کہے ہیں، اس کے علاوہ انھوں نے قومی، ملی، سیاسی، معاشی وسماجی مسائل کو بھی اپنی شاعری میں موضوع بحث بنایا ہے۔

اقبال سہیل نے جہاں بہت سے مسائل اور موضوعات پر گفتگو کی ہے وہیں مجاہدین آزادی کی شخصیت پر بھی شاعری کی ہے۔ انھوں نے شخصیت کے حوالے سے جو بات کی ہے اس میں سیاسی صورت حال اور مختلف واقعات کو سامنے رکھا ہے، انھوں نے ایک نظم ''ترانہ وطن'' لکھی ہے جس میں ملک سے محبت وانسیت اور ملک کی آزادی کے لئے بے تابی و پریشانی کا اثر نمایاں ہے۔

ہمارا وطن ہے ہمارا وطن زمانے کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمیں ساری دنیا سے پیارا وطن

تو غیروں کے پھندوں سے آزاد ہو پشیمان باہر کا صیاد ہو
دکھادے یہ دلکش نظارا وطن

غلامی کا مٹ جائے دامن سے داغ جلے گھر میں مسجد سے پہلے چراغ
چمک جائے تیرا ستارا وطن (۲)

اقبال سہیل کے اس کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ملک سے بے حد محبت تھی اور ملک انھیں بہت عزیز تھا اور وہ ہر حال میں ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔

اسی طرح انھوں نے اپنے کلام میں ایک طرف انگریزوں سے شدید ناراضگی کا اظہار کیا ہے تو دوسری طرف ملک کے لوگوں کو مل جل کر رہنے اور ایک ساتھ مل کر اپنے وطن کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے اور قومی یکجہتی کے فروغ پر زور دیا ہے۔

ہندوستان کے آزاد ہونے اور انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی جب حالات نہیں بدلے تو اقبال سہیل کو یہ سب دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی، آزادی کے بعد سب کچھ لٹتا ہوا دیکھ کر تڑپنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا، وہ اپنے وطن سے سچی محبت کرنے والے انسان تھے، انھوں نے ایک نظم ''یوم آزادی'' کے عنوان سے ۱۹۴۸ء میں لکھی جس میں انھوں نے ملک کے انتظام وانصرام کی

تمام تر خرابیوں کے باوجود اپنے قلبی سکون کے لئے آخر میں لکھا ہے۔

''ہمیں شکوہ کا کیا حق جب ہماری ہی حکومت ہے

نہ مسلم کی نہ ہندو کی یہ جمہوری حکومت ہے

یہ اپنا دیس، اپنا راج ہے اپنی حکومت ہے

یہ آزاد و جواہر لال نہرو کی حکومت ہے

فدا اس کی حفاظت میں ہم اپنی جان کردیں گے

وطن پر سب متاع زندگی قربان کردیں گے'' (۳)

اقبال سہیل کے اردو کلام میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے بلا تفریق مذہب وملت اور اپنے وطن کی عظیم شخصیات کی خدمات اور ان کے اعمال جلیلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے جن میں جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر بطور خاص ہیں۔

اقبال سہیل نے اپنی شاعری میں ہندوستان کی متنوع تہذیب وثقافت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے، یہاں کے رسم ورواج، فصلوں اور موسم کے ساتھ ساتھ یہاں کے تیوہاروں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اقبال سہیل اردو زبان وادب کے ماہر اور رمز شناس تھے ہی، اس کے علاوہ وہ فارسی شاعری پر بھی کامل مہارت رکھتے تھے، انھوں نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے، ان کا فارسی کلام ''کلیات اقبال سہیل'' میں موجود ہے، اقبال سہیل کی فارسی دانی کے تعلق سے یہ کہا جاتا ہے کہ بارہ برس کی عمر میں ہی فارسی لکھنے، بولنے اور پڑھنے کی صلاحیت ان کے اندر پیدا ہو چکی تھی اور وہ فارسی اشعار بھی کہنے لگے تھے۔ اقبال سہیل کا ایک شعر جو کہ اسی دور کا ہے بطور مثال پیش کیا جاتا ہے:

''عندلیب گلشن فردوس ہستم حامدا

مدح خوانی نبی کا راست طوبیٰ جائے من'' (۴)

اقبال سہیل کا فارسی زبان میں زیادہ تر شعری سرمایہ قصیدہ پر مبنی ہے، ان کی فارسی شاعری کا تمام تر حسن وکمال اسی صنف قصیدہ میں ہی نظر آتا ہے، ان کے قصائد دیگر شعراء کی طرح روایتی نہیں بلکہ ان کے قصائد سے جذبے کا خلوص اور شخصیت کے احترام کی بو نظر آتی ہے۔

قصائد عام طور سے مدح سرائی اور انعام واکرام حاصل کرنے کے لئے کہے جاتے ہیں اور

فارسی شعروشاعری میں قصیدے شروع ہی سے انعام واکرام کے لئے کہے گئے ہیں لیکن اقبال سہیل نے اس عام روایت سے ہٹ کر قصائد کہے ہیں، انھوں نے اپنے قصائد کوانعام واکرام کے لئے نہیں، بلکہ وہ اپنی شعرگوئی کی قوت، قومی ضروریات اور مختلف مسائل کو پیش کرنے کے لئے کہا، پروفیسر آل احمد سرور، اقبال سہیل کے اسلوب اور فکری تخیل کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کی فکر لالہ کار اور تازہ کار ہے، ان کی فارسیت اشکال سے خالی ہے، جذباتیت کے مقابلہ میں ان کے یہاں جوش بیان کا احساس ہوتا ہے جو ایک پرخلوص عقیدہ ہے اور جاندار شخصیت کے اثر سے آیا ہے، ان کے انداز بیان میں ہمواری ہے، مگر اکتادینے والی یکسانیت نہیں ہے، وہ اپنے صاحب طرز متاخرین میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ ان سے منفرد ہیں۔'' (۵)

عام طور سے لوگ اقبال سہیل کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ وہ صرف اردو شعروشاعری تک محدود تھے، لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کی فارسی شاعری کی معنویت کو بڑے بڑے ناقدین اور فکروفن کے ماہرین نے نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ ان کو داد وتحسین سے نوازا بھی ہے۔

اقبال سہیل کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں مہارت حاصل تھی، اگر یہ کہا جائے کہ وہ شبلی کے جانشین تھے تو بے جانہ ہوگا، ان کے فارسی قصائد دیکھنے کے بعد علامہ شبلی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، ایرانی شعراء وادباء ایک زمانے تک ہندوستانی شعراء کو خاطر میں نہیں لاتے تھے کیوں کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی فارسی ادب معیاری نہیں ہے، اسی دوران افغانستان کے ایک مشہور شاعر کا دارالمصنفین ورود مسعود ہوا، انھوں نے اقبال سہیل کی فارسی شاعری کو سراہا اور ان کی صلاحیت کا اعتراف کیا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

''افغانستان کے مشہور شاعر اور انجمن ادبی کابل کے سکریٹری جناب سرور خان گویا دارالمصنفین آئے تھے، اقبال سہیل ان سے ملنے کے لئے آئے بحیثیت شاعر دونوں کا تعارف ہوا، دونوں نے ایک دوسرے سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی اور سرور خان کے اصرار پر پہلے اقبال سہیل نے اپنا ایک قصیدہ سنایا، سرور خان حیرت واستعجاب کے ساتھ اس کو سنتے رہے، اور اقبال سہیل سناچکے تو سرور خان

نے اٹھ کر ان کو گلے لگایا اور مذاقاً کہا کہ اگر کبھی ہندوستان پر افغانستان کا حملہ ہوا تو میں صرف سہیل کو لوٹ کر لے جاؤں گا۔"(۶)

اس سے اقبال سہیل کے فارسی کلام کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے شاعر، قصیدہ نگار، سخن فہم اور زبان شناس تھے۔ اقبال سہیل کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں زور کلام، منظر نگاری، شعریت وترنم، قدرت زبان وبیان وغیرہ صفات بدرجہ اتم موجود ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ فارسی شاعری میں جس کی ابتدا نظامی نے کی، عرفی نے قوت بخشی اور اقبال سہیل نے اس کو اوج کمال تک پہنچایا تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ ان کی شاعری کا خاص جوہر "زور کلام" ہے ان کے اشعار میں زور کلام کہیں کم نہیں ہوتا، شروع سے آخر تک یکساں وبرابر نظر آتا ہے۔ اقبال سہیل نے اپنی درسگاہ ایم، اے، او کالج علی گڑھ میں ہدیہ تشکر میں کچھ اشعار کہے تھے۔ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے:

"دل از لطف تو آباداں ہمہ از مقدمت شاداں سہیل خستہ ونا داں بمدحت نکتہ بار آمد
چہ گویم شکر فیضانت خدا افزوں کند شانت چہ سازم حصر احسانت کہ نتواں در شمار آمد
زجود ہمت شاہا چناں گستاخ شد کالج کہ اکنوں بیشتر از بیشتر امیدوار آمد
نظامیہ بہ نیشاپور کے ماند بدیں کالج کہ پشتیباں دراں دستور وایں را شہریار آمد"(۷)

اقبال سہیل کی شاعری میں شعریت اور ترنم کی فراوانی ہے اور وہ موقع ومحل کا خیال رکھتے ہوئے نہایت ہی خوبصورت الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، ان کی شاعری میں حسن کا خاص التزام اور زبان وبیان میں خاص دلکشی پائی جاتی ہے۔

منظر کشی اقبال سہیل کی شاعری کا ایک خاص جوہر مانا جاتا ہے اور وہ اپنے قصائد کی شروعات منظر کشی سے ہی کرتے نظر آتے ہیں، انھوں نے صبح اور شام کی کیفیت کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ہو بہو اس کا پورا منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

اقبال سہیل کی شاعری کا ایک اور خاص جوہر قدرت زبان وبیان ہے اور انتخاب کلام میں وہ ایک ماہر اور فن کار نظر آتے ہیں اور اس میں بہت ہی خوبصورتی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس مضمون کو بیان کرتے ہیں اس پر ان کی گرفت کافی مضبوط ہوتی ہے، ان کی قادر الکلامی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ ان کے اشعار قاآنی سے بڑھ کر ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا، نزاکت اور مضمون

آفرینی وغیرہ میں بھی اقبال سہیل قاآنی سے کم نظرنہیں آتے۔ان کے اشعار بھی لطف سے بھرپور نظر آتے ہیں، بطور مثال چند اشعار درج ذیل ہیں:

"یکے باسادۂ کشمر کشیدہ بادہ خلّر — یکے باشیشہ و ساغر بہ سیر لالہ زار آمد
دمن یکسر سمن گشتہ چمن رشک ختن گشتہ — دکن رشک چمن گشتہ کہ لطفش آبیار آمد
بہ مدح ناصر الدین شد حبیب از گشتہ قاآنی — سہیل ار آصفی گردد بجاہت سازگار آمد" (۸)

اقبال سہیل اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کے قادرالکلام شاعر تھے اور فارسی دنیا میں بھی وہ ایک مقام رکھتے ہیں، اقبال سہیل کے بہت سارے فارسی کلام تلف ہو گئے۔

اقبال سہیل صحیح معنوں میں ایک عبقری شاعر تھے،ان کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک شاعر کو عظیم بناتی ہیں، اگر چہ ان کا ادبی سرمایہ کم ہی ہے لیکن جس قدر بھی ہے اردو اور فارسی ادب کے لئے انتہائی گراں قدر اور متاع بے بہا ہے۔

حواشی

(۱) مقالات احسان۔مرتبہ مرزا احسان احمد بیگ۔دار المصنفین اعظم گڑھ،۱۹۶۸ء،ص ۱۰۰
(۲) انتخاب کلام اقبال سہیل،ضیاء الدین اصلاحی،اترپردیش اکیڈمی ۱۹۸۹ء،ص ۶۲
(۳) کلیات اقبال سہیل،اقبال سہیل دار المصنفین ۲۰۱۱ ص ۱۳۲
(۴) کلیات اقبال سہیل،عارف رفیع بھاوے پرائیوٹ لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۸۸ء،ص ۱۴
(۵) محمد کالج میگزین سہیل نمبر جونپور،مرتب نیاز احمد صدیقی۔۱۹۵۳ء۔ص ۳۸
(۶) ایضاً ص ۱-۶
(۷) ایضاً ص ۱-۷
(۸) ایضاً ص ۱-۱۸

☆☆☆

اقبال سہیلؔ کی نظموں کا جائزہ

ظہیر حسن ظہیرؔ☆

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی دہائیوں میں جن نظم گو شعرا نے اردو نظم نگاری کے فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دیے ان میں محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، برج نرائن چکبست، سرور جہاں آبادی، علامہ اقبال، ظفر علی خاں، نظم طباطبائی اور اقبال سہیلؔ وغیرہ کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔

اقبال سہیلؔ (۱۸۸۶ء۔۱۹۵۵) کا عہد تقریباً وہی ہے جو مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، مولانا محمد علی جوہر، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مراد آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کا یہی وہ ہنگامی دور بھی رہا ہے جب صدیوں کی غلامی کے خلاف آزادی کی جدوجہد سے ہندوستان دوچار تھا، اور ملک میں آزادی، سیکولرزم، جمہوریت، قومیت اور ذہنی فکری بیداری اپنے شباب پر تھی، جس کے نتیجے میں ہمارا ملک آزاد بھی ہو گیا، مگر آزاد ہونے کے ساتھ ہی تقسیم بھی ہو گیا۔ اقبال سہیلؔ نے تحریک آزادی کا زمانہ نہ صرف دیکھا ہے بلکہ آزادی کی جدجہد میں بہ نفس نفیس شریک بھی رہے ہیں۔ انھیں دونوں عالمی جنگوں اور ہندوستانی سیاست و معاشرت پر ان کے پڑنے والے حالات کو بخوبی دیکھنے اور سمجھنے کا بھی موقع ملا ہے اور اسی عہد و ماحول میں ان کی شاعری پروان بھی چڑھی ہے اور عوام و خواص میں پسند بھی کی گئی۔ ان کے بہت سے اشعار اور نظمیں تو عوام و خواص میں زبان زد بھی ہو گئی تھیں، لیکن کسی شاعر کی چند نظموں یا اشعار کا زبان زد ہو جانا یا عوام و خواص میں مشہور و مقبول ہو جانا ہی اس کی ادبی حیثیت کے استحکام کے لیے کافی نہیں ہوتا، بلکہ برسوں

☆ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کی ریاضت و مشق کے بعد اس کے کلام میں پیدا ہونے والی فکری بالیدگی اور معنویت و فن کی بہترین ہم آہنگی کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی فنی بصیرت، شعری ندرت اور فکر و خیال کی گہرائی و گیرائی اور وسعت و انفرادیت کے پیش نظر ہی اس کے ادبی مقام و مرتبہ کا تعین کیا جاتا ہے اور تب کہیں جا کر نقاد بھی اپنی مثبت یا منفی رائے قائم کرتا ہے جب مکمل ادبی و شعری فن پارہ اس کے پیش نظر ہو، تبھی وہ یہ رائے قائم کر پاتا ہے کہ یہ فن پارہ ادبی حیثیت کا حامل ہے یا نہیں۔ اقبال سہیل کے ساتھ یہ المیہ رہا کہ ان کا کلام شائع نہیں ہوا، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خود بھی اپنی شاعری کو اہمیت نہیں دی۔ ان کا خیال تھا کہ میرے اشعار داستان کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہیں گے، ان کی اس خوش گمانی نے انھیں زبردست نقصان پہنچایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ادبی منظرنامے سے غائب ہو گئے۔

اگرچہ یہ بات بھی درست ہے کہ بیسویں صدی کے نظم گو شعرا کی فہرست میں اقبال سہیل کا نام شامل نہیں ہے۔ کچھ تو ان کی فطری بے نیازی، اپنے کلام سے بے اعتنائی اور کچھ ہمارے ناقدین ادب کی بے توجہی کے سبب اردو زبان کا یہ منفرد و ممتاز شاعر ادبی منظرنامے پر جس انداز سے نمودار ہونا چاہیے تھا نہ ہو سکا، جس طرح نظیر اکبرآبادی کو یہ کہہ کر کہ وہ عوامی شاعر ہے، نظرانداز کر دیا گیا، اسی طرح اقبال سہیل کو بھی وہ مقام و مرتبہ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس ضمن میں فضا اعظمی رسالہ ''عالمی رنگ ادب'' (کراچی، پاکستان) کے اقبال سہیل نمبر میں رقم طراز ہیں:

> ''میں اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے کم مایہ انسان کو علامہ اقبال سہیل جیسے مفکر، شاعر، عالم و فاضل اور حیرت ناک حد تک ذہین ہستی کے قدموں میں بیٹھنے کا موقع دستیاب ہوا۔ ان کی شاعرانہ عظمت ادبی دنیا کی رقیبانہ سیاست اور حکمرانان مملکت، علم و فضل کی تنگ نظری اور نظریاتی تعصب کا شکار ہو گئی، یہ تاریخ ادب کا ناقابل معافی سانحہ ہے۔'' (۱)

اقبال سہیل کی شاعری کا اگر ہم تقابلی نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ان کے کئی ہمعصر شعرا کے مماثل قرار پائے گی۔ ان کے ہم عصر شعرا میں حسرت، فانی، اصغر، جوش، فراق اور جگر کا شمار ہوتا ہے۔ ان تمام شعرا کی شاعری جن عوامل و محرکات کے زیر اثر پروان چڑھی

اسی عہد و ماحول میں اقبال سہیل کی شاعری کا بھی خمیر تیار ہوا، لیکن ان شعرا سے اقبال سہیل کی شاعری اس بنا پر منفرد و ممتاز نظر آتی ہے کہ اس زمانے کی رائج شعری لفظیات، رموز و علائم اور استعارات جیسے چمن، گل، بلبل، قفس، آشیاں، ساقی، میکدہ، رند، اغیار، محتسب، واعظ، برق، نشیمن، گلچیں اور شبنم وغیرہ کا استعمال ان شعرا نے بھی کیا ہے، لیکن جتنی حسن و خوبی اور چابکدستی کے ساتھ اقبال سہیل نے اپنی غزلوں اور نظموں میں جس وسیع تناظر میں پیش کیا ہے اس سے ان کی علمی دراکی اور فنی مشاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی اور اعلیٰ شاعری کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں آثر لکھنوی رقم طراز ہیں:

> ''اس وقت کے مشاہیر شعرا میں حسرت، فانی، اصغر، جگر کا شمار ہوتا ہے، سہیل کو قطعاً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ میرا دعویٰ ہے کہ جو خوبیاں ان حضرات کے کلام میں فرداً فرداً ہیں، سہیل کا کلام ان سب کا مجموعہ اور اس کے ماسوا بہت کچھ ہے'' (۲)

اقبال سہیل ایک سادہ لوح انسان تھے، ان کی شخصیت نمود و نمائش سے عاری تھی، وہ پوری زندگی سماجی، سیاسی اور ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے نہ تو خود اپنا کلام شائع کروایا اور نہ کسی کو اس کی اجازت دی، زندگی کے آخری ایام میں جونپور کے محمد حسن انٹر کالج کی طرف سے ایک خصوصی نمبر شائع کیا گیا، جس میں اردو زبان و ادب کے ممتاز ادیبوں نے ان کی شاعری و فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ بعد ازاں مختلف لوگوں نے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا، ان کی شخصیت و فن پر مضامین کے مجموعے بھی شائع ہوئے، عارف رفیع نے ''کلیات اقبال سہیل'' مرتب کی، کلیات میں عرض ناشر کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

> ''ایسا تو نہیں ہے کہ شعر و سخن کے اس عالم رنگ و نور میں اقبال سہیل کی شخصیت اور شاعری نقد و تعارف کی محتاج ہو، لیکن کچھ تو سہیل مرحوم کی فطری بے نیازی و بے اعتنائی خواہ وہ فن شعر سے ہو یا ان کی اپنی ذات سے، ان کے کلام کی ترتیب و اشاعت میں مانع رہی اور کچھ ان کے مرتبہ شناسوں کی کوتاہیاں بھی شامل رہیں کہ اب تک جو کلام بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوا وہ حد درجہ نامکمل تھا کہ تشنہ کامان شوق کی آسودگی کا سامان کیا فراہم کرتا، ادب کی فضائے بسیط میں گم ہو کر رہ

گیا۔" (۳)

اردو زبان و ادب یا زندگی کے کسی بھی شعبۂ حیات میں نمایاں کارنامے انجام دینے والوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت سازی میں گھریلو ماحول کے ساتھ ساتھ معاشرتی حالات اور خصوصاً اساتذہ کا نمایاں کردار رہا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کی مثال سامنے ہے، جن کے اساتذہ نے ان کی علمی و ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کیا تھا، اسی طرح اقبال سہیل کی فطری صلاحیتوں اور شخصیت کو ابھارنے میں ان کے اساتذہ مولوی محمد شفیع، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کا اہم کردار رہا ہے۔ مولوی محمد شفیع سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مولانا شبلی کے حلقۂ تلامذہ میں آگئے، مولانا شبلی ان کی ذہانت و فطانت سے بہت متاثر ہوئے، اقبال سہیل مولانا سے درس و تدریس کے علاوہ اپنے علم میں مزید اضافہ کرنے کی غرض سے پورے پورے دن ان کے پاس اس انتظار میں رہتے تھے کہ مولانا کی زبان سے نہ جانے کس مبارک ساعت میں کوئی اچھا شعر یا حکیمانہ نکتہ نکل جائے جو میری آئندہ کی زندگی میں کام آئے، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

"اساتذہ کے اکثر اشعار جو ان صحبتوں میں سنتا یا جو تنقیدی نکتے استاد مرحوم ارشاد فرماتے حافظہ میں نقش ہو جاتے، اس آبِ حیات کا ہر جرعہ اور بھی تشنگی بڑھاتا اور اسی آرزو میں کہ مولانا کی زبان سے کوئی شعر یا حکیمانہ نکتہ ادب سننے کو مل جائے اکثر پورا دن اسی بزم شرف میں گزار دیتا" (۴)

اقبال سہیل ایک فطری شاعر تھے، بچپن سے ہی ان کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی، گھر کے علمی و ادبی ماحول اور اساتذہ کی خاص صحبتوں نے ان کے اندر موجود فطری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ خدا نے انھیں بے پناہ صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، وہ بلا کے ذہین تھے، قوت حافظہ قوی تھا، جس میدان میں بھی رہے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے، طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی سے مشورۂ سخن کیا، ان کے اشعار دیکھ کر مولانا موصوف نے کہا کہ اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خود سے اصلاح کرنے پر زور دیا، رفتہ رفتہ مشق سخن کی ریاضت کے سبب ان کی شاعری میں پختگی آتی گئی۔ چونکہ مولانا شبلی سے انھیں بے پناہ عقیدت و محبت تھی، اس لیے ان کی شاعری میں انھیں کا رنگ سخن بھی در آیا، اپنے ماموں کے انتقال پر جو مرثیہ انھوں نے لکھا تھا، جب علامہ شبلی کو دکھایا تو

انھیں اپنی شاعری کا گمان ہوا، وہ بہت خوش ہوئے اور تعریف بھی کی۔

ترقی پسند تحریک اور ملک کی آزادی کی تحریک کے زمانے میں اردو نظم نگاری نے غزل کی رفتار پر قدغن لگا دیا اور اردو شاعری میں مقصدی شاعری کا رجحان غالب ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ہر طرف افراتفری کا عالم تھا، اور جنگ آزادی کے حصول کے لیے مجاہدین اور ہمارے سیاسی رہنما کوششیں کر رہے تھے اور دوسری طرف اردو کے ادبا و شعرا بھی اپنی نظموں کے ذریعہ سے مجاہدین آزادی میں جوش و ولولہ پیدا کر رہے تھے۔ اسی دور میں اقبال سہیل کی شاعری کا آغاز ہوا، اور انھوں نے سیاسی نظموں کا ایسا متن پیش کیا جو اس دور کے عظیم شعری سرمایہ کا حصہ ہیں۔ نظم کے علاوہ انھوں نے مذہبی قصائد اور غزلیں بھی کہی ہیں۔

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف شاعری ہے لیکن نظم کی اپنی شعری و ادبی اہمیت ہے۔ نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، جب کہ غزل کا ہر شعر منفرد خیال کا حامل ہوتا ہے۔ شاعر کے اندرونی جذبے کی مکمل ترسیل کے لیے نظم موزوں صنف شاعری ہے، ہماری زندگی کے مختلف رنگ کے علاوہ تہذیب و تمدن، سیاسی، سماجی، ثقافتی، ملی، قومی اور مذہبی گویا کہ ہماری حیات کے ہر پہلو کو نظم میں پیش کیا جا چکا ہے۔ نظم نگاری سے متعلق پروفیسر کوثر مظہری اپنی کتاب ''جدید نظم: حالی سے میراجی تک'' کے پیش آہنگ میں لکھتے ہیں:

> ''ہماری زندگی میں جس طرح مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے اسی طرح اردو نظم میں بھی ہماری تہذیب اور ہماری معاشرت کی جھلکیاں موجود ہیں۔ پورا نظام حیات ہماری شاعری کو متاثر کرتا ہے، اور شاعری بھی ہمارے پورے نظام کو متاثر کرتی ہے۔ جس طرح ہماری زندگی کے حسن و قبح کے دو پہلو ہیں اسی طرح ہماری شاعری بالخصوص اردو نظم کے دونوں پہلو واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں'' (۵)

اقبال سہیل کا شمار بیسویں صدی کے غزل گو اور نظم نگار شاعر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ موصوف کی شخصیت ہمہ جہت تھی، وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ہی ایک بہتر خطیب، منفرد سیاست داں اور ممتاز وکیل تھے، ان کی سیاسی و سماجی حیثیت مستحکم تھی اور وہ اپنے عہد کے معززین میں شمار کئے جاتے تھے۔ موصوف نے بھی دیگر شعرا کی طرح اردو شاعری کی مروج اصناف میں کامیاب طبع

آزمائی کی، خصوصاً نعت ومنقبت سے انھیں فطری لگاؤ تھا، ان کا نعتیہ قصیدہ ''موج کوثر'' ۸۶ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم ہے، اس کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس کی ردیف ''درود شریف'' پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری میں غالباً یہ پہلا تجربہ تھا اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہا، اس کے علاوہ بھی موصوف کا ایک اور نعتیہ قصیدہ ''رحیق مختوم'' بھی ان کی شعری انفرادیت کا عمدہ نمونہ ہے۔ قصیدہ نگاری کے لیے جس خوبی اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام خوبی ان میں موجود ہے، چنانچہ اسی خوبی کے پیش نظر کسی موقع پر افغانستان کے ملک الشعرا ''سرور خاں گویا'' ان کا ایک بہاریہ قصیدہ سن کر حیرت و استعجاب میں پڑ گئے اور مزاحیہ لب ولہجہ میں گویا ہوئے کہ ''جب کبھی ہندوستان پر افغانستان نے حملہ کیا تو میں سہیلؔ کو لوٹ کرلے جاؤں گا'' علاوہ ازیں صنف رباعی جو ایک مشکل ترین صنف شاعری ہے اس میں بھی انھوں نے اپنے فکری وفنی کمال کا مظاہرہ کیا۔ ان کی قومی وملی نظمیں بھی اردو شاعری میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہر شاعر اپنے عہد یا اپنے پیش رو شعرا سے ضرور متاثر ہوتا ہے، چنانچہ اقبال سہیلؔ کا بھی اپنے پیش رو شعرا سے متاثر ہونا فطری تھا، ان کی شاعری پر حالیؔ، شبلیؔ اور علامہ اقبالؔ کے فکر وخیال کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اخلاق وکردار، تہذیب وتمدن اور ناصحانہ انداز انھوں نے حالی سے اخذ کیے، ان کی شاعری میں جہاں فلسفہ وتصوف اور مذہبی عقائد ونظریات کی کارفرمائی نظر آتی ہے وہاں وہ اقبال کے فکر وخیال سے متاثر نظر آتے ہیں، ان کی سیاسی، قومی اور ملی نظموں میں علامہ شبلیؔ نعمانی کے سیاسی، قومی وملی افکار و نظریات کی جھلک دکھائی دیتی ہے، علامہ شبلی نے اگرچہ عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن ان کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سیاسی افکار ونظریات میں بڑی وسعت وہمہ گیری تھی، اس کے برعکس اقبال سہیلؔ نے عملی طور پر سیاست میں حصہ لیا، ۱۹۳۷ء میں یوپی کے پہلے الیکشن میں کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے شریک ہوئے، چنانچہ یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں میں سیاسی افکار ونظریات اور تجربات ومشاہدات واضح طور پر سامنے آتے ہیں، ان کی نظم گوئی مولانا شبلی کی سیاسی نظموں کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔ معروف شبلی شناس ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے نزدیک اقبال سہیلؔ دبستان شبلی کے گل سرسبد ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ خلیل عرب کی رائے بھی جو انھوں نے اقبال سہیلؔ کی شعری تخلیقی صلاحیت، ذہنی وفکری انفرادیت، جودت طبع اور منفرد نظم نگاری سے متعلق

ظاہر کی ہے پیش کردی جائے، وہ اپنے مضمون ''سہیلؔ ایک عبقری'' میں لکھتی ہیں:

''حلقۂ شبلی کے اکابر میں عبقری (GENIUS) صرف دو تھے، ابوالکلام اور اقبال سہیلؔ ان دونوں میں اختراع وتخلیق کی غیر معمولی صلاحیت تھی، ابوالکلام نے نثر کو اور سہیلؔ نے نظم کو ایک نیا لب ولہجہ اور ایک اچھوتا طرز فکر عطا کیا، ان کی تخلیقات اردو ادب کا وہ عظیم سرمایہ ہیں جس سے انکار حقیقت سے چشم پوشی ہے''(۶)

اقبال سہیلؔ کی بیشتر نظمیں سیاسی افکار ونظریات کی حامل نظر آتی ہیں، حالاں کہ انھوں نے وطنی اور قومی نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ان کی شاعری کا آغاز جس عہد وماحول میں ہوا وہ سیاسی وسماجی اعتبار سے بڑا ہی نازک دور تھا۔ مسلمان سیاسی اعتبار سے کمزور پڑ چکے تھے، اور غیر ملکی ہمارے ملک پر قابض ہو کر ہمارے ہی خلاف سازشیں رچ رہے تھے، اور ہمیں پوری طرح سے ناکام بنانے کے درپے تھے۔ لیکن ہمارے سیاسی رہنماؤں اور ملی دانشوروں نے یہ محسوس کیا کہ اگر ہم متحد نہیں ہوئے تو ہم اسی طرح غیروں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہیں گے، اقبال سہیلؔ کا اس عہد وماحول سے متاثر ہونا فطری تھا۔ وہ ایک سچے محب وطن تھے، ان کا دل بھی قومی جذبے سے سرشار تھا، ان کی بہت سی نظموں میں ان کی قومی وملی ہمدردی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ انھوں نے شخصی نظمیں بھی کہی ہیں اور سیاسی وقومی رہنماؤں کی ملک وملت کے تئیں جو خدمات رہی ہیں انھیں بجا طور پر اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور ملک کی آزادی سے متعلق ان کی جو نظمیں ہیں ان کے مطالعہ سے بھی ان کی باطنی کیفیات و احساسات اور جذبۂ حریت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سیاسی رہنماؤں سے متعلق ان کی جو نظمیں ہیں ان سے ان کی ان لوگوں سے عقیدت ومحبت ظاہر ہوتی ہے۔ بڑے ہی خوبصورت انداز میں انھوں نے اپنی نظموں میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں ''مرگ حیات آفریں'' (بر وفات محمد علی جوہر) پنڈت جواہر لعل نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، گاندھی جی، مبارکباد آزادی، یوم آزادی، آزادیٔ ہند اور فلسفۂ سیاست وغیرہ ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔

اقبال سہیلؔ کو اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان پر بھی قدرت کاملہ حاصل تھی، انھوں نے ابتدائی دور میں فارسی ہی میں شاعری کی بعد میں وہ اردو میں شاعری کرنے لگے۔ موصوف کا شعری مذاق کافی صاف ستھرا تھا، چونکہ انھیں فارسی زبان سے خصوصی لگاؤ تھا اور انھوں نے فارسی زبان کے

کلاسیکی شعرا کا مطالعہ بڑے انہماک سے کیا تھا۔ اس لیے ان کی نظموں میں فارسی تراکیب کا استعمال کثرت سے ہوا ہے، لیکن انھوں نے اس سلیقے سے اپنی نظموں میں اس کا استعمال کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے طبیعت گراں بار نہیں ہوتی، ان کی نظمیں ہنگامی ضرور ہوتی ہیں لیکن گھن گرج سے عاری ہوتی ہیں، زیادہ تر نظمیں وقت و حالات کے تقاضوں کے پیش نظر لکھی گئی ہیں اور ان میں بھی فنی تقاضوں کا پاس ولحاظ ہے، ان کا منفرد انداز نظر اور خوشگوار لب ولہجہ ان کی نظموں کے حسن و وقار میں اضافہ کرتا ہے۔

''پیام حق'' ان کی ایک اہم سیاسی نظم ہے، یہ نظم غزل کے فارم میں ہے، اس نظم میں انھوں نے انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کو اپنے وسیع مطالعہ و مشاہدہ کے نتیجے میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں اپنے حریفوں پر چوٹ بھی کی ہے، اور ناموس وطن کو رسوا کرنے والوں اور قوم وملت کا سودا کرنے والوں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ دنیا کی دوسری قومیں اپنے ہم وطن کو ہی ہر معاملے میں ترجیح دیتی ہیں، چاہے وہ کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو، لیکن ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ اپنے ہم وطن کو کسی بھی شعبۂ حیات میں آگے بڑھانے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اس کی اس انداز سے حوصلہ شکنی کرتے ہیں کہ اس کے اندر موجود صلاحیت دم توڑ دیتی ہے، بات یہیں پر ختم نہیں ہو تی بلکہ اس کو ذلیل وخوار کرنے میں بھی اس حد تک گر جاتے ہیں کہ انسانیت بھی شرم سے اپنا سر جھکا لیتی ہے، انھوں نے ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالنے اور ماضی سے سبق حاصل کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے، اپنے لوگوں کو بے وقعت اور حقیر سمجھنے والوں کو بھی مخاطب کیا ہے۔ ان کا سادہ اور پر لطف انداز بیان قاری کو نظم کی قرأت کے لیے اکساتا ہے، نظم کے اشعار دیکھیں:

ہم پر نگاہ لطف مدارا نہ کیجیے ۔۔۔ لیکن وطن کے نام کو رسوا نہ کیجیے

اجناس اور بھی ہیں تجارت کے واسطے ۔۔۔ ناموس ملک و قوم کا سودا نہ کیجیے

پھیلایئے وطن میں نہ ذوق گداگری ۔۔۔ ذاتی شرف کا قوم میں چرچا نہ کیجیے

صد حیف سر جھکایئے غیروں کے سامنے ۔۔۔ اور ایک ہم وطن کو گوارا نہ کیجیے

لڑنے کا حوصلہ ہے تو میداں میں آیئے ۔۔۔ شوق مقابلہ ہے تو پردہ نہ کیجیے

اپنے میں کچھ ہنر ہو تو جوہر دکھایئے ۔۔۔ غیروں کے بل پہ نازش بے جا نہ کیجیے

اقبال سہیل کی اکثر نظمیں ان کے وسیع مشاہدہ و تفکر کی غماز نظر آتی ہیں۔ ان کی زندگی بڑے تلخ

تجربات سے دو چار رہی، زندگی کے تمام نشیب و فراز، تجربات و مشاہدات ان کے وسیع فکر و تخیل کے ذریعہ ان کی نظموں میں اس قدر روشن ہیں کہ کوئی بھی شخص ان کی نظموں کا مطالعہ کر کے ان کی زندگی کے شب و روز کا اندازہ لگا سکتا ہے، اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور ہم نواؤں کی مخاصمانہ چالوں سے وہ بہت دل گرفتہ تھے، اس کا اظہار انھوں نے اپنی بیشتر نظموں میں بھی کیا ہے۔

اقبال سہیل کی نظمیہ شاعری پر مذہب کا رنگ بھی بہت گہرا ہے۔ وہ مذہب اسلام کے سچے پیروکار تھے، ان کی نعتیہ اور منقبتی شاعری اس کا بین ثبوت ہے، مذہب اسلام کی سرخروئی و سربلندی اور اس کے ہم نواؤں کی خیر خواہی کے بھی وہ طلب گار ہیں، ان کی پوری زندگی اسلامی شعار کے مطابق گزری، پرچم اسلام سے بھی انھیں بے پناہ عقیدت و محبت تھی اور وہ اسلامی پرچم کو ہمیشہ سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔ نظم ''پرچم اسلامیان'' میں انھوں نے اپنے صدق جذبہ کا والہانہ اظہار بڑے سادہ و دلنشیں انداز میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

الٰہی شکر تیرا آج امید دل بر آئی ہے — وطن میں رایت اسلام کی پرچم کشائی ہے

یہ پرچم ان کا ہے جو رہنما ہیں قوم و ملت کے — محافظ ہیں جہاں میں جو کتاب اللہ و سنت کے

یہ پرچم ان کا ہے جو قاسم فیض رسالت ہیں — یہ پرچم ان کا ہے جو مظہر شان خلافت ہیں

نظر افروز ہے اس کی سپیدی بھی سیاہی بھی — کہ یہ پرچم بتاتا ہے اوامر بھی نواہی بھی

الٰہی تا ابد لہرائے یہ پرچم زمانے میں — رہے یہ یادگار سید عالم زمانے میں

ہر شاعر کا اپنا انداز نظر ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے مسائل و مصائب اور عہد و سماج کے درد و غم کو اپنے طور پر محسوس کرتا ہے اور اپنے اشعار میں زندگی کی کھردری سچائیوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ شعر و سخن سے سروکار رکھنے والوں کو اس کی شاعری حقیقی زندگی کی آئینہ دار نظر آنے لگتی ہے۔ اقبال سہیل کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نظم نگاری کے تمام اصول و ضوابط کا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے سیاسی، سماجی اور خارجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ انسان کے ذاتی درد و کرب، حیات و کائنات، اخلاقی پستی، آپسی نفاق سے پیدا ہونے والی صورت حال اور انسانی نفسیات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

اقبال سہیل کو برجستگی اور فی البدیہہ شعر گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے

کہ فی البدیہہ شاعری میں نہ تو معنوی تہہ داری ہوتی ہے اور نہ خیال وفکر میں وسعت و ہمہ گیری۔۔لیکن ان کی فی البدیہہ نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس فن پر بھی عبور حاصل تھا، یہ فطرت کا عطا کردہ ایک ایسا عطیہ ہے جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ انھوں نے بہت سی فی البدیہہ نظمیں بھی کہی ہیں، ان میں ایک مشہور نظم ''شان زندگی'' کے عنوان سے ہے جو غالباً سید سلیمان ندوی کی ایما پر اعظم گڑھ میں کسی جلسہ کے منعقد ہونے پر صرف پندرہ (۱۵) منٹ میں فی البدیہہ کہہ کر پڑھی تھی، جس کے ہر شعر میں ایک پیغام پوشیدہ ہے، یہ نظم بھی غزل کی ہیئت میں ہے اور ہر شعر اپنے اندرون میں بڑی معنویت رکھتا ہے۔ زندگی کے فلسفے اور اس کی حقیقت کو بہتر انداز و اسلوب میں آشکار کرنے کی کوشش کی ہے، زبان و بیان بھی دلکش اور شگفتہ ہے۔

اس طرف آئیں کہاں ہیں طالبان زندگی ہے دم شمشیر خضر آستان زندگی
تو نفس کی آمد و شد کو سمجھتا ہے حیات میں یہ کہتا ہوں وداع جاں ہے جان زندگی
راحت کنج قفس سے زندگی کو کام کیا بجلیوں سے کھیلتا ہے آشیان زندگی
وہ تو گورستاں سمجھتا ہے غلام آباد کو جس نے دیکھے ہیں زمین و آسمان زندگی
ایک ٹھوکر مار دیتا ہے جہاں پائے طلب خود ابلتا ہے وہاں سیل روان زندگی
رو پڑے راہ طلب میں جس جگہ دو آبلے لہلہا اٹھا وہیں اک گلستان زندگی

اقبال سہیلؔ ایک حساس طبع انسان تھے۔ علامہ شبلی نعمانی کی طرح انھوں بھی قوم وملت کی زبوں حالی پر اپنی افسردگی اور رنج وغم کا اظہار اپنی مختلف نظموں میں کیا ہے، ماضی کی یادوں سے ان کا بڑا گہرا تعلق تھا اور اپنے ماضی کو یاد کر کے وہ مضطرب ہو جاتے تھے۔ ''یاد ماضی'' ان کی ایک اہم نظم میں شمار کی جاتی ہے، جس میں امت مسلمہ کے عروج وزوال کی داستان بیان کی گئی ہے، ان کی یہ نظم بڑی درد انگیز بھی ہے، اور سبق آموز بھی۔ اشعار دیکھیں:

سیاست میں، تجارت میں، فلاحت میں، صناعت میں
نہ تھا پلہ کسی ملت کا دنیا میں گراں ہم سے
سبق ہم نے پڑھایا آ کے تہذیب وتمدن کا
ہوا آراستہ یہ گلشن ہندوستان ہم سے

دیا تاریخ کو اک مستقل فن کا شرف ہم نے
ہوا جغرافیہ یوں سر بر اوج آسماں ہم سے
ادب ہو، فلسفہ ہو ، یا طبیعی ہو ،ریاضی ہو
بہت پیچھے تھے ہر اک فن میں ابنائے زماں ہم سے
خبر کیا تھی کہ ایسا دور بھی اک آنے والا ہے
کہ رفتہ رفتہ چھن جائیں گی ساری خوبیاں ہم سے
یہاں تک گردش دور فلک سے پست ہونا ہے
کہ گرد راہ بھی کرتی پھرے گی شوخیاں ہم سے

اقبال سہیل کی نظمیہ شاعری میں جوش وجذبہ کی لے بھی کہیں کہیں بہت تیز ہوجاتی ہے۔ان کی نظمیں ہمارے اندر گرمی وحرارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سعی پیہم کے لیے بھی اکساتی ہیں،دوسرے شعرا کی طرح وہ بھی جنگ آزادی میں شریک رہے،اوراپنی نظموں کے ذریعہ مجاہدین کے دلوں میں حریت کے جذبے کو بیدار کیا اوراپنی نظموں میں آزادئ وطن کا نغمہ بھی بڑے زور وشور سے گایا۔ان کی ایک مشہور زمانہ نظم جو مخمس کی ہیئت میں ہے"بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے" آزادی کے تناظر میں لکھی گئی ہے جو اپنے انداز کی بالکل اچھوتی نظم بھی ہے۔اس نظم کے ذریعہ انھوں نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ جدوجہد ہی زندگی کی علامت ہے،نشیمن کے جلنے اور فنا ہونے کا خوف وغم نہیں ہے بلکہ وہ نشیمن کے بن جانے کے بعد آگ لگانے کی دعوت دیتے ہیں،اس نظم میں ان کی دلی کیفیات کا اظہار بڑے پر سوز انداز میں پایا جاتا ہے،یہ نظم عمل پیہم اور جہد مسلسل کے لیے مہمیز کا کام کر تی ہے۔

یا برق قضا گر کے نشیمن کو جلا دے　　یا شعلۂ گل اٹھ کے اسے درس فنا دے
کوئی تو جگر سوزئ بلبل کا صلا دے　　کوئی تو اسے پھونک کے اکسیر بنا دے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے
گائیں گے ہم آزادئ گلشن کا ترانہ　　بے کار ہے اے برق بلا ہم کو ڈرانا

کافی ہے بہت وسعت صحرائے زمانہ　　ہم اور کہیں ڈھونڈ نکالیں گے ٹھکانا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ہے معرکہ ہر چند سہیلؔ اہل جفا سے　　جانباز وطن ڈرتے ہیں کب اہل دغا سے

ہٹنے کو نہیں منزل تسلیم و رضا سے　　جو کچھ بھی گزرنی ہے گزر جائے بلا سے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

''خطاب بہ مسلم'' بھی اقبال سہیلؔ کی ایک عمدہ نظم ہے۔اس نظم میں بھی ماضی کی بازگشت اور ملت کی زبوں حالی پر افسوس کا اظہار پایا جاتا ہے،وہ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان قوم تو ایسی تھی کہ جس نے دنیا کے صنم خانوں کے بت توڑ کر حق کو سربلند اور باطل کو سرنگوں کر دیا تھا،لیکن ماضی کے اثرات پھر سے تمہارے اندر ظاہر ہونے لگے ہیں اور مسلمان پھر سے گمراہی و ذلت و خواری کے راستے پر چل پڑے ہیں۔جس قوم نے پوری دنیا میں اپنے عمل،اخلاق و کردار اور علم و آگہی سے ایسا اجالا کر دیا تھا کہ دوسری قومیں اس کی روشنی میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئیں،لیکن قوم مسلم آج پھر سے دوسری قوموں کی دست نگر بن گئی ہے۔اپنے اسلاف کے عظیم اور روشن کارناموں کو پس پشت ڈال کر مغرب کی پیروی میں ایسا کھو گئی کہ یہ بھی یاد نہیں کہ اسے روئے زمین پر نیابت کے لیے بھیجا گیا تھا،یہ ہمارے آپس کے نفاق کی دین ہے،اس نظم سے ان کی ملی ہمدردی اور قومی حمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

تو نے بت توڑ دیے کتنے صنم خانوں کے　　خود مگر معتکف کلیر و اجمیر رہا

کبھی کاغذ کو کبھی قبر کو پوجا تو نے　　بت پرستی سے ترا جی بھی کہیں سیر رہا

کر دیا شمع نے محفل میں اجالا ہر سو!　　اپنے ہی پاؤں کے نیچے مگر اندھیر رہا

یہی کرتوت ہیں تیرے،تو سن اے ننگ سلف　　تو رہا ہند میں اب تک تو بہت دیر رہا

اس سے بڑھ کر ابھی آنی ہے تباہی تجھ پر　　عقل کا تیری اسی طرح اگر پھیر رہا

اقبال سہیلؔ کی قومی و ملی نظموں میں ''فتح سمرنا'' بھی ایک بہترین نظم ہے،اس نظم میں انسانی نفسیات خصوصاً اہل اسلام کے طریق کار،مصیبت میں آہ و بکا اور فریاد کی تردید کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان تو کبھی مصیبت سے گھبراتا نہیں،مصیبت میں ماتم کناں ہونا مسلمانوں کا

شیوہ نہیں ہے، بلکہ یہ اہل ایمان والوں کے لیے تمغائے شرف سے کم نہیں، عیش کوشی اور آرام طلبی تو موت کی علامت ہے۔ اس جہاں کی رونق جہد مسلسل اور ہنگاموں پر موقوف ہے، کفر و باطل میں تفریق کرنا اسلام کی ہی دین ہے، روز ازل سے ہی باطل طاقتیں مذہب اسلام کو مٹانے کی کوششیں کر رہی ہیں، لیکن باطل طاقتوں کو ہمیشہ شکست فاش ہوئی ہے اور اسلام آج بھی پوری دنیا میں سرخرو و سر بلند ہے، یہ نظم بھی ان کی دوسری نظموں کی طرح ہمارے اندر قوت و حوصلہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ اشعار دیکھیں:

مصیبت میں مسلماں شکوہ سنج آسماں کیوں ہو
نہ ہو یہ آنچ تو کھوٹے کھرے کا امتحاں کیوں ہو

مصیبت خاص تمغائے شرف ہے اہل ایماں کا
نہ کھائے ضرب گر سکہ تو عالم میں رواں کیوں ہو

مصائب ہی سے ہے آبادئی کاشانۂ ہستی
یہ ہنگامے نہ ہوں تو رونق بزم جہاں کیوں ہو

چٹانیں کفر و باطل کی اگر اس سے نہ ٹکرائیں
تو طوفاں خیز، یوں اسلام کا سیل رواں کیوں ہو

ازل سے ناوک قاتل امانت اہل دل کی ہے
حوادث کا گلہ کیوں ہو، مصائب پر فغاں کیوں ہو

مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ اقبال سہیلؔ کی دیگر نظمیں مثلاً ''رویائے صادقہ'' جنون آرزو'' نوائے وطن'' ناصح و مجنوں'' اور ''نوائے ادیب'' وغیرہ ان کے ذہنی و فکری رجحان کی غماز ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے جس ہنرمندی کے ساتھ اپنے باطنی درد و کرب کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی نظم نگاری متاثر کن ہوگئی ہے۔ نظم کی فضا سازی میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے، ان کی نظمیں فنی و فکری اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگرچہ ان کی نظموں کے مطالعہ کی طرف خصوصی توجہ نہیں کی گئی ہے اس لیے اردو نظم نگاری میں انھیں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال سہیلؔ کی شاعری کا تنقیدی نقطۂ نظر سے از سر نو مطالعہ کیا جائے تا کہ ان کی

شاعری کا معیار و مزاج واضح ہو سکے اور اردو زبان و ادب میں ان کی ادبی حیثیت مستحکم ہو سکے۔

حواشی

(۱) اقبال سہیلؔ نمبر (عالمی رنگ ادب، کراچی) علامہ سہیلؔ، فضا اعظمی، یکم ستمبر تا ۳۱ دسمبر، ۲۰۱۱ء، ص ۷

(۲) تابش سہیلؔ، مرتبہ: افتخار اعظمی، مرکز ادب، لکھنؤ، ۱۹۸۵، ص ۳۷

(۳) کلیات سہیلؔ، مرتبہ: عارف رفیع، معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، اشاعت دوم، نومبر ۲۰۱۱، عرض ناشر، ص ۹، ۱۰

(۴) اقبال سہیل نمبر (عالمی رنگ ادب، کراچی) یکم ستمبر تا ۳۱ر دسمبر ۲۰۱۱ء

(۵) کوثر مظہری، جدید نظم: حالی سے میراجی تک، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ ۲۰۱۳ء، پیش آہنگ، ص ۹

(۶) اقبال سہیل کا فن، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، سہیل ایک عبقری، عطیہ خلیل عرب، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷ء، ص ۳۸

آہ! اقبال سہیلؔ

وحشی کانپوری

شعر جس کا بادۂ عرفاں کا اک پیمانہ تھا — جس کے پہلو میں نہاں صد جلوۂ جانانہ تھا
جس کا اندازِ تکلم اس قدر رِندانہ تھا — تشنہ کامانِ محبت کے لئے میخانہ تھا

جس نے گلزارِ سخن کو اس طرح چمکا دیا
شعلہ ہائے نَے سے ہر دشت وجبل بھڑکا دیا

جس پہ اُردو شاعری کو سر سے پا تک ناز تھا — جو کہ دنیائے ادب میں ہر طرح ممتاز تھا
جو کہ نغماتِ حقیقی کا مجسم ساز تھا — جس کے ہر اک شعر میں الہام تھا اعجاز تھا

وہ گلِ آخر بھی اے بادِ صبا مرجھا گیا
اب اندھیرا ہی اندھیرا گلستاں پر چھا گیا

یہ شرف حاصل تھا شاید حُبِّ احمدؐ کے طفیل — بڑھ گیا جو اس قدر جذبات کے طوفاں کا سیل
ہوگیا شعر وسخن سے دل کو کچھ اس درجہ میل — نَیرِ بامِ ادب بن کر چمک اٹھا سہیلؔ

مہر جب نکلا ضیا تاروں کی مدھم ہوگئی
اس کی کرنیں جب بڑھیں ناپید شبنم ہوگئی

آہ اے اقبال اب تجھ کو یہاں پائیں کہاں — ڈھونڈتے ہیں ہر طرف ملتا نہیں تیرا نشاں
آہ اے سروِ روانِ گلشنِ روحانیاں — تو گیا کیا؟ ہوگیا تاراج سارا گلستاں

اب کوئی ایسا سخنور دہر میں ملتا نہیں
پھول ایسا ایک بھی گلزار میں کھلتا نہیں

تیری غزلوں سے مئے عرفاں کا ملتا تھا سرور — شاعریٔ مبتذل رہتی تھی مجھ سے دور دور
انکساری تیری عادت تھی نہ تھا تجھ کو غرور — تجھ کو فطرت نے عطا کی تھی طبیعت بھی غیور

شعر کہنے میں تجھے حاصل تھی وہ برجستگی
فکر کرنے کی تجھے گویا ضرورت ہی نہ تھی

دردِ دل سے گو کہ رہتا تھا سدا ناشاد تو
فکر دنیا سے مگر دائم رہا آزاد تو
چھیڑتا تھا جب غمِ دل کی کبھی روداد تو
اپنے وحشی کو بھی کرلیتا تھا اکثر یاد تو

تونے فخر میزبانی مجھ کو بخشا بارہا
کی ترنم ریزیوں سے گُل فشانی بارہا

میں ملا تھا تجھ سے جب اُناؤ میں آیا تھا تو
ہدیۂ نازآفریں ہمراہ جب لایا تھا تو
حافظِ شیراز کا دراصل ہمپایا تھا تو
شاعری کو ناز تھا جس پر وہ سرمایا تھا تو

یاد ہیں محفل میں تیری وہ سخن آرائیاں
وہ عروسِ شعر کی بادہ شکن انگڑائیاں

میں نہ سمجھا تھا یہ تیری زندگی کی شام ہے
تیری بیماریٔ فالج موت کا پیغام ہے
تیرے ملنے کی تمنا اب خیالِ خام ہے
اب یہ ویراں گلستاں ہے اور خدا کا نام ہے

اپنے دستِ شوق سے دامانِ مشفق چھٹ گیا
لٹ گیا اُف کاروانِ زیست اپنا لٹ گیا

تونے جو نعت رسُل بے مثل لکھی تھی یہاں
اُس کے ثمرے میں تجھے جنت ملی ہوگی وہاں
لیکن اے اقبال، اے ہمدرد و جانِ دوستاں
ہم گنہ گاروں کی قسمت میں بھلا جنت کہاں

بعد مردن بھی ترا دیدار اب دشوار ہے
تجھ سے پھر ملنے کی حسرت خام ہے بیکار ہے

تو تو اب جنت میں ہے محو تماشائے جمال
تجھ کو دنیا چھوڑنے کا اب نہیں مطلق ملال
لیکن اے اقبال اے صحبت گزینِ نونہال
تجھ کو کچھ احباب کا بھی اپنے آتا ہے خیال

ہو مبارک جانے والے تجھ کو جنت کی فضا
ہم گنہ گاروں کا بھی دنیا میں حافظ ہے خدا

☆☆☆

اقبال سہیل کی تخلیقات سے روشناسی کے لئے ہمیں ان کے خانۂ دل میں اترنا پڑے گا، علامہ شبلی کے خانوادے سے نسبت کے ساتھ ملت اسلامیہ کے مرکز محسوس میں برسوں رہ کر دانش و بینش کی حصولیابی، اور رشید احمد صدیقی وذاکر حسین جیسے سیکڑوں رفیقوں کی علمی وثقافتی ہم نشینی کے زیر سایہ ان کے شعور کی تربیت ہوئی تھی۔ علی گڑھ کو محض درودیوار یا کتاب وقاری کا معمورہ سمجھنا بدتوفیقی ہوگی۔ یہ قلب ونظر کے معاملات کا مرکزِ محسوس ہے۔ جو بہ حسب توفیق حاصل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی بے تیغ و بے نیام بھی پیدا ہوتے ہیں جو اقدار کی پامالی کو ہی عروج آدمیت سمجھتے ہیں۔ ان سے آج ہمارا سابقہ کچھ زیادہ ہے۔ اقبال سہیل کے دور میں ایسا نہ تھا۔ ان کے علاوہ علامہ اقبال کے فکر وشعر نے برصغیر کی فضا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ اس پس منظر میں اقبال سہیل کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

—— پروفیسر عبدالحق

DANISH-E-SUHAIL

by

Dr. Shababuddin
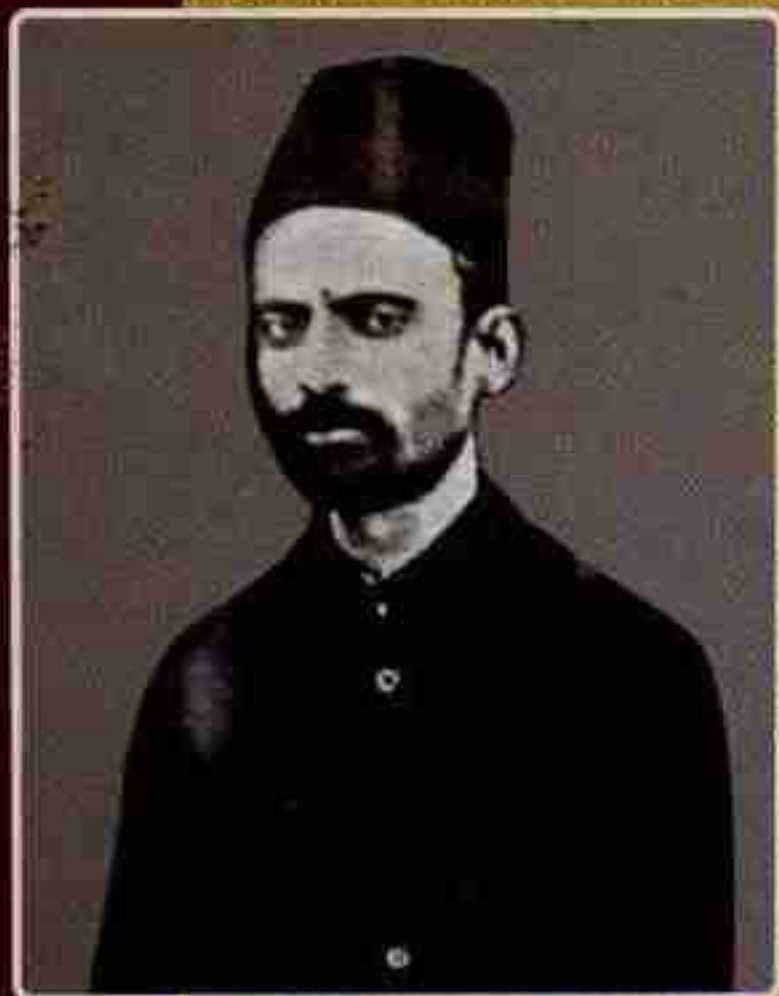
Allama Iqbal Ahmad Khan Suhail
M.A., LL.B. (Alig),
M.A.O College, Aligarh 1914 AD.

Published By:

الھدیٰ پبلیکیشنز
alHuda publications
2982, Kucha Neelkanth, Qaziwara, Daryaganj, New Delhi-2
Phone: 011-43259013, E-mail: alhudapublications@yahoo.com